

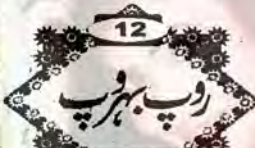
دلچسپ اور نئی نیر کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ کراچی

دسمبر 2018

تحریر: امجد علی
معارضہ: وحید

URDU TUBE
HOME OF ENTERTAINMENT
www.urdutubes.com



اسماقادی

لحمہ یہ لحد ایک نیا رخ اختیار کرتے
کرداروں کے عکس در عکس سلسلے



مدیر اعلیٰ

قارئین کی کرام فرمائیاں اور کج ادائیاں
نامہ و پیام، محبتیں، عنایتیں اور کائناتیں



عکس فاطمہ

لب سڑک پریشان حال
لوگوں کو لوٹنے والے گروہ کا انجام



تنویر ریاض

تغاب در تغاب..... زندگی و موت کے
فاسلوں کو عبور کرتی پڑھنے کہانی.....



جمال دستی

یاس زده زندگی میں خوشی کی معمولی
رقی کی متمنی خاتون کا معاہدہ ملحدوں



سرور اکرام

دو مختلف دنیاؤں کے تعلق
رکھنے والے دوستوں کا ماحیرا



اعتزاز سلیم و صلی

سادہ و معصوم زندگیوں کے کھیلنے
والے درندوں کا دہرا کھیل.....



مظہر سلیم ہاشمی

خوشیوں بھرے لحاظ میں باپ
اور بیٹے کی محبت مانگی بھگت



طاہر جاوید مغل

بسطر بسطر رنگ بدلتی...
ایک لہو رنگ اور دل گداز داستان



مدیر اعلیٰ
عزرا رسول

مدیر : لکھی خیال
ناشر : ڈاکٹر نسیم اختر



مدیر اشعار
محمد شادان
0333-2256789



سرکولیشن منیجر
سید میر حسین
0333-3285269

جلد 48 • شمارہ 12 • دسمبر 2018 • زو سالانہ 1200 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 100 روپے •

خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون (021) 35895313 • E-mail: jdpgroup@hotmail.com



160

آوارہ گروہ

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

تھیر... سننی اور ایکشن میں ابھرتا
ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...

157

سربراہ سراغ

سلیم انور

ساز کے سروں میں
چھپی سراغ کی نشاندہی.....

207

مرگ جاناں

احمد جعفری

اس مرگ جاناں کا فاسق جس کی
ذات میں ہسانہ انداز پنہاں تھا

195

ناقابل شکست

تمکین رضا

ایک وکیل اور ڈاکٹر کے
مابین حباری چپقلش کا اختتام

224

کہانی کی تلاش

محمد عفتان آزاد

کہانی کی تلاش میں انسانیت کو تار تار
کر دینے والے دل بڑا ش حقائق

215

پہچان

محمد فاروق انجم

حبرم و سزا کا انداز لے
ایک اداکار کی فنکاریاں

262

پتلی گر

امجد جاوید

حالات کی بے رحم جوجوں کی نذر جو جانے
والے ایک بے پتوار کا قصہ عبرت

235

آزاد قیدی

منظور امام

ان آزاد پرندوں کی کہانی جو زندگی
اور حبرم کے قیدی تھے.....



عزیزانِ مومن..... السلام علیکم!

دھیرے دھیرے یہ سال بھی گزر گیا۔ اس کا آخری شمارہ پیش خدمت ہے۔ اگلے ماہ 2019ء کے پہلے شمارے کے ساتھ ملاقات ہوئی اور اب، امریکا جیسے ترقی یافتہ اور طاقت ور ملک میں بربادی کے قصے حالیہ چند مہینوں اور مہینوں کے ہیں۔ فلوریڈا میں طوفان ہیراوقیا ٹوئس میں سمندر کی گہرائیوں سے اٹھا اور کیرولائنا کے ساحلی علاقوں کو تباہ و برباد کر گیا۔ پھر خبر آئی کہ کیلی فورنیا کے جنگل میں آگ بھوک اٹھی جس نے قریبی آبادیوں کو بھی لپیٹ میں لے لیا۔ تاہم غریب تقریباً ڈیڑھ سو افراد میں کربلاک ہو چکے ہیں، مکی سولا پتا ہیں، ہیکوئس ٹیکس کرڈھی ہوئے ہیں، مگر محل کرراکھ کا ڈھیر بن چکے ہیں۔ اس ملک کے جملہ وسائل اور ماہر ترین فائر فائٹر بھرپور زندگی اور فضائی کوششوں کے باوجود ان ہمسایک شعلوں کو سدھیں کر سکے۔ اس بھڑکتی آگ کا سبب ہے خشک موسم، سخت گرمی اور تیز ہوا میں الامان الحیط۔ یہ قدرتی قوتیں کسی کے قابو میں نہیں ہیں۔ قدرت خفا ہوتی ہے تو ہولناک سمندری طوفان اور ہوش ربا بگولے بھر کر حملہ آور ہوتے ہیں اور سب کچھ خشک و خاشاک کی طرح ان کا ایندھن بن جاتا ہے۔ ٹیگ ٹک ویدم، دم نہ دینے والے کے مصداق ساری انسانی جدت اور قوت دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ ماضی قریب میں ہمارے قریب و جوار کے سمندر میں بھی کئی بے مہار طوفانوں نے سر اٹھایا۔ شور ہو کر ان کا رخ ہمارے ساحلوں کی طرف ہے لیکن ان بستیوں کے ٹیکو کارٹونوں کی دعا میں رنگ لائیں، قدرت کو ہم پر رحم آگیا اور ہر بار ان طوفانوں کا رخ مڑ گیا۔ ہم سب نے اطمینان کا سانس لیا مگر اس شبی تاویب کو تفر اعداد کو دیا گیا۔ ہماری انفرادی اور اجتماعی معاشرت و معیشت میں ہولناک گناہ نے جڑیں پکڑ لی ہیں۔ ساہوکار اور رکھوالے چوری پر اتار آئے ہیں، ملاوٹ، جھوٹ، جہتان طرازی، بد اخلاقی، عدم برداشت ہماری رگ رگ میں سما چکی ہے۔ ہوس زور نے ساری مذہبی، اخلاقی اور انسانی افتاد کو بے رحمی سے روند ڈالا ہے۔ حرص و طمع کی دوڑ میں خون کے رشتے پامال کیے جا رہے ہیں..... کہیں ہم ان رویوں سے غضب الٹی کو تو دعوت نہیں دے رہے؟ یہ ہمارے لیے گونگ رہے۔ تو مومن کا بکا زور ڈروال جب اپنی حدوں سے گزرنے لگتے ہیں تو شبی لاکھی حرکت میں آ جاتی ہے۔ ہمیں اس وقت سے پناہ مانگنی چاہیے جب زمین لرزے اور سمندر رانے لگتے ہیں..... معاشرہ انفرادی اکائیوں سے تشکیل پاتا ہے۔ ہم ذاتی اصلاح کر لیں تو معاشرہ خود بخود سدھ جائے گا۔ اس دروندانہ گزارش کے ساتھ چلتے ہیں اپنی مکمل میں جہاں الفاظ گرجتے برستے اور سکرآتے نظر آتے ہیں۔

جامشورو سے خالد شیخ طاہری کی پیش گوئی ”یہ پچیس اکتوبر کی سلونی سی شام تھی۔ موسم بدل رہا تھا تو طبیعت بھی کچھ بوجھل سی ہو رہی تھی۔ دل میں ایک نیم ہی خواہش ابھری کہ کب اساتیل کی طرف سے ہوتا ہوا جاولں، ہو سکتا ہے جاسوسی آگیا ہو۔ جیسے ہی جاسوسی پر نظر پڑی، اپنی خواہش پوری ہونے کا یقین نہیں آ رہا تھا جب سو روپے نکال کر جاسوسی اپنے قبے میں کیا تو یقین آیا۔ سرورق پر نظر پڑی تو ایک حینہ کو کم آگھوں سے مسکراتے ہوئے پایا اور وہیں منظر میں ایک نوجوان کن تانے دا دیدہ دھن کو گولی مارنے کے لیے پر توں نظر آیا۔ ساتھ میں انسپلر تانے چہرے سے سرورق کو دلکش بنا دیا۔ نماز پڑھ کر جب شاپ پر پہنچا تو راوی جین ہی جین لکھ رہا تھا۔ موقع غنیمت جان کر جلدی جلدی کہا نیوں کی فہرست میں پہنچا تقریباً تمام ہی جانے پہچانے نام نظر آئے۔ جب سے تیسرے ادارے کو ارسال کرنے لگا ہوں اپنی مکمل میں پہنچنے کی جلدی ہونے لگی ہے۔ حالانکہ تیسرہ یو جی مروفیات ارسال کیا بھی نہیں تھا۔ مکمل میں پہنچا۔ شروع کرتے ہی شرمندگی نے آن میرا۔ یہ حقیقت ہے کہ ہم بہت سی اہم شخصیات کو آہستہ آہستہ بھولتے جا رہے ہیں جس کو ایک ایسے ہی کہا جاسکتا ہے۔ شاعرانہ تیسرے کے ساتھ باطل شہزاد براجمان تھے۔ سارے ہی تیسرے بہترین رہے۔ اب یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ سب سے پہلے انگارے پڑی۔ اس قسط کا شدت سے انتظار تھا۔ مکمل صاحب نے اس قسط میں تو سائیں ہی روک دی تھیں۔ تیز رفتار قسط انجین اور جیس سے بھر پور رہی۔ جہاں یا مینن بنیم کے انجام پر دکھ ہوا وہیں ایٹن اور جاول بے اختیار بہت یاد آئے۔ ایسے موقعوں پر ایسے دوست ہی کام آتے ہیں مگر انہوں..... انگارے پڑھ کر چھوٹی کہا نیوں پر ہاتھ صاف کرنے کا سوچا۔ منظر امام کی ارمان بھرا لپکے پٹکے انداز میں کسی کی سرکشا نہ کر سکی۔ جاول خان نے کہا نی خوف کے ذریعے ایک اچھی کہانی اپنے نام کی۔ سلیم انور، پھندا

لے کر جرم کو بکڑاتے نظر آئے۔ ایک بہترین کہانی پر پڑنے کوئی۔ تو بری ریاض کی راز سراغ رسانی پر ابھی رہی۔ عمران قریشی کی حساب کتاب، ٹکس قاطر کی بے وفائی، چھین رضا کو انوکھا انتقام، ساحر انور آل کار کے ساتھ، شاکر لطیف کتاب نسواں، راشد بیگ کی چالاک چور اور جمال دتتی صاحب کی خود کردہ کوہ پڑھ کر جاسوسی کوئل و جرم نمبر قرار دے دیا۔ ایک جیسے موضوعات نے کچھ یوتو کیا مگر کہانیوں کے بارے میں یہی کہوں گا کہ بہترین اور دلچسپ رہیں۔ اس دھند رنگ کچھ رنگیلے تو نہیں تھے لیکن دلچسپی لے ہوئے تھے۔ طلحہ تہا کی رات الفٹ بریدہ، مس، پندرہ اریات اور مزاح کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ ایک دلچسپ اور چونکا دینے والے انجام پر اختتام پذیر ہوا۔ کبیر عباسی کا رنگ حاصل لا حاصل لالچ میں ڈوبے دوستوں کی کہانی تھی۔ لالچ میں اندھے ہو کر انہوں نے بہت کچھ حاصل کر لیا تھا مگر قدرت کے پاس فیصلہ کچھ اور ہی ہو چکا تھا۔ امجد رئیس کی عروسی عذاب جو جاسوسی کے گولڈن صاحب پر اپنی جانب متوجہ کر رہی ہے لیکن یہی فرصت میں اسی کو پڑھتا ہے۔ امجد رئیس صاحب کا نام ہی کافی ہے۔ خشکی یہ بتا دوں کہ کہانی لا جواب ہوگی جسکی پہلے صفحات پر بیٹھا رہی ہے۔“ (بالکل بجا فرمایا)

مظفر گڑھ سے طاہر کریم کی ڈھونڈنازی ”دھوکے دل اور کانپتے ہاتھوں سے جب نومبر کا شمار سنبھالا تو اول لمحات میں جیٹی نکتہ چینی کا رخ کیا۔ یہ دیکھ کر چودہ مہینے روشن ہو گئے کہ بادشاہت بھی محفل کا حصہ تھی۔ اس حوصلہ افزائی کے لیے تادل سے مشکور ہوں۔ موجودہ شمارہ دل تو باغ کر گیا۔ سیرج لباس میں بیوس، نصف قاتلانوں میں چھپائے، قاتلانہ سرگرمی کے لیے نائل و حلیہ سرائے کو چار چاند لگا کر دیا تھی۔ حسن، جرم اور نیل سے آراستہ نائل دل کو بھا گیا۔ حسب معمول رسالے کا آغاز انگارے سے کیا۔ شاہی اور باقی فیملی کا مدد کے لیے دوستوں کو بلانا آئیل نیچے مار کے مصداق نظر آا۔ آخر ایک مشکل سے نکلنے تو دوسری آفت تیار تھی۔ ہاناوانی کا کردار بے شک فسوس خیز رہا۔ عروسی عذاب میں امجد رئیس نے کمال کر دیا۔ آپ بھی ہمارے فیورٹ مصنفین میں شمار ہوتے ہیں۔ بے چاری نیتا کو رومی کی شادی آپٹیمز کی بدولت طوالت اور کچھ کشیل ہوئی۔ سام نے نیتا کو حوصلہ فراہم کیا مگر پھر دونوں محبت میں گرفتار ہو گئے۔ پوری تحریر میں کادھی اردو میں چکراتی رہی۔ سرورق کا پہلا رنگ الفٹ بریدہ، طلحہ تہا کی زیر دست کاوش تھی۔ اختیار صاحب شبنم نے آئیل پھیر دیا وہی تھے۔ غزالہ کے ہوتے ہوئے بھی دوسری غزالہ کا پتہ نہ پتہ۔ جو کہ شروع میں لکھ کر یہ تھا مگر آخر میں ستارہ کا بابا پن پڑا۔ عشق اور پرویز کا اختیار کو کونہ ان سبب محال دھت نے کہانی کا لطف دوپلا کر دیا۔ کبیر عباسی نے لالچ بڑی بلا سے کامی سبب اپنی کہانی میں پیش کیا۔ تین دوستوں نے دولت کی خد سے چوتھے کو شکار کیا اور ہاتھ چھ نہ آیا۔ کتاب نسواں تحریر کردہ جناب شاکر لطیف ابھی تحریر رہی۔ فورت دلتی ایک پتیلی ہے۔ چار مردوں پر حاوی آنا دلتی کمال ہے۔ آوارہ گرد حسب حال رہی۔ سوزی کا سردار دلچسپ رہا۔ یوں لگتا ہے کہانی اختتام کی طرف گامزن ہے۔

منہ، روضہ فیصل آباد سے کہتی ہیں ”پورے ماہ جاسوسی ڈائجسٹ کے ملنے کا شدت سے انتظار کیا۔ بت رسالہ ملنے ہی ساری خوشی جھاک کی طرح بندھ گئی۔ جیٹی میں نے ایک کہانی سمجھی تھی لیکن ادارے نے اسے قابل اشاعت یا ناقابل اشاعت کے بارے میں بتانے کی زحمت گوارا نہ کی۔ پیلز، پیلز، پیلز میری کہانی کو جاسوسی ڈائجسٹ میں شامل کیجیے۔ میں نے عورت کو غیرت کے نام پر قتل کیے جانے کے موضوع پر کہانی لکھی ہے۔ (ابھی پڑھی نہیں گئی ہے) ایمانے زارا شاہ پھر سے غائب تھیں اور عاتکہ مرزا کی غائب ہو گئیں۔ دیکھ لو عاتکہ میں فیصل آبادی تو موجود ہوں بت تم چھوڑ کر بھاگ گئیں۔ یا سبط بھائی گریجویشن مکمل ہونے پر مبارکباد دینے کے لیے شکر ہے۔ بت آپ فیصل آباد بے کیسے ہو گئے؟ آپ تو سکھر سے لکھتے ہیں نا۔ طاہر کریم بھائی کو خوش آمدید۔ محمد اود خان بھائی کو بھی خوش آمدید۔ سعیدہ قدیری کا تبصرہ عمدہ رہا۔ باقی سب کے تبصرے بھی عمدہ رہے۔ امجد رئیس کی ترجمہ شدہ عروسی عذاب کیا کہانی تھی۔ انگریزی ترجمہ شدہ کہانیاں نیچے ویسے بھی بہت پسند ہیں۔ ہر بار نیتا کو اس کی لگ نہ بجایا۔ آخر میں روبرو سام کو بھی نیتا سے محبت ہوئی تھی۔ سلیم انوری کی چندا میں سراغ رساں ہارنے کے کافی ذہانت سے قائل شوہر کو بکڑایا۔ تو بری ریاض کی راز سراغ ابھی رہی۔ مظفر امام کی اربان بھرانے واقعی دل معطر کر دیا۔ عمران قریشی کی حساب کتاب میں یعقوب کا انجام بھی ہونا چاہیے تھا۔ عورتوں سے بدسلوکی کرنے والے مردوں سے مجھے نفرت ہے۔ آخر میں بے چاری عاتکہ کی موت پر افسوس ہوا۔ چھین رضا کی انوکھا انتقام میں ایڈمز نے ڈیرن اور جوڈی پر اپنی موت کا الزام ڈالنے کی اچھی کوشش کی تھی جو سراغ رساں کیڈی کی ذہانت کے آگے رانگاں گئی۔ شاکر لطیف کی کتاب نسواں میں نیکی نے میکا رنو، رابن، ہارڈی اور لی مون کو کافی بے وقوف بنایا اور وہ آسانی سے بیٹے رہے۔ میکا رنو کی موت چھوٹا کو کواڈی گلی لیکن رابن اور ہارڈی کی ایک ساتھ موت کے بعد بھی لی مون کی موتنی متعل میں یہ بات نہ لکھی کہ سب میکی کر رہی ہے اور خود بھی جان سے گیا۔ جمال دتتی کی خود کردہ میں جو ناخن نے اپنی ذہانت سے کیس حل کر لیا۔ سرورق کی پہلی کہانی طلحہ تہا کی الفٹ بریدہ لکھ رہے تھے جس بڑھاتی اور ابھاتی تحریر تھی۔ سرورق کی دوسری کہانی کبیر عباسی کی حاصل لا حاصل میں یاسر، راشد اور ساجد نے اپنے ہی دوست حامد کی جان لے کر چما نہیں کیا تھا۔ انہیں عبرت ناک

مزا لینی چاہیے مگر لیکن شاید اور بشری موت کا بہت دکھ ہوا۔“

ساگر ٹکڑو کر فرام چشمہ ہیراج سے ہیرانی ”مسئلہ جدوجہد کے بعد 130 کتور کو جاسوسی ملا خوشی اور ہوا آگے سے کیجیے سے لگایا۔ جاسوسی ملنا خوشی کا باعث ہے۔ ہستی مسکراتی سرخ لباس میں ملیں عورت ایک انارو دو ہزار کی عملی تصویر لگی۔ پرنکر ادارہ یہ بہت اچھا لگا۔ ادب اور دل سے گزارش ہے کہ اب کوئی نواب مرحوم کی غیر مطبوعہ کہانی بھی پیش کر دیں۔ آپ نے تو ٹیکسٹ آئین بھلا دیا ہے۔ ہم شدت سے انہیں مس کرتے ہیں۔ چینی کھٹی چینی میں باسط شہزاد کو کرسی ملنے پر مبارکباد کا ٹوکرا۔ اس بار مکمل میں نے نام دیکھ کر خوشخواری حیرت ہوئی۔ کہانیوں میں سب سے پہلے طاہر جادویش کی افکار سے پڑی۔ بہت عمدہ اور باکمال لکھتے ہیں۔ لفظوں سے تصویر کھینچ دیتے ہیں جذبات اور منظر نگاری کی۔ یاسین بیکم کے چانگ غیب نے لرزادیا۔ بنارس کی بے وفا کی اور داؤد بھادو کے غائب ہونے کے پیچھے کیا کہانی ہے۔ اس لیے اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ منظر امام کی ارمان بھرا پر حراں تحریر نے ہمیشہ کی طرح بہت محفوظ کیا۔ آواز کار مختصری کہانی بہت اچھی لگی۔ چنیدا اکثر انگریز ادبیاتی بیویوں کے قاتل کیوں لکھتے ہیں۔ کوئی اس موضوع پر بھی کہانی شائع کریں۔ خود کردہ میں جو نام کی ذہانت نے حیران اور متاثر کیا۔ چالاک چور، چور اتنا بھی چالاک ہو سکتا ہے۔ یہ بھی سوچنا تھا۔ حساب کتاب میں لمحہ بہ لمحہ بدلتی صورت حال اور انجام نے حیران کر دیا ہے کہانی بہت اچھی رہی۔ سہال کی خوف بہت عمدہ رہی۔ لارا کے پراسرار آئینہ نے جمید بادشاہ کے پیالے کی یاد دلادی۔ بے وفا کی، الوکھا انتقام اور کتاب نسواں بھی بس شیک رہی، تھوڑی سی رعایت کے ساتھ۔ عروسی عذاب کو بے دلی سے پڑھنا شروع کیا (بے دلی سے کیوں؟) اور یوں کھویا کہ انجام پر بریک لگی اور احساس ہوا کہ ابھر رہیں سے تو یونہی دور بھاسکتا سرور کی پہلی کہانی طاہر علی کی الفت بریدہ جس بڑھائی لیجانی پراسرار رموز سلجھاتی تحریر نے سرور کی کہانی کا حق ادا کر دیا۔ سرور کی دوسری کہانی حاصل لاچ بری بلا کا سبق دیتی اچھی لگی۔ ساجد کی معاملہ بھی اور موقع شناسی نے حیران کیا۔ شاید کاردار میں جاکتا اور حقیقی سا لگا۔ بہارہ کبوترہ میل سا لگراں اور پائیں میل یہ سارہ علاقہ دیکھا ہوا ہے۔ کیر عسائی کی کاوش بہت پسند آئی۔“

ریاست خان، داود خیل، میانوالی سے لکھتے ہیں ”اس بار جاسوسی جلد ہی مل گیا۔ سرورق شائد اتر تھا جو بصورت بڑی مجھے دیکھ کے پتا نہیں کیوں مسکرا رہی تھی بہر حال میں تو اس کی آنکھوں میں اتنا ڈب کیا کہ آگے کہانیوں میں جانے کا دل ہی نہیں کر رہا تھا۔ آخر کار اس کی آنکھوں سے پچھا چھڑا کے چینی کھٹی چینی میں پیچھے۔ آخر کار اللہ اللہ کر کے ہماری بھی کر بچو نہیں مکمل ہو چکی۔ (بہت مبارک ہو) خطوط میں پہلا خط باسط شہزاد کا مبارک باقبول کرو۔ مختصر مدینے بھی آخر کار میرے خیال میں اپنی جیب سے جاسوسی لے ہی لیا وہ ایسے سخن نام کا مطلب کیا ہے؟ عیدالعبار روئی کا خط دیکھ کر حیرت ہوئی اتنا مختصر کہیں شادی تو نہیں کر لی۔ خطوں میں باسط شہزاد، مختصر مدینہ، عیدالعبار روئی اور ساگر ٹکڑو کے خط بہت پسند آئے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے اپنی فیڈرٹ افکار سے پڑی۔ بہت عمدہ جاری ہے۔ ویسے شادوبک کی اتنی خشک لڑائی دیکھ کر بالکل مزہ نہیں آ رہا مزہ تو تب ہو جب کوئی تاجر کو میلی آنکھ سے دیکھے تو وہ اس کی اینٹ سے اینٹ بچا دے۔ منظر امام کی کہانی تعریف نہ تو تو زیادتی ہوئی جو لکھتے ہیں کمال لکھتے ہیں۔ اس بار ارمان بھرا لے کے آئے جس نے بے اختیار ہنسنے پر مجبور کر دیا، واہ زبردست۔ آوارہ گرد کی بھی ہر قسط لا جواب جاری ہے۔ کہانی کے نام کی طرح شہزاد بھی آوارہ ہے۔ سرورق کی دونوں کہانیاں لا جواب تھیں۔ الفت بریدہ نے کافی دیر تو خزاں اللہ اور ملکی میں الجھائے رکھا۔ آخر میں جاکے سمجھ آئی بہت عمدہ۔ حاصل لا حاصل میں کیر عسائی نے معاشرے کے پرنسپل پہلو کو اجاگر کیا۔ پیسوں کی خاطر دوست کو مار ڈالنا ہے۔ افسوس زن، زور، زمین ان تینوں کی ہی وجہ سے توکل ہوتے ہیں۔ آخر میں گزارش ہے کہ اولین صفحات میں اس کا قبل کی کوئی کہانی شائع کریں۔“ (شروود)

دینی سے طلعت مسعود کی مصروفیت ”تا پہل اس مرتبہ جاسوسی سے مطابقت رکھتا ہوا اچھا لگا۔ ادارے میں ملکی حالات کے بارے میں تجویز نظر آیا۔ ہر بار امیدیں لگانے اور ان کے ٹوٹنے کی وجہ سے ایسا لگتا ہے کہ ہم ان حالات کے اب غادی ہو چکے ہیں۔ باسط شہزاد تو قبل کی تبصرہ لیے عمل کی صدارت کرتے پائے گئے۔ مبارکباد تبصرہ اچھا رہا۔ طاہر کریم صاحب خوش آمدید۔ امید ہے آئندہ بھی نظر آتے رہیں گے۔ مختصر مدینہ صاحبہ لیڈر شپ کے بوجھ کو مائٹرز ڈریسٹ لینے چلے جاتے ہیں۔ ایمانے زارا بھی شاید انہی کے نقش قدم پر چل رہی ہیں۔ تبصرہ دلچسپ اور اچھا تھا۔ سید ذیشان کا فنی تبصرہ پسند کرنے کا شکر ہے۔ ویب سائٹ والی تجویز سے مکمل متفق ہوں۔ سحرہ قادری صاحبہ ہمیشہ کی طرح بے تھکے اور جامع تبصرے کے ساتھ موجود تھیں۔ ساگر ٹکڑو کی بات سے متفق مراد صاحب اپنی پتا نہیں کوئی نامزدیوں کی بجائے اس تبصرے لکھنے والوں پر نکال رہے تھے۔ ورنہ موجودہ زمانہ ای میل اور انٹرنیٹ کا ہے۔ اس لیے سب آسان اور موثر طریقے کو ترجیح دیتے ہیں اور اس سے مزہ موزنا پیچھے کی طرف جانے کے مترادف ہے۔ بانی جس کو اعتراض ہے اس پر اداوارے کے

مشورے کے مطابق وہ ڈاک کا استعمال کرے اور افغانہ ہو تو داغ ٹھوک شربت ہے۔ انکارے میں ہیرا پھڑ پانی اس قسط میں بھی مخصوص رہی۔ دیے اگر اس سے نکلے نکلے درج کو بھی اصرار نہیں بلکہ کاویں مکمل صاحب تو بڑی اچھا ہوگا۔ اپنی ہی اسے دیکھ کر خواہ مخواہ جھڑاتا ہے اور اوپر سے ناجور ہر وقت تر کھانے والی شکل بنائے بیٹھی ہوتی ہے۔ طلوع تہا کی کاٹھن یا بھلی دفعہ جاسوسی صفحات پر دیکھا لیکن الفت بریدہ، تیز رفتار اور کچھ حد تک پراسرار رچ کے ساتھ اچھی رہی۔ دولت کے پیچھے بھاگنے والے اور اسے پانے کے لیے ہر حد کو بھلا کھنے والے حاصل اور لا حاصل میں ہی الجھے رہے۔ اور آل کہانی اچھی رہی لیکن انجام سے متعلق نہیں۔ اپنے دوست کو بیدردی سے صرف دولت کی خاطر زندگی سے محروم کرنے والوں کو سزا تو ملنی چاہیے تھی، خاص کر سجاد کو۔ ارمان بھرا میں منظر نامہ نے کنواروں کو ایک الگ ہی راہ دکھائی۔ دلچسپ اور مزیدار لیکن سب کے ارمان ایسے ہی پورے ہونے لگے تو پھر تو طرف ارمان بھرے دفاتر کی بھر مار ہو جاتی ہے۔ خوف کہانی کا مرکز خیال اچھا تھا۔ پیش کرنے کی کوشش بھی اچھی رہی لیکن بعض نقطوں کی تکرار زیادہ لگی اور مکالموں پر بھی مزید توجہ دینے کی ضرورت ہے مصنف کو۔ پھر سوال کی پچھلی کہانی اس کے مقابلے میں زیادہ اچھی لگی تھی۔ نئے سرخسراں کی کہانی خود کردہ اور پھندا از نسیم اور محمد وہیں۔ جاسوسی کی پچھان اولین صفحات پر ہمارے فیورٹ امجد رحیم صاحب عروسی عذاب کی صورت ایکشن مہرل سے بھر پور مزاجم تحریر لے کر آئے۔ کہانی دلچسپی سے بھر پور اور زبردست رہی۔ قیہ کہانیاں اچھی درمیں نہیں۔ اس لیے یہیں تک اجازت۔“

سکھرے باسط شہزادی معذرت ”اس مرتبہ تو کمال ہو گیا۔ مصروفیت کی وجہ سے میں کافی دنوں کی تاخیر سے سسٹمز ڈائجسٹ لینے تک شائبہ پر پہنچا۔ رسالہ خرید کر جانے ہی لگا تھا کہ دکان دار نے جاسوسی کے آنے کی بھی نوید سنائی۔ پہلے تو لگا کہ موصوف مذاق کر رہے ہیں لیکن دھن کرتے ہی دل کی دھڑکنیں اوپر اچھوٹے ہوئے نکلیں۔ وہیں کھڑے کھڑے پچھنی پچھنی کی نگاہ میں گیا تو خود کو اول پوزیشن پر براجمان دیکھ کر اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ دوسری ہی انٹری میں پچھلی پوزیشن..... ارے واہ، اسی خوشی میں سسٹمز وہیں بھول گیا جس کے لیے دوبارہ آنا پڑا، ادارے کا شکریہ..... سرورق کی آنٹی کی گرل اس بار بھی نیڑی تھی۔ محترمہ کے پیچھے موجود سیف خان نے عجیب سی ساخت کا پستول بائیں ہاتھ میں قیام رکھا تھا۔ دایاں ہاتھ سرورق کی وجہ سے پھلوں میں دبایا ہوا ہوگا..... ترجمہ کی ہوئی کہانیوں کو بھلا کھتے ہوئے پسندیدہ ترین کہانی انکارے کو پڑھا۔ انٹرن کا بنارس کو کال کرنے پر خیارہ بھگتا پڑا لیکن بھلا ہو ہاناوانی کا جس نے ان خوفناک چکا کردوں کو بھیجا۔ آئے تو وہ جان لینے تھے لیکن ان کی وجہ سے سب کی جان بچ گئی لیکن انہیں اب وہ سب کیساری گینگ کے محاصرے میں ہیں جنہوں نے دارج کی ماں کو بھی مار ڈالا۔ ساری قسط ایک کھوہ میں محاصرے کے خلاف دفاع کرتے ہوئے کڑی..... بہر حال قسط سسٹمی سے بھر پور تھی۔ یہیں اگر ہاناوانی بھی آجائے تو پھر پورا ایکشن دیکھنے کو ملے گا..... پھر پہنچا آوارہ کرد کے دروازے پر اس مرتبہ کچھ بھی خبریں نہیں۔ گوہار جنتیم واصل ہوئی چکا تھا لیکن آخر کار ٹرانڈ کی بھی اور وہ پراسرار ہتھیار بھی مل گئے۔ یہیں سے شروعات ہو رہی ہے۔ اس کہانی کی پراسراریت کی۔ خدا خدا کر کے شہزی امریکا پہنچ ہی گیا ہے حالانکہ یہاں اسے ایک مصیبت کا سامنا کرنا پڑا لیکن جلد ہی وہ اس سے نکلا اور وہیں اسے عابدہ کے بارے میں کچھ معلومات ملیں۔ اب شہزی کو کپڑے بننے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ بہر حال اس قسط کے ساتھ ہی دلچسپی اور توجہات دوبارہ سے بڑھ گئی ہیں..... الفت بریدہ بے شک ایک اچھی کہانی تھی لیکن اس کی پراسراریت اور اس میں ایک روح کے نظر آنے سے مجھے لگا کہ اسے اور کسی رسالے میں ہونا چاہیے تھا۔ یہ صرف میرے محسوسات ہیں آپ سب کا انگری کرنا لازم نہیں۔ اس بار معذرت کے ساتھ کہوں گا کہ ابھی اتنا ہی پڑھ سکا ہوں۔ بانی کہانیوں کے لیے ابھی وقت نکالوں گا انتہا اللہ! اس مرتبہ تبصرہ ٹھوڑا لیت بیچ رہا ہوں۔ امید ہے کہ مکمل کے کسی کوں میں مجھے بھی جلد دی جائے گی۔“ (اب تو دینی ہی پڑے گی)

جدہ سے پرویز احمد لاٹھا کا درہم برہم قہقہہ ”یادیں انسان کا وہ سرمایہ ہوتی ہیں جس کی کوئی قیمت ادا نہیں کرنی پڑتی، 1997ء سے دور حاضر تک محفل یادوں کو پڑھنے اور انجوائے کرتا آیا ہوں مگر پہلے جیسی وہ چاشنی نہیں رہی۔ ماضی کا ذکر یہاں اس لیے کیا کہ چند تبصرہ نگار کے کچھ کلام مشہور ہوئے تھے اور میں نے بھران کے تبصروں کا اشتکار رہتا تھا تو میں نے سوچا کیوں تا میں ابھی اپنا نیکو کلام لاچ کر دوں درہم برہم..... اس بار میں سب کچھ درہم برہم کر کے جاسوسی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اب آپ سوچ رہے ہیں پڑوس میں کیسے حاصل کیا تو اپنے چھوٹے بھائی کو باج سو دینے پڑے ہیں سو ڈائجسٹ کے چار سو دوری کے جس کے بدلے وہ ڈائجسٹ کی تصاویر بنا کر بھیجتا ہے درہم برہم۔ سرورق میں ایک کھوہ کی صورت پچیس نکلتی ہوئی چھائی ہوئی تھی جس کے پیچھے ایک مرد پستول لیے اسے کہہ رہا تھا دانت اندر کو رو نہ درہم برہم کر دوں گا۔ باسط شہزاد سب کو درہم برہم کرتے ہوئے پکلی پوزیشن پر آئے، میں کب آؤں گا ان کو بڑیاں مارا کیادوں۔ ماؤ زخموں طلعے لٹکے دہن میں بیٹھی حیوانوں کے جھرمٹ میں درہم برہم ساگر کا جشن منار ہاں اسے پکے نہیں لگا یا میری ہونے والی بیوہ ایمانے کو بھی لگا درہم برہم سرورق کی گئی جو اس بار ناک بھانے محفل میں نہیں آئی۔ سجدہ قادری کا درہم برہم تبصرہ سب

سے زیادہ پسند آیا۔ ساگر کو کوہیے گئے آپ کے درہم برہم جواہرات نے چار چاند لگا دیے۔ ایسے حسد کے مارے نامراد خود بھی طور پر درہم برہم ہوتے اور اوثان تک خط لکھ کر خود بڑا ادیب خان بگھتے ہیں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے انگارے پڑھی، مثل صاحب کے قلم کا جادو اپنے عروج پر ہے، سب کچھ درہم برہم کے چارے ہیں لگتا ہے ہانا وانی سے پہلے ڈیچہ اسکوڈا کو درہم برہم کر کے چھوڑیں گے، چنگا ڈروں سے بچ کر غرامش تو کس گئے ہیں مگر مجھے لگتا ہے جب اس غار سے نکلیں گے تو بہت کچھ بدل چکا ہوگا قسطنطنیہ یا تو حلال ہوگی یا پھر تاجور کا اندھوں سے اوپر دالافت بال دارنج کی ماں کی طرح کسی کاڑی پر رکھا ہوگا، کتوں والے سینے نے بہت سستی چھلایا اور دل کیا کاش میں بھی ایسے ہی ایو جہل کتوں کو درہم برہم کر دوں۔ آوارہ گرد سابقہ قسط وار کہانیوں کا درہم برہم غلو بائین بھی، مجال ہے جو ایک لکے کا حذر آتا ہو۔ جاسوسی کی واحد کہانی ہے جس کو پڑھنے سے قتل ہی مزاج درہم برہم ہو جاتا ہے۔ طلحہ تاجی، نام چائین کہانی کوئی سو سال پرانے زمانے کی تھی، شاید جاسوسی کے کسی پرانے صندوق کو درہم برہم کر کے نکالی گئی ہو۔ کہانی میں ہی مقامات پر کھلی محسوس ہوئی۔ قاری کا اعتماد اور درہم برہم ٹپکے چھا گئے۔ کیر عبا کی درہم برہم سرورق کی دوسری کہانی شاعر اگنی۔ انجین، سسٹس سے سبر پور ریگیٹن جب سے ستا کہ یہ ایک پرانی کہانی سے ناخود سے ناخود بھی درہم برہم ہو گیا۔ عروسی عذاب ایک دم پٹا پٹ درہم برہم تھی۔ شادی ایسا لٹو جو کھائے وہ بھی بچھتا ہے اور جوتہ کھائے وہ بھی بچھتا ہے۔ ابتدا سے ہی جگڑ دینے والی اس کہانی نے خوب حزد دیا۔ اگلی بار کسی نئے ٹپکے کلام کو درہم برہم کر دوں گا۔

کراچی سے محمد اقبال کے دل کے پھولے "جاسوسی ڈائجسٹ ہاتھ میں آتے ہی دماغ تیزی سے کام شروع کر دیتا ہے، ورنہ پورے سینے سوتا رہتا ہے؟ سب سے پہلی نظر پٹنل پڑی جاتی ہے، حسب توقع اچھا ہے۔ (جناب کیا اچھا ہے؟) حسنی کی آنکھ میں پانی دیکھ کر دل میں خیال آیا کہ چلو کہیں تو آنکھ میں پانی نظر آ رہا ہے ورنہ..... بہر حال پانی کی کمی کی تکرار پاکستان کے تمام اخبارات، جینلز میں ہو رہی ہے، ڈیزیز کی ضرورت پر زور دیا جا رہا ہے۔ حرے کی بات ہے اس میں بھی عوام ہی کو لوٹا جا رہا ہے۔ سرکاری فنڈز سے حکمران حرے کرتے رہے اور کر رہے ہیں قربانی عوام سے لی جاتی ہے۔ عوام کو کچھ نہیں دیا جاتا، بیکس لگاتے جا رہے ہیں، پریشانیوں اور مہنگائی میں اضافہ کیا جا رہا ہے، کہیں سے کوئی ریلیف عوام کو نہیں دیا جا رہا۔ فنڈز اگر عوام دے گی تو ڈیم بنے گا ورنہ..... ٹائیس ٹائیس ٹش..... فہرست پر نظر ڈال کر پہنچے جتنی تھکتی تھی میں جہاں باسٹ شیز اد پہلے تھرے کے ساتھ موجود تھے، مبارک ہو ادارہ ہی ہمیشہ کی طرح سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ ہمارے حکمران کب ملک کے حالات میں بہتری لانے کے لیے تنجید اور اقدامات کریں گے۔ سب سے پہلے کہانیوں میں انگارے شروع کی اور منہ سے بے ساختہ نکلا، واہ مثل صاحب واہ، جواب نہیں آپ کا۔ ایسی جگہ لا کر کہانی ختم کرتے ہیں کہیں..... قسطنطنیہ کا ٹکڑا ریڈ اسکوڈا سے ہونے والا ہے مگر میں تو انتظار ہے شاہ زیب اور ہانا وانی کے براہ راست ٹکڑا کا۔ امید ہے آئندہ قسطوں میں ضروری خواہش پوری ہوگی۔ آوارہ گرد بھی میں عبدالرب بھی تیزی لا رہے ہیں۔ شہزادی اپنے ساتھیوں کے ساتھ دیکھیں امریکا میں کیا تیر چلاتے ہیں۔ طلحہ تاجی سرورق کا پہلا رنگ الفت بریدہ لیے حاضر تھے۔ محمد کہانی تھی۔ دیگر کہانیوں میں عمران قریشی کی حساب کتاب، عکس قاسم کی بے وفائی، ساحر انوری کی آلکار، بشا کر لطف کی کتاب نسواں، ارشد بیگ کی چالاک چور، تمکین رضا کا الوکھا انتقام اور جمال دتی صاحب کی خود کردہ بھی اچھی رہیں۔ امجد رئیس صاحب کے کیا کہنے..... عروسی عذاب میں آپ نے تو کمال کر دیا۔ آپ بھی ہمارے فیورٹ مصنفین میں شامل ہیں اور آپ سے آئندہ بھی محمد سے محمد کہانی کی توقع رکھتے ہیں۔"

فضل کریم کی ملکیت بھٹان سے رُوداد دل "جانے کتنے برس بیت گئے ڈائجسٹ پڑھتے ہوئے مگر قلم آج پہلی بار اٹھا یا ہے اس امید کے ساتھ کہ چینی تھکتی تھی میں بھی کچھ جگہ حیات فرما کر ٹھکڑا فرمائیں گے۔ (خوش آمدید) ہمیں ڈائجسٹ ملنے لگے تقریباً نصف ماہ گزر جاتا ہے کیونکہ ہمارے ہاں کسی بھی دکان دار کو جاسوسی ڈائجسٹ کا نام تک یاد نہیں ہے اس لیے ہر ماہ کا ڈائجسٹ ہاتھ میں لینے کے لیے شہر میں رہنے والے کافی دستوں کی منت ساجت کرنی پڑتی ہے تب جا کے کسی کچی کو ہماری حالت زار پر راز آتا ہے مگر ہم بھی پہاڑوں کے باسی ہیں اس لیے مجال ہے کہ کسی بھی ماہ کا ڈائجسٹ ہم سے چھوٹا ہو۔ دیوٹی سے لے کر لٹکارا گرد تک اور اب آوارہ گرد اور انکارے تک۔ جب ڈائجسٹ ہمارے ہاتھ آتا ہے تو چاہے وہ جون کی تھی دوپہر ہو یا نوپہر دوپہر کی بجائے شام میں وقت کا احساس تک نہیں ہوتا ہے۔ آخر ہماری تنہائی کا سماجی جوہر ہے بڑے سخن سرطلوں کے بعد۔ اپنا دکھنا تو بہت سنا تھا پر انہی الفاظ کے ساتھ آپ سے اجازت چاہوں گا کہ کوئی شہری یا وہم سے ناراض نہ ہو جاوے کہ کسی گنوار، انگوٹھا چھاپ دیہاتی نے چینی تھکتی تھی کی جتنی سطر میں ہم سے جھین لیں۔" (بہت شکریہ آپ کی خوشگوار آمد کا آئندہ بھی آتے رہے گا)

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شامل اشاعت نہ ہو سکے۔
حنا کاشف، بلوڑی، خاور راجا، گوہر اوالہ، جمہا اکبر، لاہور، حرائی ر، کراچی، شہین جاوید، سکھر، حافظ کا عمران، حیدر آباد، آفتاب احمد، بٹلہ و آدم۔ ریاض خان، پشاور۔

روپ بہروپ

اساتذری

کچھ لوگ غیر معمولی شخصیت کے مالک ہوتے ہیں... ان کی کامیابی زندگی میں فکر... مشاہدات... جذبات اور ذہانت کا دخل ہوتا ہے... مگر بعض اوقات ان کی زندگی میں غیر معمولی واقعات کا اتار چڑھاؤ کم ہی نہیں ہوتا... ایک ایسے ہی شخص کی عبرت سرائے زندگی کے اسرار و رموز... وہ اپنے حال سے مطمئن ایک آسودہ زندگی گزار رہا تھا... مگر اچانک ہی ایک دن اس کے ماضی کا حوالہ سامنے آگیا... وہ جو اپنی پرانی گلیوں... چوہاروں... یاروں... کو پیچھے چھوڑ آیا تھا... اسے ایک بار پھر پکارنے لگے... ماضی کے گم گشتہ واقعات ایک دھندلے خواب کے مانند اسے جگا رہے تھے... جرم کے جدا ہو جانے والے راستے جو پائوں کی دھول میں کھو چکے تھے... ایک بار پھر قدموں سے لپٹنے کو تیار تھے...

لحہ بلحہ ایک نادر اختیار کرتے کرداروں کے عکس در عکس سلسلے

اس جھوٹے لیکن خوب صورت و جدید ون پونٹ بنگلے کے گیٹ پر پولیس کی گاڑی کے علاوہ ایک عدو ایسی پولیس بھی کھڑی تھی۔ پولیس انسپٹر اسد اپنے سلسلے کے ساتھ ماسٹر بیڈروم میں موجود تھا۔

یہاں بے ترتیب بستر پر ایک خوب صورت عورت کی لاش پڑی تھی لیکن موت کی دہشت اور اذیت نے اس کی خوب صورتی توخ کر دیا تھا۔ عورت کی عمر کے بارے میں اسد کا اندازہ تھا کہ وہ اٹھائیس سے تیس سال تک کی ہو سکتی ہے۔ اسے کھانچوٹ کر مارا گیا تھا۔ لاش کی حالت زار عجیب تھی کہ یہ بھی کہ وہ موت سے قبل زیادتی کا نشانہ بنائی گئی ہے۔ کھلی الماریاں، درازیں اور بکھرا سامان واردات کو ڈھکی کے ساتھ بھی جوڑ رہا تھا۔ ابتدائی طور پر واردات کے بارے میں یہی اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ ڈاکوؤں کی مال کے ساتھ ساتھ عورت پر بھی نظر خراب ہو گئی اور انہوں نے ایک پٹھہ دو کاج والا کام کیا۔

اسد دست اور کام چور پولیس والا نہیں تھا اور اپنے ذمے آنے والے ہر کیس کو ہنکڑ حد تک حل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس وقت بھی اس نے شواہد کے حصول کے لیے مطلوبہ عملہ طلب کر لیا تھا۔ کرائمرمین کی تصویریں لی جا چکی تھیں اور انگلیوں کے نشانات سمیت دیگر اہم شواہد جمع کیے جا رہے تھے۔ اسد نے ضروری کارروائی



کی جھیل کے بعد لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال منتقل کرنے کی ہدایت دی اور خود دوسرے کمرے میں موجود اس شخص سے ملنے جا پہنچا جس نے پولیس کو واردات کی اطلاع دی تھی۔

وہ ایک دودھ والا تھا جو اس پٹنگے سمیت علاقے کے کئی دیگر بنگلوں میں بھی دودھ سپلائی کرتا تھا۔ اسد نے اس سے اس کا نام، عمر، مکان کا پتا جیسے چند عام سے سوال کر کے پہلے اس کی گھبراہٹ کم کرنے کی کوشش کی اور پھر اسے شروع سے آخر تک ہر بات پوری تفصیل سے بتانے کا حکم دیا۔ اکبر نامی اس کو الے نے پہلے ٹھوک نکل کر اپنا گلہ کرتا پھر بتانا شروع کیا۔

”میں تقریباً چھ مہینے سے اس پٹنگے پر دودھ سپلائی کر رہا ہوں۔ پٹنگے میں میڈم ضوفی اکیلی رہتی ہیں اور ان کے بارے میں مشہور ہے کہ ان کے شوہر ملازمت کے سلسلے میں بیرون ملک مقیم ہیں۔ میڈم نے ایک چوکیدار کے سوا کوئی ملازم نہیں رکھا ہوا تھا اور چوکیدار ہی باہر کے کام کاج بھی نندا دیتا تھا۔ گھر کے جملہ امور میڈم ضوفی خود انجام دیتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کی اکیلی ذات کا کام ہی لیتا تھا جو وہ ملازمہ رکھتیں اور دن بھر قارخ رہ کر کھیاں مارتی رہتیں۔ میڈم کے بارے میں یہ باتیں مجھے چوکیدار وحید کی زبانی معلوم ہوئی تھیں۔ وہ یہاں کام کر کے خوش تھا اور اکثر میڈم کی تعریف کرتا تھا کہ وہ بہت ہمدرد، مہذب اور سچی خاتون ہیں جو ملازم ہوتے ہوئے بھی اس کے ساتھ عزت سے پیش آتی ہیں۔ میرا براہ راست میڈم ضوفی سے بہت کم واسطہ پڑتا تھا اور وحید ہی روزانہ دودھ لینے کے علاوہ مہینے کے مہینے بل کی ادائیگی کر دیتا تھا۔ میڈم سے ایک آدھ بار ہی میرا سامنا ہوا تھا اور وہ ہمیشہ میری دکان کے دودھ کی تعریف کرتے ہوئے کہتی تھیں کہ اس شہر میں آنے کے بعد انہیں اپنے آبائی علاقے جیسا خالص، اچھا دودھ میرے ہاں سے ہی میسر آیا ہے۔ خیر تو میں بتا رہا تھا کہ میرا میڈم سے زیادہ واسطہ نہیں پڑتا تھا لیکن پٹنگے دونوں سے وہی مجھ سے دودھ وصول کر رہی تھیں۔ انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ وحید چھٹیوں پر اپنے گاؤں گیا ہوا ہے اور ایک ہفتے بعد واپس آئے گا۔“

”آج صبح بھی میں اپنے معمول کے مطابق پٹنگے پر دودھ سپلائی کرنے آیا تھا لیکن تین چار بار گھنٹی بجانے کے باوجود میڈم نے گیٹ نہیں کھولا حالانکہ وہ ہمیشہ پہلی گھنٹی پر

ہی گیٹ پر پہنچ جاتی تھیں۔ گیٹ نہ کھلنے پر میں الجھن میں پڑا۔ اور میں نے پہلی بار غور کیا کہ گیٹ باقاعدہ بند نہیں ہے اور ایسے ہی بھڑا ہوا ہے۔ میں نے ایک بار اور گھنٹی بجائی پھر اس خیال سے گیٹ کھول کر اندر چلا گیا کہ کہیں تنہا رہنے والی میڈم ضوفی کسی حادثے کا شکار نہ ہو گئی ہوں اور انہیں کسی قسم کی مدد درکار ہو۔

”پٹنگے کے اندر داخل ہوتے ہی مجھے ادھر ادھر بکھرے سامان کو دیکھ کر گریز کا احساس ہو گیا اور پھر میں میڈم کو تلاش کرتا ہوا ان کے کمرے میں پہنچا تو میں نے انہیں ان کے بیڈ پر مردہ حالت میں پڑا ہوا پایا۔ لاش دیکھ کر میری حالت خراب ہو گئی اور میں نے فوراً باہر نکل کر پہلے پولیس کو کال کی پھر آس پڑوس کے لوگوں کو اس بارے میں بتایا۔ کچھ لوگ اندر آ کر سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے تھے لیکن پڑوس والے از میر صاحب نے انہیں ایسا کرنے سے روکا اور سمجھایا کہ پولیس کی آمد کا انتظار کرنا مناسب ہو گا۔ مجھے بھی انہوں نے ہی یہاں رکے رہنے کو کہا تھا۔ میں نے دکان سے ایک لاکے کو بلا کر سپلائی کا کام اسے سونپا اور خود آپ کا انتظار کرنے لگا۔“

اکبر سے ابتدائی سوالات کے نتیجے میں اسد کو معلوم ہو چکا تھا کہ وہ کوئی اُن بڑھ والہ نہیں ہے اور اس نے میٹرک تک تعلیم حاصل کر رکھی ہے اس لیے اس کے صاف لہجے میں دیے گئے مربوط بیان پر اسے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ چند ایک مزید ضروری سوالات کر کے اس نے اکبر کو اس ہدایت کے ساتھ وہاں سے جانے کی اجازت دے دی کہ وہ پولیس کو اطلاع دیے بغیر شہر سے باہر نہیں جائے گا اور ضرورت پڑنے پر تعاون کے لیے ہر صورت دستیاب ہو گا۔ اکبر نے اسے یقین دہانی کروائی اور وہاں سے رخصت ہو گیا۔ اسد نے اپنے نائب کو ہدایت کی کہ وہ ضونٹاں عرف ضوفی نامی متقل کے بارے میں مزید معلومات کے حصول کے لیے اس اسٹین ایجنٹ سے رابطہ کرے جس کے ذریعے ضوفی نے یہ بگھلا کر اپنے لیے لیا تھا۔ اس ہدایت کے بعد وہ پٹنگے سے باہر جانے والے راستے کی طرف بڑھ گیا۔ پورچ میں ضوفی کی سرخ کار کھڑی تھی۔ کار بالکل نئی نہیں تھی لیکن اچھی حالت میں تھی۔ پٹنگے کی آرائش اور اس کار کو دیکھ کر اسد نے اعزازہ لگایا کہ متقل کا شوہر بیرون ملک معقول ملازمت پر تھا جب ہی اس پٹنگے کے اچھے خاصے کرائے کی ادائیگی کے علاوہ بھی اس نے بیوی کو ہر سہولت فراہم کر رکھی تھی۔

میں ایک منظر اس طرح لپٹ رکھا تھا کہ اس کی تھوڑی کا کچھ حصہ بھی نظر میں چھپ گیا تھا۔

اچھی خاصی خشک جگہ میں اس کا یہ جلیہ زیادہ چونکا نے والا نہیں تھا۔ اس کے علاوہ جہوم میں شامل دوسرے افراد نے بھی سردی سے بچاؤ کے لیے کوئی نہ کوئی اہتمام کیا ہوا تھا۔ اپنے اس طرح غیر نمایاں ہونے کا اس نے فائدہ اٹھایا اور جیسے خاموشی سے جہوم میں شامل ہوا تھا ویسے ہی چپکے سے وہاں سے سرک گیا۔ ضوئی کے ساتھ جو ہوتا تھا، وہ ہو چکا تھا، فی الحال وہ اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا، یوں بھی اسے اس وقت ضوئی سے زیادہ اپنی فکر تھی۔ اسے سوچنا تھا کہ وہ اس کے کیا کرے گا۔ ضوئی کے قتل کے ساتھ ڈاکے کی واردات کے بارے میں سن کر اس کی تشویش مزید بڑھ گئی تھی اور وہ فکر مندی سے اپنے آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں غور کر رہا تھا۔

☆☆☆

وہ پانچ افراد ایک مستطیل میز کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے دو دائیں طرف اور دو بائیں طرف کی کرسیوں پر براہمن تھے جبکہ بائیں سربراہی کرسی سنبھال رہی تھی۔ وہ پانچوں کے پانچوں اپنے چہروں کو سیاہ نقاب میں چھپائے ہوئے تھے اور کوئی بھی دوسرے کی شکل نہیں دیکھ سکتا تھا البتہ دائیں بائیں بیٹھے چاروں افراد کو اچھی طرح معلوم تھا کہ ناواقفیت صرف ان کی ذات کی حد تک ہے ورنہ سربراہی کرسی پر بیٹھا پانچوں شخص ان میں سے ہر ایک کو اچھی طرح جانتا ہے۔ ان چاروں کو ایک چھت کے نیچے جمع کرنے کا سہرا اسی شخص کے سر تھا۔ چاروں میں یہ بات مشترک تھی کہ وہ اپنی کسی اشد ضرورت کے ہاتھوں مجبور ہونے کے علاوہ ماضی میں کوئی نہ کوئی مجربانہ حرکت کر چکے تھے۔ بہر حال وہ ان کے ماضی کی بات بھی، اب وہ ایک باعزت زندگی گزار رہے تھے۔ ان کے آس پاس والوں میں سے شاید وہی کسی کو ان کے ماضی کے اس پہلو کا علم تھا۔ دائیں طرف کی دوسری کرسی پر قدرے بے آرام اور مضطرب بیٹھا فیصل اپنے امتحان ساتھیوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ لوگ اس کی طرح اپنی کسی مجبوری کی وجہ سے اس جگہ موجود ہیں یا لاچار آئیں یہاں لے آیا ہے۔ اسے صرف اپنے بارے میں معلوم تھا کہ وہ بیٹی کی محبت سے مجبور ہو کر ایک بار پھر ان تاریک راہوں کا سفر جنے کے لیے تیار ہو گیا ہے جنہیں بہت پہلے ترک کر چکا تھا۔ وہ بڑھا کھٹا شخص تھا لیکن نو جوانی

اولاد کے معاملے میں وہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ قدرت کی طرف سے یہ خانہ خالی تھا یا میاں بیوی نے خود ہی ایسی کوئی بے بی پلان نہیں کیا تھا۔

انہی سوچوں میں گمراہہ ہونے کے کیٹ سے باہر نکلا اور لوگوں کے اس چھوٹے سے جہوم کے درمیان پہنچ گیا جو ہینکے میں ایک عورت کے قتل ہو جانے کی اطلاع سن کر وہاں جمع ہو گیا تھا۔ اس جہوم میں آس پڑوس کے کینوں کے علاوہ سڑک پارٹی ابارمنٹ بلڈنگ کے رہائشی اور وہ دکان دار بھی شامل تھے جن کی دکانیں بلڈنگ کے گراؤنڈ فلور پر قائم کرشل ایریا میں موجود تھیں۔ دکان دار چند ہی تھے کیونکہ زیادہ تر دکانیں صبح گیارہ بجے کے بعد کھلتی تھیں۔ اسد نے ضوئی کے پڑوسیوں کے بارے میں پوچھ کر ترہنچی بنیاد پر ان سے گفتگو کا آغاز کیا۔

ان سے ہونے والے سوال جواب کے نتیجے میں اسے علم ہوا کہ وہ لوگ ضوئی کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں رکھتے تھے۔ انہیں بھی اس کے بارے میں وہی کچھ معلوم تھا جو وہ دھڑا اکبر بتا چکا تھا۔ اس علاقے میں لوگوں میں آپس میں زیادہ میل جول کا رواج نہیں تھا اور پڑوسی آپس میں آتے جاتے ہیلو ہانے کے علاوہ خاص خاص مواقع پر خوشی اور غم میں شرکت کی حد تک محدود رہتے تھے۔ ضوئی اس ہینکے میں صرف چھ ماہ قبل آئی تھی اس لیے اس کا لوگوں سے تعلق مزید محدود تھا۔ اس کی آمد کے بعد وہاں کوئی ایسی تقریب بھی نہیں ہوئی تھی جس میں اس کی شرکت کی نوبت آئی اور پڑوسی خواتین کو اس کے بارے میں کھوج لگانے کا موقع ملا۔ اس بات کی البتہ ہر ایک نے گواہی دی تھی کہ ضوئی فیصل مزاج کی عورت معلوم ہوئی تھی اور بہت کم ہی اسے گھر سے باہر جاتے ہوئے دیکھا جاتا تھا۔

ہینکے میں کسی کی آمد و رفت بھی نہیں دیکھی گئی تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ ضوئی بنیادی طور پر کسی اور علاقے کی رہنے والی تھی اور ممکنہ طور پر اس کے عزیز رشتے دار بھی وہیں رہائش پذیر تھے۔ پڑوسیوں سے یہ ساری گفتگو کرتے ہوئے اسد غور نہیں کر سکا تھا کہ جہوم میں شامل ایک چہرہ ایسا بھی ہے جس پر صرف رکی افسوس کے تاثرات نہیں ہیں بلکہ وہ سچ سچ بہت افسردہ ہے۔ اس افسردہ چہرے والے شخص نے سر پر بھی اونٹنی ٹوپی اس انداز میں پہن رکھی تھی کہ سر کے علاوہ دونوں کان اور ماتھے کا ایک حصہ بھی ٹوپی سے ڈھک گیا تھا۔ اس نے ہلکی جیکٹ کے ساتھ گلے

کی طرح گھر والوں پر انحصار کرنے کے بجائے اپنے اخراجات خود پورے کرنے لگا ہے۔ آئے دن بدلتے موپائلز کے ماڈلز کے بارے میں بھی اس نے یہ کہہ کر گھر والوں کو مطمئن کر دیا تھا کہ اس کے ایک دوست کے والد کی موپائل شاپ ہے اور وہ وہاں سے استعمال شدہ اچھا موپائل مناسب قیمت میں خریدنے کے علاوہ تھوڑے عرصے کے استعمال کے بعد اس موپائل کو آسانی سے تبدیل کروا لیتا ہے۔ اس کے والد کو اس طرح بار بار موپائل تبدیل کرنے کے شوق میں رقم ضائع کرنے کی عادت پسند نہیں تھی لیکن انہوں نے یہ سوچ کر بھی اسے سرزنش نہیں کی تھی کہ نوجوانی میں لڑکوں کو اس طرح کے شوق ہوا ہی کرتے ہیں اور پھر وہ اپنے شوق کی تکمیل کے لیے ان پر بوجھ نہیں ڈالتا تھا۔ بلکہ یہ بھی بہنوئی کو بھی چھوٹی موٹی رقم یہ نقد دے دیتا تھا۔ ان کے لیے سب سے زیادہ تسلی بخش بات یہ تھی کہ وہ تعلیم کے بارے میں سنجیدہ تھا اور نہایت پابندی سے پیریڈی جاتا تھا۔

فیصل نے یہ بھی ہوشیار کی تھی کہ واردات والی رات گھر سے باہر۔ بچے کا جواز دوستوں کے ساتھ کمانڈا سنڈی کی صورت میں پیش کر دیا کرتا تھا۔ والد نے اپنی جگہ خوش رہتے تھے کہ ان کا کپڑا لٹیکسی میں اس محنت کر رہا ہے اور وہ اپنی جگہ خوش تھا کہ زندگی میں اس سرورسری ہے۔ ان کا کام بے شک رسی تھا لیکن وہ اس میں ایک طرح کا فخر بھی محسوس کرتے تھے۔ ان کی ذہانت نے انہیں بھی گرفت میں بھی نہیں آنے دیا تھا۔ اپنی ہر واردات وہ مکمل احتیاط اور منصوبہ بندی کے ساتھ کرتے تھے اس لیے راوی ان کے لیے جینیں ہی جین لکھ رہا تھا لیکن پھر فیصل کا یہ جین اچانک ہی رخصت ہو گیا اور وہ اتنے بڑے حادثے کی زد میں آ گیا کہ اسے لگا اس کے حواس ہی کام کرتا چھوڑ چکے ہیں۔ اس رات بھی وہ دوستوں کے ساتھ ایک کامیاب واردات کرنے کے بعد صبح گھر پہنچا تھا اور گھر کے باہر موجود جھوم دیکھ کر بری طرح شگک گیا تھا۔ اس جھوم میں محلے والوں کے علاوہ پولیس کے اہلکاروں کی موجودگی اس کے لیے تشویش ناک تھی۔ ایک دفعہ کو اس کے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ کہیں اس کا پول تو نہیں کھل گیا ہے اور پولیس نے اس کی گرفتاری کے لیے گھر پر چھاپا مارا ہے لیکن ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اسے دیکھتے ہی چند محلے داروں نے ہمدردانہ انداز میں اُسے گھیر لیا اور ان کے گھیرے میں کھڑا

میں غلط صحبت اور شارت کٹ کے ذریعے دولت کے حصول کے لالچ نے اسے جرم کی راہ پر چلا دیا تھا۔ فیصل کا باپ ایک قفل ساز تھا۔ اعلیٰ معیار کے قفل اور ہر طرح کے قفل کے لیے چابیاں تیار کرنا اس کا وہ ہنر تھا جو ذریعہ تعلیم بنے کو بھی قفل کرتا جا رہا تھا۔ وہ اس مقولے پر یقین رکھتا تھا کہ ہنرمند انسان کبھی بھوکا نہیں سوتا اس لیے اگر فیصل تعلیم کے ساتھ ساتھ اس کا ہنر بھی سیکھتا رہے تو فائدے میں رہے گا۔ اپنی بے لگام خواہشوں کے پیچھے بھاگتے ہوئے فیصل نے اس ہنر کا یہ فائدہ اٹھایا تھا کہ اپنے آوارہ دوستوں کے ساتھ چوری چکاری اور ڈاکے کی وارداتوں میں حصہ لینے لگا تھا۔ اس کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ایک شریف خاندان کا بیوروکریٹ میں پڑھنے والا لاکا ایسی حرکتوں میں بھی سوٹ ہو سکتا ہے۔ وہ جن آوارہ دوستوں کی صحبت میں بندھ ہوا تھا، وہ بھی اس کی طرح شریف اور طالب علم تھے۔ اصل میں وہ سارے سارے اپنے لڑکے تھے۔ انہیں اپنے گھروں کی سفید پوش زندگیاں نہیں بھاتی تھیں۔ وہ مبر سے اپنی تعلیم مکمل کر کے چھ مہینے لائق ہونے سے پہلے پیسے ہی زندگی کی رعن یوں سے اخذ اندوز ہونے چاہتے تھے۔ خرچ کرنے کے لیے کھلا پیسہ، موپائل کا نئے سے نیا مینگا بالوں، ہواؤں میں آؤٹی سواری، این سب کی وہ تمنائیں تھیں جو انہیں جرم کی راہ پر لے کر تھیں۔

فیصل اپنے باپ سے ملنے والے ہنری وجہ سے ان گروہ میں نمایاں حیثیت رکھتا تھا اور دوسروں کے مقابلے میں اسے ہر واردات میں سے زیادہ حصہ ملتا تھا۔ ملنے والے اس رقم کو وہ گھر سے باہر تو فراغ دلی سے خرچ کرتا تھا لیکن گھر والوں کو اس بات کی قسمی ہنک نہیں تھی کہ وہ کیسی عیاشی کی زندگی بسر رہا ہے۔ کچھ چیزوں کے بارے میں گھر والوں کو مطمئن کرنے کے لیے اس کے پاس معقول بھانے موجود تھے۔ اس نے گھر میں بتا رکھا تھا کہ وہ بیوروکریٹ کے بعد چند دولت مند گھرانوں کے بچوں کو ہوم ٹیوشن دیتا ہے جس سے اسے معقول آمدنی ہو جاتی ہے۔ اس نے گھر والوں کو بتا رکھا تھا کہ اپنی اس آمدنی سے اس نے اپنے لیے قسطوں پر موٹر سائیکل خریدی ہے تاکہ بیوروکریٹ آنے جانے کے علاوہ ٹیوشن کے لیے جانے میں بھی سہولت رہے اور وقت کی بھی بچت ہو۔

اس کے طرز مکمل سے والدین خوش تھے کہ اس کے اندر احساس ذمہ داری ہے اور وہ اپنے ہم عمر نوجوانوں

نہایت بیدردی سے چاقوؤں اور چھریوں کے وار کر کے ہلاک کر دیا گیا تھا۔ دونوں بیٹوں کو بھی پامال کرنے کے بعد ان کے گلے کاٹ دیے گئے تھے۔

سردیوں کی رات میں اپنے گھروں میں گرم بستروں میں دیکھے پڑوسیوں کو فوری طور پر خبر ہی نہیں ہو سکی تھی کہ محلے کے ایک گھر پر سی قیامت نازل ہو چکی ہے۔ وہ تو پڑوسی صالح صاحب حسب معمول فجر کی نماز کے لیے فیصل کے والد کو مسجد لے جانے کے لیے ان کے دروازے پر پہنچے تو دروازہ چھوٹ کھلا دیکھ کر چونک گئے۔ پہلے انہوں نے ایک دو بار دھکی دھکی اور جب کوئی رد عمل ظاہر نہ ہوا تو ایک دوسرے پڑوسی کو ساتھ لے کر احوال جاننے کے لیے گھر میں داخل ہوئے۔ اندر داخل ہونے پر انہیں چار خونخوار لاشیں دیکھنے کو ملیں تو ان کی اپنی حالت غیر ہو گئی۔ محلے کے مزید افراد کو جمع کر کے اس واردات سے آگاہ کیا گیا اور یا بھی مشورے سے پولیس کو واردات کی اطلاع دی گئی۔ پولیس نے آکر اپنی کارروائی ختمائی۔ فیصل سے رابطے کی بھی کوششیں کی جاتی رہیں جو اس کا موبائل بند ہونے کی وجہ سے ناکام رہیں اور آخر کار وہ خود ہی گھر واپس آ گیا۔

حادثہ اتنا معمولی نہیں تھا کہ وہ اپنے حواس قائم رکھ پاتا۔ صدمے کی شدت نے اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ کیا غضب تھا کہ وہ کل شام ڈھلے گھر سے نکلا تھا تو اپنے پیچھے اپنا ہتسلا کر اتنا خاندان چھوڑ کر نکلا تھا۔ ماں نے گھر سے نکلے نکلے ایک توشے دان میں اسے ڈھیروں پادام ڈالا ہوا انڈوں کا حلوہ ساتھ دیا تھا کہ دوستوں کے ساتھ مل کر کھا لیتا۔ وہ بھی ساری ماؤں کی طرح اس بات کی قائل تھیں کہ پڑھنے لکھنے والے بچوں کی خوراک پر مناسب توجہ دی جائے تو وہ تعلیمی میدان میں بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔ اس معصوم ماں کو کیا معلوم تھا کہ بیٹا اس حلوے کو کھا کر دوستوں کے ساتھ ڈاکا مارنے گیا تھا۔ بیٹے کو بھی نہیں معلوم تھا کہ دوسروں کے گھر میں نقب لگانے والے کا اپنا گھر لٹ جائے گا..... وہ بھی اس طرح کہ اس کے پاس کچھ باقی ہی نہیں رہے گا۔

غم کے ساتھ ساتھ احساس جرم اور ندامت نے بھی اسے ادھ مو کر کے رکھ دیا تھا۔ دوست، رشتے دار اور محلے دار غم کی اس گھڑی میں حتی الامکان سہارا بنے ہوئے تھے۔ تسلیاں، دلا سے، ہمدردیاں سب کچھ حاصل تھا لیکن غم اتنا بڑا تھا کہ ہر شے سے دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ بس نہیں چلتا تھا

وہ دیکھ رہا تھا کہ گھر کے اندر سے خون آلود چادر میں لپٹا ایک وجود باہر لایا جا رہا ہے۔

”آپ سے بہت دیر سے رابطہ کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی فیصل بھائی لیکن آپ کا موبائل مسلسل بند جا رہا تھا۔“ محلے کا ایک لڑکا اس کے گرد اپنا بازو پھیلائے کھڑا تھا اور دوسرا نہایت ہمدرد لہجے میں اس سے کہہ رہا تھا لیکن وہ سننے سے زیادہ بھٹی بھٹی آنکھوں سے وہ منظر دیکھ رہا تھا۔ ایک کے بعد ایک کیے بعد دیکھے خون آلود چادروں میں لپٹی ہوئی چار لاشیں اس کے گھر سے باہر لائی گئیں اور کسی کو اسے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کی کہ یہ لاشیں کن کی ہیں..... وہاں چار لاشیں تھیں اور اس کے گھر میں افرادی تعداد بھی جا رہی تھی۔ ای، ابا اور چھوٹی دو بہنیں..... چار افراد اس کے ایک رات کے غیاب میں لاشوں میں گس طرح تبدیل ہوئے، یہ حقیقت بھی جلد اس کے سامنے آگئی۔ اس کی سادہ مزاج والدہ بھی متوسط طبقے کی دوسری ماؤں کی طرح اپنی بیٹیوں کا جھنجھوڑنے کی فکر میں مبتلا رہا کرتی تھیں اور وقتاً فوقتاً ان کے لیے کچھ نہ کچھ لاکر رکھتی رہتی تھیں۔ چھوٹی موٹی اشیا کی اس خریداری کے ساتھ ساتھ انہوں نے عرصے سے ایک بڑی مینی زیورات کی خریداری کے لیے ڈال رکھی تھی۔ کل ان کی وہ مینی مل گئی تھی جس کے سٹے ہی انہوں نے شوہر اور دونوں بیٹیوں کے ساتھ صرفانہ بازار کا رخ کیا تھا اور دونوں بیٹیوں کو ان کی پسند کے سیٹ اور چوڑیاں دلوانے کے ساتھ ساتھ فیصل کی ہونے والی دہن کے لیے بھی چار چوڑیاں خرید لی تھیں۔ نادیدہ اور شاز یہ بڑاں تھیں اور ان کی عادت تھی کہ ان کے لیے ہمیشہ ایک ساتھ اور ایک معیار کی چیزیں خرید کرتی تھیں۔ زیورات کی خریداری کے لیے بھی انہوں نے اپنے اس اصول کو برقرار رکھا تھا اور طویل عرصے کے انتظار کے بعد ملنے والی بڑی مینی کی رقم کے ساتھ ساتھ اپنا کچھ اور بچا جتنا بھی ملا کہ یہ خریداری کی تھی۔ خیال تھا کہ یہ تمام زیورات اگلے ایک دو دن میں بینک میں لا کر لے کر وہاں رکھوا دیے جائیں گے لیکن نوبت ہی نہیں آ سکی اور اس طرح کے سوانح کی تلاش میں رہنے والوں میں سے کسی کو بینک پر گئی۔ واردات ڈھکی کی حد تک ہی محدود رہتی تو مال کو جان کا صدقہ سمجھ کر شاید یہ صدمہ سہہ بھی لیا جاتا لیکن وہاں تو غضب ہو گیا تھا۔ ڈاکو مال ہی نہیں عزت کے بھی شیرے ثابت ہوئے تھے۔ بوڑھے ماں باپ نے یقیناً اپنی معصوم بیٹیوں کو بچانے کے لیے اپنی پوری کوشش کی تھی سوائیں

سے اپنا ٹرانسفر ایک دوسری یونیورسٹی میں کروایا اور ایک اسٹیٹ ایجنٹ کے ذریعے گھر فروخت کر کے بناسی کو بتائے چکے سے دوسرے شہر کی راہ لی۔ دوستوں کے نام بس ایک مختصر خط لکھا کہ مجھ پر جو کچھ چلی اے میں اپنی کرنی کی سزا بخشتا ہوں۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں تم لوگ بھی ایک ایک کر کے اللہ کی پکڑ میں نہ آ جاؤ اس لیے ایک مخلص دوست کی حیثیت سے یہ مشورہ دیتا ہوں کہ ملنے والی مہلت سے فائدہ اٹھا کر تائب ہو جاؤ اور اپنی تعلیم پر توجہ دو۔ اللہ نے چاہا تو ایک دن خود ہی اس لائق ہو جاؤ گے کہ اپنی ساری جائز خواہشات پوری کر سکو۔

دوسرے شہر پہنچ کر اس نے خود بھی اس بات پر عمل کیا تھا اور ایک کمرے کا قلیٹ کرائے پر لینے کے بعد اپنی ادھوری تعلیم مکمل کرنے میں جُت کیا۔ مکان کی فروخت سے ملنے والی رقم اس نے ایک بینک میں رکھوا دی تھی اور اس رقم کے ہوتے ہوئے اپنے تعلیمی اخراجات کی طرف سے بے فکر ہو گیا تھا۔ اچھے طالب کے طور پر ابھرنے کی وجہ سے اس کو ہم جماعتوں کے درمیان اچھی نظروں سے دیکھا جاتا تھا تو صاف سحرے کردار کی وجہ سے لڑکیاں بھی قدر کرتی تھیں اور بلا جھجک تعلیمی سلسلے میں مدد لینے کے لیے اس سے رجوع کرتی تھیں۔ ان ہی لڑکیوں میں سائولی رنگت اور جھکے نقوش والی فرح بھی تھی جو اس کی طرح ایک سفید پوش گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ باقی لڑکیوں کی نسبت وہ فرح سے اتنا نزدیک کب ہوا کہ تعلیم مکمل ہونے تک اس سے شادی کا فیصلہ کر لیا، اس بات کی اسے خود بھی خبر نہیں ہوئی تھی لیکن بہر حال یہ ایک اچھا فیصلہ تھا۔ فرح کے گھر والوں نے کچھ دن کے انتظار کے بعد اس کی طرف سے بھیجے گئے رشتے کو منظور کر لیا اور کچھ عرصے بعد اس کی فرح سے شادی ہوئی۔ بینک میں رکھی رقم میں سے بڑا حصہ اس نے فرح کے زیورات اور بلبوسات کی خریداری کے علاوہ شادی کے دیگر اخراجات پر خرچ کر ڈالا اور ایک کمرے کے قلیٹ کو چھوڑ کر تین کمروں کے ایک قدرے کشادہ قلیٹ میں اٹھ آیا۔ یہ قلیٹ بھی کرائے کا تھا لیکن اب اسے ایک معقول ملازمت مل چکی تھی اور اسے امید تھی کہ تمام اخراجات پورے کرنے کے ساتھ ساتھ وہ آہستہ آہستہ اپنی رقم جمع کر لیں گے کہ چند سالوں میں ایک چھوٹا سا ذاتی گھر خرید سکیں۔ فرح بھی باسٹر زمل ہونے کے بعد سے ایک جگہ ملازمت کر رہی تھی اس لیے ذاتی گھر کی خریداری کا خواب اتنا مشکل نہیں دکھائی دیتا تھا لیکن ہمیشہ

کہ کسی طرح وہ سفاک قاتل یا تھلگ جا میں اور انہیں چپ بھاڑ کر رکھ دے۔ قاتلوں تک پہنچنا خود اس کے لیے تو ذاتی طور پر ممکن نہیں ہوا لیکن پولیس نے غیر معمولی کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس واردات کا کھوج لگا لیا۔ وہ ان کی پچھلی گلی میں ہی رہنے والا ایک آوارہ لڑکا تھا جس نے اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ مل کر یہ واردات کی تھی۔ اس لڑکے کی والدہ بھی اسی جگہ کیمٹی ڈال رہی تھیں جہاں فیصل کی والدہ نے کیمٹی ڈال رکھی تھی۔ اس نے اپنی والدہ کی زبانی سن لیا تھا کہ اس باریک بینی فیصل کی والدہ کی نظر ہے۔ اس نے دوستوں کے ساتھ مل کر رقم جتھانے کا فیصلہ کیا اور رات کی تاریکی میں وہ لوگ فیصل کے گھر میں گھسنے میں کامیاب ہو گئے۔

واردات کے وقت وہ لوگ قدرے نشے میں بھی تھے اس لیے نادیدہ اور شاذ یہ کیونکر جوانیوں نے ان کے نفس کو مزید بہکا دیا اور وہ اس حد تک چلے گئے کہ ڈاکے کی واردات نہایت لرزہ خیز اور آفسوسناک بن گئی۔ نشے میں ہونے کی وجہ سے ہی وہ لڑکے اپنے ڈی این اے اور فکٹر پریش کی شکل میں ثبوت چھوڑ گئے تھے۔ پولیس نے اس نکتے کو سامنے رکھ کر کہ کن افراد کو فیصل کی والدہ کی بھاری کیمٹی ٹھننے کی خبر ہو سکتی ہے، اپنی تفتیش کا آغاز کیا اور ارد گرد کے محلے داروں کو مشکوک افراد کی فہرست میں سب سے اوپر رکھا تھا اس لیے بہت جلد اصل مجرموں تک رسائی حاصل کر لی تھی۔ مجرموں کی گرفتاری اور سزا کے اعلان تک فیصل دکھ اور مدد سے ہی نہیں خود احتسابی سے بھی گزرتا رہا تھا۔ بے شک اس نے اور اس کے دوستوں نے نقب زنی کے دوران کبھی کسی کی عزت کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی ان کے ہاتھوں پر انسانی خون کا کوئی چھینٹا تھا لیکن کون جانے کہ کب یہ جرائم بھی سرزد ہو جاتے کہ جب انسان ایک برائی کو اپناتا ہے تو دوسری برائیاں بھی آہستہ آہستہ اس کی زندگی کا حصہ بنی چلی جاتی ہیں۔ نقب زنی کا جرم بھی اپنی جگہ ایسا معمولی نہیں تھا۔ وہ کسی کی جانے کس ضرورت کے تحت جو جرم سے جمع کی گئی رقم بے دردی سے اڈا لاتے تھے اور پھر یونہی اپنی عیاشیوں میں اڈا دیتے تھے۔

احساس جرم ایسا کوڑا تھا جو فیصل کی روح کو تار تار کر رہا تھا۔ اسے اپنے ساتھ ساتھ اپنے دوستوں کی زندگیاں برباد ہو جانے کا خیال نہ ہوتا تو شاید تھانے جا کر اعتراف جرم کر لیتا۔ یہ نہیں کر سکا تو بس اتنا کیا کہ خاموشی

وہی نہیں ہوتا جو دکھائی دیتا ہے۔ شادی کے تیسرے مہینے ہی فرح امید سے ہو گئی اور ابتدا ہی سے لیزڈی ڈاکٹر نے اس کی حالت کو نازک قرار دیتے ہوئے بیڈ ریٹ کا مشورہ دے ڈالا۔ ان حالات میں فرح کا ملازمت جاری رکھنا کسی صورت ممکن نہیں تھا۔ اس نے استغفار یا اور یہ سوچ کر گھر بیٹھ گئی کہ بچے کی پیدائش کے بعد اسے صبح سے شام تک اپنی ماں اور چھوٹی بہن کے حوالے کرے گی اور خود ایک بار پھر ملازمت اختیار کر لے گی۔ اس کی چھوٹی بہن کو حصول تعلیم میں زیادہ دلچسپی نہیں تھی اور وہ انٹر کرنے کے بعد ہی گھر بیٹھ گئی تھی اس لیے فرح کو موجودہ مشکل کے بعد اپنے لیے آسانیاں دکھائی دیتی تھیں۔

فرح کے بچکے والوں کے تعاون کے نتیجے میں ان کی بیٹی رانیہ کی پیدائش تک کا عرصہ خوش اسلوبی سے گزری گیا۔ فرح کی حالت اور کیس کی نزاکت کے پیش نظر فیصل نے ڈیوری ایک بڑے نجی اسپتال میں کروانے کا فیصلہ کیا تھا۔ میجر آپریشن کے ذریعے بچی کی پیدائش میں مل آئی تو ہوش بڑباہل کی ادائیگی میں آبائی گھر کی فروخت سے بچنے والی رقم کا باقی ماندہ حصہ اور فیصل کی سال بھر کی بچت دونوں ہی خرچ ہو گئے لیکن اس نے پرہیز نہیں کی۔ رانیہ اس کے لیے دنیا کی ہر نعمت سے بڑھ کر مٹی اور جسے پا کر اسے لگتا تھا کہ اس نے قارون کا خزانہ پالیا ہے۔ فرح کے بھی بیٹی کے بارے میں یہی جذبات تھے۔ اصل میں رانیہ کی پیدائش کے بعد ہی ڈاکٹر نے انہیں یہ خبر سنا دی تھی کہ کیس کی پیچیدگیوں کے باعث فرح آئندہ بھی ماں نہیں بن سکے گی اس لیے ان کے لیے اب جو کچھ بھی تھی، وہ رانیہ ہی تھی اور ان کے سارے خواب رانیہ کے حوالے سے تھے۔ بیٹی سے دور رہنے کو مشکل ترین جانتے ہوئے بھی فرح اپنے اس فیصلے پر قائم تھی کہ وہ سوامینہ گزرائے کے بعد دوبارہ ملازمت کے حصول کی جدوجہد کرے گی۔ فیصل نہ چاہتے ہوئے بھی فرح کی اس دلیل سے قائل ہو کر کہ اگر رانیہ کو اچھی زندگی دینی ہے تو دونوں کو مل کر معاشی جدوجہد کرنی ہو گی۔ اس کو ملازمت کی اجازت دینے پر مجبور ہو گیا تھا لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

فرح ابھی ملازمت ڈھونڈ رہی تھی کہ اس کی اچھی بھلی صحت مند والدہ اچانک ہارٹ ٹل کی وجہ سے انتقال کر گئیں۔ والدہ کی موت کے صدمے سے نڈھال فرح نے کچھ عرصہ گھر میں بیٹھ کر گزارا۔ ڈیڑھ دو مہینے بعد وہ ذرا تسکین تو نوید ملی کہ اس کی چھوٹی بہن کا رشتہ چچا نے اپنے

بیٹے کے لیے طلب کیا ہے اور مہینے بھر بعد ہی شادی کرنے کا ارادہ ہے۔ کچھ چچی کی پیاری کی وجہ سے چچا کے گھر میں فوری طور پر بھوک آدھ ضروری بھی جاری تھی اور کچھ فرح کے ابا بھی بھوک کے اچانک چلے جانے سے گھبرا گئے تھے اور بیٹی کو جلد از جلد اپنے گھر کا کرنے کے خواہش مند تھے۔ چھوٹی بہن کا آسرا بھی ختم ہوا تو فرح کے ملازمت کرنے کے امکانات بالکل ختم ہو گئے۔ بچی کو کسی ڈے کیئر سینٹر میں چھوڑنے کی اس میں ہمت نہیں تھی اور بھادجوں سے یہ امید نہیں رکھ سکتی تھی کہ وہ ماں اور بہن کی طرح جانشانی سے اس کی بچی کی دیکھ بھال کر سکیں گی۔ چنانچہ اسے گھر بیٹھنا پڑا۔ فیصل کی تنخواہ میں ان کا گزارا تو اچھا ہو جاتا تھا لیکن بچت نہ ہونے کے برابر تھی۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ فیصل بیٹی کے لیے بے تحاشا خریداری کرتا تھا۔ ہر نئی چیز کو دیکھ کر اس کا دل چل جاتا تھا کہ وہ اسے رانیہ کے لیے لے لے۔ فرح بھی بھی اسے اس بات پر ٹوکتی بھی تھی لیکن پھر اس کی بے پناہ محبت سے مجبور ہو کر خاموش ہو جاتی۔ فیصل کا کہنا یہی ہوتا تھا کہ اللہ مجھے میری بیٹی کے نصیب سے بہت کچھ دے گا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کی ترقی بھی ہوئی اور وہ لوگ قلیٹ چھوڑ کر ایک دوسو گز کے پورٹن میں منتقل ہو گئے لیکن تھے بہر حال کرائے پر ہی اور یہ بھی چچی بکھار فرح کو کھتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اپنے ذاتی گھر سے جو احساس تحفظ حاصل ہوتا ہے، وہ کرائے کے گھر سے بھی نہیں ملتا۔ فیصل اس کی بات مانتا تھا لیکن سربدست وہ ذاتی گھر خریدنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اخراجات میں کمی نہ کرنے کے باعث یہ مسئلہ زیادہ شدید تھا۔ ورنہ اگر ان کی کچھ ذاتی بچت ہوتی تو وہ اپنے آفس سے لون لے کر بھی گھر خرید سکتا تھا۔ فرح کی زیادہ نہ اٹھنے کی عادت کی وجہ سے اس مسئلے پر ان کے گھر میں بھی کوئی سمجھ بھگ صورت حال بھی پیدا نہیں ہوئی تھی اور جو جیسا چل رہا تھا، وہ چل رہا تھا۔

زندگی کافی خوش باش تھی لیکن مسئلہ اس روز پیدا ہوا جب چھ سالہ رانیہ اچانک ہی اسکول میں بے ہوش ہو گئی۔ اسکول سے کال آنے پر فرح وہاں گئی اور پچھلے اس دوران ہوش اچکا تھا اسے کہ ایک قریبی کلینک چلی گئی۔ وہاں موجود ڈاکٹر نے کسی تشویش کا اظہار نہ کیا اور خیال ظاہر کیا کہ گرمی کی وجہ سے مسئلہ ہو گیا ہوگا، گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ فرح سن کر کافی حد تک مطمئن ہو گئی لیکن شام کو فیصل کے آنے کے بعد اسے یہ بات بتائی تو وہ بے قرار ہو

تھا کہ فیصل اور فرح اس کی تکلیف دیکھ کر رو پڑتے تھے۔ بس میں ہوتا تو وہ اپنی بیٹی کی تکلیف اپنی جان پر لے لیتے لیکن قدرت کا کوئی ایسا نظام ہی نہیں ہے کہ کوئی کسی کی تکلیف خود لے سکے۔ دوا، تڑپنا، دعا، عین، رنج، دوڑ دھوپ سب بے نتیجہ ثابت ہو رہے تھے۔ ایسے میں فیصل کے پاس ایک گناہ نمبر سے یہ پیغام آیا کہ اگر وہ اپنے مسئلے کا حل چاہتا ہے تو ایک بار پھر اپنے ماضی کی طرف مڑنے کا سوچے اور چھوٹے کام کے بجائے بڑے کام میں ہاتھ ڈالنے کی جرأت کرے۔ بڑا کام کیا ہو گا وہ اس کی رضامندی کے بعد بتا دیا جائے گا۔

فیصل اس پیام کے ملنے پر کتنی ہی دیر مغمم بیٹھا رہ گیا تھا۔ ماضی کا وہ باب جسے وہ بھلا بیٹھا تھا، جانے کس کو اب تک یاد تھا۔ سب سے پہلا ٹک اسے اپنے ان دوستوں پر ہی ہوا جو چوری و نقب زنی کی ان وارداتوں میں اس کے ساتھ ہوا کرتے تھے۔ اس نے چپکے چپکے ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنا شروع کر دیں۔ ان میں سے ایک کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ کینیڈا چل ہو چکا ہے اور وہیں کسی خاتون سے شادی کر کے مستقل سکونت اختیار کر لی ہے۔ دوسرے کے بارے میں اطلاع تھی کہ سعودی عرب میں آباد ہے اور آئل ریفائنری میں ابھی ملازمت کر رہا ہے۔ تیسرے کے بارے میں حاصل ہونے والی اطلاع افسوس ناک اور تکلیف دہ تھی۔ وہ پتا نہیں کیسے نشے کی علت کا شکار ہو گیا تھا اور اس علت نے اسے ایک اٹھائی گیارہ بنا دیا تھا۔ کئی بار وہ معمولی چیزیں چراتا ہوا پکڑا گیا اور جیل کی ہوا کھائی لیکن نشے کی عادت سے نجات حاصل نہ کر سکا۔ گھر والے بھی اس سے اتنے بیزار آگئے کہ ایک ناسور کی طرح اسے خود سے الگ کرنے پر مجبور ہو گئے اور وہ بیشتر نشی افراد کی طرح سڑکوں گلیوں میں آوارہ پھرتا آخر کار ایک دن ازیان رگڑ رگڑ کے لقمہ اہل بن گیا۔ دوستوں کے بارے میں حاصل شدہ ان معلومات نے اسے اتنا تو یقین دلا دیا کہ اس سے رابطہ کرنے والا ان میں سے کوئی نہیں ہے لیکن پھر سوال یہی تھا کہ وہ کون تھا جو اس راز سے واقف تھا۔ اپنے بارے میں تو فیصل کو خبر تھی کہ اس نے کسی دوسرے فرد کو کیا بھی اپنے سامنے کے سامنے بھی ماضی کے اس تاریک باب کو نہیں دہرایا تھا۔ دوستوں میں سے شاید کسی نے کہیں کچھ بول دیا ہو لیکن وہ ان سے پوچھ نہیں سکتا تھا جس نمبر سے پیغام آیا تھا، وہ نمبر ہر بار کی کوشش پر اسے بندھی ملا تھا۔ اس نے

گیا اور فوراً ہی بیٹی کو کسی قابل اعتماد ڈاکٹر سے چیک کروانے کے لیے شہر کے ایک اچھے نجی اسپتال کی طرف روانہ ہو گیا۔ نجی اسپتالوں میں مریض کی مرضی نہ ہوتے ہوئے بھی اس کی جیب ڈسٹریبل کرنے کے لیے ضروری اور غیر ضروری ٹیسٹ کروانے کا رواج عام ہے اور یہاں تو فیصل خود ہر طرح سے اطمینان کر لینے کا خواہاں تھا سو رانیہ کو کئی ٹیسٹ..... لکھ کر دے دیے گئے۔ ان ٹیسٹوں پر اچھی خاصی رقم اٹھ گئی لیکن فیصل کو کوئی افسوس نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ میں اپنی بیٹی پر ہی خرچ نہیں کروں تو پھر میرے کمانے کا کیا فائدہ.....؟ رانیہ کے ٹیسٹوں کی رپورٹ آئی تو ان دونوں میاں بیوی کے بیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ ان کی تنگی پر ہی تھے وہ کاٹنا چھتا ہوا بھی نہیں دیکھ سکتے تھے، برین ٹیمر کے موڈی ٹھٹھے میں جگڑ گئی تھی۔ ڈاکٹر نے انہیں صاف بتا دیا تھا کہ ٹیمر ایسی پوزیشن میں ہے کہ آپریشن کرنا بھی بہت رکی ہو گا اور ذرا سی ہی بیشی بیٹی کی جان لے لے گی۔ بیرون ملک آپریشن کروانے کی صورت میں کامیابی کے امکانات نسبتاً زیادہ تھے۔

فیصل نے اس سلسلے میں بیرون ملک اسپتالوں سے رابطے کے لیے علاج کے ہوٹرا یا اخراجات کی تفصیل نے اسے ڈسٹر کر دیا۔ اس کے پاس جو ٹھوڑی بہت بچت تھی اس کا بیشتر حصہ ابتدائی مرحلے میں ہی خرچ ہو چکا تھا۔ زمین چابکدو کچھ تھا نہیں جسے بچ کر رقم کا انتظام کیا جاتا۔ لے دے کر فرح کے پاس چند لاکھ کے زپورات تھے اور ٹھوڑا بہت وہ اپنے آٹس سے لون لے سکتا تھا لیکن جو اخراجات تھے، ان کے سامنے یہ رقم اوٹ کے منہ میں زیرے کے برابر ہی ثابت ہوئی۔ عزیز رشتے داروں میں سے بھی کس سے مدد مانگی جاتی۔ وہ خود تو اپنا خاندان کھو چکا تھا اور فرح کے بہن بھائی بھی بس عزت سے گزرا کر رہے تھے۔ کوئی مدد کرنا بھی تو ایک آدھ لاکھ سے زیادہ نہ دے پاتا۔ پریشانی میں فیصل کی حالت دیوانوں جیسی ہو گئی۔ وہ این جی اوز سے رابطہ کرنے کے ساتھ ساتھ سوشل میڈیا پر مدد کی درخواستیں تک ہر تدبیر لڑا رہا تھا۔ وہ ایسا دیوانہ باپ تھا جو اپنی بیٹی کی زندگی بچانے کے لیے بھیک بھی مانگ سکتا تھا اور اپنا آپ بھی بچ سکتا تھا۔

رانیہ کا مرض جو جانے کب سے اس کے اندر چپکے سے چھپا بیٹھا تھا پہلی بار ظاہر ہونے کے بعد فوراً ہی شدت اختیار کرنے لگا تھا اور اسے جلدی جلدی بے ہوشی کے دورے پڑنے کے ساتھ ساتھ سر میں اتنا شدید درد اٹھنے لگا

متعلقہ موبائل کمپنی میں ملازمت کرنے والے ایک دوست کے ذریعے اس نمبر سے متعلق معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی گئی لیکن نتیجہ بے سود تھا۔ نمبر ایک ایسے معمر صاحب کا تھا جن کی ساری اولاد بیرون ملک مقیم تھی۔ کچھ عرصے پہلے ان کا موبائل چھین لیا گیا تھا اور انہوں نے تھانے میں رپورٹ درج کروانے یا سہ بند کروانے کا تکلف کرنے کے بجائے ایک دوسرا موبائل اور سہ خرید لی تھی۔

فیصل کے لیے یہ ایک انتہائی مشکل دور تھا ایک طرف جان سے پیاری بیٹی کی تکلیف تھی تو دوسری طرف اس کے ماضی کا بھیاں تک حصہ اس کے سامنے آ کر اٹھ رہا تھا۔ وہ بیٹی سے بہت محبت کرتا تھا لیکن وہ صبح بھی اسے بھی نہیں بھولی تھی جب اس کے گھر سے چار عدد خون میں نہانی ہوئی لاشیں نکلی تھیں اور اس نے خود سے وعدہ کر لیا تھا کہ کبھی حصول مال کے لیے فطرا راہ نہیں چلے گا کہ ان راہوں پر چلتا انسان کب ایک کے بعد دوسرے جرم میں لوٹ ہوتا چلا جاتا ہے، اسے خود بھی خبر نہیں ہو پائی۔

ابھی وہ بیٹی کی محبت اور اپنے عہد کے درمیان کشش میں ہی پھنسا ہوا تھا کہ اس کے پاس ایک دوسرے نمبر سے ایک اور پیغام آ گیا۔ اس پیغام کا انداز مختلف تھا اور اسے باقاعدہ دھمکی دی گئی تھی کہ اگر اس نے کام کی ہامی نہ بھری تو اس کی بیوی اور سسرالی رشتے داروں کو اس کے ماضی سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ پولیس کو بھی چند ایسے ثبوت پیش کر دیے جائیں گے جو ہوشیار سے ہوشیار چور بھی اپنے پیچھے چھوڑ جاتا ہے لیکن آرام طلب اور کام چور پولیس والوں کی نااہلی کی وجہ سے جرم تک رسائی ممکن نہیں ہو پائی۔ ایک طرف یہ دھمکی دوسری طرف رانیہ کی روز بروز گزرتی حالت..... فیصل کو بالآخر کھینے کھینے پڑے اور اس نے سوشل میڈیا پر رانیہ کی سرخ فرائڈ پہنچی ہوئی تصویر واحد لفظ ہیپلپ کے کنکشن کے ساتھ ڈال دی۔ اسے اپنی رضامندی دینے کا بھی طریقہ بتایا گیا تھا۔ اس رضامندی کے اظہار کے فوراً بعد اس سے رابطہ کیا گیا اور ملاقات کے لیے ایک جگہ بلوایا گیا۔

یہ دنوں ملاقات بھی جس میں مقابل خود کو نقاب میں چھپا کر سامنے آیا تھا۔ ملاقات میں اس نے فیصل کے ہامی بھر لینے کے فیصلے کو سراہتے ہوئے اپنے منصوبے کا کچھ حصہ اس کے سامنے رکھا تھا۔ وہ واقعی ایک بڑی واردات کی تیاری میں تھا جس کے بارے میں فیصل اس دور میں بھی

نہیں سوچ سکتا تھا جب وہ اور اس کے دوست ایسے کام کرتے تھے لیکن اپنے حالات نے اسے اس واردات کے لیے تیار کر جانے والی ٹیم کا حصہ بننے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ کامیاب ہو جائے تو رانیہ کا علاج بہت آسانی سے ہو جاتا۔ ناکامی کی صورت میں وہ گرفتاری کے بارے میں تو کسی صورت سوچ ہی نہیں سکتا تھا اور اس نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ ایسی صورت میں وہ موقع پر ہی خودکشی کر لے گا۔ وہ ایک ناکام باپ اور مجرم کی حیثیت سے اپنی بیٹی کا سامنا کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

پہلی ملاقات کے بعد اس شخص نے جو خود کو ”باس“ کہلاتا پسند کرتا تھا، دو بار مزید اسے بلوایا تھا۔ ان ملاقاتوں میں باس کے علاوہ باقی تین افراد بھی شامل تھے لیکن فیصل سمیت ان سب نے باس کے حکم پر اسی کی طرح خود کو نقابوں میں چھپا رکھا تھا۔ انہیں ایک دوسرے کے نام تک معلوم نہیں تھے۔ باس انہیں ناموں کے بجائے نمبر سے پکارتا تھا۔ فیصل کا نمبر ٹو تھا اور اسی نمبر کی مناسبت سے وہ میزنگی داہیں جانب دوسری کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ میٹنگ کا باقاعدہ آغاز ہوا تو باس نے ایک بار پھر منصوبے کی ساری جزئیات بیان کرنے کے بعد ان چاروں سے ان کے رول سے متعلق سوال جواب شروع کر دیے۔ فیصل سمیت تین افراد نے بالکل صحیح جوابات دیے لیکن نمبر تین ذرا سا انکس گیا۔ نتیجتاً اسے بڑی طرح باس کی جھانسنی پڑی۔ آخر کار باس نے میٹنگ ختم ہونے کا اعلان کیا اور وہ مخصوص طریقہ کار کے مطابق وہاں سے رخصت ہونے لگے۔

سب سے پہلے نمبر ون رخصت ہوا پھر دس منٹ بعد فیصل کی باری آئی۔ وہ باہر پارک کی گئی اپنی گاڑی تک پہنچا تو دیکھا نمبر ون کی گاڑی غائب ہے۔ انہیں یہی ہدایت دی گئی تھی اور ان میں سے کوئی بھی میٹنگ روم سے باہر ایک دوسرے سے بات نہیں کر سکتا۔ باس نے انہیں سمجھا دیا تھا کہ ایک دوسرے سے انجان رہنے میں ہی ان کی بقاء ہے۔ اس سلسلے میں ان سے اتنی احتیاط کروائی جا رہی تھی کہ انہیں اپنی گاڑیوں کے رنگ بدل دینے اور نقلی نمبر پلیٹ استعمال کرنے کی ہدایت کے ساتھ ساتھ واپسی میں اپنے تعاقب سے ہوشیار رہنے کی بھی ہدایت کی گئی تھی۔ گاڑیاں ان چاروں میں سے فیصل اور نمبر ون کے پاس تھیں۔ نمبر تھری اور فور بائیس استعمال کرتے تھے۔ نمبر ون کی گاڑی وہ میٹنگ کے لیے آتے وقت اور نمبر تھری اور فور کی بائیس وہاں سے رخصت ہوتے وقت دیکھتا تھا۔

روپ بھروپ

ہو۔ تمہیں نہیں معلوم کہ میں نے تمہیں کتنی چاہت سے اپنا یا ہے۔۔۔۔۔؟“ ملک احسن نے اس کا ہاتھ تمام کر خود سے کچھ اور قریب کر لیا اور اسے اپنی محبت کا یقین دلانے لگا۔

”مردوں کی چاہت کا کیا پتا ہوتا ہے اور آپ کے تو میڈیا پر اتنے اسکینڈل چلتے رہتے ہیں۔“ وہ کچھ اداس اور پریشان تھی۔

”ان کی فکر نہ کیا کرو میری جان۔ وہ سب انکسشن کھینچ کر کا حصہ ہے۔ میرے مخالفین میری شہرت کو داغ دار کرنے کے لیے ایسے اوجھے جھگڑے استعمال کر رہے ہیں۔ اگر وہ انکسٹل در دست بھی ہوتے تو تمہیں کیا خطرہ ہے۔ تمہاری پوزیشن سب سے الگ اور مضبوط ہے۔ تم میری وجہ نہیں منکوحہ ہو اور منکوحہ کا حق محبوب سے زیادہ ہوتا ہے۔“ ملک احسن کا لہجہ اب بھی ہلکا ہلکا اور قدرے شرارتی تھا۔

”وہ حق جو کسی کے سامنے چٹایا ہی نہ جائے کس کام کا؟ میں شادی شدہ ہو کر بھی تنہا ہوں۔“ روشن کو آج شاید قوتیلت کا دورہ پڑا تھا جو فکروں پر فکروں کے جاری تھی۔ ملک احسن نے اس صورت حال پر بیزاری غصوں کی لیکن اس بیزاری کو کچھ سے جھٹکنے نہیں دیا اور نرم لہجے میں بولا۔

باتیں کر رہی ہو۔ یہ بات تو ہمارے درمیان شروع سے طے تھی کہ انگلش تک ہم اپنی شادی دیکھ نہیں کریں گے۔ میں کوئی باپ دادا کے زور پر سیاست کے میدان میں قدم رکھنے والا انسان نہیں ہوں۔ میں نے اپنی زندگی کے تیس سال سیاست کو دیے ہیں جب تکہیں جا کر اس پوزیشن میں آیا ہوں کہ میری پارٹی ملک کی تین بڑی پارٹیوں میں سے ایک ہے اور ہماری جیت کے امکانات خاصے واضح ہو چکے ہیں۔“ وہ اس کی پشت کو سہلاتے ہوئے دھیمے لہجے میں اسے سمجھا رہا تھا۔

”یہ تو میں بھی دیکھ رہی ہوں کہ آپ کی پارٹی نے عوام کے درمیان خاصی جگہ بنائی ہے۔ اصل میں لوگ باری باری مخصوص لوگوں کو آزما کر رکھ آچکے ہیں اور کسی ایسے فرد کے متلاشی ہیں جو حقیقت میں ان کے مسائل حل کر سکے۔ آپ لوگوں کی یہ امید نہیں تو توڑنا ملک صاحب۔“

روشن کی ذہنی رو پلٹ گئی اور وہ اپنے شکوے اور اندیشے بھول کر دوسروں کی فکرمیں مبتلا ہو گئی۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ اس نے وہاں کبھی کوئی پانچویں سواری نہیں دیکھی تھی اور اسے نہیں معلوم تھا کہ باس کس طرح وہاں پہنچتا تھا۔ اس بار بھی اس نے اس بارے میں سوچا ضرور لیکن خاموشی سے اپنی گاڑی نکال کر لے گیا۔ گاڑی میں بیٹھنے کے بعد اس نے اپنا نقاب ہٹا دیا تھا اور ایک عام شخص کی طرح گاڑی چلاتا ہوا ٹریفک کا حصہ بن گیا چونکہ اسے معلوم تھا کہ اب وہ ایک عام انسان سے ذرا مختلف ہو چلا ہے اس لیے گاڑی چلاتے ہوئے بے حد محتاط تھا اور غیر ضروری موڑ کا شفاور کم سے کم ٹریفک والی سڑکوں کا انتخاب کرتا اس بات کو یقینی بنا رہا تھا کہ اس کا تعاقب نہ کیا جاسکے۔ تعاقب کی طرف سے مکمل مطمئن ہونے کے باوجود اس نے سیدھا گھر کا رخ کرنے کے بجائے ایک عام سی آبادی میں کرائے پر لی جانے والی اس دکان کا رخ کیا جسے وہ آج کل گیراج کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔ اس گیراج میں گاڑی کھڑی کرنے کے بعد اس نے گاڑی کا اچھی طرح معائنہ کیا اور مطمئن ہو گیا کہ گاڑی کے ساتھ ایسی کوئی شے مشکوک نہیں کی گئی ہے جو اس کا سراغ دے سکے۔ اس اطمینان کے بعد اس نے گاڑی کو وہیں چھوڑا اور ایک طرف کھڑی بائیک پر سوار ہو کر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

اسے اطمینان تھا کہ اس کی سواری کے ساتھ ایسا کچھ
 مشک نہیں تھا جو کسی کو اس کے گردنک پہنچا سکے البتہ وہ خود
 اپنے باقی تین ساتھیوں کے ٹھکانے معلوم کر چکا تھا۔ ان کی
 سواریوں کے ساتھ ایک چھوٹی سی ڈیڑھاں چپاں کر دینے
 کی وجہ سے اس کے لیے یہ ممکن ہو سکا تھا۔ اس نے ایسا
 ہی کیا تھا۔ اس کے پاس اس کی کوئی بہت بڑی وجہ نہیں
 تھی لیکن وہ ممکنہ حد تک باخبر رہنا چاہتا تھا۔ وہ اس بات کا
 قائل تھا کہ باخبر آدمی کے پاس زیادہ امکانات ہوتے
 ہیں۔ وہ جس گرداب میں پھنس چکا تھا اس کے پاس کچھ تو
 ایسے امکانات ہونے چاہیے تھے جو اس کی جان بچانے
 میں اس کے کام آسکتے۔

☆☆☆

”آج کتنے دنوں بعد آپ نے مجھے ملاقات کے لیے بلایا ہے ملک صاحب! کیا آپ کا مجھ سے دل بھر گیا ہے۔“ اپنی نکلیاں میں بڑی چوڑیوں گواہگیوں سے چھڑتے ہوئے اس نے شکوہ تو ناز سے کیا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں ایک خوف اور تشویش کی کیفیت تھی۔

”باگل ہوئی ہو روضن! تم یہ بات سوچ بھی کیسے سکتی

وقت تک لوگوں کے لیے کچھ نہیں کر سکتا جب تک پاور میرے ہاتھ میں نہیں آجاتی۔“ اب وہ اس کی زلفوں سے کھیل رہا تھا۔

”عوام میں آپ کی مقبولیت دیکھ کر تو یہی لگتا ہے کہ ملک کے اگلے وزیراعظم آپ ہی بنیں گے۔“ وہ پُر امید اور پُر جوش نظر آنے لگی۔ ملک احسن اس کی بات سن کر ہنسا۔ وہ جس عوامی مقبولیت کا ذکر کر رہی تھی اس کے لیے وہ روپیہ پانی کی طرح بہا رہا تھا اور بڑے بڑے چیلنجز کو باندھ کر رکھتا تھا کہ وہ اسے زیادہ سے زیادہ پرومٹ کریں لیکن یہ بات بہر حال وہ جانتا تھا کہ ابھی وزیراعظم کی سیٹ اس سے کافی دور ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ ایک یا دو صوبوں میں حکومت بنا سکتا تھا۔ اس بات کا اظہار اس نے روشن کے سامنے بھی کر دیا۔ ”اس بار تو نہیں لیکن اگلی بار کے لیے تم تیاری پکڑ لو۔ اگلے الیکشن کے بعد میرا وزیراعظم بننا پکا ہے پھر تم خاتون اول کہلاؤ گی۔“ اس نے اسے ایک اور خواب سنا دیا۔ یہ خواب ایسا تھا کہ روشن کی خوب صورت آنکھیں پہلے سے بھی زیادہ چمکنے لگیں اور لہجہ خود ہی خمار آلود ہو گیا۔

”سوسائٹ ملک صاحب۔ میں سچ سچ دنیا کی خوش قسمت ترین عورت ہوں جسے آپ نے اپنایا۔ آپ پوری زندگی مجھے اپنا وفادار پارٹنر بن گئے۔“ ملک احسن کو پوری زندگی کی وفاداری کی پروا نہیں تھی، وہ اس وقت اسے پُر جوش و پُر امید دیکھنا چاہتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا مایوس اور ابھری ہوئی عورت ٹھنڈی چائے بھی پیتی ہے جس سے مرد کو کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اس نے اپنی سخت روئین میں سے وقت نکال کر روشن کو اس لیے طلب کیا تھا کہ وہ اس کی ٹھکن اتار دے۔ ٹھکن گرم چائے کی پیالی سے ہی اترتی ہے اور خود پھر دگی کی کیفیت میں اس کے بازو سے سر ٹکائے لیٹھی روشن ایک گرم پیالی چائے میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اس نے بہت شوق سے اس چائے کو نوش کیا۔ روشن وہاں سے رخصت ہوئی تب بھی شمار کی سی کیفیت میں تھی۔ اس شمار کو واپسی کے لیے اسے اس کی گاڑی تک چھوڑنے جانے والے ملک احسن کے پی اے نے توڑا۔

”تمہاری چچی ہونے کے دن قریب آ رہے ہیں۔ ملک صاحب آج کل ہر سماجی ملی شاہ کی حویلی کے بہت چکر لگا رہے ہیں۔ سنا ہے ان کی بیٹی خاصی خوب صورت ہے۔“ اس کی گاڑی کی کنڈلی پر ہاتھ رکھ کر جھکا وہ بظاہر

اسے مسکرا کر سی آف کہہ رہا تھا لیکن اس کے لہجے میں جوش کی کاٹ تھی، اس نے روشن کو بلایا کر رکھ دیا۔ لہجے کے علاوہ وہی جاننے والی اطلاع بھی نظر انداز کیے جانے کے قابل نہیں تھی۔ اس نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا کہ اس سے کچھ کہہ سکے لیکن وہ اپنی بات کہہ کر گاڑی سے ہٹ کر کافی دور جا کھڑا ہوا تھا اور وہ بلند آواز میں بولنے کا خطرہ نہیں مول لے سکتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ یہاں دیواروں کے بھی کان ہیں۔

☆☆☆

”تو آپ نے بنگلہ کرائے پر لینے کے لیے میڈم ضوفشاں کے لیے خاص کام کروا دیا کیا تھا.....؟“ انسپکٹر اسد نے اپنے سامنے بیٹھے نئی اسپتال کے ایم ایس ڈاکٹر شاہد علوی سے سوال کیا۔ وہ ضوفنی کے قتل کا معما حل کرنے کے چکر میں یہاں تک پہنچا تھا۔ ضوفنی کو بنگلہ کرائے پر دینے والے اسٹیٹ ایجنٹ نے اسے بتایا تھا کہ وہ میڈم ضوفشاں کی ذات کے بارے میں کوئی معلومات نہیں رکھتا تھا اور اس نے صرف ڈاکٹر شاہد علوی کی ضمانت پر بنگلہ کرائے پر دیا تھا۔

”آپ کی معلومات درست ہیں انسپکٹر صاحب! اصل میں ضوفشاں نے مجھ سے ضمانت کے لیے درخواست کی تھی اور چونکہ میں اسے ایک جھٹکی اور فرض شناس وکر کے طور پر پرنڈ کرتا تھا اس لیے اسے انکار نہیں کر سکا۔ اب بھی مجھے سخت افسوس ہے کہ کسی نے اس پیاری لڑکی کو اتنی سفاکی سے قتل کر دیا وہ تو.....“ ڈاکٹر شاہد اس کے قتل پر افسوس کا اظہار کر رہی رہے تھے کہ انسپکٹر اسد نے ان کی بات کاٹ دی اور تیزی سے پوچھا۔

”میڈم ضوفشاں آپ کے اسپتال میں جاب کرتی تھیں؟“

”جی ہاں، وہ ایک قابل اسٹاف نرس تھی۔“ ڈاکٹر شاہد نے بتایا۔

”پھر اس نے یہ ملازمت کیوں چھوڑ دی؟“ ضوفشاں کے ایک عام سی نرس ہونے کا سن کر اسد کا اندازِ تکلم خود بخود بدل گیا۔

”اس نے نہیں شادی کر لی تھی اور اس کا کہنا تھا کہ اب اسے ملازمت کی ضرورت نہیں ہے۔“

”کیا آپ اس کے شوہر کو جانتے ہیں؟“ اسد نے تیزی سے اگلا سوال کیا جس کے جواب میں ڈاکٹر شاہد نے

”اب یہ تو وہی بتا سکتی تھی۔ میں اس سلسلے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“ اسد کے منہ کھٹے پر ڈاکٹر شاہد نے شانے اچکا کر بے نیازی کا اظہار کیا۔

”اوکے ڈاکٹر صاحب! آپ کے تعاون کے لیے شکریہ۔ مجھے لگتا ہے کہ مجھے مزید معلومات کے حصول کے لیے ضوفشاں کی فحشی کو اپر وچ کرنا پڑے گا۔“ اسدان سے ہاتھ ملا کر وہاں سے رخصت ہو گیا لیکن اپنے اسٹاف میں سے ایک خاتون الہکار کی ڈیوٹی لگا دی تھی کہ اسپتال کے عطلے سے ضوفشاں کے بارے میں معلومات حاصل کرے۔ دوسری طرف وہ ضوفشاں کے گاؤں کے پتے پر اس کے گھر والوں سے رابطہ کرنے کی بھی کوشش کر رہا تھا۔ ضوفشاں کے شہنشاہی کارڈ پر اس کا جو مسئلہ بتا دیا تھا، وہ ایک دور دراز گاؤں کا تھا اور ابھی تک اس کی لاش سرد خانے میں پڑی درخت کی شہر تھی۔ فون نمبر اسے کوئی مل نہیں سکا تھا کہ ضوفشاں کا موبائل بھی اس کے زیورات اور نقدی کی طرح اس کے گھر سے غائب تھا۔

محاطات کو جلد از جلد منٹا لینے کی عادت کے باعث اسد نے کارروائی کو تیز کیا جس کے نتیجے میں ایک یوڑھی عورت اور آٹھ سالہ بچی ضوفشاں کی وارث کے طور پر وہاں پہنچ گئیں۔ عورت اور بچی دونوں بے حد کمزور تھیں اور سرد خانے میں پڑی ضوفشاں کی لاش کو دیکھ کر بہت دیر تک روتی رہی تھیں۔ اسد نے ان کا تعارف حاصل کیا تو معلوم ہوا یوڑھی عورت زینبہ بی بی ضوفشاں کی والدہ جبکہ بچی رشاں اس کی بیٹی ہے۔ ضوفشاں کا باپ مرچا تھا اور ان کے خاندان میں کوئی دوسرا مرد موجود نہیں تھا۔ ان دو لاچار ورثہ کی بے چارگی دیکھ کر اسد نے خود ہی ان کی اجازت لے کر ایک رہائشی ادارے کے ذریعے لاش کی تدفین کا انتظام کروا دیا۔ خاتون اور بچی سے سوال جواب کرنے کے بعد اسے متوالہ کے بارے میں جو معلومات حاصل ہوئیں، اس کے مطابق ضوفشاں کے میٹرک کرتے ہی کم عمری میں ہی گاؤں کے ایک لڑکے سے شادی کر دی تھی۔ شادی کرتے وقت لڑکے کی اس خوبی کو ترجیح دی گئی تھی کہ وہ مالی طور پر خوش حال ہے۔ لڑکے اور لڑکی کے درمیان عمر اور شکل کے تفاوت کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ اس قسم کی شادیاں ہمارے معاشرے میں عام ہیں۔ اس لیے ضوفشاں نے ماں باپ سے کوئی گلہ نہیں کیا اور خوش اسلوبی سے اپنی

”اس نے اپنی شادی پر کسی کو انوائس نہیں کیا تھا۔ دراصل یہ اس کی دوسری شادی تھی اور شاید بہت سادگی سے فحشی ممیز کے درمیان ہی انجام پائی تھی۔ میرے پاس تو وہ جاب چھوڑنے کے کافی دنوں بعد آئی تھی۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ اس کا شوہر اپنی جاب پر بیرون ملک واپس چلا گیا ہے اور وہ بھی سال ڈیڑھ سال میں اس کے پاس چلی جائے گی۔ اس مدت کے لیے کوئی اچھی رہائش گاہ حاصل کرنے کے لیے اسے کسی معزز شہر کی محنت و زحمت کرنی تھی جو اس نے مجھ سے طلب کی اور میں نے محنت دینے میں حرج نہیں سمجھا۔ ہاں اسے یہ مشورہ ضرور دیا تھا کہ وہ بھلا کر اپنے پر لینے کے بجائے کوئی ادارہ منٹ لے لے یا وین ہاسٹل میں رہائش اختیار کر لے لیکن اس کا کہنا تھا کہ اس کے شوہر نے اسے بھلا ہی کرائے پر لینے کی ہدایت کی تھی۔ اسے امید تھی کہ اسے باہر بلوانے سے پہلے اس کا شوہر پاکستان کا ایک آدھ چکر لگے گا اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ شوہر کو اس سے شکایت ہو۔“

”کیا اس نے اپنے شوہر کے بارے میں آپ کو کچھ بتایا تھا کہ وہ کون ہے اور کیا جاب کرتا ہے؟“ انکپٹر اسد نے آگاہ سوال کیا۔

”ہاں شاید نام وغیرہ بتایا تھا لیکن آئی ایم سوری کہ مجھے یاد نہیں ہے۔ اصل میں، میں بہت مصروف رہتا ہوں اور غیر ضروری باتیں مجھے یاد نہیں رہتیں۔“ ڈاکٹر شاہد کا لبہ محذرت خواہانہ ہو گیا۔

”تعب کی بات یہ ہے کہ ضوفشاں نے دوسری شادی کر لینے کے باوجود اپنے شہنشاہی کارڈ میں کوئی تبدیلی نہیں کروائی تھی اور کرائے نامے میں بھی شوہر کے نام کے بجائے والد ہی کا نام لکھوایا تھا۔“ اسد نے ایک اور نکتہ اٹھایا۔

”ہمارے ہاں اس طرح کی بے پروائیاں عام ہیں۔ یہاں لوگوں کے شہنشاہی کارڈ ایکسٹراڈ ہو جاتے ہیں تب بھی وہ انہیں ری نو کروانے میں ہمیں لگوا دیتے ہیں۔ ضوفشاں کا معاملہ بھی شاید ایسا ہی تھا۔“ ڈاکٹر شاہد نے خیال ظاہر کیا۔

”حالانکہ ایسا ہونا نہیں چاہیے تھا۔ وہ اپنے شوہر کے پاس بیرون ملک منتقل ہونے کا ارادہ رکھتی تھی تو ایسی صورت میں اسے اپنے ڈاکومنٹس کو آپ ڈیٹ رکھنا چاہیے

شادی نہ بنے لیکن شادی نہ بننے کے لیے صرف ایک شخص کی کوشش تو کامیاب نہیں ہوئی۔ تالی ہمیشہ دونوں ہاتھ سے جیتی ہے۔ ضوفی کا شوہر خوب صورت اور خوش اطوار بیوی پا کر رب کا شکر گزار ہونے کے بجائے شک کے مرض میں مبتلا ہو گیا۔ اسے لگتا تھا کہ گاؤں کا ہر لڑکا ضوفیاش کا عاشق ہے اور ہر مرد کی نگاہیں اس کا تعاقب کرتی رہتی ہیں۔ بات یہیں تک بھی ہوئی تو اتنا مسئلہ نہیں ہوتا لیکن حامد کو یقین تھا کہ ضوفیاش نے خود ان سب مردوں کو اپنے پیچھے لگا رکھا ہے اور ایسی ادا میں دکھائی ہے کہ سب اس کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔

اپنے اس وہم اور شک کے ہاتھوں مجبور ہو کر ہر دوسرے تیسرے دن بیوی کو روٹی کی طرح دھتک کر رکھ دیتا تھا۔ خوب صورت و پچھل ضوفیاش شادی کے ایک سال کے اندر ہی اس بُری طرح کھلا کر رہ گئی تھی کہ اس پر بی بی کی مریضہ کا گمان ہوتا تھا۔ بوزمی ماں داماد اور اس کے گھر والوں سے اپنی بیٹی پر رحم کرنے کی درخواست کے سوا بھلا کر بھی کیا سکتی تھی۔ حامد نے اس کی کسی درخواست پر بھی کان نہیں دھرے اور گھر والے اس مار پیٹ کو میاں بیوی کا ذاتی معاملہ قرار دے کر اپنا پہلو بچا لیتے تھے۔ ماں سے کرنے کے لیے اور کچھ نہیں بن پڑا تو دل کی مریضہ بن گئی۔ ایک روز بالکل اچانک اس کی طبیعت بگڑتی تو محلے دار اسے اسپتال لے گئے اور محلے کے ہی ایک لڑکے نے یہ خبر ضوفیاش کے سسرال پہنچ کر اسے سنا دی۔ ضوفیاش سن کر اتنی پریشان ہوئی کہ حامد کا رد عمل سوچے بغیر اس پڑوسی لڑکے کے ساتھ ہی اسپتال کے لیے روانہ ہو گئی۔ اس کے گاؤں سمیت آس پاس کے کئی دیہاتوں کو طبی سہولت فراہم کرنے والا یہ سرکاری اسپتال ان کے گاؤں کے بجائے ساتھ والے گاؤں میں قائم تھا۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے وہ پڑوسی لڑکے کی موٹر سائیکل پر بیٹھنے پر مجبور ہو گئی۔ اسپتال پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ ماں کی حالت بہتر ہے اور ڈاکٹر نے کہا ہے کہ کل دوپہر تک اسے چھٹی دے دی جائے گی۔ تین چار گھنٹے ماں کی پٹی سے لگ کر پیٹنے کے بعد خود اس نے بھی اپنا امیتان کر لیا اور اسی پڑوسی لڑکے کے ساتھ اپنے سسرال واپس لوٹ گئی لیکن وہاں تو گویا ایک قیامت اس کی منتظر تھی۔

گھر میں محنت ہی حامد نے اس کی گدی و بوجی لی اور پچھلے عاشق کے ساتھ چھڑے اڑانے کا الزام لگا کر اتنا مارا اتنا مارا کہ اپنے ہی سارے پچھلے ریکارڈ توڑ ڈالے۔

مارتے ہوئے عالم کو اتنا خیال بھی نہ آیا کہ وہ دوسرے جی سے ہے اور اسے کوئی نقصان پہنچنے کی صورت میں اس کی اپنی اولاد کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس کے اس جنون کو دیکھ کر ناچار کچھ پڑوسیوں کو ڈھل دے کر ضوفی کو اس کے عتاب سے بچانا پڑا۔ اس دخل اندازی پر وہ اتنا برا فرخستہ ہوا کہ ان پڑوسیوں پر بھی ضوفی کا یار ہونے کا الزام لگا دیا اور ہر حد پار کرتے ہوئے بیاہک دہل اس پر بد چلتی کا الزام لگا دیا اور کھڑے کھڑے اسے طلاق دے دی۔ آس پاس والوں نے ہی اس کی مرہم پٹی کی اور اسے اس کی ماں کے گھر پہنچا دیا۔ ماں دوسرے دن اسپتال سے گھر واپس لائی گئی تو لوگوں کو اندیشہ محسوس ہوا کہ بیٹی کی حالت اور اس کی طلاق کا علم ہونے پر کہیں اسے دل کا دورہ ہی نہ پڑ جائے لیکن زریں بی بی نے حیرت انگیز طور پر خود کو سنہال لیا اور طلاق کا غم سینے سے لگانے کے بجائے خود کو یہ کہہ کر تسلی دے لی کہ اچھا ہوا میری بیٹی کی جان اس ظالم سے چھوٹ گئی۔

بیار ماں بیٹی کی دیکھ بھال کی ذمہ داری سنہال کر پڑوسیوں نے حتیٰ کہ ہم سائیکلی ادا کر ڈالا۔ مالی مسائل اتنے زیادہ نہیں تھے۔ خاوند کی وفات کے بعد سے زریں بی بی کی بیرون ملک مقیم بہن بہن ماہ باندی سے اسے کچھ رقم بھیجتی تھی۔ خود زریں بی بی نے گھر کی بیشک میں ایک چھوٹی سی دکان ڈال رکھی تھی جس سے قلیل ہی سہی آمدنی کا سہارا تھا اور مل مار کر اخراجات سہولت سے پورے ہو جاتے تھے۔

ضوفیاش نے حمل تک کا وقت گھر میں بھر دودھ کر عدت میں گزارا اور بیٹی کی پیدائش کے بعد خالہ کے مشورے پر اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کا عزم لے کر نرسنگ کا کورس کرنے قرعہ شہر پہنچ گئی۔ داخلے وغیرہ کے اخراجات پورے کرنے کے لیے اس نے اپنا وہ زیور فروخت کر دیا جو اس کے باپ کی زندگی میں بیویا گیا تھا اور اسے اس کے جہیز میں دیا گیا تھا۔ تھوڑی بہت معاونت خالہ بھی کرتی رہی۔ خالہ میں بیرون ملک رہنے سے تبدیلی آ گئی تھی۔ اس نے زریں کے مقابلے میں زیادہ دنیا دیکھ لی تھی اس لیے ایسے مشورے دینے کی اہلیت نہ رکھتی تھی۔ ضوفی بی بی ماں کے حوالے کر کے پوری حافظت سے تعلیم حاصل کرتی رہی۔ تربیت مکمل ہونے کے بعد کچھ عرصے تو اس نے اسی شہر میں ملازمت کی پھر خالہ کے مشورے پر زیادہ بہتر ملازمت کے لیے بڑے شہر میں پہنچ گئی۔

ڈاکٹر شاہد علوی کے شاندار اسپتال میں ملازمت

بچپلوں کو پہلے سے زیادہ رقم بھی بھجوا رہی تھی لیکن مسئلہ یہی تھا کہ اس کے شوہر کا کوئی کھوج نہیں مل رہا تھا۔ ضوفی کے شاختی کارڈ کی مدد سے اسد نے پچھلے سات آٹھ ماہ کا ریکارڈ بھی چیک کر دیا تھا کہ شاید نکاح کا کوئی ثبوت مل جائے اور اس کے شوہر تک رسائی حاصل ہو سکے لیکن یہ کوشش بھی بیکار رہی تھی اور وہ ضوفی کیس کے حوالے سے ہنوز اندھیرے میں کھڑا تھا۔ شوہر کے معاملے میں جو پراسراریت سامنے آئی تھی، اس نے یہ شک پیدا کر دیا تھا کہ اس قتل میں اس کا شوہر بھی ملوث ہو سکتا ہے لیکن شوہر تھا کہاں.....؟ وہ ابھی اس سوال کے جواب کے پیچھے بھاگ رہا تھا کہ یک دم ہی ضوفی قتل کیس مل ہو گیا۔

ضوفی کے ہنگامے کا چکیدار وحید جو اس کے قتل کے وقت چھٹیوں پر اپنے گاؤں گیا ہوا تھا اور پولیس کی طرف سے کال کیے جانے کے باوجود اس وجہ سے فوری طور پر حاضر نہیں ہوا تھا کہ اسے ٹائیفا ئڈ بخار نے گھیر لیا تھا۔ پولیس کی طرف سے اجازت نہ ہونے کے باوجود ایک روز اپنے گاؤں سے باہر جانے کی کوشش کرتا ہوا دھر لیا گیا۔ اسد نے بیماری کی وجہ سے اسے رعایت ضرور دی تھی لیکن مقامی تھا نے کو یہ ہدایت بھی کر دی تھی کہ وحید پر نظر رکھی جائے۔ یہ نظر رکھنا کام آیا اور گرفتاری کے ساتھ ہی وحید ڈی این اے کی رپورٹ کے نتیجے میں دھر لیا گیا۔ اپنی طرف سے اس نے بڑی احتیاط کی تھی کہ زیادتی کے باوجود ضوفی کے جسم پر اپنا ڈی این اے کا نمونہ نہ چھوڑ کر جائے لیکن ضوفی کے دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی کے ناخن میں خون کا ایک ننھا ساختک غصہ لیا تھا۔ مرے سے قبل اس نے مزاحمت کرتے ہوئے وحید کو نوچنے کی کوشش کی تھی۔ یہ کوشش اس کی جان تو نہیں بچا سکی تھی لیکن قاتل تک پہنچنے کا سراغ ضرور دے گئی تھی۔

ڈی این اے کی رپورٹ نے وحید کے پاس محبت جرم سے انکار کی محبت نہیں چھوڑی اور اس نے اعتراف کر لیا کہ وہ مرے سے ضوفی اور اس کے مال پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ موقع ضوفی نے چھٹی دے کر فرار ہو کر لیا۔ وہ چھٹیوں پر اپنے گاؤں گیا تو ضرور لیکن پھر ایک روز چھکے سے شہر واپس آ گیا۔ ہنگامے کی چابی اس کے پاس موجود تھی اس لیے اسے اپنی من مانی کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ جس خاموشی سے آیا تھا اسی رازداری سے واپس گاؤں لوٹ گیا۔ پولیس کو مال سرودہ بھی وحید کے پاس سے مل گیا لیکن اس میں ضوفی کا موبائل شامل نہیں

ملنے کی خوش خبری وہ آخری اطلاع تھی جو وہ اپنی خالہ کو سنا سکی۔ خالہ کا اچانک ہی ہارٹ فیل ہو گیا اور گویا سارے تعلق ختم ہو گئے۔ وہ رقم جو خالہ بھجوا کر گئی تھیں، آتا بند ہو گئی۔ ضوفی کی اچھی ملازمت کے بعد رقم کا اتنا مسئلہ بھی نہیں تھا لیکن خالہ جی خیر خواہ کے بلے جانے پر وہ بہت اداس ہوئی تھی۔ زرینہ کے مطابق سنے اسپتال میں ضوفی کی تنخواہ سال بھر کے اندر ہی بہت بڑھ گئی تھی اور وہ اسے خرچے کے لیے زیادہ رقم بھیجے گئی تھی۔ ایک آدھ بار ملاقات کے لیے کھر آنے پر وہ بیٹی کے لیے مصلوں اور کپڑوں سمیت بہت سارے قیمتی تحائف بھی لے کر آئی تھی۔ زرینہ بی بی کو کریدنے پر اسد کو معلوم ہوا کہ ضوفی کی دوسری شادی کے متعلق اسے قطعی علم نہیں تھا۔ یہ بڑی عجیب بات تھی۔ ضوفی ایک شاندار ہنگامے میں کسی کی بیوی ہونے کے دعوے کے ساتھ رہ رہی تھی لیکن کسی کو خبر ہی نہیں تھی کہ اس کا شوہر کون تھا اور کہاں پایا جاتا تھا۔

اسپتال میں اس نے جس لیدی اہلکار کی ڈیوٹی لگائی تھی اس نے بھی ضوفی کے بارے میں چند معلومات فراہم کی تھیں جن کے مطابق آمدنی میں اضافے کے لیے ضوفی نے نرسنگ کے علاوہ ادکاری کے شعبے کو بھی اختیار کر رکھا تھا اور اپنی ہفتہ وار چھٹی والے دن باقاعدگی سے ایک تھیٹر میں پر فارم کیا کرتی تھی۔ وہ بی بی پر بھی کام کرنے کی خواہش مند تھی لیکن تاحال اس کی وہاں تک رسائی نہیں ہو سکی تھی۔ اسپتال کے محلے سے بات چیت کرنے پر معلوم ہوا تھا کہ ضوفی کی خوش شکل کی وجہ سے کئی دولت مند اور دل چپیک مریش یا ان کے رشتے دار وغیرہ اس پر زور دے ڈالنے کی کوشش کرتے رہتے تھے لیکن اس نے بھی کسی کو گھاس نہیں ڈالی تھی اور کسی غلط ترغیب کو قبول نہیں کیا تھا۔

اس کی ایک ساتھی نے بتایا تھا کہ ملازمت چھوڑنے سے کچھ عرصہ قبل ایک بڑے سیاست دان کے چہیتے نے بھی اسے لائن دینے کی کوشش کی تھی لیکن ضوفی نے اسے کھری کھری سنا کر وہاں اس کی طبیعت صاف کر دی تھی۔ وہ جس تھیٹر میں کام کرتی تھی وہاں سے بھی اس کے متعلق کم و بیش یہی معلومات حاصل ہوتی تھیں۔ خاص بات یہ تھی کہ اس نے تھیٹر میں کام کرتا بھی اسی وقت ترک کر دیا تھا جب اسپتال کی ملازمت چھوڑی تھی۔ اس صورت حال کا واضح مطلب تھا کہ کوئی جو کہ شاید اس کا شوہر ہی تھا، اچھی طرح اسے سپورٹ کر رہا تھا جب ہی تو وہ اچھے گھر میں رہائش کے ساتھ ساتھ اچھی گاڑی بھی استعمال کر رہی تھی اور اپنے

”میرے پاس چوائس نہیں ہے فرح! میں اپنے دل پر بھروسہ رکھ لوں اور رانیہ کو یونہی بغیر علاج کے مرنے کے لیے چھوڑ دوں تب بھی ہمیں تباہی سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ میرا انکار ہماری زندگیوں میں طوفان لے آئے گا اور میں تمہیں اور رانیہ کو اس طوفان سے بچانے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ اس نے ہلکتے خورہہ لہجے میں فرح کو جواب دیا۔

”پلیز فیصل! مجھے بتاؤ کہ معاملہ کیا ہے۔ میں سب کچھ جان لوں گی تو زیادہ بہتر طور پر تمہارے ساتھ تعاون کر سکوں گی۔“ اس بار فرح نے حوصلے سے کام لیا اور مضبوط لہجے میں قائل کرنے لگی۔ اس کی بات فیصل کے دل کو لگی اور اس نے ایک دم ہی اسے سب کچھ بتانے کا فیصلہ کر لیا۔

”یعنی وہ تمہاری مجبوری اور کمزوری دونوں سے قائمہ اٹھا کر تمہیں بلیک میل کر رہا ہے۔ اگر تم اس کے لیے کام کرنے پر راضی نہیں ہو گے تو وہ تمہیں تباہ کر دے گا۔“ ساری تفصیل سن کر فرح نے تشویش زدہ لہجے میں تبصرہ کیا جس پر فیصل نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔

”اسی لیے میں اس کے ساتھ کام کرنے کی ہامی بھر چکا ہوں۔ اس طرح کم از کم ہم رانیہ کا بہترین علاج کروانے کے لائق تو ہو سکیں گے۔“ فرح نے جواب نہیں دیا۔ اس کے پاس کوئی جواب تھا ہی نہیں۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ واقعی فیصل یہ سب کرنے پر مجبور ہے۔

”میں نے تمہیں یہ سب اس لیے بتایا ہے کہ تم حالات کی نزاکت کا اندازہ کر سکو۔ یاد رکھنا کہ نوا انٹرنیٹ، نو موبائل، نو فون کا لائز اینڈ نو لیٹرز۔ تمہیں یہ عرصہ ایسے گزارنا ہے جیسے تم اور رانیہ کہیں موجود ہی نہیں ہو۔“ اس نے ایک بار پھر اپنی ہدایات کو دہرایا۔

”میں تمہاری ان ساری ہدایات کو یاد کر چکی ہوں لیکن رانیہ..... رانیہ کا کیا ہوگا، وہ تمہاری اتنی قیمتی ہے۔ اس کے لیے تمہارے بغیر، تم سے بنا کوئی رابطہ رکھے وقت گزارنا مشکل ہو جائے گا۔“ فرح نے ایک اور خدشہ بیان کیا۔

”اس مشکل سے ہم تینوں ہی کو گزارنا ہے۔ تم رانیہ کو کسی نہ کسی طرح بھلا لیتا۔ میں نے کوشش کی ہے کہ وہاں اسے اتنا کچھ میسر ہو کہ وہ مگن ہو جائے اور تمہیں زیادہ پریشان نہ کرے۔ وہاں لیٹڈ لائن فون ہوگا اور میں کوشش کروں گا کہ کبھی کبھار رانیہ سے بات کر لوں۔ ویسے بھی میرے خیال میں اس سارے معاملے کو غٹنے میں زیادہ

تھا۔ اس کے بارے میں وحید کا کہنا تھا کہ پہلے تو اس کا ارادہ تھا کہ وہ مہنگا موبائل بلیک مارکیٹ میں بیچ دے گا لیکن پھر موبائل کی وجہ سے پکڑے جانے کا خدشہ پیدا ہونے پر اسے توڑ کر پھینک دیا۔ جس کم جہاں پاک..... ضوئی کے موبائل کے ساتھ ہی اس کے گناہ شوہر کے لئے کا امکان بھی ختم ہو گیا۔ شوہر کی تلاش اسد کا مسئلہ بھی نہیں تھا، اسے قتل اور ڈاکے کے کیس کو حل کرنا تھا اور وہ اس نے حل کر لیا تھا اس لیے اس کیس کی فائل بند کر کے ان کیسوں کی طرف متوجہ ہو گیا جو حل ہونے کے لیے اس کی توجہ کے منتظر تھے۔

☆☆☆

”تم نے ہر بات اچھی طرح سمجھ لی ہے نا فرح؟“ فرح کو بہت ساری ہدایات دینے کے بعد اس نے اس سے سوال کیا۔

”تمہاری ہر بات مجھے ذہن نشین ہو گئی ہے لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ یہ سب کیا ہے؟“ ابھی ابھی سی فرح کی آنکھوں میں ہلکا سا خوف بھی تھا۔

”میں نے تمہیں بتایا تو ہے کہ یہ وہ ہے جو ہماری رانیہ کی زندگی بچانے کا تم اگر خود کو اور رانیہ کو محفوظ رکھنا چاہتی ہو تو تمہیں میری ہر ہدایت پر حرف بہ حرف عمل کرنا ہو گا۔“ اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر ایک بار پھر فرح کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ اس سے نظر نہیں ملارہا تھا۔

”کیا تم کوئی غلط کام کرنے جارہے ہو فیصل؟ کوئی ایسا کام جو غیر قانونی ہے؟“ فرح جو کھٹکھٹا کھٹکھٹا، ایک دم اس سے پوچھ بیٹھی۔ فیصل کو اسی سوال کا اندیشہ تھا۔ سوال پوچھ لیا گیا تو وہ ہل بھر کے لیے خشکا پھر خود کو سنبھال کر بولا۔

”تم اس وقت خود کو اس المیہ میں مت ڈالو۔ اس وقت ہمارے لیے سب سے اہم یہ ہے کہ ہم رانیہ کی زندگی کس طرح بچا سکتے ہیں۔“ اب وہ فرح کے دونوں ہاتھ تھام چکا تھا اور اس سے نظریں ملائے بغیر کہو گیا اسے قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”پلیز فیصل! ایسا کچھ مت کرو جو ہمارے لیے عمر بھر کا پچھتاوا بن جائے۔ رانیہ میرے لیے ساری دنیا سے زیادہ قیمتی ہے لیکن میں تمہیں خود کبھی زندہ نہیں رہ سکتی۔“ اس کے ہاتھوں میں موجود فرح کے ہاتھ سرد ہو رہے تھے اور آنکھوں سے بے ساختہ ہی آنسو پھلنے لگے تھے۔

سلے میں کچھ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تھی جس کے نتیجے میں اسے معلوم ہوا تھا کہ سجاد علی شاہ کی تقریباً چالیس سالہ بیوہ بچی موجود ہے جس کے باپردہ ہونے کے باوجود اس کی خوب صورتی اور قابلیت کے بڑے چرچے ہیں۔ سجاد علی شاہ کی ایک مضبوط سیاسی ساکھ تھی اور ان کا ووٹ بینک کسی بھی سیاسی پارٹی کے پلڑے کو خاصا بھاری کر دیا کرتا تھا۔

آج کل اس کے ملک احسن سے بڑھتے ہوئے تعلقات کا شور تھا۔ اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اس بار وہ ملک احسن کی حمایت کرنے والا ہے۔ جوانی میں مکلی بیوی کی موت کے بعد مجرد کا طویل عرصہ گزارنے والا ملک احسن اگر سجاد علی شاہ کی بیٹی کے لیے رشتہ بھجاتا تو موجودہ حالات میں اس رشتے کے قبول ہونے کے بہت زیادہ امکانات تھے۔

ملک احسن معاشی اعتبار سے ہمیشہ سے مضبوط تھا اور اس کا خاندانی پس منظر بھی اچھا تھا۔ سیاسی پس منظر نہ ہوتے ہوئے بھی خود کو ایک کامیاب سیاست دان کے طور پر پیش کر کے اس نے اپنی قابلیت اور اہلیت کا سکہ بجالایا تھا۔ خوب صورت شخصیت اور خوش لباسی اس کی اضافی خصوصیات تھیں جن کے باعث وہ پچاس سال سے جمہور ہونے کے باوجود جوان ہی معلوم ہوتا تھا اس لیے سجاد کا اسے اپنی بیوہ بننے کے لیے قبول کر لینا مشکل دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ملک احسن کے بارے میں وہ اندازہ لگا سکتی تھی کہ اسے پیر صاحب کی بیٹی کی خوب صورتی اور قابلیت سے زیادہ پیر صاحب کی سیاسی ساکھ سے دلچسپی تھی۔ اس بار کے الیکشن کے بارے میں تو تقریباً طے ہی تھا کہ اسے پیر سجاد کی حمایت حاصل ہوگی لیکن اس کی بیٹی سے شادی کر کے وہ اگلے الیکشن کے لیے یقین دہانی چاہتا تھا تا کہ بن پندرے کے لوٹنے کی طرح بار بار لڑھک کر پارٹیاں بدل لینے والا سبھا دل علی کی ٹھنی میں رہے۔ اگلے الیکشن میں وہ وزیر اعظم بننے کا خواب دیکھ رہا تھا اور اس خواب کی تعمیر کے لیے اگر اسے روشن جیسی کم حیثیت بیوی کو چھوڑنا پڑتا تو وہ زیادہ سوچ بچار نہیں کرتا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر ملک احسن ایسا کرنے پر آیا تو اس سے محبت کا دعویٰ رکھنے کے باوجود چھوڑ دے گا۔

عقرب مطلقہ ہو جانے کے خدشے نے اسے عدم تحفظ کے احساس میں مبتلا کر دیا تھا۔ بہت سوچنے سمجھنے کے بعد اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ ملک احسن کو اس کا فیصلہ

دن نہیں گلیں گے اور ہم سب پھرے ایک ساتھ ایک جگہ موجود ہوں گے۔ اس نے فرح کو ایک اچھی امید دلائی تو اس نے بھرائی ہوئی آنکھوں سے اثبات میں سر ہلادیا۔
”اکی ایم سوری فرح! مجھے معلوم ہے کہ میرے ماضی کے بارے میں جان کر تمہیں شاک لگا ہوگا لیکن یقین جانو کہ میں خود اپنے ماضی کے اس حصے پر ہمیشہ شرمسار رہا ہوں اور اسے برس گزر جانے کے باوجود میرے اندر بچتا رہا ہے۔“

”اکیس او کے فیصل! میں یہ نہیں کہوں گی کہ مجھے شاک نہیں لگا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر شخص کی زندگی میں کوئی نہ کوئی تاریک گوشہ ہوتا ہے۔ کسی کی زندگی میں وہ گوشہ ذرا کم اور کسی کی زندگی میں زیادہ تاریک ہوتا ہے۔ اصل اہمیت احساسِ ندامت کی ہے۔ جس کا احساسِ ندامت جتنا شدید ہو اس کے لیے معافی کی اتنی ہی گنجائش ہوتی ہے۔“ فرح نے اس کا سارا بوجھ سمیٹ لیا تھا۔ وہ اسے شکر یہ کہہ پاتا اس سے کل ہی رات یہ اپنی گڑبائے وہاں آگئی۔ سنہری بالوں والی گڑبائی کو اس نے زرق برق سرخ لباس پہنا کر دلہن کی طرح سجایا ہوا تھا اور اب اپنی اس کارگزاری کی داد لینا چاہتی تھی۔ فیصل اس کی یہ خواہش پوری کرتے ہوئے اپنے ہی خوابوں کی کچیوں کو دل میں چھپتا ہوا محسوس کرتا رہا۔ وہ بھی تو اپنی گڑبائی کی بیٹی کو ایسے ہی سجایا کر کسی شہزادے کی دلہن بنانے کے خواب دیکھا کرتا تھا لیکن ایک موذی مرض نے اس نعمتی کلی کے وجود میں سیندھ لگا کر اس کے ماں باپ کو ہر خواب سے محروم کر دیا تھا۔ اب وہ دن رات بس اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ کسی طرح اپنی بچی پری کو اس موذی مرض کے جھٹے سے نکال سکیں۔ زندگی بھی بھی انسانی کو بہت زیادہ مشکل میں ڈال دیتی ہے۔ وہ بھی اس مشکل کو سر کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔

☆☆☆

میج ٹون بیچے پر اس نے اپنا موبائل اٹھا کر پیغام پڑھا اور اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا۔ اپنے اکاؤنٹ میں مطلوبہ رقم منتقل ہونے کی اطلاع نے اسے خاصا لڑکھن کر دیا تھا۔ وہ اندیشہ بھی قدرے کم ہو گئے تھے جو احسن کے بی اے کی اطلاع نے اس کے دل میں پیدا کر دیے تھے۔ اچھی ملک احسن نے اس کی اور اپنی شادی کا اعلان نہیں کیا تھا اور وہ یہ سن کر بچ پریشان ہوئی تھی کہ وہ سجاد علی شاہ کی بیٹی میں دلچسپی لے رہا ہے۔ اپنے طور پر اس نے اس

بدلے پر مجبور نہیں کر سکے گی اس لیے بہتر ہے کہ وہ وقت آنے سے پہلے اس سے مناسب مالی فائدہ اٹھالے۔

ملک احسن ہر ماہ اسے اخراجات کے لیے خاصی معقول رقم دیتا تھا جس میں سے وہ کافی کچھ چالیتی تھی اور اسے بھی اس سے مانگنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اس بار اس نے یہ ضرورت محسوس کی تو اس کا مطالبہ روئیں کیا گیا اور فوراً ہی رقم اکاؤنٹ میں پہنچ جانے کی اطلاع مل گئی۔ رقم ہمیشہ کسی آدمی کے ذریعے کیش کی صورت میں جمع کروائی جاتی تھی تاکہ کھوج لگانے والے ملک احسن اور روشن کے مابین کسی تعلق کو نہ بھانپ سکیں۔ روشن نے بھی اس بات کو محسوس بھی نہیں کیا تھا لیکن اب اس صورت حال کو محسوس کر رہی تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ نکاح نامے کے علاوہ اس کے پاس کوئی ایسا خاص دوسرا جوت نہیں ہے جو اس کے اور ملک احسن کے رشتے کو ثابت کر سکے۔ پیغام ملنے کے بعد فوراً بینک جانے کا فیصلہ کر لینے کے باوجود اس نے الماری کھول کر اس میں رکھا نکاح نامہ نکال کر دیکھا اور گویا خود کو مطمئن دلانے کی کوشش کی کہ خفیہ ہی کیا وہ ملک احسن کی قانونی بیوی ہے۔ ابھی وہ نکاح نامے کے کاغذ کو دیکھ کر واپس رکھنے ہی لگی تھی کہ اس کے موبائل کی کھنٹی بجنے لگی۔ اس نے غلت میں کاغذ کو الماری میں رکھا اور موبائل کی طرف دوڑی۔ کال ملک احسن کی تھی جسے پوری توجہ اور لگاؤ سے سنتے ہوئے اسے پتا بھی نہیں چلا کہ غلت میں قدرے بے پروائی سے رکھا گیا یہ شدہ نکاح نامہ کب نیچے کر اور ہوا اسے ذکر الماری کے نیچے چلا گیا۔ فون کال سے فارغ ہو کر اس نے الماری سے لباس منتخب کر کے نکالا اور کھلے پٹ بند کر کے تیزی سے واش روم کی طرف بڑھ گئی۔

آج جیسے کا دن تھا اور بارہ ساڑھے بارہ کے بعد بیٹکوں میں نماز اور لچ کا وقفہ ہو جاتا تھا۔ اس کا اکاؤنٹ جس برانچ میں تھا، وہ بین مارکیٹ میں تھی اور مارکیٹ ویر سے کھلنے کے باعث صبح کے اوقات میں تو وہاں اتنا رش نہیں ہوتا تھا لیکن دوپہر کے بعد کافی گہما گہما رہتی تھی اور کوئی بھی کام کروانے کے لیے خاصی دیر انتظار کرنا پڑتا تھا۔ انتظار کی اس کوفت سے بچنے کے لیے وہ وقفے سے محل بینک پہنچتا چاہتی تھی۔ اپنی پھرتی کے باعث وہ اس مقصد میں کامیاب رہی۔

بینک کے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی اس نے بائیں ہاتھ پر موجود مشین سے ٹوکن نکالا اور ایک نظر

میں جائزہ لیتی ہوئی اس مطمئن کے ساتھ ایک چری صوفے پر ٹپک گئی کہ اس کے علاوہ بینک میں بہت کم لوگ موجود ہیں اور اس کی باری فوراً ہی آجائے گی۔ ابھی اسے اپنی جگہ پر بیٹھے ہوئے بمشکل تیس سیکنڈ ہی گزرے ہوں گے کہ ایک دم لائٹ چلی گئی اور ایک ساتھ ہی حیرت زدہ آوازی سنائی دیں۔ لائٹ کا جانا غیر معمولی بات نہیں تھی۔ ملک کے بیشتر حصوں کی طرح اس علاقے میں بھی باقاعدگی سے لوڈ شیڈنگ ہوتی تھی لیکن بینک میں موجود افراد کو یہی اسٹینڈ بائی جزیئر کی وجہ سے بجلی کے آنے جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا اور ہر کام بغیر کسی معمولی تھقل کے جاری و ساری رہتا تھا۔

اس وقت بجلی گئی اور جزیئر فوراً نہیں چلا تو فوراً پکاریں پڑنے لگیں۔ دن کا وقت ہونے کی وجہ سے کمپ انڈر وائٹ نہیں ہوا تھا لیکن عموماً بیٹکوں کی طرح اس بینک کا طرز تعمیر ایسا تھا کہ باہر کی روشنی زیادہ اندر نہیں آتی تھی۔ جزیئر میں کسی فلٹ کے امکانات کے بارے میں سوچتی ہوئی روشن نے ملگبی روشنی میں چار پانچ افراد کو اندر آتے ہوئے دیکھا۔ ان میں سے تین افراد روشن کے مقابل بیٹھ گئے جبکہ دو معلوماتی کاؤنٹر کی طرف بڑھ گئے۔ روشن نے سنا کہ ان میں سے ایک شخص کافی بڑی رقم کے بارے میں دریافت کر رہا ہے کہ وہ اسے فوری طور پر کیش کی صورت میں اپنے اکاؤنٹ سے نکال سکتا ہے یا نہیں۔ کاؤنٹر کے پیچھے موجود لڑکی نے اکاؤنٹ سن کر اطلاع دی کہ اس سلسلے میں پہلے منبر سے اجازت لینی ہوگی۔ اس آدمی نے منبر کے کمرے کے بارے میں دریافت کیا تو لڑکی نے ہاتھ سے ایک دروازے کی طرف اشارہ کر دیا۔ بجلی نہ ہونے کے باعث وہ اکثر کام پر اجازت لینے سے قاصر تھی۔ اس کے اشارہ کرتے ہی وہ دونوں افراد منبر کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ جس وقت ان میں سے ایک نے دروازے پر دستک دی، جزیئر نے کام شروع کر دیا اور بجلی بحال ہوئی۔ دوسرے لوگوں کی طرح روشن نے بھی سکون کا سانس لیا۔ باہر سے ہوا کی آمکا انتظام نہ ہونے کے باعث چند منٹوں میں ہی دم گھٹنے جیسی کیفیت محسوس ہونے لگی تھی۔ جزیئر چلا اور انٹرکنٹینٹلرز نے کام شروع کیا تو سب کے حواس بحال ہونے لگے۔ آس پاس کا منظر بھی واضح ہو گیا اور کام کا کارواں سلسلہ بھی پھر سے جاری ہو گیا۔ روشن نے یونہی نظر اٹھا کر اپنے سامنے براجمان افراد کو دیکھا تو اپنے اندر کچھ بے چینی محسوس کی۔ وہ تینوں اس کے

مل کرنے آئے تھے۔ وہ کس مل ہو چکا تھا اس لیے سیاہ پوش کو اپنی مطلوبہ شے کے حصول میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی تھی۔

پولی صین بگ میں بیک وہ خاصا درنی پیکٹ نکالنے کے بعد اس نے پیکٹ چمت پر رکھا اور نسل خارج دانوں میں دبائے اسے کھولنے لگا۔ پیکٹ کھول کر اس نے اس میں موجود ایک لفافہ الگ کیا اور پیکٹ کو دوبارہ بند کر کے اس میں سے برآمد کیے گئے لفافے کو اس پر رکھنے کے بعد جیب سے ایک بال بوائیٹ نکال کر لفافے پر "فار انکسپر اسد" کے الفاظ تحریر کیے۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ نیچے جانے والی میز جیوں کی طرف بڑھا۔ حسب توقع میز جیوں کا دروازہ مقل تھا لیکن یہ اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ عام سا نقل اس نے ایک منٹ سے بھی کم وقت میں کھول لیا تھا اور اب وہ بے قدموں نیچے جا رہا تھا۔ وہ یہ لفافہ کسی نمایاں جگہ پر رکھنا چاہتا تھا تا کہ جب ہنگے کا مالک، اسٹیٹ ایجنٹ یا اس کے نمائندے میں سے کوئی وہاں آئے تو اسے یہ لفافہ مل جائے اور وہ اسے انسپٹر اسد تک پہنچا دے۔ لفافہ انسپٹر اسد تک پہنچ جاتا تو وہ ایک بار پھر مل شدہ کیس کی فائل کھولنے پر مجبور ہو جاتا۔ سیاہ پوش کے پاس منتولہ کے احسان کا بدلہ چکانے کا بھی ایک راستہ تھا۔

اپنے طے شدہ پروگرام پر عمل کرنے کے لیے میز جیاں اترتے ہوئے اسے ایک بات کا قطعی علم نہیں تھا۔ وہ ہنگے کو خالی سمجھ رہا تھا لیکن وہاں دونوں موجود تھے۔ ایک بوڑھی زرینہ بی بی اور دوسری آٹھ سالہ رشا۔ وہ دونوں خوشحال کی موت کی اطلاع کے ساتھ گاؤں سے بلوائی گئی تھیں۔ یہاں رہائش کے مسئلے سے دو چار تھیں اس لیے انسپٹر اسد نے انہیں اسی ہنگے میں رہنے کی اجازت دلوا دی تھی۔ ان دونوں کی لا چار دی دیکھتے ہوئے اس نے انہیں بار بار چکر لگوانے کی زحمت دینا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ چاہتا تھا کہ ضروری کارروائی سے جلد از جلد فارغ کر کے ایک ساتھ ہی واپسی کی اجازت دے۔ انسپٹر اسد کی مہربانی سے تاؤ اتف سیاہ پوش نے جیسے ہی آخری قدم طے کیا، اس کی نظر ادرین بگن سے لٹکی پٹی پر پڑی۔ بگن شاید پانی پینے وہاں آئی تھی اور اندر خواب گاہ سے آئی امبر جیسی لائٹ کی بے حد معمولی روشنی میں سیاہ پوش کو اس کا صرف ہیوا سا سی نظر آ رہا تھا۔ وہ خود کو چھپاتا اس سے قبل ہی بگن نے اس کی موجودگی کو محسوس کر لیا۔ پہلے وہ کھلی پھر اس نے چپخنے کے لیے منہ کھولا لیکن سیاہ پوش پھر تپتا ثابت ہوا اور اس نے

لیے اجنبی تھے لیکن ان میں سے دو کے بارے میں وہ اپنے تجربے کی بنیاد پر ایک دھڑکی کر سکتی تھی۔

☆☆☆

رات بہت گہری ہو چکی تھی۔ موسم کی خشکی کے باعث لوگ رات پڑتے ہی اپنے کمروں تک محدود ہونا شروع ہو جاتے تھے اس لیے سڑکوں پر جلد سناٹا چھٹا شروع ہو جاتا تھا۔ ایسے میں رات کے اس پہر بالکل ٹوکا عالم تھا۔ رات بھر بھونک بھونک کر اپنی عملداری کا احساس دلانے والے آوارہ گئے کسی کو نہ کھدروں میں دیکھے ہوئے تھے۔

اس خاموشی میں اس دن یونٹ ہنگے کی طرف بڑھتا ہوا سرتا سیاہ پوش شخص حیثیت تاریکی کا ایک حصہ بنا ہوا تھا۔ آدھی رات کے بعد تک جاری رہنے والے لوڈ شیڈنگ کے سلسلے نے بھی اس کی خاصی مدد کی تھی۔ اس وقت اسٹریٹ لائٹس بند تھیں اور کمروں میں چلے جڑیڑ کی باہر تک آتی آوازیں اس کے قدموں کی چاپ کو ظاہر نہیں ہونے دے رہی تھیں۔ علاقے کا نام نہاد چور کیدار حسب معمول جاگتے رہو کی آواز لگا کر اہل علاقہ کو اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے بعد جس کا سونا لگے ایک ہنگے کی آڑ میں بیٹھا تھا۔ عالم سڑوں میں جانے کن جہانوں کی سیر کرتے ہوئے اسے پتا بھی نہیں چلا کہ سیاہ پوش کب، بے پناہ مہارت کا مظاہرہ کرتا ہوا اس دن یونٹ ہنگے کی چمت پر جا پہنچا ہے۔

چمت پر پہنچنے کے بعد اس نے اور ریڈ ٹیک تک بھی نہایت چابکدستی سے رسائی حاصل کر لی اور اس کا ڈھکنا ہٹا کر اپنی جیب سے ایک چنل نارنج نکالی اور ایک مخصوص گوشے میں روشنی ڈالی۔ روشنی ڈالتے ہی اسے وہ شے نظر آگئی جس کی تلاش میں وہ یہاں آیا تھا۔ اسے کافی حد تک یقین تھا کہ وہ اس شے کو وہیں پائے گا لیکن پچھلے دنوں میں پولیس کی ہنگے میں آمد رفت کے باعث ایک معمولی سا نڈیہ ضرور دل میں پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں پولیس والوں کی اس شے تک رسائی نہ ہو جائے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ ہونا بھی نہیں چاہیے تھا۔ پولیس والوں کو قطعی علم نہیں تھا کہ یہاں ایسا کچھ چھپا ہوا ہے جس کی اہمیت و قدر وصولی کے ہنگے سے لوٹے جانے والے زیورات و نقدی کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ انہوں نے اپنے طور پر بہت ذمے داری سے کارروائی نمٹائی تھی لیکن ظاہر ہے ان کا دھیان اور ہیڈ ٹیک کی طرف نہیں جاسکتا تھا۔ وہ وہاں کچھ تلاش کرنے نہیں بلکہ مل اور ڈاکے کی واردات کا کیس

کھولنے پر مجبور کیا۔ کھلے پیکٹ میں سے اس نے کچھ نکال کر بچی کے حوالے کیا اور تاکید کرنے والے انداز میں بولا۔

”اسے بہت سنبھال کر اپنے پاس رکھ لو۔ یہ صرف اپنی نانی کو دینا اور ان سے کہنا کہ کسی پڑھے لکھے اور بھروسے کے لائق بندے سے اس کے بارے میں مشورہ کریں۔“ وہ بچی کو جتنے سادہ الفاظ میں سمجھا سکا تھا سمجھایا اور اودھائی انداز میں ہاتھ ہلا کر باہر نکل گیا۔ اس کے پاس وقت محدود تھا اور اجالا پھیلنے سے پہلے اسے محفوظ ٹھکانے پر پہنچنا تھا۔

☆☆☆

روشن ابھی اُبھرنے میں ہی تھی کہ اس کا ٹوکن نمبر اناؤنس ہونے لگا۔ وہ سوئے سے اٹھ کر کیش کاؤنٹر کی طرف بڑھی۔ ابھی اس نے اپنا چیک کاؤنٹر پر رکھا ہی تھا کہ وہاں ہچکل مچی گئی اور اپنی ریڑھ کی ہڈی میں ہوتی سنناٹاٹ کو محسوس کرتے ہوئے اسے ادراک ہوا کہ ان پانچ افراد کی بینک میں آمد کے ساتھ ہی اس کی چھٹی حس نے اسے کس بات کا اشارہ دیا تھا۔ بینک میں ڈاکا پڑ چکا تھا اور وہ دو افراد جنہیں دیکھ کر کھکی تھی، خوفناک گھبراہٹ سے ہوتے بینک کے عملے اور سگزر کو احکامات دے رہے تھے۔ ان کے ساتھ موجود تیسرا فرد اپنی جگہ بیٹھا ہوا تھا اور دیگر افراد کی طرح ہی خوف زدہ نظر آ رہا تھا یعنی وہ ان کا ساتھی نہیں بلکہ ایک عام شخص تھا۔

ڈاکوؤں کی ہدایت پر دیگر افراد کی طرح شامی دیوار کے ساتھ کھڑے ہونے کے لیے جاتے ہوئے اس نے دیکھا کہ بغیر کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ کچھ دیر قبل منیجر کے کمرے میں جانے والے افراد میں سے ایک فرد دروازے پر ہتھیار بدست اس طرح چوکتا کھڑا تھا کہ بیک وقت کمرے کے اندر اور باہر نظر رکھ سکے۔ اندر جاتے ہوئے روشنی کی کمی کی وجہ سے روشن انہیں ٹھیک طور پر نہیں دیکھ سکی تھی لیکن اب اسے دروازے پر کھڑا شخص واضح نظر آ رہا تھا۔ اس کے بارے میں بھی اس نے فوراً ہی دو بات محسوس کر لی جو پہلے دو افراد کے بارے میں محسوس کی تھی۔ جو تھا شخص ہنوز اس کے سامنے نہیں آیا تھا لیکن اسے یقین ہو چلا تھا کہ اس میں بھی اپنے ساتھیوں جیسی مشترک قدر موجود ہوگی۔ اس قدر مشترک کے بارے میں سوچتے ہوئے یک دم ہی اس کے ذہن میں ایک نام گونجا۔ اس نام پر غور کرتے ہوئے وہ پرمٹین ہو گئی کہ اس کے ذہن میں بالکل

لیک کر بچی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ بچی خوف سے لرزنے لگی۔

”سوری مائی ڈول! میں تمہیں تکلیف نہیں پہنچانا چاہتا لیکن پہلے تم وعدہ کرو کہ چٹو کی نہیں۔“ اس نے حتی الامکان نرم اور دھمکے لہجے میں بچی کو سمجھایا۔ بچی اس کی بات سمجھ گئی اور ہر سکون ہوتے ہوئے اپنا سراسر اثبات میں بلا یا۔ سیاہ پوش نے عطا شدہ انداز میں اس کے منہ پر سے ہاتھ ہٹا لیا اور دھیمی آواز میں پوچھنے لگا۔

”تمہارے ساتھ یہاں اور کون کون ہے؟“

”صرف میری نانی! وہ سوری ہیں۔“ بچی نے خواب گاہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سہمے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

”تم کون ہو؟“ اس نے پہلے کیا جانے والا سوال بعد میں پوچھا۔

”رمشا۔“ بچی نے جواب دیا تو وہ مل بھر کے لیے خاموش ہو گیا۔ بچی اس کے لیے بالکل ہی غیر شاہانہ نہیں مگی لیکن نہ ہونے کے برابر روشنی میں وہ اسے ڈھنگ سے دیکھ ہی کہاں پار تھا کہ شناخت کر پاتا۔

”آپ کون ہیں اگل؟“ اس کی لحاظی خاموشی میں بچی نے سوال کرنے کی جرأت کی۔

”میں دوست ہوں اور آپ کو ایک چیز دینے آیا تھا۔ لیکن پہلے آپ یہ بتاؤ کہ آپ یہاں کیسے آئیں اور آپ کو یہاں کس نے بھرا دیا ہے؟“ اس نے بچی سے سوال کیا تو اس نے مختصر آساری بات بتادی۔

”اوکے! آپ یہ لفاظ اپنے پاس رکھو اور جب انسپٹر اسد سے ملاقات ہو تو انہیں یہ دے دینا لیکن انہیں یہ مت بتانا کہ یہ میں نے آپ کو دیا ہے۔ ان سے یہی کہنا کہ یہ آپ کو یہاں ایک الماری سے ملا ہے۔“ لفاظ بچی کو ہتھاکر اسے ہدایت کرنے کے ساتھ ساتھ وہ خواب گاہ کے دروازے پر بھی نظر رکھے ہوئے تھا کہ اگر اس کی نانی جاگ کر باہر آ جائے تو وہ یہ خبر نہ رہے۔

”ٹھیک ہے اگل۔“ بچی نے تاجدار کی کا مظاہرہ کیا تو اس نے نرمی سے اس کے رخسار کو چھوچھوایا اور بولا۔

”گڈ گرل۔ اب تم جا کر سو جاؤ میں بھی جا رہا ہوں۔“ باہر جانے کے لیے قدم اٹھانے سے قبل اس نے مگن کاؤنٹر پر رکھ دیا جانے والا پیکٹ اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا تو ذرا سا ہٹک گیا اور ایک سوچ اس کے ذہن میں ابھری۔ اس سوچ نے اسے پیکٹ کو ایک بار پھر



اتفاقاً

کلاس لٹچر بچوں کو سمجھائی تھی کہ کن باتوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اتفاقاً ہو سکتیں مگر انہوں نے ایک بچے کو ہدایت کی کہ وہ اس کی کوئی مثال بیان کرے۔
بچہ سوچ کر بولا۔ ”میرے ابو اور اسی کی شادی اتفاقاً ایک ہی دن ہوئی تھی۔“

عبدالبارودی انصاری کا تعاون پورے والے سے

بچہ کہہ رہا تھا کہ ”میرے ابو اور اسی کی شادی اتفاقاً ایک ہی دن ہوئی تھی۔“ اس نے ہسائے سے چار پائی مانگی۔
ہسائے نے جواب دیا۔

”چو! میں چار پائی ضرور دے دیتا لیکن میرے گھر میں صرف دو چار پائیاں ہیں۔ ایک پر میں اور اباسوئے ہیں دوسری پر اماں اور میری بیوی سوئی ہیں۔“

بچہ مایوسی سے واپس جانے کے لیے مڑا دروازے پر پہنچ کر پلٹا اور ہسائے سے بولا۔
”چار پائی بے حکم نہ دو کیونکہ اپنے سونے کی ترتیب تو ٹھیک کرلو۔“

☆☆☆

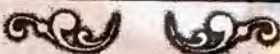
کون کہا ہے کہ مرد بدل جاتے ہیں؟ مرد بھی نہیں بدلتے۔

انہیں شادی سے پہلے بھی شادی کا شوق ہوتا ہے اور شادی کے بعد بھی شادی کا شوق رہتا ہے۔

☆☆☆

بیوی: میں سیدھی بیوی پارے سے آ رہی ہوں۔ پورے تین گھنٹے بیٹھا پڑا۔
شوہر حیرت سے: مگر بھی تمہاری باری نہیں آئی۔

خانیوال سے قدرت اللہ نیازی کے چٹکلے



درست نام آیا ہے۔ ابھی وہ اس نام کا ان ڈاکوؤں سے تعلق تلاش کر رہی تھی کہ ڈاکوؤں کی کارروائی مکمل ہو گئی۔ اس نے کیش کاؤنٹر پر سے مال سمیٹ کر باہر کی طرف دوڑتے ڈاکو کے علاوہ منبر کے کمرے سے برآمد ہونے والے چوتھے ڈاکو کے دونوں ہاتھوں میں بھی ایک ایک بیگ دیکھا۔ اس نے ایک بیگ اپنے ساتھی کی طرف اچھال دیا اور دوسرا خود منجھال کر باہر کی طرف دوڑا۔ ابھی وہ چاروں بینک کے دروازے سے باہر نکلے ہی تھے کہ فائرنگ کا خوفناک سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک ڈیڑھ منٹ بعد ہی یہ سلسلہ رک بھی گیا لیکن روشن سمیت کسی بھی فرد میں اپنی جگہ سے ہلنے کی ہمت نہیں تھی۔

”میں نے پولیس کو کال کر دی ہے۔ آئی ایم سوری لیکن آپ میں سے کوئی بھی شخص پولیس کی آمد سے پہلے یہاں سے نہیں جاسکے گا۔“ منبر نے اپنے کمرے سے باہر آ کر یہ اعلان کیا تو خوف سے جاہد ہو جانے والا ماحول آہستہ آہستہ جاتے لگا۔ کوئی ڈاکو کے پر تبصرہ کر رہا تھا تو کوئی بینک کی سکیورٹی نظام کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے اس بات پر برہمی کا اظہار کر رہا تھا کہ اب تفتیش کے نام پر تین وقت برباد کیا جائے گا۔ تموز اس وقت گزرنے کے بعد دو گھنٹوں کے ساتھ ساتھ روشن کو بھی معلوم ہو گیا کہ ڈاکوؤں کے پرغال بن جانے والے سکیورٹی کے عملے کے علاوہ ایک سکیورٹی گارڈ باہر اسے ٹی ایم پر بھی ڈیوٹی دے رہا تھا۔ اس گارڈ نے چار افراد کو بیکوں سمیت بینک کے دروازے سے باہر نکلنے دیکھ کر صورت حال کو بھانپ لیا تھا اور ڈاکوؤں کو روکنے کی اپنی کوشش کرنے کے بعد شدید زخمی حالت میں اسپتال پہنچا دیا گیا تھا۔ پولیس وہاں پہنچی اور تفتیش کا آغاز کیا تو روشن نے اپنے ڈاکوؤں کے ہاتھوں سے اپنے ثبوت دیتے ہوئے انہیں ڈاکوؤں کے بارے میں اپنے مشاہدے سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ وہ نام بھی لے دیا جو مسلسل اس کے ذہن کے دروازے پر دھک دے رہا تھا۔ سلطان علی کا نام لیتے ہوئے وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ شخص ڈاکے کی اس واردات سے دو گھنٹے قبل ہی متوکل ہو چکا ہے۔

☆☆☆

ایکسپرس اس نے زریں بی بی کا دیا ہوا لافظ کھولا اور اس میں سے برآمد ہونے والے کافزات کو پڑھنے لگا۔ وہ کل دو صفحات تھے جن پر لکھے محض چند الفاظ ہی پڑھنے کی ضرورت تھی۔ اس نے ایک نظر میں ان چند الفاظ کو پڑھا

لگا۔ ثانی کا اشارہ پا کر وہ ہر سوال کا جواب دیتی چلی گئی لیکن سیاہ پوش کے چلنے کے بارے میں وہ کوئی واضح بات اس لیے نہیں بتا سکی کہ کبھی نہ ہونے کی وجہ سے اسے ڈھنگ سے کچھ دکھائی ہی نہیں دیا تھا۔ انسپٹر اسد اس کے جوابات سے سیاہ پوش کے صرف قہ کاٹھ کے بارے میں ہی اندازہ لگا سکا۔ پھر اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے نوں پر ایک پھرٹا کھجواں کا حکم دیا اور زرینہ بی بی سے بولا۔

”میں معافی چاہتا ہوں اماں جی لیکن یہ بہت نازک معاملہ ہے۔ مجھے تفتیش کے لیے سب کچھ اپنی کھڑی میں لینا ہوگا۔“ اس نے میز پر پڑی ہوئی شے اٹھا کر اپنے قبضے میں لے لی۔

”لیکن تو میرے دوست نے مجھے اور ثانی کو دیا تھا۔“ رمشانے برآمان کر احتجاج کیا۔

”یہ میرے پاس تمہاری امانت ہے۔ کیس حل ہونے کے بعد واپس لے لیتا۔“ انسپٹر اسد نے اسے عیار سے بھجایا تو وہ خاموش ہو گئی لیکن تاثرات سے ناپسندیدگی بہر حال ظاہر ہو رہی تھی۔

”ایسا کرو کہ تم مجھے بھی اپنا دوست بنا لو پھر تمہیں میری بات ماننے میں آسانی رہے گی۔“ انسپٹر اسد نے اس کی شکلی کو دیکھ کر اس کی طرف دوستی کے لیے ہاتھ بڑھایا جسے رمشانے فوری طور پر نہیں تھا۔

”ہاتھ ملالے دیجئے۔ یہ بھی تیرے دوست ہیں۔ دیکھ ان کی وجہ سے ہم کو رہنے کی جگہ مل گئی ہے ورنہ ادھر شہر میں کون تھا جو ہمیں اپنے پاس ٹھہراتا۔“ زرینہ بی بی نے اسے دوستی کے لیے اکسایا تو اس نے گویا مجبوراً اسد سے ہاتھ ملا لیا۔

اپنے عملے کے انتظار میں اسد اس سے چھوٹی چھوٹی بے معنی باتیں کرتا رہا پھر حجت کا جائزہ لینے چلا گیا۔ رمشا کی اطلاع کے مطابق وہ شخص اوپر سے نیچے آیا تھا۔ اوپر پہنچ کر اس نے گہری نظروں سے ہر شے کا جائزہ لیا اور پھر چند نشانیوں نے اسے آگاہ کر دیا کہ اوپر ہیہ ٹینک کا ڈھکنا کھول کر اس میں سے شاید کچھ نکالا گیا ہے شاید وہی جس کا ایک حصہ ابھی رمشانے اس کے سامنے رکھا تھا۔ اس کا دل چاہا اپنا سر پیٹ لے۔ اسی وقت اس کا مطلوبہ عملہ آگیا۔ اس کی ہدایت کے مطابق مختلف جگہوں سے فنگر پرنس اٹھائے جانے لگے۔ ٹینکی کا ڈھکنا، دروازے کا قفل اور اسے موصول ہونے والا لفاظ..... سب اس فہرست میں شامل تھے لیکن ناکامی اس کا مقدر تھی کہ وہ شخص بہت

اور اس کی ایک بہت بڑی الجھن دور ہوئی لیکن اس الجھن کے دور ہوتے ہی فوراً دوسری الجھن پیدا ہو گئی۔ اسے یہ لفاظ بھیجنے والے کا کیا مقصد تھا؟ مقصد اسٹینڈل کھڑا کرنا ہوتا تو پولیس والے سے بہتر انتخاب معافی ہوتا۔ اسے لفاظ بھجوائے جانے کا واضح مطلب تھا کہ وہ شخص تفتیش چاہتا ہے۔ کس بات کی؟ یہ ایک اور اہم سوال تھا۔ اس سوال کا جواب ڈھونڈتے ہوئے وہ لفاظیہ پر لکھے۔ ”فار انسپٹر اسد“ کے الفاظ کو بھی غور سے دیکھتا جا رہا تھا کہ زرینہ بی بی کی آواز نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

”اس نے آپ کو کیا کوئی کچھ بتانے سے منع کیا تھا صاحب اور خود کو دوست کہا تھا لیکن مجھے آپ پر بھروسہ ہے اس لیے میں آپ کو سب کچھ سچ سچ بتا رہی ہوں۔ اللہ جانے وہ کون تھا جو رات کی تاریکی میں بند گھر کے اندر گھس آیا تھا اور مجھے جگائے بغیر بیٹھی سے ہی سب کچھ کہہ گیا تھا۔“ اس نے رمشا کو لفاظ دینے کے علاوہ بھی کچھ اور کہا تھا کیا؟“ انسپٹر اسد نے ایک بار پھر لفاظیہ پر لکھے الفاظ کو پڑھتے ہوئے زرینہ بی بی سے سوال کیا۔ اس سوال کے جواب میں وہ ذرا سی الجھی دکھائی دی لیکن پھر فوراً ہی فیصلے پر پہنچ گئی اور بلند آواز میں رمشا کو پکارا۔

”رمشا دیکھ! اوپر بیڈ لاکر انسپٹر صاحب کو دکھا جو رات تجھے وہ شخص دے کر گیا تھا۔“ اس کی پکار پر ذرا سے توقف کے بعد رمشا خواب گاہ کے دروازے سے اس طرح برآمد ہوئی ہوئی نظر آئی کہ اس کے چہرے پر واضح خفگی تھی۔ وہ خوب صورت نقوش والی بے حد بیاداری کی تھی جس کے چہرے پر یہ خفگی بڑی جلی معلوم ہو رہی تھی۔ زرینہ بی بی نے اس کی شکلی کو محسوس کیا اور پچکار کر اسے اپنے قریب بلا لیا۔

”پولیس ہماری مدد کرنے کے لیے ہوتی ہے دیجئے۔ پولیس والوں سے کچھ نہیں چھپاتے۔ تیرے دوست نے تجھ سے کہا تھا کہ ثانی سے بولنا اپنے بھروسے کے آدمی سے بات کریں تو یہ افسر صاحب بڑے بھروسے والے ہیں۔ تو انہیں دکھا دے کہ تیرے دوست نے تجھے کیا دیا ہے۔“ رمشا کو اپنے برابر میں بٹھا کر اس کی پشت سہلاتے ہوئے زرینہ بی بی نے اسے سمجھایا تو اس کے چہرے کے تاثرات تو تہ بد لے لیکن اس نے نیلی پلائٹ کی سیٹی میں احتیاط سے لپٹی ہوئی ایک شے نکال کر انسپٹر اسد کے سامنے رکھ دی۔ انسپٹر اسد نے اس شے کو دیکھا اور رمشا سے اپنے مخصوص انداز میں کریڈ کریڈ کر سوالات کرنے

منزل پر تھا، اس کی اوپری منازل پر بہت سے دفاتر قائم تھے اس لیے پارکنگ میں اچھی خاصی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ وہ جس گاڑی کے نیچے چھا تھا اسے چھوڑ کر اس کے قریب ترین کھڑی ایک دوسری گاڑی منتخب کی اور پوری مہارت سے اپنا کام کرنے لگا۔ کام کرتے ہوئے اس کے ذہنی ہوجانے والے بازو میں ہلکی ہلکی میسین اٹھ رہی تھیں لیکن اچھی بات یہ تھی کہ خون نہیں بہہ رہا تھا۔ اور گرد بھرتی آوازوں پر کان لگے ہونے کے باوجود اس نے ”کلک“ کی مخصوص آواز سن لی جو تالا کھلنے کی آواز تھی۔ تالا کھلتے ہی اس نے ڈکی کا دھکنا توڑا سا اوپر اٹھایا اور پہلے اس میں بیگ اور گھن کو ڈالا پھر خود بھی کسی سائب کی طرح اندر بیگ گیا۔ ڈکی کے اندر کی محدود جگہ میں خود کو ایڈجسٹ کرنے میں تکلیف تو پیش آئی لیکن وہ اس تکلیف سے گزر گیا اور دھکے کو اس حد تک اٹھایا کہ اس میں معمولی سی جھری بن جائے۔ اس جھری سے آسجین کے حصول کے علاوہ باہر کے منظر پر نظر رکھنے میں بھی مدد مل رہی تھی۔

ایمبولینس اور پولیس کی گاڑی کے سائرن، بعد از حادثہ حالات کو جاننے کے لیے اُٹھ آنے والا ہجوم اور ذرا فاصلے سے گزرتے ٹریفک کی آوازیں اس کے لیے منظر کو مکمل کر رہی تھیں۔ وہ تھوڑا سا گھبراہٹ میں رہا تھا کہ کہیں کسی کے دل میں پارک کی گئی گاڑیوں کی تلاشی لینے کا خیال نہ آجائے۔ اس خیال کے ساتھ ہی اسے اس بات پر سمجھتا ہوا ہورہا تھا کہ وہ ڈکی کے بجائے گاڑی کا اگلا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر کیوں نہیں پہنچا۔ بغیر چابی کے گاڑی اسٹارٹ کر لینے کے فن میں بھی وہ ماہر تھا لیکن شاید ذہن لو جوانی کے دنوں کی طرح اتنا چابکدست نہیں رہا تھا کہ فوری طور پر درست فیصلہ کر لے۔ اصل میں اب وہ تھریل اور ایڈونچر کے نام پر بہت کچھ کر گزرنے والے لالہ بالی نوجوان کے بجائے ایک ڈرا سہا شوہر اور باپ تھا جو اپنی بیوی اور بیٹی کو کسی بدنامی کا حصہ اور بنانے سے ڈرتا تھا۔ یہ ڈر ہی تھا جو اسے جس اور بازو کی تکلیف سے بے نیاز کیے بس ایک دعوے کا گھنٹے پر مجبور کر رہا تھا کہ کسی طرح وہ یہ خیر و عافیت اس جگہ سے نکل جائے۔ نکلنے کی ایک ہی صورت تھی کہ گاڑی کا مالک آئے اور گاڑی کو نکال لے جائے۔ اب آس پاس اسنے لوگ جمع ہو گئے تھے کہ خود سے وہ اب نکل بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ کسی کی بھی نظر پر چڑھتا اور سارا مکمل ختم ہو جاتا۔ مکمل جاری رکھنے کے لیے اسے انتظار کے کرب سے لازماً گزرنہ تھا سو گزرتا رہا۔ ساتھ ساتھ ارگرد

ہو شیار تھا۔ ایک لمحے کے لیے بھی اس نے اپنے ہاتھوں سے دستانے نہیں اتارے تھے۔ اس کی ہوشیاری کے باوجود انپکٹر اس کے بارے میں چند اندازے قائم کر چکا تھا اور اب صرف اسے تلاش کرنے کا مسئلہ درپیش تھا۔

☆☆☆

”بابا آپ جلدی ہمارے پاس آ جانا۔ آپ کو معلوم ہے تاکہ مجھے آپ کے بغیر نیند نہیں آتی۔ میں آپ کو بہت مس کروں گی بابا!“ اس نے اپنے بازو میں دیکھتے اٹکارے کی تکلیف کو تو دانت پر دانت جھاکر برداشت کر لیا لیکن مین اسی وقت ذہن پر یلغار کر دینے والی یاد نے اس کے ہونٹوں سے سسکی نکال دی۔ اس کی تنہی پری کو اس کی ضرورت تھی۔ وہ جو کچھ کر رہا تھا، اسی کی خاطر کر رہا تھا۔ اسی کے لیے اسے زندہ اور آزاد رہنا تھا۔ وہ نہ رہتا تو اس کی تنہی پری کا کیا ہوتا۔ وہ معصوم جوانی سی عمر میں بہت بڑی تکلیف میں مبتلا ہو گئی تھی اور ہر بار دورہ پڑنے پر اس کی طرف آس بھری نظروں سے دیکھتی تھی کہ جیسے وہ اب تک اسے زندگی کی ہر راحت فراہم کرتا رہا ہے ویسے ہی اس اذیت کو بھی راحت میں بدل دے گا۔ وہ اپنی بیٹی کی آس کو قائم رکھنا چاہتا تھا۔ اسے لگتا تھا بیٹی کی سانس کے ساتھ اس کی سانس کی ڈور بھی بندھی ہے۔ اگر اسے کچھ ہوا تو وہ جی نہیں سکے گا۔ وہ اس کے لیے جینا چاہتا تھا سو ایک گولی۔ لگ جانے پر بھی بہت تہ باری اور لڑھکتا ہوا دائیں جانب پارک کی گئی گاڑیوں تک پہنچ گیا۔ ذہنی بازو کی وجہ سے یہ عمل بہت تکلیف دہ ثابت ہوا تھا لیکن جب جان پر ہتی ہو تو ایسی تکلیفیں سہنا زیادہ مشکل نہیں رہتا۔ وہ بھی اپنی تکلیف پر دھیان دینے بغیر ایک گاڑی کے نیچے چت پڑا تھا۔ اسے اور اس کے ساتھیوں کو جس گاڑی میں فرار ہونا تھا وہ بائیں جانب پارک کی گئی تھی لیکن وہ جان بچانے کی اضطراری کوشش میں دائیں طرف لڑھک گیا تھا اور اب ایک گاڑی کے نیچے پڑا تھا۔ تکلیف کی معیہد ہوئی آوازیں سن کر اندازہ لگا رہا تھا کہ اس کے ساتھی وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ وہ بھی زیادہ دیر اس جگہ پر نہیں چھپا رہ سکتا تھا اور اسے کسی نہ کسی طرح یہاں سے نکلنے کی تدبیر کرنی تھی۔ تدبیر ذہن میں آئی تو اس کا ہاتھ خود بخود اپنی جیب میں ریگ گیا اور جب برآمد ہوا تو اس میں ایک مڑا تڑا تار موجود تھا۔ تار کو اٹھایں میں پا کر اس نے اپنے اندر ایک نئی توانائی دوڑتی محسوس کی اور آہستہ سے کھٹک کر گاڑی کے نیچے سے نکلا۔ بینک جس عمارت کی زیریں

سے باخبر رہنے کی کوشش اور بیوی اور بیٹی کے بارے میں سوچنے کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

اس نے بیوی اور بیٹی کو ایسی جگہ پہنچایا تھا جس کی طرف ”پاس“ تو کیا فرح کے اپنے گھروالوں کا دھیان بھی نہیں جاسکتا تھا۔ اس جگہ کا انتخاب اس نے اپنے ایک ایسے واقف کار کے ذریعے کیا تھا جو نہ ان کا رشتے دار تھا اور نہ ہی دفتر کا کوئی کولیک۔ اس لیے اس بات کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا کہ کوئی اس کے ذریعے فرح اور رانیہ تک پہنچ پاتا۔ دیے بھی یہ سارا انتظام صرف چند دنوں کے لیے تھا۔

یہ معاملہ غٹ جاتا تو وہ ان دونوں کو لے کر ملک سے باہر چلا جاتا جہاں رانیہ کا بہترین علاج ہو سکتا تھا۔ اچھی بات یہ تھی کہ ان دنوں رانیہ جس ڈاکٹر کی دوا میں کھار رہی تھی، اس سے اسے بہت آرام تھا اور دورے کی کیفیت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ ڈاکٹر نے امید دلائی تھی کہ آپریشن کا انتظام ہو جانے تک کا عرصہ ان دواؤں کے سہارے آرام سے گزر جائے گا اور رانیہ کو دورہ نہیں پڑے گا۔ اس امید کے سہارے ہی اس نے فرح اور رانیہ کو ایک ایسے علاقے میں چھوڑ دیا تھا جہاں کوئی بڑا اسپتال موجود نہیں تھا۔ امیر چنی کے لیے الیہ فرح کے پاس رانیہ کے ڈاکٹر کا نمبر موجود تھا اور کوئی گڑبڑ محسوس ہونے کی صورت میں فرح فون پر ڈاکٹر سے مشورہ کر سکتی تھی۔ اس نے کل رات ہی فون پر فرح سے بات کی تھی اور اس نے اسے بتایا تھا کہ رانیہ بالکل ٹھیک ہے۔ اسے وہ جگہ بھی پسند آئی تھی لیکن وہ اپنے بابا کے لیے اداس تھی۔

”اداس نہ ہو میری جان۔ بابا ضرور تمہارے پاس آئیں گے۔“ رانیہ کی ادا کی کا سوچ کر اس کی ایک آنکھ سے آنسو ٹپکا اور وہ زیر لب بڑبڑایا۔ قبر سے بھی زیادہ تنگ اس ڈکی میں پڑا اس کا دماغ دوسرے ادھر تھلا بازیاں کھا رہا تھا۔ بھی وہ باہر کے حالات سے باخبر رہنے کی جدوجہد میں مصروف ہو جاتا تو بھی اپنے اندر کی دنیا اسے پیچھے لیتی تھی۔

اسے معلوم تھا کہ جس گاڑی کو ملی نے اس کے بازو کو زخمی کیا تھا، اس گاڑی کو اس کے ساتھیوں میں سے کسی کی چلائی ہوئی گولیاں لگ گئی تھیں۔ اس نے اپنی آنکھوں سے خون میں نہائے اس گاڑی کو اس حالت میں بھی بہادری سے گولیاں چلاتے ہوئے دیکھا تھا۔ بلا ارادہ ہی اس کے غم میں مبتلا ہو گیا تھا کہ پتا نہیں وہ فوج بھی پایا تھا کہ نہیں۔ وہ صرف ایک گاڑی تو نہیں تھا کہ اس کے پیچھے مرنے سے کسی

کو فرق نہیں پڑتا۔ یقیناً وہ بھی ماں باپ، بہن بھائیوں اور بیوی بچوں کے رشتوں سے جڑا انسان تھا۔ ایسا انسان جب حادثاتی موت مرتا ہے تو اس کے پیاروں کے لیے خود کو سنبھالنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ وہ اپنے ماں باپ اور بہنوں کے قتل کے بعد بہت مشکل سے سنبھل سکا تھا۔ اس نے جانا تھا کہ یہ مال کی محبت بڑی گھٹیا محبت ہوتی ہے جو انسان کو انسان کے بجائے وحشی بنا کر اپنے ہی بھائی بند کو چیر چھاڑ کر رکھ دینے کی مٹی طاقت عطا کر دیتی ہے۔

وہ جو بہت سال پہلے مال کی محبت سے تاب ہو کر سیدھے راستے پر چل پڑا تھا آج پھر نہ چاہتے ہوئے بھی وحشیوں کے ایک گروہ کا حصہ بن گیا تھا۔ وحشی درندے خون بہانے سے باز نہیں رہ جاتے سو یہاں بھی ایک بے گناہ کا خون بہہ گیا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ اس جنگ ڈکی میں پڑا اس بے گناہ گاڑی کے لیے رور ہا تھا یا برسوں پہلے بربریت کا شکار ہو جانے والے اپنے پیاروں کو..... اس کے دوا میں جانب ڈکی میں وہ بیگ رکھا ہوا تھا جو اس کی بیٹی کے علاج کو ممکن بناتا لیکن جانے کیوں وہ اس مال کو پا کر وہ خوش محسوس نہیں کر رہا تھا جو اپنے مقصد کے حصول کے بعد محسوس ہوتی ہے۔ شاید اس کے اندر گھٹ تھا کہ جو ہوا وہ غلط ہے اور غلط ہی غلط ہوتا ہے چاہے اس کے لیے آپ کتنے ہی جواز کھڑے کر لیں۔

یادوں، خوف اور ندامت کی اس یلغار میں کتنا وقت گزر اس کے پاس حساب نہیں تھا چوٹ کا وہ اس وقت جب اس نے گاڑی کا دروازہ کھلنے اور پھر انجن کے اسٹارٹ ہونے کی آوازیں سنیں۔ گاڑی چلی تو جس زدہ ڈکی میں بھی تھوڑی سی تازہ ہوا در آئی اور وہ آہستہ آہستہ اس کیفیت سے ٹپکنے لگا جو اسے مایوسی کے گڑھے میں دفن کرتی جا رہی تھی۔ زندگی میں کتنا بھی کچھ غلط ہو جائے لیکن یہ طے ہے کہ جب تک زندگی ہے، بندہ اسے نئے طور سے جینے کی آس قائم کرتا ہی رہتا ہے۔ وہ بھی آس اس سے بندھ گیا تھا۔

گاڑی فرار لے بھرتی ہوئی دوڑی چلی جا رہی تھی اور اسے کہیں مہلت نہیں ملی تھی کہ وہ ڈکی سے نکل پاتا۔ سفر بھی مختصر ہی تھا اور گاڑی جلد ایک رہائی علاقے کی طرف مڑ گئی۔ وہ جبری سے جھانک کر ارد گرد کا جائزہ لیتا رہا۔ گاڑی ایک پتھلے کے سامنے رکی اور زور سے ہارن دیا۔ اس کے پاس ڈکی سے باہر ٹپکنے کا ایک چھوٹا سا موقع تھا لیکن وہ اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھا سکا۔ جبری کو ذرا سا

روپ بہ روپ

”ہمیں یہ رشتہ منظور ہے لیکن ہماری ایک شرط ہو گی۔“ نہایت رعب دار شخصیت کے حامل پارٹیشن خنص نے حقے کی گھونٹوں سے جدا کرتے ہوئے یہ الفاظ ادا کیے تو اس کے سامنے بیٹھے ہوئے شخص کے دل میں بیک وقت خوشی اور الجھن کے احساسات جاگے لیکن اس نے اپنے کسی بھی جذبے کو چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اس کی اس بے نیازانہ خاموشی پر رعب دار شخصیت کے مالک ذرا مہمتر شخص نے بے اختیار ہی پہلو بدلا لیکن پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ چمک گئی۔ اسے یاد آگیا تھا کہ بے نیازانہ اور قدرے غمور انداز ہی تو تھا جو اس... کی شخصیت کو دوسروں کے لیے زیادہ پرکشش اور خوب صورت بنا دیتا تھا اور نوجوان بالعموم اور خواہ مخواہ شخص اس کے گرد مٹھ لاتی تھیں۔

”کیا ہماری شرط دریافت نہیں کریں گے؟“ سوال نہ آنے پر انہوں نے خود ہی سوال کر ڈالا۔
”جی نہیں۔ کیونکہ مجھے جانے بغیر بھی آپ کی ہر شرط قبول ہے۔“ اپنی بہترین مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے بالآخر اس نے داؤد کھیلنے کا فیصلہ کر لیا۔
”تو پھر شین۔ ہم اس شادی کو اناؤنس نہیں کریں گے۔ دوسرے الفاظ میں یہ ایک خفیہ شادی ہوگی۔“ ان کی شرط سن کر وہ بھونچکا رہ گیا۔ شادی کا اعلان نہ ہوتا تو وہ اس شادی سے وابستہ تو اندکیسے حاصل کرتا۔

”یہ تو آپ بڑی عجیب بات کر رہے ہیں سامعین۔“ وہ انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا لیکن دبے لہجہ میں اعتراض بہر حال کر ڈالا۔

”آپ کے لیے یہ عجیب لیکن ہمارے لیے یہ بہت مشکل فیصلہ ہے۔ ایسا فیصلہ جو ہم نے بنی کی بے پناہ محبت سے مجبور ہو کر کیا ہے۔ وہ ہمیں اتنی عزیز ہے کہ ہم نے اسے بیٹوں سے بھی بڑھ کر محبت اور مراعات کے ساتھ پروان چڑھایا لیکن زندگی کا سب سے اہم فیصلہ کرتے ہوئے ہم اس کے ساتھ زیادتی کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اپنی تمام تر لبرل سوچ کے باوجود ہمارے پاس خاندانی روایات سے انحراف کی گنجائش نہیں ہے۔ ان روایات پر قائم رہنے کی صورت میں ہی ہم اپنی گلدی پر بیٹھے رہ سکتے ہیں۔ گلدی چھن جانے کا مطلب ہے طاقت اور اختیار کا چھن جانا اور بہر حال ہم اس کے تحمل نہیں ہو سکتے۔ ہم جانتے ہیں کہ اس کی ہمکنی شادی ہمارا وہ فیصلہ تھا جس پر آج بھی اس کے دل میں شکوہ ہے۔ اس شکوے کو دور کرنے کی ہمارے

کشادہ کرنے پر اس نے دیکھ لیا تھا کہ جھٹکے کے سامنے والا علاقہ کٹر شل ہے اور ظاہر ہے ڈکی سے باہر نکلے ہوئے کسی کی اس پر نظر پڑ سکتی تھی۔ وہ تذبذب ہی میں رہ گیا اور گھٹ کھٹنے پر گاڑی اندر چلی گئی۔ کسی کی نظر نہ پڑ جائے یہ سوچ کر اس نے جبری کو بند کر دیا۔

”سامنے میڈیکل اسٹور سے میرے لیے دو لادو وحید۔ میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔“ اس نے ایک نسوانی آواز کو کہتے سنا۔ لہجہ نرم اور مہذب تھا پھر بھی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کسی ملازم سے مخاطب ہے۔

”ابھی لایا بیٹیکم صاحبہ۔“ مردانہ آواز نے اس کے ملازم ہونے کی تصدیق کر دی۔ اس نے ساعت پر پورا زور دے کر کہا تھا اس لیے نسوانی مہل کی ٹنگ ٹنگ اور مردانہ چیل کے ٹھیک کر چلنے کی آوازیں اور ان کی سست کاتین کرنے میں کامیاب رہا۔ عورت گھر کے اندرونی حصے کی طرف اور ملازم گھر سے باہر جا رہا تھا اور اس کے لیے یہ وہاں سے نکلنے کا ایک اچھا موقع تھا۔ اس نے صرف اتنی دیر کا انتظار کیا کہ بیرونی دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں سنائی دیں اور پھر ڈکی کھول کر باہر نکل آیا۔ بہت دیر تک جسم کو تو زرد زرد کر ایک ٹنگ جگہ میں محدود رکھنے کے باعث خون کی روانی متاثر ہوئی تھی اور عضلات میں بھی عجیب سا کھنچاؤ پیدا ہو گیا تھا اس لیے باہر نکل کر اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کے بعد اس نے جسم کو فارم میں لانے کے لیے ہاتھ پیروں کو جھٹکے دینا شروع کر دیے۔ دائیں ہاتھ کو دبے جانے والے پہلے جھٹکے نے ہی اس کے ہونٹوں سے سسکی نکال دی۔ وہ گولی کے زخم کو فراموش کر بیٹھا تھا لیکن وہ اپنا احساس دلانے کے لیے موجود تھا۔ ہونٹوں سے نکلنے والی سسکی کے ساتھ ہلکی سی نسوانی چیخ مدم ہوئی تو اس نے فوراً آواز کی سمت اپنی گن سیدی کر لی۔ اس کے سامنے ایک خوب صورت عورت نکلے پھر کھڑی تھی۔ اس نے ایک خوفناک گن کا رخ اپنی طرف دیکھا تو بڑی طرح کا پتہ نہ لگی۔ اسے ڈر محسوس ہوا کہ خوف کے باعث کہیں وہ زور زور سے چلاتا شروع نہ کر دے۔ اس نے ایک جھٹکے سے ڈکی کا ڈھکن بند کیا اور لپک کر عورت کے قریب پہنچا۔ اسے قریب باکر عورت نے بے ساختہ ہی ایک اور چیخ مارنے کی کوشش کی لیکن اس نے اس کا منہ دبوچ کر اس کوشش کو ناکام بنا دیا اور اپنے ساتھ گھسٹ کر اندر لے جاتے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔

☆☆☆

اکثر ہاتھ دکھا جاتے ہیں۔

☆☆☆

اسد اپنے سامنے رکھی فائل کو بغور پڑھ رہا تھا۔ خود کو
لٹنے والے لفافے نے اسے شوشاں گل کیس کی فائل ایک
بار پھر کھولنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اپ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ
پڑھتے ہوئے وہ خود پر ہی لخت بھج رہا تھا۔ یہ رپورٹ اس
نے پہلے بھی پڑھی تھی لیکن اس کے ایک کتھے کو اس لیے
نظر انداز کر گیا تھا کہ اس کے حساب سے وہ کوئی غیر معمولی
بات نہیں تھی حالانکہ اگر اس سے وقت کے حساب کو
نظر انداز کر دینے کی غلطی سرزد نہ ہوتی تو وہ غیر معمولی معلوم
نہ ہونے والی بات اسے فوراً ہی کھٹکا دیتی۔ اصل میں مسئلہ
یہ تھا کہ اگرچہ اس نے اپنے تئیں اس کیس کو پوری محنت اور
جانتی جانتی سے حل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ان دنوں وہ
ذہنی طور پر بُری طرح الجھا ہوا تھا اور کچھ دوسرے مسائل
نے اس طرح توجہ پانٹ رکھی تھی کہ وہ اپنی سو فیصد
کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کر سکا تھا لیکن موجودہ حالات میں
ضروری ہو گیا تھا کہ وہ اس بظاہر حل ہو جانے والے کیس کا
از سر نو جائزہ لے اور حقائق کی تیک پیکچے۔ فائل بند کرنے
کے بعد وہ کچھ دیر کرسی کی پشت سے سر کا کر آئینیں بند
کیے غور کرتا رہا اور جب ایک لمحہ عمل لے ہو گیا تو اپنی جگہ
پر سیدھے ہوتے ہوئے فون کی طرف ہاتھ بڑھا یا۔ مطلوبہ
نمبر ڈائل کرنے پر دوسری ہی لمفنی پر کال ریسیو کر گئی۔

”ہیلو ونڈم سڑو کیسے ہو؟“ دوسری طرف سے شوشا
نسوانی آواز سن کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔
وہ اس کی کلاس فیلو نانکھ جی جو زیادہ تر اسے اسی نام سے
پکارتی تھی۔ اصل میں دوران تعلیم اسد اپنی خوب صورت
شخصیت کی وجہ سے صنف نازک کے لیے بے حد کشش رکھتا
تھا لیکن اس نے کبھی کسی کو گفت نہیں کروائی تھی۔ اس لیے
نانکھ نے اسے یہ نام دے دیا تھا۔

”تم سے ایک کام ہے۔“ لمبی بات کرنے کے
بعد اس نے سیدھا مطلب کی بات کی۔
”وہ تو میں تمہارا نمبر دیکھ کر ہی سمجھ گئی تھی۔ بولو کیا
کام ہے؟“ نانکھ کے لیے میں بلکی سی تھی لیکن اس نے
اسے نظر انداز کر دیا اور اپنا کام بتانے لگا۔

”تو تم چاہے ہو کہ میں اس سے خون کا عطیہ مانگوں
لیکن ضروری تو نہیں کہ وہ راضی ہو جائے۔ اس کی عمر پچاس
سال سے زیادہ ہے۔ وہ کوئی بھی بہانہ بنا سکتا ہے۔“
”تم اسے موقع نہیں دینا اور سمجھنا کہ عمر کا کوئی ایٹو

پاس ایک ہی صورت ہے کہ ہم آپ کا رشتہ منظور کر لیں لیکن
مسئلہ وہی ہے کہ اپنی تمام تر قابلیت اور لیاقت کے باوجود
آپ ہمارے خاندان کے لیے اس لیے قابل قبول نہیں ہو
سکتے کہ آپ کی ذات الگ ہے اور ہمارے ہاں بیٹی کو غیر
ذات میں پرانا بہت بڑا گناہ سمجھا جاتا ہے۔“ مسمر شخص
کے ہونٹوں پر اداسی مسکراہٹ چمک کر معدوم ہو گئی۔

”میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں لیکن سچ یہ ہے کہ
میرے بھی کچھ تحفظات ہیں۔“ اس نے اب بھی دبے لہجے
میں اپنی عرض گوش گزار کی۔

”ہم سمجھتے ہیں..... ہم نے اس دنیا میں عمر کی بہتر
بہاریں دیکھی ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ یہاں ہر شخص کی اپنی
کوئی نہ کوئی غرض ہوتی ہے۔ آپ اطمینان رکھیں کہ ہم آپ
کے تحفظات کا پورا پورا خیال رکھیں گے۔ اس انیشن سمیت
آئندہ ہونے والے ہر انیشن میں آپ کو ہماری ہر طرح کی
سپورٹ حاصل رہے گی اور اس سب کے بدلے ہم آپ
سے صرف ایک چیز طلب کریں گے۔ اپنی بیٹی سے
وقاداری..... وہ بہت حساس طبیعت کی مالک ہے۔ اس
نے زندگی کا ایک طویل عرصہ ذہنی وجہاتی کرب میں
گزارا ہے اس لیے ہم نے یہ بے حد مشکل فیصلہ کیا ہے۔
آپ سے اس بات کے تمہی ہیں کہ آپ ایسا کچھ نہیں کریں
گے جو ہماری بیٹی کے لیے باعث آزار ہو۔“ وہ جواب
علاقے کے لیے ایک سخت گیر مگر ان کی حیثیت رکھتے تھے
اور جن کی سربراہی میں ہونے والی پچائیتوں میں دوسروں
کی نیکیوں کو بڑے آرام سے کاری اور دینی کر دینے کے
فیصلے سنا دیے جاتے تھے، اپنی بیٹی کی خوشیوں کے لیے ہر
محنت چاہتے تھے۔

”آپ فکر نہ کریں سائیں۔ آپ کو مجھ سے کبھی کوئی
شکایت نہیں ہوگی۔“ اسے اس شادی کے پیچھے جیسے مقاصد
کے حصول کی یقین دہانی کروادی گئی تو خوشی سے چہرے نے نہ
ساتے ہوئے ایک جھوٹی یقین دہانی کروادینے میں کوئی
حرج نہ سمجھا۔ وہ دیے بھی اس بات کا قائل تھا کہ وعدے
توڑنے کے لیے ہی ہوتے ہیں۔

”بس تو پھر ملے ہے کہ اس جیسے کو آپ اپنے
بھروسے کے دو آدمیوں کے ساتھ ہمارے فارم ہاؤس
پہنچیں گے جہاں سلاکی سے نکاح کی رسم ادا کر دی جائے
گی۔“

جو فیصلہ سنایا گیا اس پر سن و سن عمل بھی ہوا لیکن یہ بھی
تو دنیا کی ایک حقیقت ہے کہ جن پر بھروسہ کیا جائے، وہی

”آپ کے سر میں اتنا درد ہو رہا ہے تو پہلے میڈیسن لے لیں۔“ اس نے ہمدردانہ لہجے میں عورت کو مشورہ دیا۔
”یہ عام سر درد کی گولی نہیں بلکہ انجی ڈپرینسٹ ہے۔ میں تمہاری موجودگی میں اسے نہیں لے سکتی۔“ اس نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

”میں اتنا زیادہ آدمی نہیں ہوں خاتون امیری مجبوری نے مجھے بینک ڈسکریٹ میں لوٹ ضرور کر دیا ہے لیکن میں انسانیت سے عاری نہیں ہوں۔“ اس کے لہجے میں اداسی در آئی۔

”کیا مجبوری ہے تمہاری..... شاندار گھر کی خواہش، گھڑی کا ڈیڑی میں گھومنے کی آرزو، اونچے ہونٹوں میں کھانے کی تمنا.....“ اس نے طنز کیا۔

”برین ٹیمر میں جتا چھ سالہ اکلوتی بیٹی۔“ وہ یک دم بولا تو وہ گنگ ہو گئی۔

”چھ سال پہلے میری بیٹی ہوئی تھی تو ڈاکٹر نے ہمیں بتا دیا تھا کہ میری بیوی اب دوبارہ ماں نہیں بن سکے گی۔ اپنی زندگی کی واحد خوشی کو موت کے کھنبے میں جکڑا ہوا دیکھنا کتنا خوفناک ہوتا ہے، یہ صرف میرے جیسے والدین ہی سمجھ سکتے ہیں۔“ سر جھکا کر بولتے ہوئے اس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی تھی۔

”آئی ایم سوری۔“ اس نے اس کا دکھ اپنے دل پر محسوس کیا۔ اس سے بڑھ کر بھلا کون جانتا تھا کہ اولاد کے لیے انسان کیا کچھ کر گزرنے کو راضی ہو جاتا ہے۔

”اٹس اوکے۔“ وہ اُداس مسکرایا اور بے ساختہ ہی اپنے اس بازو پر ہاتھ رکھا جو گولی سے زخمی ہو گیا تھا اور لمحہ بہ لمحہ اس کی تکلیف میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

”کیا آپ زخمی ہیں؟“ اس نے پہلی بار محسوس کیا۔ سیاہ جیکٹ کی وجہ سے خون کا دھما مایاں نہیں ہو رہا تھا۔
”میرے خیال میں گولی ایک کس کر کے کل گئی ہے۔“ وہ زیادہ گہرا غم نہیں ہے۔“ وہ زخمی مسکرایا۔
”مجھے دکھائیں، میں دیکھتی ہوں۔“ وہ فوراً اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔

”آپ دیکھ کر کیا کہیں گے؟ آپ تو میرے یہاں سے نکلنے کا انتظام کریں۔ میرا ایک بھی آپ کی گاڑی کی ڈکی میں رہ گیا ہے۔“

”پہلے آپ مجھے اپنا زخم دکھائیں۔“ اس نے اصرار کیا تو فیصل کو اپنی جیکٹ اتار لی پڑی۔ جیکٹ کے نیچے اس کی قمیض کی آستین خون میں تر ہو رہی تھی۔ اس نے قدرے

نہیں ہے۔ آدمی صحت مند ہو تو ستر سال کی عمر میں بھی خون کا عطیہ دے سکتا ہے۔ اس شخص کو تو ویسے بھی خبط ہے خود کو جوانوں سے بھی زیادہ فٹ ظاہر کرنے کا۔ وہ کیسے انکار کرے گا بلکہ اسے تو جیلنٹی کے لیے اچھا موقع مل جائے گا کہ وہ اپنے دل میں عوام کے لیے کتنا درد رکھتا ہے۔ تمہارا میڈیا سے تعلق تمہارے لیے کام کو آسان بنا دے گا۔“

اس نے نالہ کے اعتراض کو اپنے دلائل سے دور کیا۔ نالہ ایک فری لانس صحافی تھی جو میڈیسیا کے مریضوں کے لیے کام کرنے والی ایک مشہور این جی او سے بھی وابستہ تھی اسی لیے اس نے اسے یہ کام سونپا تھا۔

”اوکے باس اکام ہو جائے تو تمہیں رپورٹ کرنی ہوں۔“ آخر کار وہ راضی ہو گئی تو اس نے ہائے کہہ کر فون بند کر دیا۔ اس کال سے فارغ ہو کر اسد نے اپنے ایک ماتحت کو بلا کر اسے چند ہدایات دیں اور سر پر کیپ بھا کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ ابھی اسے بہت سے کام نمٹانے تھے۔

☆☆☆

”خوش مت مچانا۔ میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا لیکن اگر تمہارے شور مچانے سے میرے لیے مسئلہ بنا تو میں تمہیں نقصان پہنچانے پر مجبور ہوں گا۔“

خوف زدہ عورت کا منہ دبائے دبائے اس نے دھیمی آواز میں اسے سمجھا تو وہ جلدی جلدی اثبات میں سر ہلانے لگی۔ اس نے اس کے منہ پر سے ہاتھ ہٹا لیا لیکن کمن کا رخ اسی کی طرف کیے رکھا۔

”پلیز اسے پیچھے ہٹاؤ۔ وہاں بینک میں بھی تم اور تمہارے ساتھیوں نے آدھا خون خشک کر دیا تھا اب جو رہ گیا ہے اسے باقی رہنے دو۔“ حیرت انگیز طور پر اس نے اپنے خوف پر تیزی سے قابو پا لیا تھا اور اب منہ بناتے ہوئے اس سے کہہ رہی تھی۔ اپنے جملے سے اس نے یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ وہ اسے بینک ڈسکریٹ میں لوٹ ڈاکو کی حیثیت سے شناخت کر چکی ہے۔

”یہ صرف احتیاط ہے۔ ابھی آپ کا ملازم میڈیسن لے کر آجائے تو اسے فارغ کر کے گیٹ پر بھیج دیجیے گا پھر میں یہ بتاؤں گا۔“ اس نے مہذبانہ لہجے میں جواب دیا تو عورت نے دوبارہ اعتراض نہیں کیا اور اس کی ہدایت کے مطابق ملازم کو دروازے سے ہی دوا لے کر واپس مین گیٹ پر بھیج دیا اور دونوں ہاتھوں سے اپنی کنپٹیوں کو دباتی ہوئی ایک صوفے پر جا بیٹھی۔

میں کوئی تعارف ہی نہیں۔“ فیصل بھی بے ساختہ بولا۔

”میں خوفناک ہوں۔ زیادہ تر لوگ مجھے ضوئی کہتے ہیں۔ میری بھی آپ کی طرح ایک ہی بیٹی ہے۔ وہ گاؤں میں میری والدہ کے پاس ہوتی ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ کچھ عرصے بعد ان دونوں کو بھی یہاں بلواؤں گی تاکہ میری بیٹی اچھی تعلیم حاصل کر سکے۔“ فیصل کو محسوس ہوا کہ وہ کچھ اداں ہے۔

”اور شوہر..... ان کے بارے میں کچھ نہیں بتایا آپ نے.....“

”ان کے بارے میں کچھ بتاؤں گی تو وہ جھوٹ ہوگا اس لیے بہتر ہے اس موضوع پر بات ہی نہ کی جائے۔“ اس نے صاف کوئی کا مظاہرہ کیا تو فیصل نے بھر کوئی سوال نہیں کیا۔ اپنے اور اپنی فیملی کے بارے میں مختصر آہٹانے لگا۔

”آپ چاہیں تو کچھ دیر اوپر گیٹ روم میں آرام کر سکتے ہیں۔ آئی دیر میں، میں آپ کی جیکٹ اور شرٹ واش کر دیتی ہوں۔ کپڑوں کے بغیر آپ باہر نہیں نکل سکتے۔“

”میں یہیں صوفے پر ہی کچھ دیر لیٹ جاتا ہوں۔“ ضوئی کے تمام تر ایسے رویے کے باوجود وہ اسے نظروں سے اوجھل کرنے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ سمجھ گئی اور اس کے کپڑے اٹھا کر خاموشی سے واش روم کی طرف چلی گئی۔

اسے احساس تھا کہ وہ اس کے لیے بوجھ بن گیا ہے لیکن حالات پر اس کا اختیار نہیں تھا۔ وہ خود بچھن گیا تھا۔ باس اور اپنے ساتھیوں کے رویوں کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اس کے رقم سیت غائب ہو جانے پر جانے وہ کیا سوچ رہے ہوں گے۔ وہ خود سے باس سے رابطہ بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس کے پاس کوئی رابطہ نمبر یا پتا موجود نہیں تھا۔ وہ

مکان جہاں انہیں باس ملاقات کے لیے بلاتا رہا تھا، پہلے ہی متروک قرار دے دیا گیا تھا۔ ڈاکے کے لیے ایک شخص نے خود ہی انہیں مقررہ مقامات سے پک کیا تھا اور گاڑی میں ہی اسلحہ وغیرہ فراہم کیا تھا۔ واردات کے بعد انہیں کہاں جانا تھا، یہ بھی وہی شخص جانتا تھا۔ وہ شخص ان کے ساتھ بینک کے اندر نہیں گیا تھا اور گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر باہر ہی موجود رہا تھا۔ وہ ہانچا ہوا شخص خود باس تھا یا اس کا کوئی کماشتہ اس بارے میں فیصل صحیح اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔

”میں تمہاری جیکٹ اوپر چھت پر پھیلانے جا رہی

تکلیف سے قیص بھی اتار دو۔

”میں فرسٹ ایڈ باکس لے کر آتی ہوں۔“ وہ اندر دہنی کمرے کی طرف بڑھی تو فیصل اس کے پیچھے تھا۔

”بے فکر رہیں۔ میں پولیس کو انعام نہیں کروں گی۔“ وہ بولی تو فیصل جھپٹ گیا۔ زار دیر بعد وہ اس کے بازو پر لگا خون صاف کر کے نہایت ماہرانہ انداز میں اس کے زخم کی پینڈیج کر چکی تھی۔

”بچت ہوگئی ہے بس تھوڑا سا گوشت پھٹا ہے لیکن درد اور سائز اٹھیکس سے بچنے کے لیے اسٹی بائیونک اور چین کمر لپٹی ہوگی۔ چین کمر میرے پاس ہے آپ ابھی لے لیں۔ اسٹی بائیونک کا بعد میں انتظام ہو جائے گا۔ اب تو ویسے بھی مجھے کی نماز کا وقت ہونے والا ہے اس لیے دکائیں اور میڈیکل اسٹورز بند ہونا شروع ہو گئے ہوں گے۔“

”لگتا ہے آپ کا تعلق طب کے شعبے سے ہے؟“ اس کی مہارت کو دیکھتے ہوئے فیصل نے اندازہ لگا دیا۔

”جی ہاں۔ میں ایک پریڈیکٹل نرس ہوں لیکن اپنے شوہر کی اجازت نہ ہونے کے باعث اب ملازمت نہیں کرتی۔“ اس نے جواب دیا۔

”آپ کے شوہر شاید دفتر گئے ہوئے ہیں؟“ اس نے اندازہ لگا دیا۔ گھر کی خاموشی سے وہ اس کے تنہا ہونے کا اندازہ پہلے ہی لگا چکا تھا۔

”وہ یہاں نہیں ہوتے۔ یہاں میں اکیلی رہتی ہوں۔ اس لیے آپ کو مردانہ لباس بھی مہیا نہیں کر سکتی۔ آپ کی شرٹ اور جیکٹ کو دھو کر فرو کرنے میں خاصا وقت لگے گا۔ اس وقت تک کے لیے آپ سردی سے بچنے کے لیے میری شال اوڑھ لیں۔“ اس نے اسے ایک گرم چادر مہیا کر دی۔ پھر کافی اور سیڈو تیار کر لگئی۔

”آج میری طبیعت تھوڑی سی تھکی پھر بینک کے کام سے بھی جانا پڑ گیا تو میں کما نہیں بناسکی۔ فی الحال ان سے کام چلا لیں۔“ کافی کا کپ اور سیڈو وچر کی پلیٹ اس کے سامنے رکھتے ہوئے وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولی تو فیصل شرمندہ ہو گیا اور نہ امت سے بولا۔

”میں آپ کے گھر میں زبردستی کھس آیا ہوں اور آپ میری ایسی مہارت کر رہی ہیں جیسے میں آپ کا مہمان ہوں۔“

”مہمان تو ہیں پر بن بلائے.....“ وہ مسکرائی۔

”اور عجیب بات ہے کہ مہمان اور میزبان کا آپس

ظلمی کی زبان بند کر دی۔“

”آف میرے خدا اکٹھا شقی القاب ہے وہ شخص۔“ وہ رنگ اڑے چہرے کے ساتھ ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ خبروں کا سلسلہ جاری رہا جس سے انہیں بہت سی نئی معلومات حاصل ہوئیں۔ ڈیپٹی میں مزاحمت کرنے والے سیکورٹی گارڈ کے علاوہ دو مزید گارڈ بھی ہلاک ہوئے تھے۔ یہ وہ گارڈز تھے جو بینک کے گیٹ پر کھڑے رہتے تھے۔ تفصیلات کے مطابق واردات سے قبل جب بجلی غائب ہوئی تو ایک گارڈ اپنی جگہ پر موجود نہیں تھا۔ واردات کے وقت ڈاکوؤں نے منجر کے ذریعے دونوں گارڈز کو اندر بلوایا تھا لیکن فائرنگ شروع ہونے پر وہ دونوں باہر نکل گئے تھے اور ڈاکوؤں کی چلائی ہوئی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ بجلی جانے پر جریئر کے آن نہ ہونے کو سازش قرار دیا جا رہا تھا اور شک ظاہر کیا جا رہا تھا کہ ڈاکوؤں کے اسٹے سمیت وال قہر و گیت سے گزر جانے کے لیے یہ انتظام کیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں گارڈز پر بھی شک کیا جا رہا تھا خصوصاً اس گارڈ پر جو ڈاکوؤں کی آمد سے قبل اپنی ڈیوٹی پر موجود نہیں تھا۔ واردات میں بہت بڑی دم لونی بھی مچی اور تین گارڈز ہلاک ہو گئے تھے اس لیے اس واردات کو خاصی اہمیت دی جا رہی تھی۔ گارڈز اور سلطان ظلمی کو ملا کر چار افراد ہلاک ہو گئے تھے اور ان ہلاکتوں کا بوجھ فیصل اپنی ذات پر محسوس کر رہا تھا۔ اگر وہ اپنی بیٹی کو بچاتا چاہتا تھا تو یہ چار افراد بھی تو کسی کے پیارے تھے۔ بے شک اس نے ان میں کسی کو ہلاک نہیں کیا تھا لیکن یہ بوجھ بھی کم نہیں تھا کہ وہ اس واردات کا حصہ تھا۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ ان خبروں کو سننے کے بعد موقوفات بھی بہت زیادہ ڈسٹرب ہوئی ہے اور پہلے کی طرح دوستانہ انداز قائم نہیں رہا ہے۔

”آئی ایم سوری لیکن یقین کریں کہ ان میں سے کسی بھی شخص کی ہلاکت میں میرا ہاتھ نہیں ہے۔ آپ میری گمن چیک کر سکتی ہیں۔ اس کے میگزین میں آپ کو پوری گولیاں مل جائیں گی۔“ وہ بے ساختہ ہی اپنی صفائی دینے لگا۔ ضوئی جواباً کچھ نہیں بولی اور اٹھ کر بین میں چلی گئی۔ وہ شاید کچھ پکانے کا ارادہ رکھتی تھی لیکن اس کے حواس اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ پہلے اس کے ہاتھ سے دپٹی مری جسے وہ دوسری کوشش میں چولے پر رکھنے میں تو کامیاب ہوئی لیکن دپٹی میں کوئنگ آئل ڈالنے کی کوشش کامیاب نہیں ہوئی اور وہ بہہ کر چولے پر جا گرا۔ اوپن

ہوں۔ ڈرائر میں کھانے کے باوجود اس میں ہلکی سی باقی ہے جسے دور کرنے کے لیے دھوپ لگانا ضروری ہے۔“ اس کی سوچوں کے دوران ضوئی واٹس روم سے باہر نکل آئی اور اسے اطلاع دی۔ اس بار وہ اس کے پیچھے نہیں گیا۔ واپس آکر اس نے اس کی قمیص رفو کر کے استری کی تو وہ پہننے کے لائق ہو گئی۔

”میں نماز پڑھ رہی ہوں۔ آپ چاہیں تو اس دوران فی وی دیکھ سکتے ہیں۔“ ضوئی اسے ریگٹ تھما کر چلی گئی۔ اس نے فی وی کھولا اور مختلف چینلز سرچ کرنے لگا۔ اس کا فوکس نیوز چینلز تھے۔ تقریباً ہر چینل سے ہی بینک ڈپٹی کی واردات کے بارے میں خبر آرہی تھی۔ ”تھیر کی دنیا سے تعلق رکھنے والے مشہور میک آپ آرٹس سلطان ظلمی کی قتل کر دیے گئے۔“ ایک چینل سے نشر کی جانے والی اس خبر پر وہ چونک گیا اور بے ساختہ ہی آواز بلند کر دی۔ اب خبر کی تفصیل بیان کی جا رہی تھی۔ ”ایک عینی گواہ نے پولیس کو بیان دیا تھا کہ ڈپٹی کی واردات میں شامل ڈاکوؤں نے میک آپ کر رکھا تھا اور میک آپ کا اسٹائل مشہور میک آپ آرٹس سلطان ظلمی کا محسوس ہو رہا تھا۔ پولیس اس کلیپ پر سلطان ظلمی کے پاس تصدیق کے لیے پہنچی تو وہ پہلے ہی قتل کیے جا چکے تھے۔“ خبر چلنے کے ساتھ ساتھ اسکرین پر ایک طرف سلطان ظلمی اور سی سی ٹی وی فوٹیج سے حاصل کردہ ڈاکوؤں کی تصاویر بھی چلائی جا رہی تھیں۔

”ادھ مانی گاڈ! یہ کیا ہو گیا؟“ ضوئی آواز سن کر پتا نہیں کب باہر آ گئی تھی اور اب فی وی اسکرین کی طرف پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھتے ہوئے بول رہی تھی۔

”آپ ان صاحب کو جانتی ہیں؟“ اس نے ضوئی کے چہرے پر دکھ محسوس کیا۔

”ہاں، میں بھی کبھی تھیر کے لیے بھی کام کرتی تھی۔ ظلمی صاحب نے کئی بار میرا میک آپ کیا تھا۔ بہت سچے فنکار تھے۔ ان کا میک آپ اداکار کا روپ ایسے بدل دیتا تھا کہ اس کی اصل شخصیت غائب ہو جاتی تھی اور دیکھنے میں اندازہ بھی نہیں ہوتا تھا کہ اس شخص نے میک آپ کیا ہوا ہے لیکن انہیں کیوں مارا؟“ وہ صدمے کا شکار تھی۔

”جرم چھپانے کے لیے۔ ہمیں سلطان ظلمی کے پاس بھیجنے والا جانتا تھا کہ ظلمی ڈپٹی کی فوٹیج سامنے آنے پر ڈاکوؤں کو پہچان کر پولیس کو ان کے اصل حلیوں کے بارے میں آگاہ کر دے گا اس لیے اس نے ہمیشہ کے لیے

موجود تھا اور اتفاق تھا کہ اس بیگ میں پاکستانی کرنسی کے بجائے ڈالرز بھرے ہوئے تھے۔ خود کو اور اس رقم کو بچانے کے لیے اسے ہر صورت پاس سے بچنا تھا۔ کیسے؟ یہ ایک مشکل سوال تھا۔ وہ خود کو ادھر ادھر چھپ کر بچا بھی سکتا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اس کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ اسے رات کو علاج کے لیے ہسپتال ملنے لے جانا تھا۔ یہ بات پاس بھی جانتا تھا اس لیے بے طے تھا کہ وہ جب بھی ملک سے باہر جانے کی کوشش کرے گا پاس اس تک پہنچ جائے گا۔ اندھیرے کے اس تیر کا اس کے پاس کوئی حل نہیں تھا اور یہ چیز اسے اعصاب زدہ کر رہی تھی۔ اعصابی کشیدگی سے بچنے کے لیے اس نے ضوفی کی منگوائی ہوئی ٹیلیفون میں سے خود بھی دو گولیاں نکال کر پانی سے نگلیں اور صوفی پر ایٹ کیا بولی پر بھی آجائے والی نیند والے سہارے ہی سہی اس پر مہربان ہونے لگی۔ دھیرے دھیرے اس کی آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں۔

☆☆☆

ضوفی کی آنکھ کھلی تو شام کے سائے لیے ہو رہے تھے۔ سردیوں کے دنوں میں ویسے بھی شام جلدی در آتی ہے۔ عصر کے مختصر وقت کی وجہ سے اس نے پہلے نماز ادا کی اور پھر کمرے کا دروازہ کھول کر باہر آئی۔ وہ سامنے ہی صوفی پر بے خبر سو رہا تھا۔ اس نے اپنا میک اپ نہیں اتارا تھا اس لیے وہ ابھی تک اس کی اصل شکل نہیں دیکھ پائی تھی لیکن اس کی آنکھوں کے تاثر میں جوڑی تھی، اس نے ضوفی کے دل کو یقین دلایا تھا کہ وہ واقعی ایک شریف آدمی ہے جو اپنی بھجوری کے ہاتھوں اس مشکل میں گرفتار ہو گیا ہے۔ اس کے لیے اپنے دل میں ہمدردی محسوس کرتے ہوئے اس نے اس کے قریب جا کر اسے آواز دی۔ دو تین آوازیں دینے کے باوجود وہ نہیں جاگا تو مجبوراً جھجکتے ہوئے اس کا بازو دھکیلا۔ بازو پر ہاتھ رکھتے ہی اسے احساس ہو گیا کہ وہ تیز بخار میں مبتلا ہو چکا ہے۔ اس کے ہلانے پر اس نے آنکھیں کھولیں تو وہ بھی بخار کی شدت سے سرخ ہو رہی تھیں۔ چند ثانیوں میں ہی اس نے آنکھیں دوبارہ بند کر لیں اور بڑبڑانے لگا۔

”راؤ..... میری رانی میں کیسے تمہارے پاس آؤں۔ وہ بہت ظالم ہے۔ اس نے سب کو مار ڈالا۔ وہ مجھے بھی مار ڈالے گا۔“ اس کی اس کیفیت نے ضوفیاں کو پریشان کر دیا۔ وہ اپنے حواس میں نہیں رہا تھا ایسے میں وہ اسے اپنے گھر سے جانے کا کہتی تو کیسے۔ یہاں سے جانے

بچن کی وجہ سے فیصل سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ یک دم ہی ضوفی کو اپنی آگئی تو وہ اپنی جگہ بیٹھا نہ رہ سکا اور اسے بازو سے پکڑ کر باہر لے آیا۔

”پلیز آپ یہ میڈیسن لے لیں۔ آپ کو اس وقت سکون کی ضرورت ہے۔“ اس نے اسی کی منگوائی ہوئی گولیاں اور پانی کا بھرا ہوا گلاس اس کے سامنے رکھ کر اس سے درخواست کی تو اس بار اس نے انکار نہیں کیا۔ اس کی آنکھوں کے گوشے پٹکے ہوئے تھے۔

”میں ابھی یہاں سے چلا جاتا ہوں۔ آپ اپنے چوکیدار کو کسی بہانے گیٹ سے ہٹا دیں۔ میں اس کی موجودگی میں یہاں سے گیا تو مجھ سے زیادہ آپ کے لیے مسئلہ بن جائے گا۔“ اس نے نڈھال سی ضوفی سے درخواست کی۔

”ابھی نہیں رات میں جانا۔ تمہاری بیٹی کو تمہاری ضرورت ہے۔“ وہ دھیرے سے پولی اور ایک جھپٹے سے اٹھ کر بیڈروم میں جا کر دروازہ بند کر لیا۔ فیصل نام سا اپنی جگہ بیٹھا رہ گیا۔ پیٹھے پیٹھے خاصا وقت گزر گیا۔ وہ خالی الذہنی کی کیفیت میں ہی دی و دیکھتا رہا۔ یک دم ہی ایک خبر نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کی۔ شہر کے ایک ویران حصے سے تین افراد کی لاشیں ملی تھیں۔ تینوں گولیاں مار کر ہلاک کیا گیا تھا۔ موت کی تکلیف سے مسخ ان تین چہروں کو فیصل نے شناخت کر لیا۔ یہ تینوں اس کے وہ ساتھی تھے جنہوں نے ڈکیتی کی واردات میں اس کے ساتھ حصہ لیا تھا۔ انہیں کس نے ہلاک کیا تھا، وہ اندازہ لگا سکتا تھا۔ ساتھ ہی اسے یہ خیال بھی آیا تھا کہ اگر وہ ان کے ساتھ فراہونے میں کامیاب ہو گیا ہوتا تو اس وقت خود اس کی لاش بھی ان کی لاشوں کے ساتھ موجود ہوتی۔

باس نے شروع سے جس طرح ان لوگوں کو ٹریٹ کیا تھا اس سے فیصل کو پہلے ہی خطرے کی بو آتی رہی تھی۔ اب بالکل واضح ہو گیا تھا کہ پاس نے ان چاروں کو اس واردات کے لیے استعمال کیا اور وہ ان میں سے کسی کو بھی حصہ دے بغیر ساری رقم خود ہڑپ کرنے کے چکر میں تھا۔ تینوں مقتولین کو ان کے میک اپ اترنے کے بعد ہلاک کیا گیا تھا۔ اگر وہ کھوج لگا کر ان تینوں تک نہ پہنچا ہوتا تو اسے پتا بھی نہیں چلتا کہ ہلاک کیے جانے والے اس کے ساتھی تھے۔ وہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ ان تینوں کو ہلاک کرنے کے بعد پاس اس کی تلاش میں ہو گا۔ وہ اس کے لیے اس لیے بھی زیادہ اہم تھا کیونکہ اس کے پاس رقم سے بھرا ہوا بیگ

سوپ تیار کیا اور ایک ٹرے میں رکھ کر اس کے پاس لے آئی۔

”یہ سوپ پی لیں۔ اسے پی کر آپ بہتر محسوس کریں گے۔“ ٹرے میز پر رکھ کر اس نے آنکھ موند کر لینے فیصل کو ہکا بھکا کر دیکھا کہ کچھ کھانے کی چیزیں اور شرابیں سامنے ہیں۔

”آپ نے اتنی زحمت کیوں کی؟“

”یہ صرف آپ کے لیے نہیں ہے۔ مجھے خود بھی اپنا پیٹ بھرنا تھا اس لیے بنایا۔“ اس نے بے نیازی سے جواب دیا اور اپنے لیے پیالے میں سوپ نکال کر پینے لگی۔ ذہنی انتشار کے باوجود سوپ ڈانٹنے دار بنا تھا۔ دن میں کھانا نہ کھانے کے باعث بھوک بھی لگ رہی تھی اس لیے وہ رغبت سے انصاف کرنے لگی۔ اس کے مقابلے میں فیصل کی رفتار سست تھی۔

”میں آپ کا بیگ گاڑی کی ڈکی سے نکال کر لے آئی ہوں۔ یہاں سے جاتے وقت لے لیجیے گا۔“ اس نے فیصل کو اطلاع دی۔

”آپ اپنے ملازم کو گیت سے ہٹانے کا انتظام کر دیجیے گا میں چلا جاؤں گا۔“ اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

”وہ دس بجے رات کا کھانا کھانے قرعہ ہی ہوئی تک جاتا ہے۔ اس وقت آپ یہاں سے نکل سکتے ہیں۔“ ضوئی نے اسے بتایا کچھ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

”میرے خیال میں یہاں سے نکلنے سے قبل آپ اپنا میک اپ صاف کر لیجیے گا، اس صلیب سے تو فوراً ہی پولیس آپ کو دھر لے گی۔“

”پولیس سے زیادہ موت کا ہر کارہ میرے پیچھے ہے جو میری اصل شکل اور اس میک اپ دونوں سے انہی طرح واقف ہے۔“ اس نے پس مردہ سے لہجے میں جواب دیا تو ضوئی چونک گئی۔ کچھ دیر قبل خود کی کیفیت میں بھی وہ کسی کے بارے میں کہہ رہا تھا کہ وہ اسے مار ڈالے گا۔

”کیا آپ کو کسی سے اپنی جان کا خطرہ ہے؟“ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ خود کو سوال کرنے سے نہ روک سکی۔

”میرے ساتھ واردات میں حصہ لینے والے میرے تین ساتھی قتل کیے جا چکے ہیں۔“ اس نے بتایا تو ضوئی نے بے ساختہ ہی چپچہ ہاتھ سے چھوڑ کر ہاتھ منہ پر رکھ لیا۔

”اودہ مائی گاڈ!“

”اس نے ہم چاروں اور ہماری مجبوریوں کو استعمال کیا ہے اور وہ ہم میں سے کسی کو حصہ دار بنانے کا

کے لیے اس کا ٹھیک ہونا شرط تھا۔ وہ ایک منٹ کے لیے وہیں کھڑی اس مسئلے پر سوچتی رہی پھر اپنی خواب گاہ کی طرف مڑ گئی۔ دوبارہ باہر نکلی تو اس کے ہاتھ میں ایک پرچہ اور کچھ روپے موجود تھے۔ اس نے باہر نکل کر وحید کو پکارا اور اسے حکم دیا کہ وہ پرچے پر لکھی دو انکس خرید لائے۔ وحید چلا گیا تو وہ اپنی گاڑی کے پاس گئی اور اس کی ڈکی کا ڈھکن کھول کر دیکھا۔ اسے وہاں موجود بیگ نظر آیا۔ کچھ سوچ کر اس نے وہ بیگ نکالا اور اپنے ساتھ اندر لے آئی۔ وحید عموماً گیت کے اندر کی طرف ایک کرسی پر بیٹھا رہتا تھا یا گیت کے ساتھ ہی بنے ایک چھوٹے سے کمرے میں آرام کرتا تھا اس لیے اس کی موجودگی میں بیگ نکالنا مشکل تھا۔ بیگ کو مناسب جگہ پر رکھنے کے بعد اس نے ایک بار پھر فیصل کو چیک کیا۔ وہ بے سدھ تھا اور اس کا بخار کچھ اور بھی تیز محسوس ہو رہا تھا۔ وہ ایک برتن میں پانی لا کر اس کے سر پر پٹیاں رکھنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی تو باہر نکلی۔ وحید اس کی مطلوبہ دوا بھی وغیرہ لے کر آچکا تھا۔

”اگر آپ کی طبیعت زیادہ خراب ہے میڈم تو اسپتال چلی جائیں۔“ اسے دواؤں کا تھپکا پکڑاتے ہوئے وہ فکر مند سی بولا۔ ضوئی اس کی طبیعت آج کل یوں بھی خراب ہی چل رہی تھی اور فکر و پریشانی کے باعث چہرہ مزید ست گیا تھا اس لیے وحید کو اس کے دوا میں مشکوئے پریشانی لگا کر اس کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔

”فکرت کرو۔ میں خود آدمی سے زیادہ ڈاکٹر ہوں۔ اپنے علاج سے ہی ٹھیک ہو جاؤں گی۔“ اس نے وحید کو تسلی دی اور دوا میں لے کر اندر آ گئی۔ وحید کو وہ کسی خاص کام کے بغیر کبھی اندر نہیں بلاتی تھی اس لیے اس کے لیے اس کا رویہ انہی نہیں تھا۔ اندر آ کر اس نے سب سے پہلے ایک انجکشن تیار کیا اور فیصل کے بازو میں لگا دیا۔ سوئی کی چھن پر وہ تھوڑا سا گھسسا یا تو ضرور لیکن آنکھ نہیں کھولی۔ وہ سر ہانے بھی پٹیاں رکھتی رہی۔ بخار کی شدت کم ہوئی تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ضوئی نے اسے کلی وغیرہ کر کے آنے کو کہا پھر چائے کے ساتھ بسکٹ اور کھانے کی دوا میں دیں۔ وہ صرف ایک بسکٹ کھانے اور ادا کپ جائے پی۔ ضوئی اسے آرام کا کہہ کر خود چن میں مصروف ہو گئی۔ دوپہر میں کھانا نہ کھانے کے باوجود کچھ کھانے کا دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن جسم کو تو نانی کے لیے غذا کا ایندھن تو فراہم کرنا تھا۔ اس نے اپنا پسندیدہ چکن اور سبز یوں کا

ارادہ نہیں رکھتا۔“ وہ ضوئی کو مزید تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا۔

”ان حالات میں تو آپ کا یہاں سے نکلنا بہت خطرناک ثابت ہوگا؟“

”نکلنا تو ہے، میں آپ کو مزید کتنی زحمت دے سکتا ہوں۔“ اس کی تشویش پر وہ اداس سا مسکرایا۔

”اپنے جانا ٹھیک نہیں رہے گا۔ آپ آج رات یہیں ٹھہر جائیں۔ کل نیک میں کوئی انتظام کروں گی اور آپ کی طبیعت بھی تسخیل جائے گی۔“

”کیسا انتظام؟“ وہ اس کے مشورے پر حیران ہوا۔

”نیا نیک اپ اور لباس۔ میرے پاس غلطی صاحب جیسی مہارت تو نہیں ہے لیکن تعمیر میں کام کرنے کی وجہ سے تھوڑی سی شہد بد ہے۔۔۔۔۔ کل میں مارکیٹ سے سارا ضروری سامان خرید لائوں گی۔ آپ حلیہ بدل کر یہاں سے چلے جائے گا۔“

اس کی تجویز پر وہ کچھ دیر حند بذب سا بیٹھا رہا پھر محسوس کیا کہ مان لینے میں ہی بہتری ہے۔ اس کی رضامندی پا کر ضوئی نے اسے رات کو سونے سے قبل لی جانے والی دواؤں کے سلسلے میں ہدایت دی اور ایک کبل فراہم کر کے خود اپنی خواب گاہ میں بند ہوگئی۔

دوسرے دن ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر گیارہ ساڑھے گیارہ بجے وہ باہر جانے کے لیے تیار تھی۔ اس کے جانے کے بعد فیصل آواز بند کر کے ٹی وی دیکھتا رہا تاکہ باہر موجود وحید کو ہاں کسی کی موجودگی کا احساس نہ ہو۔ کچھ دیر بعد اس شغل سے اکتا کر جانے اسے کیا سمجھی کہ رقم والا بیگ نکال کر لے آیا۔ کیا نیک ہی اسے لگا تھا کہ ابھی پوری رقم لے کر یہاں سے نکلنا مناسب نہیں ہوگا۔ ابتدائی ضرورت کے لیے کچھ ڈالر نکال کر ایک دروازے میں ڈالنے کے بعد اس نے بیگ اٹھایا اور سیز حیاں چڑھ کر اوپر جانے لگا۔ ابھی وہ پہلی سیڑھی کی لینڈنگ پر ہی تھا کہ اس نے دروازہ کھلنے کی تہم آواز سنی۔ اس کے حساب سے ضوئی کو اتنی جلدی واپس نہیں آنا چاہیے تھا پھر وہ کیوں آئی تھی اس سوال کے جواب کے لیے اس نے بہت احتیاط سے نیچے جھانکا اور یہ دیکھ کر چونک گیا کہ پینکے کے ملازم وحید کھلے دروازے سے اندر آ رہا ہے۔ وہ چابی سے دروازہ کھول کر آیا تھا اور سیدھا بیڈ روم کی طرف بڑھ گیا تھا۔

بالکن کی غیر موجودگی میں اس کا اس طرح اندر آنا

بے حد مشکوک تھا۔ فیصل خطرہ مول لیتے ہوئے دبے قدموں چند سیز حیاں نیچے اترا اور جھانک کر دیکھنے لگا۔ وحید کو کمر میں اپنے سوا کسی کی موجودگی کا گمان بھی نہیں تھا اس لیے وہ بے فکرگی سے اپنے کام میں مصروف تھا۔ فیصل کے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے الماری کھولی اور اس کے خانوں کی تلاشی لینے لگا۔ فیصل کو کھ ہوا کہ وہ بالکن کی غیر موجودگی میں نقب لگا کر اس کا مال لوٹ رہا ہے لیکن وہ اسے کچھ بھی لکھتا ہوا دکھائی نہیں دیا۔ الماری کے بعد وہ ڈریسنگ اور سائڈ ٹیبل کی درازیں کھٹکاتے لگا۔ ان میں سے ایک دروازے میں فیصل کے رکھے ہوئے ڈالر بھی موجود تھے لیکن وحید نے آٹھ اٹھا کر بھی ان کی طرف نہیں دیکھا۔

ایسا لگ رہا تھا کہ اسے کسی خاص شے کی تلاش ہے۔ وہ خصوصیت سے کاغذات اور فائلیں وغیرہ دیکھ رہا تھا۔ آخر کچھ دیر بعد وہ مایوس ہو گیا اور جیب سے موبائل نکال کر ایک نمبر مایا۔

”میں نے سب دیکھ لیا ہے سرجی! یہاں سے کچھ نہیں ملا۔“ دوسری طرف سے کال موصول کیے جانے پر اس نے کسی کو اطلاع دی۔

”میں اتنا بھی آن پڑھ نہیں ہوں جی کہ مجھے نکاح نامے کا پتا نہ چلے۔ نکاح نامہ کونسا انگریزی میں ہوتا ہے جو مجھے پڑھنا نہیں آئے گا۔ میں نے میڈم کا ایک ایک کاغذ دیکھ لیا ہے۔ یہاں کچھ نہیں ہے۔“ دوسری طرف سے اُسے جانے کیا کہا گیا کہ وہ فحشی بھرے لہجے میں زور زور سے بولنے لگا پھر رک کر دوسری طرف کی بات سننے لگا۔

”ٹھیک ہے۔ آپ بولتے ہیں تو میں اوپر بھی دیکھ لیتا ہوں۔ ویسے مجھے امید نہیں کہ وہاں کچھ ملے گا۔ اوپر بھی سارا سامان میں نے رکھا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ اوپر کے کمرے کی الماری خالی پڑی ہے۔“ آواز بلند ہونے کی وجہ سے فیصل کو سب سنائی دے رہا تھا۔ وحید کے اوپر جانے کا ارادہ بن کر وہ پھرتی سے بے آواز سیز حیاں چڑھتا چلا گیا اور پہلی منزل پر رے بغیر سیدھا چھت پر پہنچ گیا۔ وہیں سے وہ نیچے کی سن کن لیتا رہا۔ کچھ دیر آواز بن سنائی دیتی رہی پھر خاموشی چھانے پر اندازہ ہوا کہ وحید واپس نیچے چلا گیا ہے۔ وحید کے کردار پر غور کرتا ہوا وہ کچھ دیر اوپر ہی بیٹھا رہا پھر دھوپ میں سوکھنے کے لیے پڑی اپنی جیکٹ اتار کر پہلی منزل پر آ گیا۔ وحید کی حرکت کے بعد اس کے اندر بہت نہیں سمجھی کہ نیچے کی منزل پر چلا بیٹھا۔ یہ تو اچھا ہوا تھا کہ خوفناک باہر جانے سے قبل اس کا بیل وغیرہ

صاحب نے مجھ سے رابطہ کیا اور شادی کی آخری۔ آپ جانتے ہی ہوں گے کہ وہ کتنی اچھی شہرت کے مالک ہیں۔ میں نے ان کے پروڈیوزر پر غور کیا تو مجھے لگا کہ ہاں کرنا میرے حق میں بہتر ہوگا۔ میں ساری زندگی تنہا تو نہیں گزار سکتی تھی اس لیے بہتر تھا کہ ملک صاحب جیسا مضبوط سہارا تمام لیتی۔ میرے ہاں کرتے ہی ہمارے خفیہ نکاح کا انتظام ہو گیا۔ ملک صاحب نے کہا تھا کہ وہ اپنی کچھ مجبور یوں کی وجہ سے فوری طور پر اس شادی کو انڈس نہیں کر سکتے۔ مجھے ان کی یہ شرط مانتی پڑی اور میں اس ہنگامے میں ایک ایسی عورت کی حیثیت سے رہنے لگی جس کا شوہر ملک سے باہر ہے۔ ملک صاحب کا جب دل چاہتا ہے مجھے ملاقات کے لیے بلا لیتے ہیں۔ ان ملاقاتوں کا جو نتیجہ نکلتا چاہے تھا، وہ کھل چکا ہے لیکن میں ملک صاحب کو بتانے کی ہمت نہیں کر سکی۔ انہوں نے اس معاملے میں مجھے باہنڈی کا حکم دیا تھا لیکن میں اس حکم پر عمل نہیں کر سکی۔ مجھے معلوم ہے کہ اگر میں نے انہیں بتا دیا تو وہ مجھے ابارشن کا حکم دیں گے اور میں ایسا نہیں چاہتی۔ میں نے نکاح کیا ہے، کوئی گناہ نہیں جسے چھپانے کے لیے ایسا بیباک جرم کروں۔ مجھے معلوم ہے کہ ایک دو ماہ میں تبدیلیاں نمایاں ہوں گی تو ملک صاحب کو بھی پتا چل جائے گا لیکن اس وقت وہ مجھے ابارشن کروانے پر مجبور نہیں کر سکیں گے۔ وہ جکی نظروں سے فیصل کو اپنے بارے میں بتا رہی تھی۔

”تو کیا آپ کا خیال ہے کہ وہ شادی کو انڈس کر دیں گے؟“ فیصل نے اس سے پوچھا۔

”پہلے مجھے لگتا تھا کہ میں ان سے اپنی بات منوالوں کی لیکن جب سے مجھے اطلاع ملی ہے کہ وہ جادل علی شاہ کی بیٹی سے شادی کر رہے ہیں، مجھے یہ ممکن نظر نہیں آتا اور میں بہت پریشان ہوں کہ میں کیا کروں۔ میں چھ ماہ سے یہاں رہ رہی ہوں۔ سب کو معلوم ہے کہ میرے شوہر چھ ماہ سے زیادہ عرصے سے ملک سے باہر ہیں ایسے میں جب میرے ہاں بچے کی ولادت ہوگی تو لوگ میرے کردار پر انگلیاں اٹھائیں گے۔ میرا ڈرہ گاؤں میں اپنی ماں اور بیٹی سے بھی ملنے کے لیے آنا جانا لگا رہتا ہے اور میں نے وہاں کسی کو اپنی شادی کے بارے میں نہیں بتایا ہے تو میں ان لوگوں کا سامنا کیسے کروں گی۔ بہت سوالات ہیں جو مجھے پریشان کرتے رہتے ہیں اور اب یہ نیا مسئلہ سامنے آ گیا ہے۔ یہ تو طے ہے کہ وحید، ملک صاحب کے کہنے پر نکاح نامہ تلاش کر رہا تھا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیوں؟ ملک

سمیت کر رکھ گئی تھی اور وہاں کوئی ایسی شے نہیں تھی جس سے اس کی موجودگی کا احساس ہوتا ورنہ شاید وحید چونک جاتا۔ وہ اوپر ہی بیٹھ کر رضوی کی آمد کی سن گئی لیٹا رہا اور جب اندازہ ہوا کہ وہ واپس آگئی ہے تو سیز میوں پر جا کر دیر سے آواز نکال کر اسے اوپر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ حیران سی اوپر آگئی۔ وہ اسے اپنے ساتھ اوپر گیسٹ روم میں لے گیا اور جو دیکھا اور سنا تھا سب گوش گزار کر دیا۔ وہ فحش چہرے کے ساتھ سب سنی رہی پھر ہاتھوں میں سر قائم کیا۔

”وحید کو آپ نے کس کے کہنے پر ملازم رکھا تھا؟“ فیصل نے پوچھا۔

”میرے شوہر خود.....“ جواب دیتے ہوئے اس نے ایک دم اپنا جملہ ادھر اور اچھوڑ دیا۔ بہت کچھ تھا جو خود بخود اس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ وہ یک دم ہی بہت بڑا حال نظر آنے لگی۔

”آپ چاہیں تو مجھ سے شیئر کر سکتی ہیں۔ آپ نے مجھے پناہ دے کر میرے اوپر احسان کیا ہے۔ شاید میں اس احسان کا بدلہ چکا سکوں۔“ فیصل نے اس کی حالت دیکھتے ہوئے ہمدردی سے کہا۔

”کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ جب میں خود اپنے لیے کچھ نہیں کر پاری تو کوئی دوسرا میرے لیے کیا کرے گا۔“ اس کے لہجے میں شکست خوردگی تھی۔

”اور کچھ نہیں تو آپ کا بوجھ ہی کم ہو جائے گا۔ مجھے لگتا ہے کہ آپ بہت زیادہ ذہنی دباؤ اور تنہائی کا شکار ہیں۔“ فیصل نے اس کے بارے میں بالکل درست تجزیہ کیا تو وہ یک دم ہی بھر بھری مٹی کی طرح ڈھس گئی۔ واقعی اسے اپنے اندر کی بات کہنے کے لیے کسی سہارے کی ضرورت تھی خواہ وہ فنی ہی ہو۔

☆☆☆

”میں نے زندگی میں قدم قدم پر بھیڑیوں کا سامنا کیا لیکن کبھی اپنی عزت پر آٹھ نہیں آنے دی۔ نرسنگ کا شعبہ خدمت کا ہے لیکن لوگ اپنے رویے سے اسے بدنام کر دیتے ہیں۔ ان بڑے رویوں کو سہتے ہوئے ایک دن میری ملاقات ملک احسن سے ہوئی۔ ان کی نظروں میں، میں نے اپنے لیے پسندیدگی دیکھی لیکن انہوں نے میرے ساتھ کوئی غلط حرکت نہیں کی۔ ایک بار ان کے بی اے نے بدتمیزی کی تو میں نے اسے شیک خاک جھاڑ پلا دی۔ اسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد اچانک ہی ملک

صاحب کو نکاح نامے کی کیا ضرورت پڑ گئی؟“ وہ ابھی ہوئی تھی۔

”وہ نہیں چاہے کہ آپ کے پاس نکاح کا ثبوت باقی رہے اور آپ ان کے لیے کوئی مسئلہ کھڑا کریں۔ سجاد شاہ کی بیٹی سے شادی کرنے کی صورت میں وہ آپ سے نکاح کا حکم ہونے کا غصہ مول نہیں لے سکتے۔“ فیصل نے اس کے سوال کا سیدھا سادا جواب دیا۔

”اور میں یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ کوئی میرے کردار پر انگلی اٹھائے۔“ وہ مضطرب سی ہو کر کھڑی ہو گئی۔

”آپ کا نکاح نامہ کہاں ہے؟ میرے خیال میں آپ اسے کسی بہت محفوظ جگہ پر رکھ دیں۔“

”وہ تو وہیں الماری میں رکھا تھا، پتا نہیں کیوں وحید کو نہیں ملا۔“

”آپ چل کر چیک کر لیں پھر اسے کہیں محفوظ کر دیتے ہیں۔“ فیصل نے اس سے کہا اور دونوں نیچے آ گئے۔

اس گھر کے سارے دروازے ایسے تھے جن پر آٹھ چمک لاک لگے ہوئے تھے اور دروازوں میں کئی پاؤں نہیں تھیں یعنی وحید جب چاہے لاک کھول کر اندر آ سکتا تھا لیکن

ضوشتاں کی موجودگی میں اس سے اس حرکت کی امید نہیں تھی۔ اس لیے فیصل بغیر کھلے نیچے آ گیا تھا۔ اس کے سامنے

ضوشتاں نے ساری الماری کھال ڈالی لیکن اسے نکاح نامہ نہیں ملا۔ اس کی پریشانی دیکھتے ہوئے فیصل کی نظریک

دم ہی الماری کے نیچے سے جھانکتے سفید کاغذ کے ایک کوٹے پر پڑی۔ اس نے جتوں سے بل الماری کے قریب

بچھ کر دو اگھیلوں کی پوروں سے آہٹکی سے پکڑ کر کھینچا تو پورا کاغذ باہر آ گیا۔ وہ ضوشتاں اور ملک احسن کا نکاح نامہ تھا۔

ضوشتاں حیرت سے اسے دیکھتی رہی۔

”اب ہم اسے کہیں محفوظ کر دیتے ہیں۔“ فیصل نے اس سے کہا۔

”ٹھوڑی دیر میں ہی وہ اور ہیلڈ ٹینک کا ڈھکن اٹھائے پولی تھین میں لپٹا ایک ٹیکٹ بڑی مہارت سے

ٹینک کی سمیت کے ساتھ چسپاں کر رہا تھا۔ وحید کو ضوشتاں نے اس کے کہنے پر سودا سلف لینے کے لیے بازار بھیج دیا تھا

تاکہ اسے ادھر ہونے والی کسی کارروائی کی جھجک نہ پڑ سکے۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ گیٹ روم اور ضوشتاں

نیچے کچن میں چلی گئی تھی۔ ضوشتاں اور اس کے درمیان اتنا مبرور سا قاتح ہو چکا تھا کہ اب کسی نگرانی کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ تقریباً پون گھنٹے بعد ضوشتاں کھانے کی

ٹرے لے کر اوپر آئی تو اس نے بتایا۔

”ملک صاحب کا فون آیا تھا، کہہ رہے تھے کہ کچھ ڈاکوئٹس کی تیاری کے لیے انہیں نکاح نامے کی ضرورت

ہے۔ وحید سے مجھادو۔ میں نے ان سے کہا کہ میں نکاح نامہ نہیں رکھ کر بھول گئی ہوں۔ تلاش کر کے دیکھتی ہوں اگر

مل گیا تو مجھادوں گی۔“

”انہوں نے غصوں تو نہیں کیا کہ آپ بہانہ بنا رہی ہیں؟“

”پتا نہیں۔ بس خفا ہو رہے تھے کہ اتنی اہم چیز میں نے سنبھال کر نہیں رکھی۔“ اس نے شانے اچکائے۔

”مجھے تو حیرت ہے کہ انہوں نے نکاح نامہ آپ کی کھڑی میں دے ہی کیسے دیا تھا؟“

”میں نے مانگا تھا اور عموماً لوگ نئی دہن کی فرمائش پوری کر دیتے ہیں۔“ وہ یاسیت سے مگرانی۔

”کھانا بہت اچھا بناتی ہیں آپ۔“ فیصل نے یک دم ہی موضوع بدل دیا۔ چائینیز راکس اسے بچ بچ پسند آئے

تھے اور وہ رغبت سے کھا رہا تھا۔

”اپنے لیے تو ایسے ہی بے دلی سے کچھ بھی تیار کیا جاتا ہے۔ صرف اپنے لیے کہاں محنت کر کے کچھ پکانے کا دل چاہتا ہے، تو آپ کا احساس کر کے ٹھوڑی محنت

کر لی ہے۔“ وہ اس خوب صورت گھر میں تمام تر آسائش کے ساتھ رہ کر بھی ادھوری تھی کہ اس کے حصے

میں ایک ناول فلی لائف نہیں آ سکتی تھی۔

”میں نے اپنے پلان میں ٹھوڑی سی تبدیلی کی ہے۔ مجھے ایک بندے کا خیال آیا ہے، رابطہ ہو جائے تو اس سے

لے لے جاؤں گا۔ مجھے اور میری فلی کو باقی روڈ کی قریبی ملک نکال سکتا ہے۔ وہاں سے ہم باقی اتر لندن چلے جائیں

گے۔ اس طرح ہاس کے اچھ آئے کا فوری خطرہ ختم ہو سکتا ہے۔ میری بیٹی کا علاج ہو جائے تو اس کے بعد میں ہر طرح

کے حالات سے نمٹ لوں گا۔“ وہ ایک بار پھر موضوع بدلنے پر مجبور ہو گیا۔

”اسی لیے آپ نے رقم چھپا دی ہے۔“ اس نے اندازہ لگایا۔

”ہاں، فوری ضرورت کے لیے کچھ رقم نکال کر باقی میں نے چھپا دی ہے۔ انتظامات ہونے کے بعد میں ایک بار پھر آپ کو زحمت دوں گا۔“

”اور اگر اس عرصے میں، میں نے آپ کی رقم پر قبضہ کر لیا؟“

”آپ اتنے امیر شخص کی بیوی ہیں اور مستقبل میں

سکتا تھا۔ اچھی بات یہ تھی کہ اس نے اپنی موجودگی کا کوئی نشان دہاں نہیں چھوڑا تھا۔ پورے گھر کی ڈسٹنگ کر کے انگلیوں کے نشانات مٹانے کے علاوہ اپنے استعمال کی چیزیں ایک شاہر میں بھر کر جاتے جاتے پھرے میں چھپک گیا تھا۔ رانیہ کی طرف سے مگر مہر ہونے کے باوجود غلت سے کام لینے کے بجائے اس نے اس معاملے کی دھول بھیننے کا اہتمام کیا تھا۔ یہ اطمینان ہو جانے کے بعد کہ اب پولیس ضوفی کے ہتھکے کا رخ کرنا چھوڑ چکی ہوگی، رقم ٹکا لے گیا۔ اس رات رمشا کو دوست بن کر ملنے والا شخص فیصل ہی تھا۔

☆☆☆

”ہم..... م..... تو اب کیا چاہتے ہو تم؟“ ملک احسن نے اپنے سامنے رکھے کناخ نامے پر ایک نظر ڈالی اور بے نیاز انداز میں اپنے سامنے بیٹھے انسپٹر اسد سے دریافت کیا۔

”مجھے معلوم ہے سر کہ یہ کناخ نامہ رجسٹرڈ نہیں ہے اور آپ اسے یہ آسانی جعلی قرار دے سکتے ہیں لیکن میرے پاس ایک ایسا ناقابل تردید ثبوت بھی ہے جسے آپ کسی صورت نہیں جھٹلا سکتے۔“ اس نے ایک اور کاغذ ملک احسن کی طرف بڑھایا۔

”ضوفشاں بی بی تین مہینے کی حاملہ تھیں۔ پہلے میں نے اس پوائنٹ کو نظر انداز کر دیا کہ ایک شادی شدہ عورت کا حاملہ ہونا کوئی انوکھی بات نہیں ہوتی لیکن پھر یہ کناخ نامہ سامنے آ گیا اور کچھ وقت کا حساب کتاب کیا۔ تھوڑی مدد سائینس نے کی۔ نامکمل بچے کے ڈی این اے کا نمونہ ریکارڈ میں تھا اسے آپ کے ڈی این اے سے میچ کیا گیا تو ثابت ہو گیا کہ وہ آپ کا بی بی تھا اور ضوفشاں بی بی بچے کے آپ کی منکوحہ بیوی تھیں۔“ ملک احسن کے کاغذ پر کبھی رپورٹ پڑھنے کے دوران میں وہ زبانی بھی سب بتا چکا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ میں یہ سب مان لیتا ہوں لیکن اس سے کیس پر کیا فرق پڑنے والا ہے۔ اس کا قاتل ثبوتوں سمیت گرفتار ہو چکا ہے، آپ اُسے سزا دیں۔ اگر مجھے کسی اسکینڈل کے ذریعے بدنام کرنا چاہتے ہیں تو یاد رکھیں اسکینڈل اور سیاست داں کا چوٹی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ میں اس اسکینڈل سے نکل جاؤں گا لیکن آپ اس کے بعد کہاں ہوں گے، یہ کہنا مشکل ہے۔“ دیمی آواز میں بولتے ملک احسن کے لیے جس ایسی سر مہری تھی کہ انسپٹر اسد کی

جگہ کوئی اور ہوتا تو گھبرا جاتا لیکن وہ ذرا سا مسکرایا اور بولا۔
”میں اسکینڈل پر ٹوکس کرنے والا آدمی نہیں ہوں سراسیمہ حقائق کی دیکھ بھج کر دم لیتا ہوں۔ میں گرفتار ملزم وحید سے سارے سچ اگلوں کا چکا ہوں۔ اس نے بیان دیا ہے کہ اس نے جو کچھ کیا اس کی ہدایت اسے آپ کے بی بی اے نے دی تھی۔ وہ ایسا کرنے پر اس لیے مجبور ہوا تھا کہ اسے دھمکی دی گئی تھی کہ اگر اس نے حکم عدولی کی تو اس کے سارے خاندان کو عیسیت و نابود کر دیا جائے گا اور اس کی جوان بہن کو سر عام بے عزت کیا جائے گا۔“

”اس نمک حرام کے بدترین انجام کے لیے تو میں خود بے چین ہوں۔ اس نے حد سے تجاوز کیا ہے۔ اس کی ہمت کیسے ہوئی کہ وہ میری منکوحہ عورت کے ساتھ زیادتی کرے۔ چھائی کے پھندے پر چڑھنے سے قبل وہ اپنے خاندان کی ایک ایک عورت کا منہ کالا ہوتا ہوا دیکھے گا۔“ ملک احسن غضب ناک ہوا۔

”لیکن اس کا تو کہنا ہے کہ اس نے جو کچھ کیا حکم کے مطابق کیا اور نہ وہ میڈم ضوفی کی بہت عزت کرتا تھا۔“
”ضوفی تو وہ دنیا کے لیے تھی۔ میں تو اسے روشن کہا کرتا تھا۔ اس کا روشن چہرہ اور روشن آنکھیں مجھ پر ایسا جادو کر گئی تھیں کہ میں اسے اپنانے پر مجبور ہو گیا تھا لیکن اس نے میری مجبور یوں کو نہیں سمجھا اور میری مرضی کے خلاف چلنے لگی۔ وہ بھی تھی کہ مجھے بچے والی بات کا علم نہیں لیکن مجھے پتا چل گیا تھا کہ آج کل وہ باقاعدگی سے ایک لیڈی ڈاکٹر سے چیک آپ کروا رہی ہے۔ باقی سب معلوم کرنا کون سا مشکل تھا۔ کاش اس نے میری مجبور یوں کو سمجھا ہوتا تو آج زندہ ہوتی۔“ ملک احسن کی ذہنی رواجانک ہی بہک گئی اور وہ بڑبڑانے والے انداز میں بولا۔ انسپٹر اسد اس کی بات سننے کے ساتھ ساتھ کسی اور کتے پر بھی غور کر رہا تھا چنانچہ جیسے ہی ملک احسن خاموش ہوا تو وہ بولا۔

”میری معلومات کے مطابق جن دنوں آپ اسپتال میں داخل تھے، آپ کے بی بی اے اکبر نے بھی میڈم ضوفشاں پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی تھی اور مت کی کھائی تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے اس نے موقع سے فائدہ اٹھایا ہو اور وحید کو حد سے تجاوز احکامات جاری کیے ہوں۔“

”اگر ایسا ہے تو اسے اس کا خیازہ بھگتنا پڑے گا۔“ ملک احسن کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس نے اتھر کام پر اکبر کو کال کیا۔ اکبر کو اپنے سامنے کھڑا کر کے سچ اگلوں نے میں

کے مزاج کے خلاف تھا۔ وہ بہت صفائی اور نفاست پسند عورت تھی اور گھر کو خوب سجا سٹوار کر رکھتی تھی پھر یہاں اس گھر کا یہ حال کیوں تھا۔ ان ساری چیزوں میں اگر اسے کوئی صاف شے نظر آتی تھی تو وہ رانیہ کے کپڑے اور کھلونے تھے لیکن وہ بھی الماری میں رکھے ہونے کے بجائے ایک صوفے پر پڑے ہوئے تھے۔ یہ سب کیا تھا؟ یہ جاننے کے لیے اسے ایک بار پھر فرح کے پاس جانا پڑا۔ وہ بستر پر اسی طرح آنکھیں کھولے ساکت لیٹی تھی۔

”خدا کے لیے فرح! کچھ تو بولو کہ یہ سب کیا ہے اور میری رانیہ کہاں ہے؟“ فیصل نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے اور لجاجت سے بولا تو فرح کے ہونٹوں میں ہلکی سی جھنجھٹ ہوئی اور وہ سرگوشی کے انداز میں بولی۔

”وہ چلی گئی فیصل! اس کا جانا ملے تھا لیکن میں اور تم یہ بات سمجھ نہیں پائے۔“

”کہاں چلی گئی؟“ اس کی بات سن کر فیصل کو کمرٹ سا لگا۔ جو سمجھ آ رہا تھا، وہ اسے سمجھنا نہیں چاہتا تھا۔ ”کون لے گیا ہے اسے؟“ وہ دوسرے چلایا۔

”موت کا فرشتہ۔“ فرح کا دھمکے لہجے میں دیا ہوا جواب ایسا تھا جس نے فیصل کی ذات کے پرہیزگار دہانے پر دھک دیا۔

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو فرح! ایسے کیسے ہو سکتا ہے؟ ڈاکٹر نے تو کہا تھا کہ اسے فوری طور پر اتنا خطرہ نہیں ہے۔ ہمیں اس کے بہترین علاج کا انتظام کرنے کے لیے ہسپتال مل سکتی ہے۔ پھر..... پھر کیسے وہ موت کے فرشتے کے ساتھ چلی گئی؟“ فرح کی حالت گواہی دے رہی تھی کہ وہ المناک واقعہ پیش آچکا ہے لیکن فیصل ماننے کو تیار نہیں تھا۔ وہ ڈاکٹر کی رائے کو قدرت کے فیصلے کے آگے دیکل بتا کر ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ موت کے فرشتے سے اس کی بیٹی کو لے جانے میں غلطی ہوئی ہے۔

”وہ اپنی بیماری سے نہیں مری فیصل! وہ تمہاری محبت میں مری۔“ فرح کے جملے نے اسے ساکت کر دیا۔

”تمہیں پتا ہے تاکہ وہ تمہارے بغیر نہیں رہ پاتی تھی۔ میں نے اسے بہلانے اور سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن اس کی بھی ضد تھی کہ مجھے بابا کے پاس جانا ہے۔ تم نے اسے کوئی خواہش کوئی بات رد کیے جانے کا عادی بھی تو نہیں بنایا تھا۔ میرے منہ کرنے کے باوجود بالکل اچانک وہ دروازہ کھول کر گھر سے باہر نکل کر بھاگ گئی۔ میں ننگے پیروں بغیر دوپٹے کے اس کے پیچھے بھاگی پھر بھی مجھے وہ پر

اسے پانچ منٹ بھی نہیں لگے اور چھپے منٹ پر اکبر دنا میں نہیں تھا۔ انپکٹر اسدا آنکھیں پھاڑے ملک احسن کی جرأت ملاحظہ کر رہا تھا کہ اس نے اس کی موجودگی میں اکبر کی کھوپڑی میں روشن دان بنادیا تھا۔ ڈراخوف زدہ نہیں تھا کہ اسے اس جرم میں گرفتار کیا جاسکتا ہے۔

☆☆☆

بکھرے بال، اندر کو دھنسی آنکھیں، مرجھائی ہوئی سیاہ پرتی رنگت اور سوکھے پتھر کی زرد ہونٹ..... اس عورت کو فرح کی حیثیت سے شناخت کرنے میں فیصل کو بے انتہا مشکل پیش آئی۔

”فرح..... فرح..... یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے میری جان! اتنے تھوڑے سے دنوں میں تم نے اپنا یہ کیا حال کر لیا ہے؟“ اس نے فرح کے پتھر مردہ سے وجود کو اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ اس کے ہاتھوں کا سہارا پا کر وہ بھر پوری مٹی کی طرح ڈھلے گئی۔ اگر فیصل اسے مضبوطی سے پکڑا ہوا نہ ہوتا تو وہ زمین پر گر جاتی۔ اس کی اس حالت پر وہ بے پناہ تشویش میں مبتلا اسے اپنی ہاتھوں میں اٹھائے اندر لے گیا۔ اسے بستر پر لٹا کر رخسار چھتے ہوئے اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ ہوش میں نہیں آئی تو ایک جگہ میں پانی بھر لایا اور اس کے منہ پر پانی ڈال کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کی۔ یہ تدبیر کارگر ثابت ہوئی اور فرح نے آنکھیں کھول دیں لیکن اس کی آنکھوں میں ویرانی تھی اور وہ بس ایک تک اسے دیکھے جا رہی تھی۔

فیصل نے اس سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن وہ کوئی جواب ہی نہیں دے رہی تھی۔ فیصل کا دل بڑی طرح ہولنے لگا اور وہ یک دم ہی کمرے سے نکل کر رانیہ کو آواز دیں دینے لگا۔ اب تک اس کا خیال تھا کہ رانیہ ساتھ والے کمرے میں سو رہی ہوگی اس لیے اسے نظر نہیں آئی لیکن اس نے دیکھا کہ کمرہ خالی پڑا ہوا تھا۔ دو کمروں اور لاؤنج پر مشتمل اس چھوٹے سے گھر میں رانیہ کو ڈھونڈنے میں کتنی دیر لگ سکتی تھی لیکن فیصل اسے ڈھونڈتا رہا۔ پیڑز اور صوفوں کے نیچے، دروازوں اور پردوں کے پیچھے، کچن کے کینٹین اور واش روم کے اندر..... اس نے اسے ایسے ڈھونڈا جیسے وہ پکی نہیں کوئی چھوٹی سی، تنہی سی گڑیا ہے جو کسی بھی کوئے کھدرے سے مل جائے گی لیکن وہ نہیں ملی۔ گھر کی حالت بھی عجیب اجڑی تھی۔ ہر طرف دھول مٹی ہو رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ یہ گھر صفائی سے کسے محروم رہا ہو۔ یہ فرح

گئی۔ میں اس کی رفتار کا مقابلہ نہیں کر سکی اور وہ مجھ سے بہت آگے نکل کر سرسبز پہنچ گئی۔ اچانک ہی وہاں سے ایک تیز رفتار ٹرک آیا اور.....“ فرح اپنا جملہ مکمل کیے بغیر یوں خاموش ہو گئی جیسے اس کے گلے میں کوئی گولا اٹک گیا ہو لیکن حیرت انگیز طور پر اس کی آنکھیں بالکل خشک تھیں اور ان سے ایک آنسو بھی نہیں نکلا تھا۔ وہ پچھلے چند دن میں رائیہ کو اتنا درد چکی تھی کہ اس کے آنسو بھی خشک ہو گئے تھے۔ فیصل یہ سب سن کر بہت دیر تک ہلکے ہلکے کر دوتا رہا پھر خود ہی خاموش ہو گیا۔ فرح یونہی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے اس کا رویہ ایسا بے ناز لگا۔

”تم..... تم اتنے بڑے دکھ کے ساتھ یہاں تنہا بیٹھی ہو۔ تم نے کسی کو بلایا کیوں نہیں یا خود سب کے پاس کیوں نہیں چلی گئیں۔“ اسے کچھ کچھ فرح کی کیفیت سمجھ آ رہی تھی۔ اس نے اتنا بڑا دکھ بالکل تنہا سہا تھا اور شاید ایسے اتنے ایسا نازل رویتے کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

”میں تمہارا انتظار کر رہی تھی فیصل! میں نہیں چاہتی تھی کہ میری وجہ سے تم کسی مشکل میں پڑ جاؤ۔“ فرح کے جواب نے اسے ساکت کر دیا۔ وہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ اسے زیادہ اچھی ماں سمجھے یا زیادہ وفادار بیوی۔ ایک ماں کی حیثیت سے وہ بیٹی کی جدائی کے غم میں راکھ جیسی ہو گئی پھر بھی اسے اپنے شوہر کے خوف کا احساس تھا۔ وہ نہیں بھولی تھی کہ اس کا منظر پر آنا اس کے شوہر کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔

”مجھے اس کے پاس لے چلو فرح! میں اُسے پیار کرنا چاہتا ہوں۔“ اس نے فرح سے درخواست کی تو وہ اپنے وجود کی بچی بچی توانائیاں سمیٹ کر اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔

ان کے شہر سے بہت دور اس چھوٹے سے پُر سکون و خوب صورت قصبے کے قبرستان میں بنی اس ننھی سی قبر میں صرف چھ سالہ رائیہ دفن نہیں تھی، اس کے ساتھ اس قبر میں ان دو افراد کے دل، رومیں، خوشیاں، خواہشیں اور انگلیں سب دفن ہو گئی تھیں۔ بیٹی کی قبر سے لپٹ کر فیصل قبر کی مٹی میں اس کی خوشبو، لمس اور چکاریں ڈھونڈ رہا تھا۔ اس سے اگر اس وقت اس کی واحد خواہش پوچھی جاتی تو وہ یہی کہتا کہ ایک بار، بس ایک بار اسے اس کی بیٹی زندہ لوٹا دی جائے تاکہ وہ اسے دل بھر کر دیکھ لے اور خوب سارا پیار کر لے۔ جس بیٹی کی بیماری سے لڑنے کے لیے اس نے اپنی تو بتو تو دی تھی، وہ بیٹی اس سے ایسے چھین لی تھی کہ اس کی

زندگی بچانے کی جدوجہد کرنا تو دور کی بات وہ اس کا آخری دیدار بھی نہیں کر سکا تھا۔ فرح نے اسے بتایا تھا کہ لاش کی حالت ایسی تھی کہ اسے فیصل کے انتظار میں مردہ خانے میں رکھوانے کے بجائے فوراً دفن کر دینا ہی مناسب تھا۔ جس رضا کار تنظیم نے یہ کام انجام دیا تھا، انہوں نے فرح کو بھی بیٹی کی لاش نہیں دیکھنے دی تھی اور وہ بھی تابوت کے شیشے سے اس کے چہرے کی بس ذرا سی چمک ہی دیکھ سکی تھی۔

بہت دیر قبرستان میں گزار کر وہ دونوں میاں بیوی واپس اپنے ٹھکانے پر لوٹے تو بالکل تھی دامان تھے اور ڈالر زے ہمراہ پیکٹ جو فیصل جان پر مکمل کر اپنے ساتھ لایا تھا، ناقدری سے ایک تپائی پر پڑا تھا۔ وہ اپنی سب سے بڑی دولت کھوپکے تھے اور اب ان کے لیے قانون کا خزانہ بھی بے معنی و بے مصرف تھا لیکن یہ بھی بڑی سفاک حقیقت ہے کہ چاہے قلب و روح مردہ محسوس ہوں جب تک جسم سے روح کا رشتہ نہیں ٹوٹا، زندگی اپنا کوئی نہ کوئی تقاضا لے کر سامنے آ کھڑی ہوتی ہے۔ فیصل کے لیے بھی فرح کی حالت اپنے شک و جود کو سنبھال کر کھڑے ہونے کا بہانہ بن گئی۔ اس نے بیٹی کی جدائی کا بوجھ کسی نہ کسی طرح اٹھا لیا تھا لیکن فیصل کے آنے پر ہلکا کر رہ گئی تھی۔ اس رات فیصل اسے قصبے کے واحد اسپتال لے کر پہنچا تو وہ بخار میں بڑی طرح پھنک رہی تھی۔ اس کے سارے جسم پر لرزے کی سی کیفیت طاری تھی۔ اسپتال کا عملہ اسے مٹی اعداد دینے کے لیے اپنے ساتھ اندر لے گیا اور فیصل کو باہر ہی انتظار کرنے کا کہا گیا۔ انتظار گاہ میں ایک ایل ای ڈی ٹی وی لگا ہوا تھا جس پر خبریں چل رہی تھیں۔ وہ بے دھیانی میں خبریں دیکھنے لگا۔ اسکرین پر انسپکٹر اسد کا چہرہ نظر آیا تو اس کی بے توجہی خود بخود دھیان میں ڈھل گئی اور وہ غور سے اس کی بات سننے لگا۔ انسپکٹر اسد کہہ رہا تھا۔

”پولیس نے وحید نامی شخص کے خلاف ٹھوس ثبوت ملنے پر میڈیم سوشلائز عرف ضوئی قتل کیس کو حل شدہ کیس تصور کر کے اس پر کارروائی بند کر دی تھی لیکن پھر ایک انجان شخص نے ایسا کلیو دیا کہ ہم اس کیس پر دوبارہ سے کام کرنے پر مجبور ہو گئے اور اس کی حیرت انگیز باتیں سامنے آ گئیں۔ میری پولیس کو وہ کلیو دینے والے شخص سے گزارش ہے کہ وہ مجھ سے رابطہ کرے اور مکمل معلومات فراہم کر کے ہمارے کام کو آسان بنائے میں مدد دے۔ اس کی مدد ایک مظلوم کو انصاف دلوا دے گی۔ میں اس شخص کو یقین دہانی کرواتا ہوں کہ اس کی مرضی کے خلاف اس کا نام ظاہر نہیں

کے سامنے بھی ایک شرمندہ و نادام شخص کی حیثیت سے بات کر رہا تھا۔

”تم کام بتاؤ فیصل.....؟“ فرح نے کسی بھی بات پر تبصرہ کیے بغیر ویران آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پاٹ سے لچے میں مطالبہ کیا تو وہ ایک گہرا سانس لے کر اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کرنے لگا۔

☆☆☆

شہر کے مضافات میں واقع اس دو منزلہ ایک سوئیس گز کے گھر کے دروازے کی دایم جانب لگی کھینچی کے پٹن کو دہاتے ہوئے فیصل کو اپنے اندیشوں میں غاسی کی محسوس ہوئی۔ یہ سادہ سا گھر گواہی دے رہا تھا کہ اس کا کلین رشوت اور حرام خوری سے دور ہے اور پولیس کے جھگے میں ایسے لوگ شاید انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے۔ اسے اپنی زندگی میں جن پولیس افسران وغیرہ کے گھر دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا، ان کی ایک ایک اینٹ گواہی دیتی تھی کہ بنوانے والے نے اپنی آمدنی سے بہت زیادہ مال خرچ کر کے ان گھروں کو تعمیر کروایا ہے لیکن انسپٹر اسد کا گھر بہت سادہ اور کافی پرانا بنا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ انسپٹر اسد نے فیصل پر اچھل کرتے ہوئے اپنا فون نمبر بھی بتایا تھا جسے فیصل نے نوٹ کر لیا تھا اور قحبے سے نکلے ہوئے ایک کال آفس سے اسد سے رابطہ کیا۔ اس رابطے پر اسد نے تھانے آنے کے بجائے اپنے گھر آنے کی دعوت دی تھی۔ اس کے مطابق ضوئی کلک بیس کے ڈانڈے جس بڑے آدمی سے جا کر مل رہے تھے، وہ اتنا بار سونگ تھا کہ اس کے معاملے میں وہ اپنے عملے پر بھی اعتماد نہیں کر سکتا تھا کہ جانے ان میں سے کون اس کا خیر ہوا اس لیے بہتر یہی تھا کہ فیصل تھانے سے ہٹ کر اس سے ملاقات کرتا۔ انسپٹر نے اسے اپنے گھر بلایا تھا اور وہ اس کے گھر پہنچ چکا تھا۔ کھینچی کے رومل میں دروازہ کھلا تو فیصل نے انسپٹر اسد کو اپنے نو رو برو کھڑا پایا۔ وہ اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”میرا نام فیصل ہے اور میں ضوئی مرڈر کیس میں آپ سے تعاون کے لیے آیا ہوں۔“ فیصل نے اپنا تعارف کروایا۔

”اوہ سرفیصل..... یقین کریں، میں نہایت شدت سے آپ سے ملاقات کا خواہش مند تھا۔“ انسپٹر اسد نے نہایت گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا اور پھر اسے اپنے ساتھ لیے ہوئے اندر کی طرف بڑھ گیا۔ ڈرائنگ روم بھی بہت سادہ تھا۔

کیا جائے گا اور پولیس اسے تحفظ فراہم کرے گی۔“ انسپٹر اسد کی اچھل نے فیصل کو متاثر کیا۔ ایک ایسے نظام میں جہاں زیادہ تر لوگ بدحرام اور کام چور تھے، اگر ایک شخص فرض شناسی کے ساتھ کام کر رہا تھا تو یقیناً وہ لائق تحسین تھا اور اس قابل تھا کہ اس کی درخواست پر کان دھرے جائیں۔

دوسرے دن فرح کو اسپتال سے ڈسچارج کر داکر لانے کے بعد تک وہ اس سلسلے میں حتیٰ فیصلہ کر چکا تھا۔ اس نے فرح کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا تو وہ پریشان ہو گئی اور بے قراری سے بولی۔

”اگر تمہارے لیے کوئی مسئلہ کھڑا ہو گیا تو.....؟“
”انسپٹر اسد نے تحفظ کی یقین دہانی کر دائی ہے۔ ویسے بھی اب زندگی میں ایسا کیا رہ گیا ہے جس کے لیے میں اپنی اتنی پروا کروں۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ اپنی پروا کرنے کا نہیں کفارہ ادا کرنے کا وقت ہے۔ میں نے اللہ سے کیا ہوا وعدہ تو ذکر اسے خفا کر دیا تھا اب حق کی خاطر ایک سچ بولوں گا تو شاید وہ مجھ سے راضی ہو جائے۔“ اس کی دلیل ایسی تھی کہ فرح کے پاس اسے روکنے کی گنجائش نہیں تھی لیکن پھر بھی اس نے ایک نکتے کی طرف اس کا دھیان دلایا۔

”تم نے بتایا تھا فیصل کہ تم ضوئی کی بیٹی کو چیک سے لوٹی مٹی رقم میں سے کچھ حصہ دے کر آئے تھے۔ ہو سکتا ہے بچی نے وہ رقم پولیس کے حوالے کر دی ہو اور پولیس کو پتا چل گیا ہو کہ یہ ذبیح کے مال کا حصہ ہے اس لیے نہیں پکڑنے کے لیے یہ جال بچھایا گیا ہو۔“ فیصل نے اسے سارے حالات سے آگاہ کرنے کے بعد ہی اپنے جانے کی بات چھیڑی تھی اس لیے وہ.... اندازے سے کہہ رہی تھی۔

”میرے ذہن میں بھی یہ بات موجود ہے۔ مجھے اس بات سے فرق نہیں پڑتا کہ وہ لوگ مجھے گرفتار کر لیں گے۔ میں نے جو کیا ہے، اس کی سزا سنبھالنے کے لیے تیار ہوں لیکن کسی آپ سیٹ سے بچنے کے لیے میں نے ایک تدبیر سوچی ہے جس پر عمل کرنے کے لیے مجھے تمہارا تعاون درکار ہے۔ میں جانتا ہوں فرح..... تم پر تمہاری بساط سے زیادہ بوجھ پڑ چکا ہے لیکن یہ کام میں صرف تمہیں ہی سونپ سکتا ہوں۔ تمہیں ہمت کر کے بستر سے اٹھنا ہو گا تاکہ کفارہ ادا کرنے میں میری مدد کر سکو۔“ اس نے اپنے ماں باپ اور بہنوں کی لاشوں کو دیکھ کر کیا جانے والا عہد توڑا تھا تو اس کی سزا یہی تھی کہ غوثوں کر رہ گیا تھا۔ آج اپنی شریک حیات

”میں نے زندگی میں پہلی بار کسی پولیس افسر کا اتنا عام سا مگر دیکھا ہے۔“ فیصل خود کو تہجرہ کرنے سے نہ روک سکا۔

”یہ پولیس افسر کا گھر ہے بھی نہیں میرے بھائی! یہ تو میرے والد کا گھر ہے جو انہوں نے اب سے پینتیس برس قبل بنوایا تھا اور ان کے اور والدہ کے گزرنے کے بعد میں اکیلا یہاں وقت گزار رہا ہوں۔“ انسپٹر اسد نے ہنس کر اس کی بات کا جواب دیا۔

”آپ کی اپنی فیملی نہیں ہے؟“ گھر کی خاموشی نے فیصل کو سوال کرنے پر اکسایا۔

”فیملی میں نے ابھی بنائی نہیں کیونکہ فیملی بنانے سے پہلے میں اپنے خواہوں کی سرزمین پر اپنے سہوں کا کل بنانا چاہتا ہوں۔“ انسپٹر اسد کی آنکھوں میں ایک ناقابل فہم سا تاثر تھا جس نے فیصل کو انجمن میں جتلا کر دیا۔

☆☆☆

جشن راجا ایک کتاب کے مطالعے میں مصروف تھے کہ ملازم نے انہیں ایک خاتون کی آمد کی اطلاع دی۔ اطلاع کے مطابق خاتون نے اپنا چہرہ ایک چادر میں چھپا رکھا تھا اور ایک پیکٹ سمیت جشن صاحب سے ملنے کی خواہش مند تھیں۔ سیکورٹی کا عملہ پیکٹ کو ڈسٹر سے چیک کر کے اس بات کی تسلی کر چکا تھا کہ پیکٹ میں کوئی دھاتی شے یا بارودی مواد موجود نہیں ہے پھر بھی پیکٹ سمیت خاتون کو ملاقات کی اجازت بہر حال ان کی رضامندی کی صورت میں ہی دی جاسکتی تھی۔ جشن صاحب نے ایک پل کے لیے سوچا اور پھر اجازت دے دی۔ وہ ایک انسان دوست آدمی تھے اس لیے اکثر لوگ اپنے مسائل لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے۔ وہ بساط بھر ان کی مدد کر دیا کرتے تھے۔ آنے والی خاتون کو بھی انہوں نے ایسا ہی کوئی ضرورت مند تصور کیا۔ ان کی اجازت ملنے پر ملازم خاتون کو ان کی اسٹڈی میں لے کر آیا تو خاتون نے انہیں دھیمی آواز میں سلام کیا۔ انہوں نے خاتون کے سوال کا جواب دیا اور ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”جی فرمائیے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“ ملازم کمرے سے باہر نکل گیا تو انہوں نے خاتون سے سوال کیا۔

”میں ایک امانت قومی خزانے میں جمع کروانے کے لیے آپ کے تعاون کی طلب گار ہوں۔“ آنے والی نے اپنا مقصد بیان کیا تو انہوں نے اس کے بارے میں دو

اندازے لگائے۔ اول یہ کہ وہ جوان العمر ہے۔ دوم تعلیم یافتہ اور مہذب ہے۔

”کیا آپ ممبئی خاص پروجیکٹ میں ڈوٹیشن دینا چاہتی ہیں؟“ صورت حال کی وضاحت کے لیے انہوں نے سوال کیا۔

”جی نہیں۔ میں سرکار کی امانت سرکار کو لوٹانا چاہتی ہوں۔ اس امانت کے سلسلے میں تفصیل میں نے تحریری شکل میں بیان کر دی ہے جو آپ میرے جانے کے بعد پڑھ لیجئے گا۔ یہ امانت خاصی قیمتی ہے اور میرے شوہر کے خیال میں اسے درست جگہ پہنچانے کے لیے آپ موزوں ترین آدمی ہیں۔ امید ہے آپ ہمارے اعتماد پر پورا اتریں گے۔“ خاتون جو کہ فرح تھی نے جشن راجا کے سامنے وہی الفاظ ادا کیے جو فیصل نے اس سے کہے تھے۔

”آپ کے اعتماد کا شکریہ لیکن آپ نے کہا کہ امانت خاصی قیمتی ہے تو کیا آپ کو ذرا نہیں ہے کہ مجھ جیسے آدمی کی نیت میں بھی فتور آسکتا ہے؟“ انہوں نے اپنی ذہین آنکھیں اس پر جماتے ہوئے سوال کیا۔

”فتور تو کسی کی بھی نیت میں آسکتا ہے لیکن اعتماد کرتے ہوئے انسان اندازہ لگا لیتا ہے کہ خطرے کا تناسب کس جگہ کم ہے۔ ہم نے بھی ایسا ہی کیا ہے اور ساتھ ہی کچھ احتیاطی تدابیر بھی اختیار کی ہیں۔ میں جو کچھ آپ کو دے کر جا رہی ہوں، اس کا پورا تصویریری اور ڈوڑیو ریکارڈ ہمارے پاس موجود ہے۔ اس ریکارڈ کی ایک کاپی ہم اسٹیشن بینک کو بھی ارسال کر دیں گے اس اطلاع کے ساتھ کہ یہ سب جشن راجا صاحب کے پاس موجود ہے۔ ایسی صورت میں اول تو آپ کے پاس انکار کی گنجائش نہیں رہے گی۔ اگر انکار کر بھی دیا تو آپ کے پاس وہ امانت بیکار پڑی رہے گی اور آپ اس سے فیصل اٹھانے کے لیے اسے استعمال نہیں کر سکیں گے۔“ اس نے پوری سنجیدگی سے ان کے سوال کا جواب دیا تو ان کی آنکھوں میں تحسین نظر آنے لگی۔

”مگد، گلتا ہے آپ دونوں میاں بیوی ہی تعلیم یافتہ اور ذہین ہیں۔ میں نے اس بات کا پڑا نہیں مانا کہ آپ نے مجھ پر اعتماد کرنے کے باوجود شک کی گنجائش رکھی اور کچھ اقدامات کیے۔ انسان کو ایسا ہی کرنا چاہیے۔ ویسے بھی ہمارے دین میں اونٹ بائعہ کو توکل کرنے کا حکم ہے۔“

”آپ نے بُرا نہیں مانا اس بات کے لیے شکریہ۔ اب مجھے اجازت دیجیے۔“ فرح نے اپنے پاس موجود

میں اتنا طویل عرصہ لگ جاتا ہے کہ زندگی کی نعمتوں سے خوشیاں کشید کرنے کا وقت گزر چکا ہوتا ہے اور آپ ایک مشین کی طرح نوٹ چھاپتے چھاپتے بالآخر اپنے ہی دنیا سے چلے جاتے ہیں۔ آپ کی کوئی خواہش پوری نہیں ہوتی ہوتی اور آپ کے کمائے ہوئے مال و دولت پر آپ کے پچھلے پیش کرتے ہیں۔ میں سب سے پہلے دولت کا اپنے لیے خواہش مند تھا بعد میں چاہے وہ اس کا جو بھی کرتے، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ دولت کے حصول کا پہلا راستہ مجھے یہ نظر آیا کہ میں پولیس کی ملازمت اختیار کر لوں لیکن ملازمت ملنے میں مجھے احساس ہو گیا کہ ایسے چند ہزار کی رشوتیں وصول کر کے اور لوگوں کو چرنا لگا کر میں دولت مند نہیں بن سکتا۔ پکڑے جانے کے خطرات الگ تھے۔ میں کسی بڑے آدمی کا پٹھان بننے کا خطرہ بھی نہیں مول لے سکتا تھا۔ ایسے لوگوں کو قوی طور پر دولت اور اختیار تو مل جاتا ہے لیکن بڑے آدمی ایسے پھول کو جب دل چاہے پٹی بھی چڑھا دیتے ہیں۔ میں اپنے لیے کوئی محفوظ منصوبہ بنانا چاہتا تھا چنانچہ پولیس کی نوکری دیانت داری سے کرتے ہوئے اس منصوبے پر بھی کام کرتا رہا۔“

وہ یہاں ضوئی مرڈر کیس میں انسپٹر اسد کی مدد کرنے آیا تھا لیکن وہ اسے جانے کو نسی رام لیلانے بیٹھ گیا تھا جو اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی یا پھر یہ تھا کہ وہ بہت اچھی طرح سمجھ چکا تھا جب ہی اس کی پھلتیوں پر پسینا پھونٹنے لگا تھا۔ وہ شدت سے یہاں سے نکل بھاگنے کی خواہش کر رہا تھا۔

”ہاں تو مسٹر فیصل..... میں بتا رہا تھا کہ میں بہت آہستگی سے اپنے منصوبے کو ترتیب دے رہا تھا۔ اس منصوبے کی تکمیل کے لیے میں نے اپنی ٹیم بھی تشکیل دے دی تھی۔ اس ٹیم میں تمہاری شمولیت تمہارے نئے باز دوست سجاد کی وجہ سے ہوئی تھی۔ ایک بار دوران حراست اس نے اپنے اور اپنے دوستوں کے کارناموں کے بارے میں سب آگلی دیا تھا۔ میں نے اس کے نئے میں ہونے کا فائدہ اٹھا کر سب دوستوں کے بارے میں معلومات حاصل کر لیں۔ باقی تو ملک سے نکل چکے تھے لیکن تمہیں میں نے تلاش کر لیا۔ تمہارے گھر ہونے والی ذمہ داری اور قتل کی وارداتوں کی وجہ سے تمہارا ریکارڈ بھی پولیس کے پاس تھا۔ میں تمہارے شناختی کارڈ نمبر کی مدد سے تم تک پہنچ گیا اور یہ میری خوش قسمتی تھی کہ اس وقت تمہیں اپنی بیٹی کے علاج کے لیے رقم کی ضرورت بھی تھی۔ میں نے تم سے

بیماری پیکٹ ان کی میز پر رکھا تو انہوں نے دیکھا کہ اس پیکٹ کے اوپر ایک لفظ انگ سے رکھا ہوا ہے۔ ان کا جی چاہا کہ اس سے کچھ کہیں، کوئی اور سوال کریں لیکن ان کے تجربے نے انہیں باور کروا دیا کہ مزید سوال کر کے بھی وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں جان پائیں گے جو وہ اب تک انہیں بتا چکی ہے۔

وہ خاموشی سے اسے اپنی اسٹڈی سے باہر نکلتا ہوا دیکھتے رہے اور پھر پیکٹ پر رکھا ہوا لفظ اٹھا کر کھول لیا۔ لفظانے میں موجود خط کے متن سے انہیں معلوم ہو گیا کہ پیکٹ میں اس رقم کا ایک حصہ موجود ہے جو کچھ روز قبل ایک بینک ڈسکریٹ میں لونی گئی تھی۔ لکھنے والی نے واضح لکھ دیا تھا کہ رقم کا جو حصہ اس کے شوہر کے پاس موجود تھا وہ ذرا سی کمی کے ساتھ وہ لوگ واپس لوٹا رہے ہیں اور زندگی میں کبھی اگر انہیں باقی رقم کے بارے میں کچھ معلوم ہوا تو اس کی اطلاع بھی متعلقہ محکموں اور ڈسٹرکٹ داران کو دے دی جائے گی۔ خط میں ایسی کوئی بات نہیں تھی جس کے ذریعے خاتون یا اس کے شوہر کے بارے میں کچھ معلوم ہو پاتا۔ ظاہر ہے وہ لوگ اپنی شناخت چھپانے رکھنا چاہتے ہوں گے۔ جسٹس صاحب کو وہ وجہ بھی معلوم نہیں ہو سکتی تھی جس کے باعث ڈسکریٹ کی رقم کا وہ حصہ واپس تو ہی خزانے میں جمع کروانے کا فیصلہ کیا گیا تھا لیکن ان کے حساب سے فیصلہ پر طرح سے قابلِ حین تھا۔ کوئی اتنی بیماری بابت کی رقم واپس کر رہا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ اس کا نمبر زندہ ہے اور انہیں بھی اپنا نمبر زندہ ہی رکھنا تھا اس لیے امانت کو اصل مقام تک پہنچانے کے لیے اقدامات کرنے میں انہوں نے ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کی۔

☆☆☆

”خواب جتنی خوب صورت شے ہوتے ہیں اتنے ہی عذاب ناک بھی ہیں مسٹر فیصل! خاص طور پر اس صورت میں کہ جب آپ اپنی حیثیت سے بہت اونچے خواب دیکھتے ہوں۔ میرا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ میں نے اپنے عام سی آدمی والے باپ کی محدود چادر میں بے شمار خواہشوں کا گلا گھونٹ کر صرف ضرورتیں پوری کرنے والی زندگی گزار دی اور کبھی اس زندگی سے خوش نہیں رہا۔ میرے ماں باپ مجھے پڑھا لکھا کر بڑا آدمی بننے کے خواب دکھاتے تھے لیکن کالج کے ابتدائی سالوں میں ہی میں نے یہ بات سمجھ لی تھی کہ میرے طبقے کے لوگ صرف تعلیم کے سہارے بڑے آدمی نہیں بن پاتے ہیں۔ بن بھی جائیں تو اس

نے مکلی بار اپنی زبان کھولی۔

”اودہ..... یہ بات ہے تو اس کا مطلب ہے اب تم وہ ڈارز والا بیگ میرے حوالے کرنے کو تیار ہو۔“ اسد نے استہزائے انداز میں اس سے کہا۔

”تا کہ تم وہ بیگ لے کر مجھے بھی ویسے ہی گولیاں مار کر ہلاک کر دو جیسے میرے باقی تین ساتھیوں کو ہلاک کیا تھا۔“ اس کے استہزاء کا جواب فیصل نے طعنے سے دیا۔

”تمہیں کیسے معلوم کر میں نے ان تینوں کو ہلاک کر دیا ہے؟“ اسد اس کی بات سن کر بڑی طرح چوٹا۔

”تم نے میری ذہانت کا ذرا اظہار اندازہ لگا یا تھا اس لیے خود کو چھپانے کا تو عمل انتظام کر لیا لیکن ان تینوں کی اصلیت کو مجھ سے نہ چھپا سکے۔“ فیصل نے بتا دیا کہ کیسے اس نے ان تینوں کو کڑیوں میں کیا تھا۔

”میں نے مان لیا کہ واقعی تم ذہین ہو، اب اپنی ذہانت کا مزید ثبوت دو اور وہ بیگ میرے حوالے کر دو۔ تمہاری ذہانت کی قدر کرتے ہوئے میں تمہارے ساتھ یہ ڈیل کر سکتا ہوں کہ تمہیں اتنا حصہ دے دوں کہ تم اپنی بیٹی کا علاج کروا سکو۔“ اسد نے اسے پیشکش کی لیکن اس نے توجہ نہیں دی اور موضوع بدلنے سے بوللا۔

”پہلے تم بتاؤ کہ تم نے ضوفی مرڈر کیس میں کیا کیا؟ مجھے یقین ہے کہ اس کیل کے پیچھے اصل ہاتھ ملک احسن ہی کا تھا۔“

”میں نے وہی کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔ میں نے ملک احسن سے اپنی زبان بند رکھنے کی مناسب قیمت لے لی۔ ویسے بھی ملک احسن زیادہ قصور وار نہیں تھا۔ ضوفی اس کی بیوی تھی اور اسے اس کے حکم کی تعمیل کرنی چاہیے تھی۔ وہ اپنی سرکشی کی وجہ سے جان سے گئی۔ اس کی بے حرمتی میں ملک احسن کا ہاتھ نہیں تھا۔ اس کے پی اے اکبر نے موقع کا فائدہ اٹھا کر ضوفی سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لیا تھا۔ اکبر کو اس کی سرکشی کی سزا میں ملک احسن نے میرے سامنے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ اس کی لاش وغیرہ کا وہ خود انتظام کر لے گا۔ باقی ضوفی مرڈر کیس میں مجھے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیس حل ہو چکا ہے اور قاتل قانون کی گرفت میں ہے۔ کیس ری اوپن کرنے کا اعلان میں نے تمہیں جال میں پھنسانے کے لیے کیا تھا سو میں اس مقصد میں کامیاب رہا۔ بعد میں، میں میڈیا کو ایک بیان اور دسے دوں گا کہ کسی نے ایسے ہی کیس کو اٹھانے اور پولیس کو گمراہ کرنے کی کوشش کی تھی ورنہ کیس حل ہو چکا ہے۔ اب ضوفی

رابطہ کیا۔ باقی تین بھی تم جیسے ہی تھے۔ تم چاروں کو میں اپنے اشاروں پر چلاتا رہا لیکن پھر تم میرے ہاتھ سے محفل گئے۔ میں نے تمہارے ذہین ہونے کا سا تھا اور اس کا مجھے ثبوت بھی مل گیا۔ تم رقم سمیت خود غائب ہو گئے اور خود تک پہنچنے والی بیڑی یعنی بیوی اور بیٹی کو بھی منظر سے ہٹا دیا۔ میں پاگلوں کی طرح تمہیں تلاش کرتا رہا لیکن تم مجھے نہیں ملے اور پھر اچانک مجھے اپنی ایمانداری سے پولیس کی نوکری کرنے کا صلہ مل گیا۔ میرے بابا کہتے تھے کہ ایمانداری کا صلہ بھی نہ بھی ملتا ہے تو وہ مجھے مل گیا۔

”تم جو اپنا کوئی کلیو نہیں چھوڑتے تھے ضوفی جسے ملک احسن روشن کے نام سے پکارتا تھا کے اصل قاتل کا کلیو دینے کے چکر میں اپنا کلیو دے گئے۔ تحریر کو شاخت کر لینا میری ایک اضافی خوبی تھی اور میں نے تمہاری تحریر سے تمہیں پہچان لیا۔ میں نے بہت سے فیکٹس اور ٹکڑے جمع کیے اور مجھے معلوم ہو گیا کہ ضوفی اس روز بیک میں موجود تھی جس روز تم نے اور تمہارے ساتھیوں نے وہاں ڈاکا ڈالا۔ تم یقیناً اس کی گاڑی میں چھپ کر اس کے گھر پہنچے اور اسے دونوں وہیں قیام کیا۔ اس قیام کی احسان مندی کا بوجھ اتارنے کے لیے ہی شاید تم نے میرے لیے ضوفی کا نکاح نامہ اور اس کی بیٹی رمشاک کے لیے وہ ڈارز چھوڑے جو مجھے تم تک پہنچنے کی ایک تدبیر سمجھا گئے۔“ وہ بہت روانی سے بول رہا تھا اور فیصل اپنی جگہ ساکت بیٹھا وہ سب سننے پر اس لیے مجبور تھا کہ اسپیکٹر اسد نے ایک خوفناک کمن نکال کر اس کا رخ اس کی طرف کر رکھا تھا۔ وہ ذرا بھی جیش کرتا تو اسد گولی چلا دیتا سو وہ ساکت بیٹھا ہوا تھا۔

”تمہارے ذہن میں یقیناً شروع سے بے ایمانی تھی جب ہی تم فائرنگ شروع ہونے پر باقی ساتھیوں کی طرح بھاگ کر اس گاڑی کی طرف نہیں آئے تھے جس میں، میں تم لوگوں کا شہر تھا۔ تم نے اپنے پاس بیگ بھی وہ رکھا تھا جس میں پاکستانی کرنسی کے بجائے ڈارز بھرے ہوئے تھے۔ اس طرح تم ایک نہایت موثر رقم پر اکیلے قبضہ کرنے کا خواب دیکھ رہے تھے لیکن تمہارا خیو اب پورا ہو جاتا تو میرے خواب ابورے رہ جاتے اس لیے میں نے بالآخر تمہیں ڈھونڈ نکالا۔“

”جو کچھ ہوا، وہ اتفاق تھا۔ میرے ذہن میں کچھ خدشات ضرور تھے جن کی وجہ سے میں نے اپنی بیوی، بیٹی کو منظر سے ہٹا دیا تھا لیکن میں تمہیں دھوکا دینے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔“ اس پوری گفتگو کے دوران میں فیصل

چلنے کے باوجود کوئی آواز بلند نہیں ہوئی۔ اسد ہتھیار اٹھانے کے لیے جگا لیکن فیصل نے اسے مہلت نہیں دی اور اس پر چلاٹک لگا دی۔ اب وہ دونوں ایک دوسرے سے لپٹے ایک دوسرے پر دوا کر رہے تھے۔ اسد کے پاس پولیس کی تربیت تھی تو فیصل کی نوجوانی میں حاصل کی گئی لڑائی بھڑائی کی تربیت اور ہمیشہ تم جانے کی عادت سے حاصل ہونے والی سخت جانی اس کے کام آ رہی تھی۔ دونوں ایک دوسرے پر تازہ توڑ کٹے برسائے کے علاوہ سر کی گھریں مارنے میں بھی مختلف سے کام نہیں لے رہے تھے۔ دونوں میں سے کسی ایک نیچے ہوتا تو کسی دوسرا زور مار کر اوپر آ جاتا تھا۔ اسد کی کھیر پھوٹ چکی تھی اور فیصل کی آنکھ کے نیچے نیش پڑ گیا تھا۔

وہ دونوں جنگلی جانوروں کی طرح ایک دوسرے کو زیر کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ اس کوشش کے دوران اسد کی نظر اپنے ہتھیار پر پڑ گئی۔ وہ صوفے کے نیچے پڑا تھا لیکن اتنا اندر نہیں گیا تھا کہ ٹکڑا مشکل ہوتا۔ اس نے یک دم ہی فیصل پر اپنی گرفت کمزور کی اور جھپٹ کر ہتھیار نکالنے کی کوشش کی۔ وہ اس کوشش میں اس حد تک کامیاب رہا کہ ہتھیار اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ اسی وقت فیصل نے اس کی پشت پر ایک زوردار لٹا رسید کی وہ جوڑیگر پر لگی رکھے پلٹ کر فیصل پر گولی چلانے کا ارادہ رکھتا تھا اس جھگڑے سے سنبھل نہیں سکا۔ ٹرنگر پر دھاؤ پڑا، گولی چلی اور صوفہ جس دیوار کے ساتھ رکھا تھا اس دیوار سے ٹکرا کر اوپس اچھٹی ہوئی سیدی اسد کی دائیں آنکھ میں گھس گئی۔ وہ چند لمبے کے لیے تڑپا اور ساکت ہو گیا۔ دم بخود سا فیصل اس صورت حال پر کچھ دیر تو ایسے ہی کھڑا رہا پھر خاموشی سے باہر نکل گیا۔ خوابوں کی سرزمین پر سچوں کا محل بنانے کے خواب دیکھنے والا باپ کے بتائے ہوئے مکان میں ہی اپنی آخری سانسیں پوری کر چکا تھا۔ اس روز ہی جنس راجا کو ایک فون کال موصول ہوئی۔ کال کرنے والے نے اطلاع دی کہ کٹھن کی باقی رقم انکسٹر اسد مرزا کے گھر سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ اطلاع درست ثابت ہوئی۔ اسد مرزا کے گھر سے اس کی لاش اور ڈھنکی کی رقم کے علاوہ، وہ ہماری رقم بھی دریافت ہوئی جو اس نے ملک احسن سے وصول کی تھی۔ اسد مرزا اپنی ساری کمائی اپنے منصوبے کی تکمیل کے لیے بچاتا رہا تھا اس لیے اس نے کبھی اپنے آبائی گھر کی مرمت پر توجہ نہیں دی تھی۔ سننے اور دیکھنے والے اس بوسیدہ گھر سے اتنی بڑی رقم بازیاب

کوئی اتنی اہم شخصیت تو تھی نہیں کہ اس معاملے کو میڈیا یا دادہ اہمیت دے۔ اس ملک میں تو وزرائے اعظم کے قتل کے کیسز آج تک حل نہیں ہوئے اور قاتل پوری شان سے دندناتے پھرتے ہیں۔ ضوئی کس کھیت کی مولیٰ تھی۔ وہ بڑی فرصت میں اس کے ہر سوال کا جواب دے رہا تھا۔

”مجھے افسوس ہے کہ میں قاتلوں کی وردی میں موجود تم جیسے بھیڑیے کو نہ پہچان سکا۔“ فیصل نے تاسف کا اظہار کیا۔

”تمہاری اس کم عقلی کے بارے میں، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ مجھ سے تو تم اس رقم کے بارے میں بات کرو اور بتاؤ کہ ڈیل کر رہے ہو یا نہیں؟“

”ڈیل کی گنجائش نہیں کیونکہ رقم میرے پاس موجود ہی نہیں ہے۔“ فیصل نے اطمینان سے انکار کر دیا۔

”جو اس مت کرو۔ میں تمہیں گولی مار دوں گا اور رقم بعد میں تمہاری بیوی سے وصول کر لوں گا۔ وہ تمہاری کب تک خود کو چھپا کر گئی۔ اسے بٹنی کے علاج کے لیے تو ٹکٹا ہی پڑے گا۔ اب بھی مجھے معلوم ہے کہ تم نے ان دونوں کو قصبہ شاہ پور میں رکھا ہوا ہے۔“ اس نے یقیناً وہ فون کال ٹریس کر دالی تھی جو فیصل نے قصبے سے روانگی کے وقت اسے کی تھی اور اب اسی حوالے سے اپنی معلومات جما ڈر رہا تھا۔ فیصل اس کی بات سن کر اداسی سے مسکرایا اور بولا۔

”اس قصبے میں اب صرف میری بیٹی موجود ہے اور تم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔“

”کیا مطلب؟“ اسد نے بے ساختہ ہی سوال کیا۔

”وہ مرنے لگی ہے۔ اس کے بعد مجھے اور میری بیوی کو رقم کی کوئی ضرورت نہیں رہی اس لیے ہم نے وہ رقم سرکاری خزانے میں واپس جمع کرادی ہے۔“ فیصل نے جتنے اطمینان سے جواب دیا، اسد کو اتنی ہی زور کا جھکا لگا۔

”یو.....“ اس نے ایک بڑی سی گالی دی اور اچھل کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ فیصل کو اپنے ہی کسی لمحے کی تلاش تھی۔ اوپر اسد نے اس پر گولی چلائی اور آدھرا اس نے دائیں جانب چھلانگ لگا دی۔ چھلانگ لگاتے کے ساتھ ہی اس نے چھوٹی لکڑی کی ساڑھی لٹیکل اٹھا کر اسد پر دے ماری۔ اتفاق سے میز سیدی اس کے ہتھیار والے ہاتھ پر جا کر لگی۔ ایک گولی اور پھلی اور ہتھیار اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ شاید آبادی میں موجود ہونے کی وجہ سے اس نے اپنے ہتھیار پر سالٹسٹ فرٹ کر رکھا تھا ایسے ہی دو بار گولی

ہونے پر انگشت بدنداں رہ گئے اور وہ سب کی حیرت سے بے نیاز اپنے خوابوں سمیت ہر خاک چلا گیا۔ اسی دو گز زمین کے اندر جو مخلوق اور جموہ پتلیوں سب میں رہنے والوں کا یکساں نصیب ہوتی ہے۔

☆☆☆

فیصل اور فرح اس یتیم خانے میں موجود بچوں کو اپنے ہاتھوں سے کھانا تقسیم کر رہے تھے۔ رانیہ کے چلے جانے کے بعد ان کے پاس دل کے سکون کے لیے ایک یہی ذریعہ رہ گیا تھا کہ وہ ان بے سہارا بچوں کی حسب استطاعت مدد کرتے رہیں۔ اسد کے مرنے کے بعد سارے خطرات ختم ہو گئے تھے اس لیے وہ انہوں کے درمیان واپس آ گئے۔ اپنے اتنے دن کے غیاب کی وجہ انہوں نے یہ بتانی کہ ڈاکٹر نے رانیہ کو علاج قرار دے دیا تھا اس لیے وہ سب سے الگ اس کی زندگی کا ایک ایک پل اس کے ساتھ گزارنے کے لیے سب سے دور چلے گئے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ رانیہ کے بچے کچھ وقت کو ان کے علاوہ بھی کوئی بنائے اس لیے انہوں نے سب سے رابطہ ختم کر لیا تھا۔ ان کی اس سوچ کو پاگل پن قرار دیا گیا تھا لیکن اس پاگل پن کو صرف اس لیے قبول کر لیا گیا کہ وہ اپنی اکلونی بیٹی کی جدائی کے غم سے تڑپتے، بے بس اور کئی والدین تھے۔ ان دونوں کو کسی کی رائے کی پروا بھی نہیں تھی اور وہ زندگی کو اپنے حساب سے ایک نئے ڈھنگ سے جینے لگے تھے۔

زندگی کے اس نئے ڈھنگ میں یہ یتیم خانہ اولین اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ ہر بچے کی مسکراہٹ میں انہیں اپنی رانیہ کی مسکراہٹ نظر آتی تھی۔ اچھی زندگی، توجہ، خوراک اور لباس کو ترسے ہوئے یہ بچے جب ان جیسے کچھ لوگوں کو اپنے درمیان پاتے تو ان کی دیران آنکھوں میں بھی تھوڑی سی چمک اتر آتی تھی۔ اس چمک کو دیکھنے کے لیے ہی فیصل ہر بچے کا چہرہ غور سے دیکھتا تھا۔ اب بھی ایک بچی کی پلیٹ میں چمن پلاؤ ڈالتے ہوئے اس نے اس کا چہرہ دیکھا اور غصہ کیا۔ اس بچی کو اس نے صرف تصویروں اور نیم تاریکی میں دیکھا تھا لیکن بچان کی منزل اس لیے فوراً طے کر گیا کہ وہ اپنی ماں کا عکس تھی۔ ہاں وہ خوشنشاں کی بیٹی رمانی تھی۔ اس نے کھانے کے بعد یتیم خانے کے منتظم سے علیحدگی میں رمانی کے حالات دریافت کیے تو معلوم ہوا کہ گاؤں واپس جانے سے قبل اس کی بوڑھی مائی زینہ بی بی باریٹ ٹل میں چل بسی تھی۔ بچی کا والی وارث کوئی نہیں تھا

سو پہلے وہ ادھر ادھر دھکے کھاتی رہی پھر اس یتیم خانے میں آ گئی۔ صاف سترے کردار کی مالک اپنی حسد کی تخت جگر کا یہ احوال فیصل کو تباہ کیا۔

پہلے اس نے ضوئی کے احسان کا بدلہ دینے کے لیے اس کے قاتل کو انجام تک پہنچانے کی کوشش کی تھی لیکن ملک احسن اپنے پیسے اور اسد کے لالچ کی وجہ سے غصے کا ایک تھاپہ یہ سمجھتا اس کے کچھ کام نہیں آیا تھا اور ایکشن سے صرف چار دن قبل جب وہ ایک چلے کی صدارت کر کے واپس لوٹ رہا تھا، اسے گولیاں مار کر ہلاک کر دیا گیا تھا۔ وہ کرسی جس کے حصول کے لیے اس نے بڑی جڑ توڑی تھی اور خون ناحق بہایا تھا، اس کا نصیب ہی نہیں بن سکی تھی۔ قدرت کا انصاف ایسا ہی ہوتا ہے اور جب زمین والے انصاف کے تقاضے پورے نہیں کرتے تو آسمان سے انصاف اتارا جاتا ہے۔ ملک احسن کے ساتھ بھی انصاف کر دیا گیا تھا لیکن رمانی..... خوشنشاں جیسی مظلوم عورت کی جان کا کٹوا وہ بچی آج اس یتیم خانے میں کیوں تھی؟

فیصل نے سوچا تو پہلے لمحے میں اسے یہ ایک زیادتی لگی اور وہ رمانی کے لیے اپنے دل میں بُری طرح تڑپا لیکن دوسرے پل ہی اسے سمجھ آئی کہ رمانیاں ہیں کیوں تھی۔ اس روز وہ یتیم خانے سے واپس جا رہے تھے تو رمانی یتیم نہیں رہی تھی۔ ہمیشہ باپ کی شفقت اور ماں کی قربت سے محروم رہنے والی بچی کو ماں باپ دونوں مل گئے تھے۔ فرح اور فیصل بھی رانیہ کے بعد آج پہلی بار خوش تھے۔ رمانی کی صورت میں رانیہ ان کے پاس واپس لوٹ آئی تھی۔ انہوں نے شروعات میں ہی طے کر لیا تھا کہ وہ رانیہ کی طرح صرف لاڈ سے اس کی پرورش نہیں کریں گے بلکہ اسے ایسی تربیت دیں گے کہ وہ ایک دن اس یتیم خانے لوٹ کر جائے اور ان معصوم بچوں کے لیے چارہ کر بنے جو کسی بھی وجہ سے وہاں زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔

زندگی..... صرف عیش کے لیے عطا نہیں کی گئی۔ جو اس کا یہ مقصد سمجھتے ہیں، وہ فیصل اور اسد جیسے لوگوں کی طرح شوکر کھاتے ہیں یا فرعون، قارون، شہداد اور نمرود جیسوں کی طرح ہمیشہ کے لیے ذلیل و رسوا کر دیے جاتے ہیں۔ زندگی درود دل اور اطاعت رب کے بتائے فیض اور بے مقصد تھی اور کئی بات انہیں رمانی کو سکھاتی تھی۔ وہ سکھا بھی سکتے تھے کیونکہ یہ بات انہوں نے خود بھی سیکھ لی تھی..... سمجھ لی تھی.....



کسی معصوف نے ایک دفعہ لکھا تھا۔ ”خوابوں کو مضبوطی سے پکڑے رہو۔ اگر یہ مر گئے تو زندگی ایک ایسے پرندے کے مانند ہو جائے گی جو اڑ نہیں سکتا۔“ کچھ خواب ایسے ہوتے ہیں جنہیں پاہل نہیں ہونا چاہیے۔ یہ ایسے سلوک کے مستحق ہیں جو نازک اور قیمتی اشیاء کے لیے مخصوص ہے۔ میرا خیال ہے کہ کلارا اسٹیوارٹ بھی پہلے اسی انداز میں محسوس کرتی ہوگی جب ایک خطرناک لیکن نرم گفتار انجینیئیر سٹرقلیٹ اس کی زندگی میں آیا۔ کلارا کو لی ٹرکری دوست تھی

تغائب در تغائب..... زندگی و موت کے فاصلوں کو عبور کرتی پُر خطر کہانی.....

کس وقت کیا رونما ہو جائے... کسی کو علم نہیں ہوتا مگر اس کے ساتھ ہر وقت کچھ نہ کچھ ہو رہا تھا... وہ آگاہ تھا کہ خطرہ بڑھ رہا ہے... کئی لوگ اس کی جان کے درپے ہیں... وہ مسلسل بھاگ رہا تھا... اور خوشی قسمتی اس کا ساتھ دے رہی تھی کہ کوئی نہ کوئی ہمدرد مل کر اس کی مدد پر آمادہ تھا... بھاگتے بھاگتے وہ ایک ایسی عورت سے ٹکرا گیا جو حساس طبیعت کی مالک تھی... اس کی تمام کتھا پر اعتبار لے آئی اور پھر اس کی گمشدگی نے اسے یہ چین کر دیا...

گم نام سراغ رساں

تویر ریاض



اور وہ میرا وکیل تھا۔ وہ زیادہ تر ان لوگوں کا مقدمہ لڑتا جو کسی حادثے میں زخمی ہو جاتے تھے لیکن وہ دل کا بہت اچھا تھا اور کئی مسائل میں گھبرا ہوا ہونے کے باوجود دوسروں کے کام آتا تھا۔ اسی لیے وہ ہالی ڈے کے ایک بار میں مجھ سے ملنے چلا آیا۔

ان دنوں میں ہالی ڈے، میں قرنا بیجا رہا تھا اور میری رہائش سب سے اوپر کی منزل کے اپارٹمنٹ میں تھی۔ میں دوستوں کی بھی مدد کرتا تھا۔ اسی لیے گولی اکتوبر کی ایک گرم دوپہر میں اپنی دوست کو مجھ سے ملانے لے آیا۔

”مسٹر کراہم۔“ اس عورت نے بات شروع کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نہیں چاہتی کہ تم مجھے کوئی بے وقوف عورت سمجھو۔ میری عمر پچاس سال ہے اور میں گزشتہ جون تک بہت پرسکون زندگی گزار رہی تھی۔ میں نے اچھے اسکولوں میں تعلیم حاصل کی اور والدین سے ورثے میں ملنے والے پیسوں سے سرمایہ کاری کی جہاں سے مجھے معقول آمدنی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ میں سیڈرز، نامی فرم میں بہت اچھی ملازمت کر رہی ہوں لیکن اب مجھے لگتا ہے کہ مجھ سے ایک بہت بڑی حافضت سرزد ہو گئی ہے۔“

”تمہاری شادی ہو چکی ہے؟“ میں نے اس کے دلکش سراپا پر نظر ڈالے ہوئے کہا۔

”نہیں، کوکے مجھے کئی لوگوں نے شادی کی پیشکش کی۔“ میں نے وجہ جاننا ضروری نہیں سمجھی اور کہا۔ ”مجھے پوری بات بتاؤ۔“

”ایک ہفتے کی صبح میں جیسن اسکوار میں آڈیشن کی تصویریں دیکھ رہی تھی کہ ایک جوان شخص میرے پاس آیا اور اس نے اپنا نام نیکسٹر فلیٹ بتایا۔ وہ کافی گھبرایا ہوا اور پیٹنے میں شرابور تھا۔ اس نے مجھ سے کچھ دور ساتھ چلنے کی درخواست کی اور کہا کہ کچھ لوگ اس کا پچھا کر رہے ہیں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کون لوگ ہیں تو اس نے کہا کہ میرے لیے یہ جاننا ضروری نہیں۔ میں تو ڈی سی ایمن میں پڑ گئی اور میری سمجھ میں نہیں آیا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے تاہم مجھے اعتراض کر لیتا چاہیے کہ میں اس کی باتوں میں آگئی اور میں سوچے سمجھے بغیر اس کے ساتھ چل دی۔

کئی بلاک کا قافلہ طے کرنے کے بعد وہ کچھ پرسکون نظر آنے لگا اور بولا۔ کیا وہ میرے لیے ڈرنک خرید سکتا ہے۔ مسٹر کراہم! میں عام طور پر اجنبیوں کی دعوت قبول نہیں کرتی لیکن اس نے اتنے خلوص سے کہا کہ میں انکار نہ کر سکی۔ پھر اس نے ایک بہت ہی حیرت انگیز کہانی سنائی۔

اس نے کہا کہ وہ ایک سرکاری خفیہ ایجنسی کے لیے کام کر رہا تھا کہ اس کو نیو اور لینز میں کچھ لوگوں نے پہچان لیا جو ہمیں بدل کر کام کر رہے تھے۔ انہیں ڈیپ کور کہا جاتا ہے۔ ان لوگوں کو خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں وہ ان کا راز فاش نہ کر دے لہذا وہ اسے مارنا چاہتے ہیں۔“

میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم نے کبھی ان لوگوں کو دیکھا جن کا اس نے تذکرہ کیا تھا؟“

”نہیں لیکن مسٹر فلیٹ کا کہنا تھا کہ اس روز اس نے انہیں کئی بار دیکھا۔ میں نے اسے اپنی کار میں گھر چھوڑنے کی پیشکش کی اور کہا کہ وہ گاڑی چلائے۔ وہ کافی دیر تک کار کو رادھر اُدھر کھاتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا کہ وہ انہیں چمکا دینے میں کامیاب ہو گیا ہے اور فی الحال محفوظ ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ اسے چھپنے کے لیے کوئی محفوظ جگہ مل جائے اور یہ کہ میں اسے اگلے موڑ پر اتار دوں۔ میں خوف زدہ ہونے کے ساتھ بہت پُر جوش بھی ہو رہی تھی۔ لہذا میں نے اسے کہا کہ وہ میرے گھر میں چھپ سکتا ہے۔

”وہ وہاں وقفے وقفے سے تقریباً دو مہینے رہا۔ وہ سچ سچ میں تین چار دنوں کے لیے کہیں چلا جاتا اور جب وہاں آتا تو بیمار اور تھکا ہوا کھاتی دیتا۔ وہ انتہائی خوفناک کہانیاں سناتا کہ کس طرح اس کا تعاقب کیا گیا۔ اس پر سوتے ہوئے اور اسے گھسیٹا ترین جگہوں پر پٹا لپیٹا پڑی۔

”میں اس کے قریب میں آگئی اور اس کی باتوں پر یقین کر لیا۔ اس نے بتایا کہ جس ایجنسی کے لیے وہ کام کر رہا تھا، انہوں نے اسے قانع کر دیا ہے جس کا مطلب ہے کہ اب وہ اس پر مزید بھروسہ نہیں کر رہے اور نہ ہی وہ اس کی حفاظت کریں گے۔ اس نے ایک دوسری ایجنسی میں بات کی ہے لیکن شانتی کارڈ اور دوسرے کاغذات کے لیے اسے دس ہزار ڈالر کی ضرورت ہے۔ میں نے احمقانہ فیصلہ کیا اور اسے مطلوبہ رقم دے دی۔ وہ میرا ٹکریا ادا کر کے چلا گیا پھر میں نے اس کی شکل نہیں دیکھی۔

”کیا تم نے پولیس کو اطلاع دی؟“

”میں نے تین ہفتے اس کا انتظار کیا۔ مجھے ڈر تھا کہ کسی نے اسے قتل نہ کر دیا ہو، چنانچہ میں نے ایک سراغ رساں کو اس سے بات کی۔“

”غیرے نکولس۔“ میں نے کہا۔ ”میں اسے جانتا ہوں۔ بہت اچھا پولیس آفیسر ہے۔“

”اس نے بتایا کہ میرے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ فلیٹ ایک قسم کا ذہنی مریض تھا۔ وہ ذہنی پرانگی کی کا شکار تھا اور

دیت نام پر بھیجے کے لیے فوجی بھرتی ہو رہی تھی۔ ایک نوجوان کا ملکی محاذ شروع ہوا تو اسے یقین تھا کہ وہ آنکھوں کے ٹیٹ میں ناکام ہو جائے گا کیونکہ اس کی دور کی نظر سے حد کمزور تھی۔ جب ڈاکٹر نے اس سے کہا کہ چارٹ پڑھو تو اس نے بتایا کہ اسے چارٹ پر کچھ نظر ہی نہیں آ رہا ہے۔

ڈاکٹر نے اسے ایک قدم اور آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ وہ وہاں سے بھی نہ بڑھ سکا۔ ڈاکٹر اسے آگے بڑھاتا رہا، یہاں تک کہ چارٹ اور نوجوان کے درمیان صرف دو فٹ کا فاصلہ رہ گیا۔

”ٹھیک ہے۔“ ڈاکٹر نے اسے پاس کرتے ہوئے کہا۔ ”تم دست بدست لڑائی میں تو کام آئی جاؤ گے۔“

کاشف سعید..... لاہور

”الزام“

تخلیل: کیا یہ درست ہے کہ تم نے امجد سے شادی صرف اس لیے کی ہے کہ اس کے دادا اس کے لیے ڈیمر ساری دولت چھوڑ کر مرے تھے؟
 شمیم: بالکل غلط... اگر دادا کے بجائے کوئی اور بھی امجد کے لیے اتنی دولت چھوڑ کر مرتا تب بھی میں اس سے شادی کر لیتی۔

پرائیویٹ سراغ رساں نہیں ہوں بلکہ کبھی بھی نہیں رہا۔ میں صرف لوگوں کو ڈرا دھمکا کر اپنا کام نکالتا ہوں۔ ماضی میں، میں نے کئی جواریوں کی نیندیں حرام کر رکھی تھیں۔ اس زندگی کو چھوڑنے کے بعد بھی میں اپنی اس صلاحیت سے فائدہ اٹھاتا رہا اور اس سے مجھے لاپتا افراد اور لوگوں کی گمشدہ چیزیں ڈھونڈنے میں مدد ملی، جو پولیس کے پاس نہیں جاسکتے تھے یا ان کا خیال تھا کہ پولیس ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ تعویذی بات چیت کے بعد ہمارے درمیان معاوضہ طے پا گیا۔

کھارائے مجھے جو کہانی سنائی، اس کا ایک حصہ میرے ذہن میں مسلسل گونج رہا تھا۔ مجھے بہت عرصے پہلے پولیس ڈپارٹمنٹ کے ایک نفسیاتی معالج کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا تھا۔ اس دوران میرا واسطہ کئی ذہنی مریضوں سے پڑا۔ کھارائے نے جو کچھ فلیٹ کے بارے میں بتایا تھا، اس کی علامات ان مریضوں سے بالکل مختلف تھیں۔ کیونکہ وہ پہلے ہی فیرے ٹکوس سے رابطہ کر چکی تھی۔ اس لیے میں نے بھی اس سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس کے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ کسی دشمن ملک کے نامعلوم اور ناپیدہ خفیہ ایجنٹ اس کا پیچھا کر رہے ہیں اور یہ کہ میں پہلی عورت نہیں جسے اس نے بے خوف بنایا تھا۔“
 میں نے فریج سے بیڑ کی بوتل نکالی اور کہا۔ ”مس اسٹیوارٹ! میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟“
 ”مسٹر کوئی نے بتایا ہے کہ شاید تم فلیٹ کو تلاش کرنے میں میری مدد کر سکتے ہو۔“
 ”کیا اس نے تمہیں یہ بھی بتایا کہ میں ان معاملات میں بہت محتاط ہوں؟“

”ہاں، اس کا کہنا ہے کہ تم پولیس کو وہ سب کچھ بتا دیجے جو جان نہیں معلوم ہونا چاہیے۔“
 ”کیا اس میں تمہیں کوئی مسئلہ ہے؟“

”بالکل نہیں، میں چاہتی ہوں کہ تم انہیں بتا دو، پلیز مسٹر گراہم۔ اسے تلاش کر کے پولیس کے حوالے کر دو۔ اس کے وارنٹ نکل چکے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ اسے وہ مدد مل جائے جس کی اسے ضرورت ہے۔“

”کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ وہ کہاں مل سکتا ہے؟“
 ”مجھے اتنا معلوم ہے کہ وہ دو ہفتے پہلے کہاں تھا۔ میں کل جیکسن اسکوآرڈ تو میں نے ایک نوجوان فوٹو گرافر کی کچھ تصویریں دیکھیں۔ ان میں ایک تصویر رائل اسٹریٹ کے کسی اپارٹمنٹ کی تھی۔ عام طور پر سیاح ایسی تصویریں خریدنا پسند کرتے ہیں۔ اس میں ایک سٹر فلیٹ اس عمارت کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ میں نے وہ تصویر خرید لی اور فوٹو گرافر سے پوچھا کہ وہ اس نے کب خریدی تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ ہفتے پہلے جب دفتر چھوڑے گا گزر رہا تھا۔“

اس نے اپنے ہینڈ بیگ سے آٹھ ضرب دس کی ایک تصویر نکال کر مجھے چڑائی۔ یہ ایک پرانی اپارٹمنٹ بلڈنگ کی بہت ہی عمدہ تصویر تھی۔ جس کے سامنے ایک دبلا پتلا پریشان حال چالیس سالہ شخص اپنی تنگی جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا ہوا تھا۔

”میں اس عمارت سے واقف ہوں۔“ میں نے کہا۔
 ”یہ فلیٹ ریڈ آرمز“ کے نام سے مشہور ہے۔ تمہارا خیال ہے کہ فلیٹ اس عمارت میں مقیم ہے؟“

”میں نہیں جانتی۔“ اس نے کہا۔ ”مجھے وہاں جاتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔ اگر اس نے مجھے دیکھ لیا تو شاید دوبارہ بھاگ نہ جائے پھر میں اسے بھی نہیں تلاش کر سکوں گی۔ مجھے بتاؤ مسٹر گراہم، تم اس کام کا کیا معاوضہ لو گے؟“

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دوں۔ میں کوئی

اور لیئر پولیس ڈیپارٹمنٹ کے سراغ رساں کلوس کی میرے بارے میں کوئی اچھی رائے نہیں تھی۔ اسے میری سرگرمیوں سے نفرت تھی لیکن وہ آج تک کچھ بھی ثابت نہیں کر سکا۔ وہ کہنے میں کارٹون لگتا تھا لیکن میں جتنے سراغ رساںوں سے ملا وہ ان سب میں بہترین تھا۔

”تم اس کیس کے بارے میں کیا جانتے ہو؟“
”وہی جو کلار اسٹیوارٹ نے بتایا۔ وہ شخص اس کی زندگی میں آیا۔ اس سے دس ہزار ڈالر لیے اور غائب ہو گیا۔“
”اس نے جو کہانی کلار کوسٹانی اس بارے میں کیا کہی ہے؟“

”جو کچھ میں نے سنا، اس کے بعد میرے ذہن میں دو باتیں آ رہی ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ وہ شخص ذہنی پراگندگی کا شکار ہے۔ البتہ اس پر غور سا اثر ہے۔ اس کے ذہن میں چیزیں گٹھڑ ہو رہی ہیں یا پھر وہ نفسیاتی مریض بن گیا ہے۔“
”ذہنی مریض؟“ اس نے حیرت سے کہا۔
”ایک بے گناہ شخص، وہ جو چاہے حاصل کر لیتا ہے۔

جھوٹ، چوری، دھوکا وغیرہ۔“
”میں جانتا ہوں کہ نفسیاتی مریض کیسے ہوتے ہیں۔“
”یہ عام طور پر بہت ذہین ہوتے ہیں اور دوسرے لوگوں کی طرح اخلاقی قدروں کا لٹا نہیں رکھتے کیونکہ روایتی طور پر بہت ہوشیار ہوتے ہیں۔ اس لیے بہت بڑے جعل ساز اور دھوکے باز بن جاتے ہیں۔“
”کیا وہ ذہنی طور پر پیار ہوتے ہیں؟“ کلوس نے

پوچھا۔
”بالکل نہیں، یہی مسئلہ ہے۔ ان میں سے زیادہ تر یہ سمجھتے ہیں کہ وہ دوسروں سے زیادہ عقلمند ہیں اور وہ بھی پیچھے مڑ کر دیکھنے کی زحمت نہیں کرتے کہ دوسرے پر کیا گزر رہی ہے۔ وہ بہت گھمنڈی ہوتے ہیں۔ اگر انہیں کچھ چاہے تو وہ اسے حاصل کرنے کا طریقہ نکال لیتے ہیں۔ انہیں اس کی پروا نہیں ہوتی کہ اس سے دوسروں کو کتنی تکلیف ہوگی۔“

”تم نے دو امکانات کی بات کی تھی۔ دوسرا کیا ہے؟“
”یہی کہ قلیط بالکل وہی ہے۔ اس نے اپنے آپ کو بالکل ظاہر کرنے کے لیے یہ خول چڑھا رکھا ہے۔ اس طرح وہ دیکھنا خطرناک ہو گیا ہے۔ اس اسٹیوارٹ کے مطابق اس نے کہا تھا کہ اسے فارغ کر دیا گیا ہے۔ کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ اس سے کیا مراد ہے؟“

”ہاں، جب کوئی اپنی وفاداری تبدیل کرے یا اسے کنٹرول کرنے والے سمجھیں کہ ایسا ہو رہا ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ اس میں کوئی خامی نظر آئے؟ اور اسے کنٹرول کون کرتا ہے؟“
”ایک اور آپریٹو جو ڈپ کو فلیڈ ایجنٹ کو ہدایات اور احکامات دیتا ہے۔ بعض اوقات انہیں وینڈر بھی کہا جاتا ہے۔“

”اگر کسی کو فارغ کر دیا جائے تو پھر کیا ہوتا ہے؟“
”یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے، اگر آپ ان کے لیے اہم ہیں تو وہ آپ کی نگرانی کر سکتے ہیں ورنہ آزاد گروں کے۔“
میں نے اس کے ضمنی وقت کا شکر یہ ادا کیا اور وہاں سے چل دیا۔ مجھے اپنے کام کے سلسلے میں ہالی وڈ سے پہنچنا تھا۔ اسٹج پر میرے چہ گھنے انتہائی بے چینی کے عالم میں گزرے اور میرا دماغ بکسٹر فلیٹ میں ہی الجھا رہا۔ اس کی حقیقت چاہے کچھ بھی ہو لیکن بہر حال اس نے کلار اسٹیوارٹ سے دس ہزار ڈالر ایشیے اور غائب ہو گیا۔ اب مجھے اس رقم کی وصولی کے لیے اسے تلاش کرنا تھا۔ اس کے بعد اس کے ساتھ جو کچھ ہوتا، اس سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔

میں نے کلار کو بتایا تھا کہ میں فلیڈرز آرمز سے واقف ہوں۔ اس عمارت کے سامنے والی فٹ پاتھ پر میرا ایک جاننے والا موسیقار بیٹا، سیکس فون پر ڈشیں بچایا کرتا تھا۔ جب بھی مجھے فرصت ہوتی تو میں ٹھٹھا ہوا راکل اسٹریٹ کی طرف چلا جاتا اور بیٹی کی مسکون رخصتوں سے لطف اندوز ہوتا اور چلتے وقت اس کے ڈبے میں دس بیس ڈالر ضرور ڈال دیتا۔

دراصل میں اس کا احسان مند تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں لیڈوک کے لیے کام کر رہا تھا۔ اس نے مجھے ایک جگہ رقم وصول کرنے کے لیے بھیجا۔ اس وقت میں جوان اور طاقتور ہوا کرتا تھا لیکن مجھے اس کام کا کوئی تجربہ نہیں تھا اور ڈرتا تھا کہ شاید یہ مجھ سے نہ ہو سکے۔ اسی لیے میں نے ایک غلط آدمی سے معلومات حاصل کیں اور میرا سامنا ایسے چار بد معاشوں سے ہو گیا جن کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا اور ہاتھوں میں بڑے بڑے چاقو تھے۔ انہیں ایک نظر دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ میرے جسم کی یونٹیاں بنانے میں لمحہ بھر کی تاخیر نہیں کریں گے۔

میں نے فوراً دوڑ ڈگ دی جیسے میں اولمپک کی ریس میں حصہ لے رہا تھا۔ وہ چاروں بد معاش میرا تعاقب کر رہے تھے۔ دوڑتے دوڑتے میں ایک بندگی میں چھپ گیا۔ بیٹی اس وقت سڑک کے پار اپنا سبز بھارا تھا۔ اس نے مجھے گلی میں جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا لیکن جب بد معاشوں نے اس

ہو گیا اور آہستہ سے دروازہ کھولا۔ مدھم روشنی والے کمرے سے کوئی آواز نہیں آئی۔

میں نے پوچھتے سے جھانک کر اندر نگاہ دوڑائی لیکن کچھ نظر نہیں آیا۔ کھڑکیوں کے پردے گرے ہوئے تھے اور کناروں سے آنے والی روشنی کمرے کے لیے کافی تھی۔ میں تیزی سے اندر گیا اور ایک دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اچانک ہی میں نے اپنے آپ کو بہت ہی غیر محفوظ تصور کیا۔ میرے ذہن میں دو باتیں آئیں۔ پہلی یہ کہ شاید فلیٹ کسی قریبی ریسٹوران میں کھانا کھانے گیا ہو اور دوسری یہ کہ وہ میری موجودگی کو محسوس کر کے پردوں کے دروازے کے پیچھے چھپ گیا ہو۔

ایک تیسرا امکان بھی تھا جس پر میں نے غور نہیں کیا۔ جب میں نے بیڈروم کے دروازے سے جھانکا تو وہ مجھے ایک کرسی پر بیٹھا ہوا نظر آیا۔ پہلی بات جس نے مجھے چونکے پر مجبور کر دیا وہ اس کی دہری مسکراہٹ تھی۔ میں نے اپنی آنکھیں ملیں لیکن اس منظر میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ ایک مسکراہٹ اس کے کھلے ہوئے منہ سے قائم ہوئی اور دوسری بالکل اس کے نیچے تھی۔ مجھے اس کا مجید جاننے میں چند سیکنڈ لگے اور جب مجھ پر حقیقت واضح ہوئی تو اس نے مجھے شک میں مبتلا کر دیا۔

کسی نے بڑی بے رحمی سے اس کا گھلا کا تھا۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں کھارے کہہ کر اس کے گھر کی تلاشی کا وارنٹ لکھوا چتا نیچے میں نے اپنے طور پر ہی تلاشی شروع کر دی۔ میں کسی کا نام یا تصویر ڈھونڈ رہا تھا۔ خوش قسمتی سے مجھے اس کی جیکٹ کی جیب سے ایک چھوٹی اسپرائل نوٹ بک مل گئی جس میں بہت سی دیگر تفصیلات کے علاوہ چار نام بھی درج تھے۔ گھائیڈ گل، فیڈ فورڈ، جیمکین راجرز اور رائزن میگلین۔ میں نے وہ نوٹ بک واپس اس کی جیب میں رکھی اور فیصلہ کیا کہ اب فیرے گولس کو ٹون کرنا چاہیے۔

میں فون نکال ہی رہا تھا کہ کسی نے میرے ہاتھ میں کان کے پیچھے سر پر ایک زوردار ضرب لگائی۔ یہ کسی ماہر پیشہ ور کا کام تھا۔ میں گھٹنوں کے بل جھک گیا اور دونوں بازوؤں کے درمیان اپنی کمر پوز کر لی تاکہ مزید ضربات سے بچ سکوں لیکن اس کے بعد کوئی حملہ نہیں ہوا۔ میں آہستہ سے سیدھا ہوا تبھی چار ہاتھوں نے مجھے جیکٹ سے پکڑا اور ایک کرسی پر بٹھا دیا۔

”ٹھیک ہے۔“ کسی نے بڑے مہذب انداز میں کہا۔ ”تم کون ہو؟“

سے میرے بارے میں پوچھا تو اس نے کنال اسٹریٹ کی طرف اشارہ کر دیا۔ اس احسان کی قیمت میں ہزار ڈالر دے کر بھی نہیں ادا کر سکتا تھا۔ میں نے اسے ایک مرتبہ ہالی وڈ میں اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کی دعوت دی تھی لیکن وہ سڑکوں پر سنا بجائے کو تریج دیتا تھا جہاں سے اسے محض چند چھوٹے نوٹ اور تھکی حاصل ہوتے تھے۔

اگر عیسائیت، اس عمارت میں قیام پذیر تھا تو چینی نے اسے ضرور آتے جاتے دیکھا ہوگا۔ اس کی یادداشت بہت اچھی ہے۔ میں نے اسے وہ تصویر دکھائی جو کلار نے مجھے دی تھی۔ اس نے کن انکھیں سے تصویر دیکھی اور اپنا منہ صاف کیا پھر اس کی زرد آنکھوں میں چمک آئی۔

”ہاں، میں نے اس شخص کو دیکھا ہے۔ یہ عام طور پر اندھیرے میں لٹکا ہے لیکن اس کی رہائش فلیٹرز میں نہیں بلکہ اس کے برابر والی عمارت ڈولیر میں ہے۔ البتہ یہ معلوم نہیں کہ یہ کس فلور پر رہتا ہے۔“

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ میں ڈالر کا ایک نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھا اور سڑک پار کر کے ڈولیر پارکسٹ کی طرف چل دیا۔ میں نے وہاں گئے ہوئے بیل باکس پر نظر دوڑائی۔ ان میں سے کسی پر بھی فلیٹ کا نام نہیں تھا۔ دوسری بار غور سے دیکھنے پر جی۔ فلیٹ کا نام کرا نمبر 209 پر لکھا ہوا نظر آیا۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ فلیٹ کوئی جعلی نام استعمال کر رہا تھا۔

میں ہتھیاروں سے دور رہنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میرا ماننا ہے کہ جب ہتھیار استعمال کیے جائیں تو داغ کا کام کرنا چھوڑ دیتا ہے گوکہ میں بھی اپنے ساتھ ایک ہتھیار رکھتا ہوں لیکن وہ صرف حفاظت کے لیے ہے۔ یہ ایک ڈیڑھ فٹ کی آئزنی چمڑی ہے جس میں سیرس بھرا ہوا ہے اور اسے بہ آسانی چھپایا جاسکتا ہے۔

میں اپنی چمڑی کو مضبوطی سے پکڑے پڑ سکون انداز میں لالائی سے ہوتا ہوا سیزیموں کی طرف بڑھا۔ یہ پرانے طرز کی عمارت تھی جس کی سیزیموں پر قوانین نہیں تھا اور میرے تیرہ نمبر کے جتوں کی آواز گھڑی کی سیزیموں پر گونج رہی تھی۔ اگر فلیٹ کو واقعی کوئی خطرہ تھا تو وہ کوئی بھی ایجنسی آواز سن کر محتاط ہو جاتا ہوگا۔

میں نے کرا نمبر 209 پر پہنچ کر دروازے پر دستک دی۔ وہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا اور یہ خطرے کی علامت تھی۔ میں بھی فوراً ہی اندر نہیں جھانکا۔ یہ کسی ناخوشگوار واقعے کی دعوت دینے کے برابر ہے۔ اس کے بجائے میں قبضوں کی طرف کھڑا

گناہ کمال کرنے کے بعد میں انگڑااتا ہوا پینڈر اس اسٹریٹ تک گیا اور اس کے دفتر کی چکی منزل پر واقع اسٹینڈ اینڈ اسٹیک، سے فون کر کے اسے اپنے ساتھ کھانے کی دعوت دی۔

”بے چارہ۔“ پوری کہانی سننے کے بعد وہ ناک مڑکتے ہوئے بولی۔ ”وہ اس دنیا سے تنہا ہی چلا گیا۔ اس کی لاش وصول کرنے والا بھی کوئی نہیں ہے۔ لقمی دروہاک موت ہے۔“

میں نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی تو وہ بولی۔ ”مشر مگر ہم! معلوم کرو کہ اسے کس نے قتل کیا ہے؟“

”نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ اب یہ پولیس کیس ہے اور مجھے یقین ہے.....“

”لیکن تم نے تو کہا تھا کہ شاید وہ کچھ نہ کریں اور وہ اسے بھی داخل دفتر کر دیں گے۔ کیا اس کا یہ مطلب لیا جائے کہ جس کسی نے بھی اسے قتل کیا ہے اسے بھی سزا نہیں ہوگی؟“

اس نے غیر ارادی یا اتفاقی طور پر میری رسی کھینچ لی تھی اور میں یہ سوچتے پر مجبور ہو گیا کہ قلیٹ کے قاتل کو انصاف کے کٹہرے میں لانا چاہیے۔

”کیا تمہیں اس کام کے لیے مزید رقم کی ضرورت ہو گی؟“

”نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”تم نے پہلے جو معاوضہ دیا تھا۔ اس میں سے میں نے کچھ خرچ نہیں کیا۔ میں شام کو سراغ رساں نکولس سے بات کروں گا۔ اگر میں نے محسوس کیا کہ وہ اس کیس میں کوئی بڑی تحقیقات کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تو پھر میں غیر سرکاری طور پر اس معاملے کو دیکھوں گا۔“

☆☆☆

نیرے میرا چہرہ دیکھ کر خوش نہیں ہوا۔ بلکہ میں نے جو کچھ کہا اس نے اس کی بھی پروا نہیں کی۔

”میرا خیال ہے کہ تم نے ہی وہاں سے گناہ فون کر کے قتل کی اطلاع دی تھی۔“ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

”میں اس کی تصدیق کر سکتا ہوں اور نہ تردید.....“ میں نے بولنا شروع کیا۔

”میرے پاس صرف پندرہ منٹ ہیں جو کہنا ہے جلدی کہہ ڈالو۔“

”میں جانا چاہ رہا تھا کہ بیکسٹر کے کیس میں کیا پیش رفت ہوئی؟“

وہ اٹھ کر دفتر سے باہر چلا گیا۔ اس کی واپسی کافی دیر

”مگر ہم، پیٹ گراہم۔ ایک عورت نے مجھ سے اس آدمی کو تلاش کرنے کے لیے کہا تھا۔ اس نے مجھے اس کام نام بیکسٹر قلیٹ بتایا جبکہ نیچے نیل باکس پر اس کا نام بی فلیگ لکھا ہوا ہے۔ کیا تم مجھے اس کے علاوہ کچھ بتانے والے ہو؟“

”ہم نہیں کچھ نہیں بتانا چاہ رہے ہیں۔ وہ عورت کیوں چاہ رہی تھی کہ تم اسے تلاش کرو؟“

”وہ اس کے لیے فکر مند تھی۔ پولیس نے اسے بتایا کہ یہ شخص ذہنی مریض ہے۔ وہ اس کی مدد کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے میں اسے تلاش کر رہا تھا۔“

کچھ دیر خاموشی رہی پھر ان میں سے ایک بولا۔ ”ہم اس شخص کو نہیں جانتے۔ ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ اسے کس نے قتل کیا اور نہ ہی ہمیں اس کی پروا ہے۔ ہم صرف ایسے پریشان شہری ہیں جو بے جانے کے لیے آئے کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ تم اس کے ساتھ کیا کرتے ہو۔ یہ تمہارا مسئلہ ہے۔ اب ہم یہاں سے جا رہے ہیں اور اپنے دوسرے کام نمٹائیں گے۔ ہم سے دوبارہ ملنے کی کوشش نہ کرنا بلکہ یہ زیادہ بہتر ہوگا کہ تم ہمیں بھول جاؤ اور یہ کہ تم نے ہمیں بھی دیکھا تھا۔ سمجھ گئے؟“

”اچھی طرح سمجھ گیا۔“ میں نے جواب دیا۔ اس کے بعد وہ فوراً چلے گئے۔ میں نے میز صوفی پر ان کے قدموں کی آواز بھی نہیں سنی۔ وہ براہ اعتبار سے پروفیشنل تھے اور انہوں نے مجھے یہ احساس دلایا کہ میں شخص ایک شوشن فنکار ہوں۔ میرا خیال درست نکلا۔ قلیٹ بالکل وہی تھا جیسا میں نے کہا تھا۔ اگر ان لوگوں نے اس کا گلا کاٹا ہوتا جنہوں نے میری پٹائی کی تھی تو وہ مجھے بھی نہ چھوڑتے۔ پولیس پہلے ہی اسے ذہنی مریض قرار دے چکی تھی۔ اس کا کوئی رشتہ دار یا لاش وصول کرنے والا نہیں تھا۔ اس کی لاش کو چند روز مردہ خانے میں رکھا جاتا پھر لاوارث سمجھ کر دفن دیا جاتا۔ وہ جن لوگوں کے لیے کام کر رہا تھا، اب انہیں اس سے کوئی پریشانی نہیں تھی۔

میں کوئی پولیس والا یا پرائیویٹ سراغ رساں نہیں ہوں اور نہ ہی میرے پاس کوئی لائسنس یا شناختی کارڈ ہے جسے دکھا کر میں کہیں سے معلومات حاصل کر سکوں بلکہ ایک بے ڈھنگا شخص ہوں جسے ایک لالچی انسان نے چند ایسے ناگوار طریقے سکھائے پر مجبور کر دیا جن کے ذریعے میں لوگوں سے جو چاہوں نکلا سکتا ہوں۔ کلارا اسٹیوارٹ نے مجھے قلیٹ کو تلاش کرنے کی دتے داری سوئی تھی جو میں نے پوری کر دی۔

میں اسٹیوارٹ کے ذہن میں کچھ اور تھا۔ پولیس کو

فلٹ کا کپڑا داخل دفتر کر دے۔

کلارا نے یہ سن کر صرف اتنا کہا کہ یہ جائز نہیں ہے اور یہ سن کر میرا قصہ عروج پر پہنچ گیا۔ بہر حال ایک اچھی بات ہے، جب میں کسی معاملے میں ذاتی طور پر ملوث ہو جاؤں تو زیادہ اچھا کام کرتا ہوں۔ اس کے لیے وہ چارنا مکینڈا غازی بن سکتے تھے جو فلٹ کی ٹوٹ بک میں لکھے ہوئے تھے۔

ایسے لوگ جو ہسپتال میں جیسے ہوئے ہوں، میں ان کا کھوج لگانے میں وقت ضائع نہیں کرتا بلکہ سیدھا چرچ جاتا ہوں۔ کوئنٹن وارڈیل وہاں ماہر النساب تھا۔ اس چرچ کے ارکان حسب نسب کو بہت اہمیت دیتے تھے اور انہوں نے ساری دنیا میں اپنے پیچ و کاروں کا شجر نسب اکٹھا کر رکھا تھا۔ اس نظام کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ آپ ان لوگوں کے بارے میں سب کچھ معلوم کر سکتے تھے جو ابھی حیات ہیں۔

کوئنٹن کی عمر پچاسی برس کے قریب تھی اور وہ اپنا زیادہ وقت کتابوں اور کمپیوٹر میں گزارتا۔ اسے عمر کے اس حصے میں میری بہادری کی کہانیاں سننے سے دلچسپی ہوئی تھی۔ اس کے بدلے وہ مجھے مطلوبہ معلومات فراہم کرتا۔

”کیا آج بھی تم میرے لیے کوئی کہانی لائے ہو؟“ اس نے مجھ سے پوچھا۔

”کیا میں نے تمہیں انوشدہ شکر ریالے بالوں والے کتے اور اس کی وارڈ کی کہانی سنائی تھی؟“

”نہیں۔“

میں نے اسے وہ کہانی سنائی جس میں میرے ہاتھ کی ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ وہ ایک پانچ سالہ بچے کی طرح ہر لفظ غور سے رہا تھا جب کہانی ختم ہوئی تو اس نے خوشی سے تالی بجاتے ہوئے کہا کہ وہ میری کیا مدد کر سکتا ہے۔

میں نے اسے ان چارناموں کی فہرست تھما دی۔ کلائیڈ گل، ٹیل فورڈ، رابن میک لین اور جیکسن راجرز۔ اس نے کام شروع کر دیا اور پندرہ منٹ سے بھی کم وقت میں مطلوبہ معلومات فراہم کر دیں۔

”ان میں سے ایک باقی تینوں سے مختلف ہے۔“ میں نے کاغذ پر نظر ڈالنے ہوئے کہا۔ ”تین کاروباری لوگ ہیں اور ایک فوجی۔“

کلائیڈ گل ایک کیمیکل کمپنی کا مالک تھا جو تیسری دنیا کے ملکوں کو اپنا سامان فراہم کرتی تھی۔ ٹیل فورڈ انوشدہ شکر تھا جس نے سابقہ سوویت ریاستوں میں بھاری سرمایہ کاری کر رکھی تھی۔ رابن میک لین ایڈورٹائزنگ مینڈیا کمپنٹ تھا جس کے امریکا میں عربی زبان کے ریڈیو نیٹ ورک سے تعلقات

میں ایک فائل کے ساتھ ہوئی جسے وہ زیر لب پڑھ رہا تھا پھر اس نے وہ فائل میز پر رکھ دی اور آگے کی طرف جھٹکے ہوئے بولا۔

”تم مس اسٹیوارٹ کو بتا دینا کہ یہ کیس بند کر دیا گیا ہے کیونکہ اس نے خودکشی کی ہے اور ہم مزید تحقیقات کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ تمہارے آنے کا بہت بہت شکریہ۔“

”ایک منٹ۔“ میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ”تم اسے کس طرح خودکشی کہہ سکتے ہو۔ کیا لاش کا پوسٹ مارٹم ہو گیا۔ کیا انہوں نے کچھ زیادہ تیزی نہیں دکھائی، آخر اسے کیوں ترجیح دی گئی؟“

”شاید ان کے پاس کوئی دوسرا کام نہ ہو۔ بہر حال اب تم جاسکتے ہو؟“

”میں موت کی وجہ جاننا چاہتا ہوں۔“ میں نے مطالبہ کیا۔

”اس نے خودکشی کی ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکتا۔ اب تم جاؤ پیڑ۔“

”کیا تم بتا سکتے ہو کہ کوئی شخص تارے اپنا گلا کاٹنے کے بعد ذہنی طور پر حاضر ہو سکتا ہے کہ وہ مرنے سے پہلے اس تارے سے جھٹکارا حاصل کر لے؟“

”گو کیا تم وہاں موجود تھے؟“ اس نے میز پر ہاتھ راتے ہوئے کہا۔

”تم ابھی طرح جانتے ہو کہ میں وہاں گیا تھا۔ یہ بات تمہیں ان دونوں آدمیوں نے اسی وقت بتا دی ہوگی۔“

”کون سے دو آدمی؟“ اس نے پوچھا۔

”وہی جنہوں نے اس کے اپارٹمنٹ میں میری پٹائی کی تھی۔ سرکاری جاسوس۔“

اس نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ بند کیا اور اپنی کرسی پر بیٹھنے کے بجائے مجھے گھورنے لگا۔

”میری بات سنو۔ میں صرف ایک بار کہوں گا۔ یہاں سے چلے جاؤ۔ میں پہلی بار ان دو آدمیوں کے بارے میں سن رہا ہوں جن کا تم نے ذکر کیا ہے لیکن میں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں۔ ان کا کام ہی یہی ہے کہ وہ مسئلے کو ختم کر دیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص دوبارہ نظر نہ آئے۔ تم ان لوگوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ بکسر فلٹ کو بھول جاؤ اور اپنے کام پر واپس چلے جاؤ۔“

میں نے اسے دوبارہ کہنے کا موقع نہیں دیا۔ میرے کچھ کہنے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا کیونکہ معاملہ اس کے اختیار سے باہر تھا۔ کسی بااثر شخصیت نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ

میں نے کچن سے دو خالی پلاسٹک کی تھیلیاں اٹھائیں اور پستول ان میں ڈال کر ہاتھ روم کے ٹائلٹ نیک میں رکھ دیا۔ میں بعد میں اسے گمنام فون کر کے بتا سکتا تھا کہ وہ پستول کہاں رکھا ہوا ہے۔ باقی گھر میں کوئی خاص چیز نظر نہیں آئی۔ اس سے اس کی فوجی ذہنیت کا اندازہ ہوتا تھا۔ صاف ستھری، ترتیب اور نظم و ضبط والی۔ اس کے پاس پریشانی اشیا اور فضول خرچی کی گنجائش نہیں تھی۔ اسے زیادہ ساز و سامان کی بھی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ متحرک رہتا تھا۔ میں حیران تھا کہ فلیٹ اس سے کس قسم کے راز معلوم کر رہا تھا۔ وہ ہاؤن سالر غیر شادی شدہ تھا اور اس کے سر ہانے کوئی خفیہ ڈائری نہیں رکھی ہوئی تھی۔

میری نوعیت اس کی کاری آواز سن کر ٹوٹ گئی۔ میں نے گیراج کا دروازہ کھلنے کی آواز سنی اور کچن کا ڈنکر کے پیچھے چلا گیا جس کے سامنے گیراج کی طرف کھلنے والا دروازہ تھا۔ وہ اندر داخل ہوا۔ اس کا قد چھ فٹ سے زیادہ اور بال سلیٹے سے جتے ہوئے تھے۔

میں نے عقب سے اس کا بازو پکڑا اور کہا۔ ”مجھے سختی کرنے پر مجبور نہ کرنا۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

میں نے اس سے کہا۔ ”میں آہستہ آہستہ اپنی گرفت کم کر کے تمہیں صوفے تک لے جاؤں گا۔ تم اس پر بیٹھ کر مجھ سے بات کرو گے۔ اس دوران میں پورے وقت تمہارے عقب میں کھڑا ہوں گا تاکہ میں کسی بھی وقت تمہارے سر پر ضرب لگا سکوں۔“

اسے کا ڈنچ پر بٹھانے کے بعد میں نے کہا۔ ”میں تمہیں ایک کہانی سن رہا ہوں۔ تمہیں صرف گردن ہلاتی ہے اور پھر کچھ سوالوں کے جواب دیتا ہیں۔ ایکسٹرفلیٹ نامی ایک شخص کسی سرکاری ایجنسی کے لیے خفیہ جاسوس کے طور پر کام کرتا تھا پھر وہ مخفی ہو گیا اور اس نے کسی دوسری حکومت کو سرکاری راز دینا شروع کر دیے۔ ایک دن وہ تمہارے پاس آیا۔ اس نے فوجی مفاد کے نام پر تم سے مدد مانگی یا کوئی ایسی دھمکی دی کہ تمہیں اس کی بات ماننا پڑی۔ اس نے تم سے حساس نوعیت کی معلومات دینے کے لیے کہا۔ تم نے ایسا کیا اور بعد میں بھی ہر بار اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر ایسا کرتے رہے۔ بالآخر جب تم سے برداشت نہ ہو سکا تو ایک دن تم اس کے گھر گئے اور اس کی گردن کے گرد ایک بار پک پٹا لگا دیا۔“

اس نے بہت تیزی دکھائی یا مجھ سے بے احتیاطی

تھے۔ فلیٹ کی طرح وہ تینوں کنارے تھے اور ایسا کوئی ثبوت نہیں ملا جس سے معلوم ہوتا کہ وہ ایک دوسرے کو جانتے تھے اور نہ ہی وہ اس یوزن میں تھے کہ وہ کسی غیر ملکی ایجنٹ کو کوئی معلومات فراہم کرتے۔ ان کے سابقہ ریکارڈ میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جس سے ظاہر ہوتا کہ ان میں کوئی صلاحیت تھی جس کے بل بوتے پر وہ فلیٹ کے گھر میں کوئی پُر تشدد کارروائی کرتے۔

بجسٹن راجرز ان سب میں مختلف تھا۔ وہ فوج میں کپٹن کے عہدے سے ریٹائر ہوا۔ اس کے ریکارڈ میں ہفتوں بلکہ مہینوں کے کئی وقفے تھے۔ اس دوران اس کے کام کی تفصیلات موجود نہیں تھیں۔ راجرز کی ہسٹری سے اندازہ ہوتا تھا کہ شاید اس کے پاس کچھ معلومات تھیں۔ فلیٹ نے کسی طرح اس سے سمجھوتا کر کے وہ معلومات دینے پر آمادہ کر لیا تھا۔ اس سے کوئی زلزلہ نہیں آتا۔ میں جانتا تھا کہ کس طرح ان چھوٹے ٹکڑوں سے ایک بڑی تصویر بنائی جاسکتی ہے۔ ایک امریکی خفیہ جاسوس کے لیے کسی غیر متجانس فوجی کو تیار کرنا آسان تھا۔ اس حقیقت کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہ وہ امریکی فوجی تھا، اس پر شک کیا جاسکتا تھا کہ اسی نے فلیٹ کی گردن کے گرد پٹا لگانا چاہا ہوگا۔

میں اپنی خستہ حال فورڈ میں میٹری تک گیا اور راجرز کے گھر کے قریب ایک کونے پر گاڑی کھڑی کر دی۔ وہ ایک سادہ سی جگہ پر رہتا تھا۔ شاید فوج سے ملنے والی پینشن میں وہ بھی فورڈ کر سکتا تھا۔ مجھے ایک بات پریشان کر رہی تھی۔ فرض کیا کہ میں اسے فلیٹ کے کٹل کا اعتراف کرنے پر مجبور کر دیتا ہوں پھر کیا ہوگا؟ کیا مجھے فون کر کے کٹل کو بتا دینا چاہیے کہ میں نے قاتل کو پکڑ لیا ہے۔ اگر فلیٹ دوسرے لوگوں کو خفیہ راز دے رہا تھا تو اس طرح راجرز نے ایک قومی خدمت انجام دی ہے۔

میں اس کے عقبی پورچ تک پہنچا اور سلاٹنگ ڈور کی چوکت میں ایک سلاح ڈال دی اور میں اندر داخل ہو گیا۔ مجھے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ وہاں کوئی الارم نہیں تھا۔ میں نے تھوڑا سا انتظار کیا تاکہ یقین ہو جائے کہ وہ گھر میں نہیں ہے۔ مجھے وہاں کا جائزہ لینے کے لیے کچھ وقت درکار تھا۔

مجھے اس کا پستول اسی جگہ نظر آیا جہاں توقع تھی۔ ہم نے قلموں میں بھی دیکھا ہے کہ ہتھیار رکھنے کی بہترین جگہ بستر کے قریب ہوتی ہے۔ زیادہ تر لوگ اپنی گن بستر کے ساتھ والی دروازے یا الماری میں رکھتے ہیں۔ وہ بہت چالاک تھا۔ اس نے اپنا ہتھیار بیڈ کی پٹی کے ساتھ باندھ رکھا تھا۔

”اور نیواورلینز میں اپنی کورسٹوری کے ساتھ ظاہر ہوا کہ اسے فارغ کر دیا گیا ہے۔ وہ جہیں تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا تا کہ اس سے پہلے کہ تم اس تک پہنچو، وہ جہیں کسی کارروائی سے باز کر سکے۔ یہ ایک بہت زبردست کہانی ہے جس میں دونوں ایک دوسرے کا پیچھا کر رہے تھے۔ سوال یہ ہے کہ کیوں؟“

”بیویوں کے لیے۔ میں دنیا بھر میں سچائی، انصاف اور امریکا کی سر بلندی کے لیے لڑتا رہا۔ اس کے بدلے مجھے کیا ملا۔ صرف پشیم جس سے چند دن کا گزارہ بھی مشکل ہوتا ہے۔ کوئی بھی ادارہ ایک پچاس سالہ محض کو ملازمت دینے پر تیار نہیں جسے صرف لوگوں کو مارنا اور تباہی پھیلانا آتا ہو۔ اس لیے میں نے موقع سے فائدہ اٹھا یا۔ یہ میری بقا کا مسئلہ تھا۔ مجھے بھی کبھی یہ کام اچھا نہیں لگا۔ میں کئی راتیں جاگ کر گزارتا تھا لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اسے چھوڑ دیتا۔ ایک بار آپ اس میں پشیم جاسم کو تباہ کرنے کا راستہ نہیں ملتا۔“

”تم نے اپنے مفاد کا تحفظ کرنے کے لیے فلیٹ کو کل کر دیا؟“

”وہ اس کھیل میں آتا جا رہا تھا لیکن وہ ایک بہت ہی اہم اصول بھول گیا کہ تم ہار گئے تو سب کچھ ہار جاتے ہو۔“

اس نے آٹوٹیک پستول میری طرف کیا اور میرا ہاتھ پریشانی گنا بڑھ گیا۔ ”تم بھی ہار گئے ہو مگر اہم۔“

”ہاں، میں سمجھ رہا ہوں۔“

”اگر تم نے مجھ سے تعاون کیا تو میں تمہیں باقاعدہ روم تک لے جاؤں گا۔“

”وہ کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”مجھ سے یہ توقع نہ کرو کہ میں تمہیں اس جگہ کو لی ماروں گا کیونکہ مجھے خون کے دے جے چھپانے کے لیے قاتلین اور فرنیچر بدلانا ہوگا۔ اس کے لیے باقاعدہ کامیاب مناسب رہے گا۔“

میں آہستہ سے کھڑا ہوا اور گھٹنوں کے بل جھک گیا۔ کمر اٹھوٹ رہا تھا اور مجھے چکر آ رہے تھے۔ میرے لیے اپنا توازن برقرار رکھنا مشکل تھا۔ میں نے ایک ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”تم نے میرے سر پر ضرب لگائی ہے جس سے دماغی جوت لگی ہے۔ مجھے اپنے بیروں پر کھڑے ہونے میں وقت لگے گا۔“

میں نے آہستہ سے اپنا ہاتھ صوفے پر رکھا اور لڑکھواتا ہوا ہاتھ روم کی طرف چل دیا۔ جب میں دروازے پر پہنچا تو میں نے اپنا ایک ہاتھ ماتھے پر رکھا اور یوں ظاہر کیا جیسے میں پیچھے کی جانب گرنے والا ہوں۔ میں نے راجرز کو پیچھے ہٹنے

ہوئی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے اپنی کلائی سے میری گردن پر دار کیا۔ میرے نخرے میں اسٹینن ہونے لگی اور عارضی طور پر مجھے سانس لینے میں رکاوٹ محسوس ہوئی۔ میں نے حفاظتی تدبیر کے طور پر سر جھکا لیا تا کہ میرے جسم کا نظام معمول پر آجائے لیکن اس سے پہلے ہی میرے سر پر زوردار ضرب پڑی اور میں چکر اکر نیچے گر گیا۔

جب راجرز نے مجھے اٹھا کر صوفے پر بٹھایا۔ اس وقت تک میرے حواس بحال ہو چکے تھے اور مجھے اپنا نام، پتہ وغیرہ یاد آ گیا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ میں ایک آٹوٹیک پستول دیکھا یہ وہ پستول نہیں تھا جو میں نے ٹوائٹ کے ٹیک میں چھپایا تھا۔

”تم واقعی بہت بے وقوف ہو سٹر۔“ اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

”میرا نام گراہم ہے۔“ میں نے مشکل کہا۔ میرے سر میں ابھی تک شیش اٹھ رہی تھی۔ ”تم نے کس چیز سے میرے سر پر ضرب لگائی تھی؟“

میرے لیے کمرے پر نظریں جمائے رکھنا مشکل تھا۔ مجھے ہر شئی طاری ہو رہی تھی اور شاید مجھے ٹھیک ہونے میں کئی مہینے لگ جاتے اور یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اگر رات تک زندہ رہا تو یہ میری خوش نصیبی ہوگی۔

اس نے ٹوٹے ہوئے نکل دان کے ٹکڑوں کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک ٹکڑے پر خون لگا ہوا تھا۔ میں نے اپنی کھوپڑی کی پشت پر ہاتھ رکھا تو میری انگلیوں پر بھی خون لگ گیا۔ یہ اچھی بات نہیں تھی۔

”مان لیا کہ تمہاری کہانی درست ہے لیکن میں اس میں کہاں فٹ ہوتا ہوں، اگر میں نے اسے قتل کیا ہوتا تو تمہیں مارنے میں مجھے کیا مشکل تھی؟“

”تم یہ کہہ رہے ہو کہ میں غلطی ہی ہوں؟“

”بالکل کوکہ یہ ایک اچھی کہانی تھی لیکن تمہیں ذرا پیچھے جانا ہوگا۔ فلیٹ نہیں بلکہ میں منحرف ہو گیا تھا۔ وہ بہت ہی باعزت شخص تھا اور سی آئی اے میں کلرک کے طور پر کام کر رہا تھا۔ اس کے پاس انتہائی خوفناک راز تھے جن سے بائس بھرا ہوا تھا۔ اس کے لیے اسے ایک اور الماری کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا یا اور اسے یہ معلومات سیٹلائٹ ٹریکنگ سسٹم پر ڈالنے کے لیے کہا جو میرے کنٹرول میں تھا۔ اس کے.....“

”میں اس کے بارے میں جانتا ہوں پھر کیا ہوا؟“

”پھر وہ غائب ہو گیا.....“

کام لے رہا ہے۔ بالآخر انہوں نے اسے تلاش کر لیا لیکن اس وقت تک وہ مر چکا تھا اور جانے تو وہ پر ایک قریب جانے والا بھی موجود تھا جو کسی طرح بھی ان کے منظر نامے میں فٹ نہیں ہو رہا تھا۔ چنانچہ انہوں نے مجھے آزاد چھوڑ دیا۔ دوسرے لفظوں میں انہوں نے راجز تک پہنچنے کے لیے مجھے چارے کے طور پر استعمال کیا تھا۔

جہاں تک گل، فورڈ اور میک لین کا تعلق ہے تو قلیٹ نے کلارا کے گھر سے غائب ہونے کے بعد ان کی خدمات حاصل کی تھیں تاکہ بوقت ضرورت ان کے گھروں میں چھپ سکے۔ ایف بی آئی کے لوگوں کو بھی اس کی نوٹس تک میں یہ نام ملے لیکن انہوں نے راجز کے علاوہ تینوں کو نظر نہ کر دیا۔ انہوں نے میرے پیچھے سے چند گھنٹے پہلے ہی اس کے گھر کی دائرہ تک کاٹ دی تھی لیکن میں ایک سلاخ کے ذریعے دروازہ کھولنے میں کامیاب ہو گیا۔

”میں نے تمہیں پوری بات بتادی۔“ میک نیلی نے کہا۔ ”امید ہے کہ تم اسے خیر رکھو گے۔“

میرے لیے اپنے آپ کو گناہ رکھنا زیادہ اہم تھا۔ میرے چند قریبی دوستوں، کچھ منگولوں اور ایک ناراض پولیس سرانچ رساں کے علاوہ سب ہی مجھے سیدھا سادہ موسیقار سمجھتے تھے جو بارش کرتا پر زمین بجاتا تھا اور مجھے اپنا طبری زندگی پسند تھا۔ راجز کو ہر صورت میں کسی مزاحمتی بھی چاہے میں اس پر قتل کرنے کی کوشش کا الزام عائد کرتا یا نہیں۔ اس پر جاسوسی، استحصال یا بغیر اور کچھ جیسے سنگین الزام تھے۔ اس لیے میں نے اس پر الزام عائد کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

اسپتال میں ڈاکٹر نے مجھے ہدایت کی کہ میں کم از کم چھ ہفتوں تک لڑائی جھگڑے سے دور رہوں۔ کلارا کو اس بات کا شدید بچھڑاؤ تھا کہ اس نے میری زندگی کو خطرے میں ڈال دیا۔ اس کی طعانی کے لیے وہ میری آن کال زس بن گئی۔ بہر حال میں نے اسے سارا قصہ سنا دیا اور اس سے وعدہ لیا کہ وہ قومی مفاد میں اسے کسی پر ظاہر نہیں کرے گی۔ وہ میری ہنجر گزار بھی اور ہر بات میرے لیے مقامی ریستوران سے کھانا لاتی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں بہت کچھ پڑھ لیا ہے۔ وہ واقعی ایک پرکشش عورت ہے۔ جب میں کسی لڑکھڑاہٹ کے بغیر اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو جاؤں گا اور مجھے ایک کی جگہ تین چیزیں نظر نہیں آئیں گی تو شاید میں اس کے ساتھ ڈیٹ پر جا سکوں۔ واقعی یہ ایک حیرت انگیز دنیا ہے۔ یہاں کی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

ہوئے دیکھا تو فوراً چھلانگ مار کر باہر روم میں چلا گیا اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ وہاں تک کے برابر میں ایک کرسی رکھی ہوئی تھی۔ میں نے اسے اٹھا کر سبک اور دروازے کے درمیان پھنسا دیا۔ جب بھی راجز دروازے پر ٹکرا رہا تو وہ ہلنے لگتی۔

”تم اندر ہی بند رہو گے گراہم۔“ وہ چلایا۔ ”باہر روم سے نکلنے کے لیے کوئی کھڑکی نہیں ہے۔ میں پورے ہفتے تمہارا انتظار کر سکتا ہوں۔“

میں نے ٹوائلٹ کا ڈسکنا اٹھایا۔ میں نے راجز کے بستر کے نیچے سے جو پستول اٹھایا وہ وہیں موجود تھا۔ میں نے اسے پلاسٹک بیگ سے باہر نکالا اور اس کی بیٹری چیک کرنے لگا۔ میں نے بھی پستول نہیں چلایا تھا۔ کسی کو مارنا مذاق نہیں۔ میرے پیٹ میں مروڑ اٹھ رہے تھے اور سر جھکا رہا تھا۔ میں اسٹیل کے ہاتھ میں بیٹھ گیا۔ پستول میرے دائیں ہاتھ میں تھا۔ راجز کی آواز سے لگ رہا تھا کہ وہ دروازے کے بالکل سامنے کھڑا ہے اور اسے یہ معلوم نہیں کہ میں بھی مسلح ہوں۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور گولی چلانے کے لیے تیار ہو گیا۔ تاہم میرا ہاتھ بری طرح کانپ رہا تھا اور مجھے بالکل یقین نہیں تھا کہ میں گولی چلا سکوں گا۔

پھر میں نے ایک زوردار آواز سنی۔ وہ فائر ہوئے اور کسی کے چلانے کی آواز آئی۔

”مگر اہم کہاں ہے؟“ کسی نے راجز سے پوچھا۔

”باہر روم۔“ وہ گھٹی ہوئی آواز میں بولا۔

میں نے ریوالور فرش پر پھینکا اور آہستہ سے دروازہ کھول دیا۔ ایک مداخلت کار نے مجھے دیکھ کر پستول تان لیا۔ ”رک جاؤ۔“ میں نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”میں ہی گراہم ہوں۔“

”میک نیلی۔ ایف بی آئی۔ تم حیک تو ہو؟“ یہ آواز ان دو آدمیوں میں سے کسی ایک کی تھی جو میں پہلے بھی ڈویژن میں سن چکا تھا۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ میک نیلی اور اس کا ساتھی جینک کئی ہفتوں سے قلیٹ کو تلاش کر رہے تھے۔ وہ جب بھی اس کے نزدیک آتے وہ بھاگ جاتا۔ اس طرح اس کی یہ بات تو صحیح نکلے کہ اس کا پیچھا کیا جا رہا ہے۔ اس کا تعاقب کرنے والوں میں راجز کے علاوہ وہ لوگ بھی شامل تھے جو اس کی مدد کرنا چاہ رہے تھے۔ ایف۔ بی۔ آئی کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ پہلے کیا ہوتا رہا ہے لیکن انہیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ قلیٹ سے کون



خوشی کا سودا

عکس بنط

کسی سٹائش ... طمع و لالچ کے بغیر کیا گیا کام ہی اصل نیکی ہوتا ہے... ایک ایسی ہی عورت کی دلچسپ کہانی... جس کا کہنا تھا کہ ایک جنرل تین افسانوں پر بھاری ہے... مگر اس نے اپنی صلاحیتوں اور نیک نیتی سے ثابت کر دیا تھا کہ عورتیں کسی بھی معاملے میں مردوں سے کم نہیں ہوتیں...

لب سڑک پریشان حال لوگوں کو لونے والے گروہ کا انجام.....

لیسن لی کو اپنے بارے میں بہتر طور پر جان لینا چاہیے تھا۔ اس وقت وہ میرے لیونگ روم میں بیٹھی ہوئی تھی اور میں جانتی تھی کہ وہ انتہائی حد تک بے وقوف ہے تاہم میں نے اس پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ میں اس کے بارے میں کیا رائے رکھتی ہوں۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں جو دوسروں کی توجہ کا مرکز بننا پسند کرتے ہیں۔ ویسے بھی اسے ڈانٹنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسے اپنی حماقتوں کا اندازہ نہیں ہوتا لیکن میں یقین

جاسوسی ڈائجسٹ ﴿ 67 ﴾ دسمبر 2018ء

مجھ سے بہت ناراض ہے۔“
 ”مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔ میں نے ٹیلی فون پر اس کی آواز سن کر کچھ لپٹا تھا کہ وہ بہت غصے میں ہے۔“
 لین کی بیٹی نے ہی مجھ سے وقت لینے کے لیے فون کیا تھا کیونکہ لین کی تو اپنی اس حرکت پر بہت شرمندہ تھی اور مجھ سے بات کرنے کی ہمت نہیں کر پارہی تھی۔
 ”مجھے بہت افسوس ہے۔“ اس نے ایک بار پھر یہ الفاظ دہرائے۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہو رہی تھی کہ کم از کم وہ اپنی حرکت پر نادم تھی۔

اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”یہ واقعہ میٹری اسٹریٹ پر پیش آیا۔ جب میں نجوی کو ہاتھ دکھا کر آگے بڑھی تو پہلی عورت ایک کونے سے نکل کر میرے پاس آئی جہاں پہلے کچھ گاؤں ہوا کرتا تھا۔“

کچھ گاؤں میرے مرحوم شوہر کے ریسٹوران کا نام تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس کا ذکر کر کے اسے میرے دل میں نرم گوشہ بنانے کی اسید تھی۔ میں نے اس پر کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا کیونکہ میری نظر میں یہ ایک فضول کوشش تھی۔ لین کی نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ علاقہ جون کے زیر اثر ہے لیکن وہ بہت بوڑھا ہو چکا ہے لہذا.....“

میرے صبر کا پتہ نہ لبریز ہونے لگا۔ یہ سچ ہے کہ کئی برس پہلے چاکا ناٹون کے اس حصے میں رہنے والے لوگوں نے جون راہ کا اولڈ جون کہنا شروع کر دیا تھا لیکن یہ لقب اس کے احترام میں کہا جاتا تھا اور اس کی اصل عمر سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ بہر حال یہ کہنا صحیح نہیں تھا کہ بڑھتی ہوئی عمر اس پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ بہت سے لوگ بوڑھے ہونے کے باوجود بہت قابل ہوتے ہیں۔

”اگر بیٹیوں کے بجائے اس کے یہاں بھی بیٹے ہوتے تو شاید اس کی یہ حالت نہ ہوتی۔“ لین کی نے مایوسی سے کہا۔

اب مجھ سے برداشت نہ ہو سکا اور میں نے کہہ ہی دیا۔ ”تم اپنی غلطی کا الزام دوسروں پر ڈال رہی ہو۔ تم نے جو حماقت کی اس کا اولڈ جون کے بیٹوں کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی تعلق نہیں۔ ممکن ہے کہ تمہارا کہنا ٹھیک ہو کہ حالیہ دنوں میں اس کی جانب سے اپنے علاقوں پر کنٹرول رکھنے میں کوتاہی ہوئی ہے۔“

وہ بے وقوف تھی یا نہیں لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ ”لیکن میں پھر کبوں کی کہ تم اس غلطی کے لیے کسی کو مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتیں۔ مجھ سے بحث مت کرو

سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ حد درجہ بے وقوف ہے اور اسے عقل سکھانے کی کوشش کرنا بھتر پرانڈا مارنے کے برابر ہے۔ بھتر کا تو کچھ نہیں بگڑے گا۔ البتہ انڈا ضائع ہو جائے گا۔“
 ”میں معذرت خواہ ہوں میڈم۔“ اس نے اپنی دردناک کہانی سناتے کے بعد کہا۔ وہ مجھ سے عمر میں بڑی ہے اور ہمارا آپس میں کوئی رشتہ نہیں ہے۔ لیکن یہ مناسب تھا کہ وہ مجھے بڑی بہن کہہ کر بکاڑے کیونکہ وہ میرے پاس مدد کے لیے آئی تھی۔ ایک عرض گزار پر لازم ہے کہ وہ اپنے مخاطب کو مناسب عزت دے۔

”جانتی ہوں کہ میں بے وقوف ہوں۔“
 مجھے حیرت ہوئی کہ وہ اس حقیقت سے آگاہ ہے جبکہ زیادہ تر بے وقوفوں کو اس کا علم نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ میرے لیے نئی اطلاع نہیں تھی اس لیے میں نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا۔

وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”لیکن یہ سب میرے بیٹے کی وجہ سے ہوا۔ اس کی ابھی شادی نہیں ہوئی ہے۔ میں اس کی طرف سے بہت پریشان ہوں پھر میں اس کو بچانے کے لیے وہ سب کیوں نہ کروں جو میرے اختیار میں ہے۔“

”میرے بھی پانچ بچے ہیں جن میں چار لڑکے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ کہیں وہ یہ سمجھے کہ میری سراخ رساں بیٹی بھی انکوئی اولاد سے تادم میں نے یہ نہیں بتایا کہ ان میں سے دو بیٹیوں کی ابھی شادی نہیں ہوئی ہے جیسا کہ لین کی کی بھی ایک غیر شادی شدہ بیٹی تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ لین کی کے دل میں کوئی ایسا خیال آئے اور وہ میرے کسی بیٹے کے ساتھ اپنی بیٹی کا رشتہ جوڑنے کے بارے میں سوچنے لگے حالانکہ اس کی بیٹی دیکھنے میں خاصی معقول اور کچھ وارننگ تھی اور اس کے گھرانے میں وہی ایک واحد شخصیت تھی جس کے بارے میں یہ بات کہی جاسکتی تھی لیکن بے وقوفوں کے خاندان میں کسی ایک کی شادی ہونے سے بھتر تھا کہ میرے دونوں بیٹے نکاح سے رہیں۔

”میں جانتی ہوں کہ ہر ماں اپنے بیٹے کی مدد کرنا چاہتی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم مزک پر بیٹھنے والے عاملوں اور جو بیویوں کے پاس بچے جاؤ جس کا پتا چھپس کسی اجنبی نے بتایا ہو۔ سچ سچ بتاؤ لیکن..... کیا چھپس ایسا کرتے ہوئے ایک لمحے کے لیے بھی جھجک محسوس نہیں ہوتی؟“

اس نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ ”اسی لیے میری بیٹی

خوش کا سودا

ہوئے کہا۔ ”اگر وہ یہاں سے جا چکی ہیں تو مجھ لینا کرم نے اپنی حماقت کی قیمت ادا کر دی لیکن میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہوا ہوگا۔“

جب وہ ٹھکری ہوئی تو میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ بہر حال میں اُتر اُتار دیکھی کہ ہم ان ڈاکوؤں کو قرب و جوار میں ہی تلاش کر لیں گے۔ ممکن ہے کہ وہ اسحق یوڈی عورت ہو لیکن چانتا ٹاؤن میں اس جیسی اور بھی عورتیں محسوس جن کی بدولت ان دھوکے بازوں کا دھندا چل رہا تھا۔

اس روز ہمارے باہر جانے اور مڑ گشت کرنے کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ ہم اگلے تین دن تک سہ پہر کے وقت اس علاقے میں جاتے رہے۔ لیکن لی کے کہنے کے مطابق یہی وہ وقت تھا کہ وہ ان تین بد معاش عورتوں کی دھوکا دہی کا شکار ہوئی۔ بالآخر پانچویں روز اس نے ان میں سے ایک کو کولبس پارک کے قریب میلری اسٹریٹ پر دیکھ لیا۔ گوکہ میں اپنی پچھل قدری ضرورت کے مطابق جاری رکھنے پر تیار تھی کیونکہ سراغ رسانی کے کام میں مہر کی بہت اہمیت ہے۔ ”اب تم گھر جاؤ۔“ میں نے اس سے کہا۔ ”اگر انہوں نے ہم دونوں کو ساتھ دیکھ لیا تو ساری محنت ضائع ہو جائے گی۔“

”لیکن تم اسے اپنی بیٹی کو کس طرح دکھاؤ گی؟“ ”گھر جاؤ۔“ میں نے دوبارہ کہا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ میری بیٹی اس کیس کی حقیقتات کرے گی۔ میں نے اس کی کوئی پروا نہیں کی۔

میں اس کے پاس سے ہٹ کر اس جگہ بیٹھ گئی جہاں ایک طائفہ اپنے فن کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ وہاں سے اس جوان عورت پر یہ آسانی نظر رکھی جاسکتی تھی جس کی جانب لین لی نے اشارہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ وہاں بیٹھ کر میں موسیقی سے بھی لطف اندوز ہو سکتی تھی۔

خوش قسمتی سے موسم خوشگوار تھا اور ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ گوکہ میں نے بھی دھوپ کی پروا نہیں کی لیکن اس وقت میں نے دھوپ کا پشہ لگایا ہوا تھا کیونکہ جب کسی کی جاسوسی کی جائے تو ہمیں بدلنا ہمیشہ فائدہ مند ہوتا ہے۔ میں بھی اس عورت کا بغور مشاہدہ کر رہی تھی۔ میں نے نوٹ کیا کہ اس کا طرز عمل بھی تقریباً میرے جیسا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ میں نے اسی کو فوکس کیا ہوا تھا جبکہ اس کی نظریں ایک یوڈی عورت سے دوسری یوڈی عورت تک جاری تھیں یہاں تک کہ ایک مرحلے پر وہ مجھ پر بھی جم گئیں۔ خاص

کیونکہ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ہم تمہارا کیس لیں گے۔“

میں جانتی تھی کہ وہ اسی طرح اپنی غلطی پر پردہ ڈالنے کے لیے کوئی نہ کوئی جواز تلاش کرتی رہے گی جو میرے لیے ناقابلِ برداشت ہوگا۔ اسی لیے میری رضامندی جان کر اس کا چہرہ بھل اٹھا۔

میں لی اپنی بیٹی کے کہنے پر مجھ سے نہیں بلکہ میری بیٹی سے مدد مانگنے آئی تھی۔ بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ ہمارے خاندان میں صرف میری بیٹی ہی واحد سراغ رساں ہے۔ یہ ایک غلط تصور ہے جس کے لیے لین لی جیسی بے وقوف کو بھی تصور وار نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ مجھی کھار میں خود بھی کیسز کی تحقیقات کرتی ہوں لیکن اپنی بیٹی کے برعکس اس کی سمجھ نہیں کرتی۔ میرا کوئی فتنہ نہیں ہے اور نہ ہی میں لوگوں میں اپنے کارڈ تقسیم کرتی ہوں۔ یہ سارا کام غیر محسوس طریقے سے ہو رہا ہے۔ جب میں دیکھتی ہوں کہ متعلقہ فرد کراہت آمیز یا نامناسب کردار کا حامل ہے تو میں اس بات کو ترجیح دیتی ہوں کہ میری بیٹی اس میں ملوث نہ ہو یا وہ کیس اتنا سادہ ہو کہ اس میں صرف اس کا وقت ہی ضائع ہوگا یا اس میں کچھ ایسے عوامل ہوں جو میرے لیے باعثِ تجسس بن جائیں تو ایسے کیس میں خود مل کر رہتی ہوں۔

یہ بالکل واضح تھا کہ لین لی کے ساتھ دھوکا ہوا تھا اور اگر اس کا تذکرہ نہ کیا گیا تو مستقبل میں مزید لوگ خصوصاً بزرگ مرد و خواتین اس دھوکا دہی کا شکار ہو سکتے ہیں۔ مجھے سب سے زیادہ تشویش اس بات پر تھی کہ یہ واقعہ ایک ایسے علاقے میں پیش آیا جو عملاً اولڈ جون کے کنٹرول میں تھا۔

”ٹھیک ہے۔“ میں نے جانے کی پیالی ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ ”اب ہم آدھ مٹھے کے لیے باہر جائیں گے۔ تھوڑی سی پچھل قدری ہو جائے گی۔“

میں نے ذہنی طور پر اپنے آپ کو اس کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کے لیے تیار کر لیا تھا کیونکہ اس کے بغیر میرا مقصد بدل نہ ہوتا اور یہ بات میں نے اسے بھی بتادی۔ ”اگر آج وہ عورتیں نظر نہ آجیں جنہوں نے تم سے رقم بھجوا لی تھی تو ہم کل دوبارہ جائیں گے اور روزانہ جاتے رہیں گے جب تک تم انہیں دیکھ نہ لو یا ہمیں یہ اطمینان نہ ہو جائے کہ وہ چانتا ٹاؤن چھوڑ کر چلی گئی ہیں۔“

”لیکن اگر وہ چانتا ٹاؤن سے جا چکی ہوں تو مجھے میری رقم کس طرح واپس ملے گی؟“

”تم اسے بھول جاؤ۔“ میں نے اپنی جگہ سے اٹھتے

بات یہ تھی کہ اس کی دلچسپی کا مرکز صرف عورتیں تھیں جس پر مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ کیونکہ عام طور پر مردوں کے مقابلے میں عورتیں مدد کے لیے اجنبیوں پر بھروسہ کر لیتی ہیں۔

میں اس جگہ بیٹھی موسیقی سے لطف اندوز ہو رہی تھی جمی وہ عورت حرکت میں آئی۔ وہ ایک پریشان حال عورت کو بہت دیر سے دیکھ رہی تھی جو ایک عجوبی کے اسٹال پر رکھے اسٹول پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ایسے کی اسٹال پارک میں جگہ جگہ لگے ہوئے تھے جہاں عجوبی اور عامل پریشان حال لوگوں کی قسمت کا حال اور ان کے مسائل کا حل بتاتے۔ میں نے اس پہلو پر بھی غور کیا کہ کہیں وہ عجوبی عورت بھی عورتوں کے گردہ میں شامل تو نہیں تھی لیکن میں اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کر سکتی تھی کہ ان عجوبی عورتوں کی اکثریت کئی برسوں سے یہاں بیٹھ کر لوگوں کو قسمت کا حال بتا رہی ہے۔ میں ان میں سے کئی ایک کو جانتی ہوں بشمول اس عورت کے جسے دیکھنے کے لیے میں جلتی ہوئی اس جگہ تک گئی جہاں سے مجھے اس کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ پارک میں بیٹھ کر قسمت کا حال بتانے والیاں خود بہت بڑی دھوکے باز ہوتی ہیں لیکن جب میں واپس اپنی بیچ پر آئی تو میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ دھوکے بازوں کے گردہ کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ کسی مقامی رہائشی کو اپنے ساتھ شامل کرنے کا خطرہ مول لے۔

اس عورت نے قسمت کا حال بتانے والی کے فارغ ہونے کا انتظار کیا۔ پریشان حال عورت نے عجوبی کی فیس ادا کی اور کھڑی ہو گئی۔ اب وہ پہلے سے کم پریشان نظر آ رہی تھی۔ جب وہ جانے لگی تو جوان عورت اس کے پاس گئی اور اس سے کچھ پوچھا۔ وہ عورت راہ چلتے کسی پر اپنی پریشانی ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے اس نے اسے ٹالنا چاہا لیکن جوان عورت نے اس کا پیچھا ہی لے لیا۔ اس نے شکرانہ انداز میں پریشان عورت کے بازو پر اپنا ہاتھ رکھا اور کچھ کہنے لگی جس کا اس عورت نے جواب دے دیا۔ جوان عورت نے پھر اس سے کچھ پوچھا۔ پریشان عورت نے اس کی بات سنی اور تائید میں سر ہلایا۔ جوان عورت نے اس سے مزید کچھ پوچھا، اس کے جواب میں بھی اس نے وہی کچھ کیا جو وہ پہلے کر چکی تھی۔

میں اس کے بے ڈھنگے انداز سے اکتا چکی تھی۔ تبھی اس جوان عورت نے ایک دوسری عورت کی طرف دیکھا۔ وہ ایک فٹ پاتھ پر کھڑی ہوئی تھی اور اس کی نسبت قدرے

موٹی اور اوسط عمر کی تھی۔ پہلی عورت نے اسے دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور آواز دے کر بلانے لگی۔ وہ عورت تیزی سے چلتی ہوئی آئی اور ان کی گفتگو میں شریک ہو گئی۔ مجھے یہ یقین کرنے میں بالکل بھی دیر نہیں لگی کہ وہ بھی پہلی عورت کی ساتھی تھی۔ اب وہ تینوں آپس میں صلاح مشورہ کر رہی تھیں لیکن اس گفتگو میں زیادہ حصہ بعد میں آنے والی عورت کا تھا۔ پریشان عورت نے غالباً اس سے کوئی سوال پوچھا جس پر اس نے معذرت آمیز انداز میں سر ہلایا۔ پریشان عورت نے جذباتی انداز میں کچھ کہا تو وہ تھوڑی سی نرم پڑتی دکھائی دی۔ اس نے جیکٹ کی جیب سے سیل فون نکالا اور اس پر کوئی نمبر ڈائل کرنے لگی یا وہ ایسا ظاہر کر رہی تھی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اس کا فون پہلے سے آن ہوگا اور دوسری جانب اس نمبر پر ان کی باتیں سنی جا رہی ہوں گی اور اس بات کا بہت زیادہ امکان تھا کہ پہلے والی جوان عورت بھی ایسا ہی کر چکی تھی۔

سیل فون بند کرنے کے بعد موٹی عورت کے چہرے پر اطمینان نظر آنے لگا اور وہ سیل دینے کے انداز میں دوسری دونوں عورتوں سے باتیں کرنے لگی۔ اب وہ تینوں کسی کا انتظار کر رہی تھیں۔ اس دوران وہ موٹی عورت ہاتھ کے اشاروں سے دونوں عورتوں کو سیل دیتی رہی جیسے انہیں باور کروا رہی ہو جس کا انتظار ہو رہا ہے۔ اس کے آتے ہی پریشان عورت کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔

بالآخر ان کا انتظار ختم ہوا۔ موٹی عورت نے ایک اور عورت کی طرف اشارہ کیا، وہ مڑ کر کونے پر بیٹھ گئی۔ اتر رہی تھی۔ موٹی عورت نے اسے دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ان کی جانب آنے لگی۔ وہ بھی اوسط عمر کی دہلی پٹی عورت تھی۔ مجھے اس کے انداز میں حکمت اور غرور نظر آیا۔ وہ بالکل میرے گاؤں کے تاجر کی بیوی کی طرح لگ رہی تھی جہاں میں ہٹی بڑھی۔ اس نے عمدہ تراش خراش کا لباس پہن رکھا تھا جس سے میں متاثر ہوئی۔ صاف لگ رہا تھا کہ یہ گردہ میسے کمانے کے لیے پیسے خرچ کرنے کو بھی تیار ہے۔ میں نے بھی اپنے بچوں کو کھانے کی کوشش کی تھی۔ میرے بیٹوں کی سمجھ میں تو یہ بات آگئی لیکن بیٹی پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اور مجھے اس کی وارڈ روپ میں بھی کوئی ڈھنگ کا پکڑا نظر نہیں آیا۔

نئی آنے والی نے پہلے موٹی عورت سے بات کی جس نے اسے فون کر کے بلایا تھا۔ اس کے بعد وہ پریشان عورت کی جانب متوجہ ہوئی۔ اس نئی آنے والی نے نہ جانے ایسا

سید احمد شہید کی تحریک جہاد میں جو لوگ شامل ہوئے تھے۔ 1864ء میں ان پر سازش اور بغاوت کا مقدمہ چلا۔ اس تاریخی مقدمے میں مولانا محمد جعفر تھانیری، مولانا یحییٰ علی اور لاہور کے سوداگر حامی محمد شفیع وغیرہ ماخوذ تھے۔ 2 مئی 1864ء کو انگریز گورنر کی خواہش کے مطابق انگریز بیج نے ان تینوں کو پھانسی دینے کا حکم سنایا۔ مولانا جعفر تھانیری پھانسی کا حکم سن کر ایسے خوش ہوئے جیسے انہیں بادشاہت مل گئی ہو۔ یہی کیفیت مولانا یحییٰ علی اور حامی محمد شفیع کی تھی۔ 2 مئی سے 16 دسمبر تک یہ لوگ پھانسی کی کھڑی میں بند رہے۔ جیل والے ہمیشہ پھانسی کا سامان تیار رکھتے تھے۔ روزانہ سیکڑوں میسیں اور انگریز صاحبان یہ دیکھنے کے لیے آتے تھے کہ وہ سب پھانسی کا حکم ملنے پر اتنا خوش کیوں ہیں؟ وہ تعجب سے ان کی خوشی کا سبب پوچھتے۔ وہ تینوں ہنس کر جواب دیتے۔ ”حق کی راہ میں جو اس طرح ظلم سے مارا جائے وہ شہادت کا درجہ حاصل کرتا ہے۔“ جب انگریز صاحبان اقتدار کو معلوم ہوا کہ یہ لوگ پھانسی کی سزا سے بہت خوش ہیں تو انہوں نے 1865ء میں سزا بدل کر انہیں کالا پانی بھیج دیا۔ پھر یہ لوگ اٹھارہ سال بعد 1883ء میں وہاں سے رہا ہو کر واپس آئے۔

تاریخ کے ادراق سے ایک ورق
کراہی سے عکس فاطمہ کا تھوان

تھا۔ میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں نہیں جانتی کہ تمہاری پریشانی کی وجہ کیا ہے یا واقعی کوئی ایسا مسئلہ ہے جسے حل کیا جاسکے۔ مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تمہاری ساری قیمتی اشیاء اور نقد رقم لینے کے بعد وہ جادوگر نے کوئی ایسا عمل بتائے گی جو سورج غروب ہونے سے پہلے کرنا ہوگا یا اسی طرح کی کوئی حماقت جس کے نتیجے میں تمہارے لیے مزید مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔ وہ تمہاری ساری قیمتی اشیاء اور نقدی لے کر غائب ہو جائیں گی۔ وہ اس سے پہلے بھی ایسا کر چکی ہیں۔“

”تم کیا کہہ رہی ہو؟“
”تمہارے جادو اور اپنے مسئلے سے حل کے لیے کسی اور سے مدد مانگو۔ چائنا ٹاؤن میں ایسے کئی ذرائع ہیں جو لوگوں کے مسئلے حل کرنے میں مدد کرتے ہیں لیکن یہ عورتیں ان میں سے نہیں ہیں۔“

”میرا بیٹا۔۔۔۔۔“

میں نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”برائے

کیا کہہ دیا کہ پریشان عورت کے چہرے پر حیرانی چھانے لگی۔ یقیناً اس مرحلے پر لین لی کے چہرے پر بھی ایسے ہی آثار نمودار ہوئے ہوں گے۔ اس وقت مجھے ان دھوکے باز عورتوں سے شدید نفرت محسوس ہونے لگی۔

بالآخر کچھ مزید فوری نوعیت کی گفتگو کے بعد اس خوش وضع عورت نے سورج کی طرف دیکھا اور اپنی آنکھیں میچ لیں پھر اس نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ اس کے بعد اس نے اپنے بڑے قیمتی برس سے ایک کپڑے کا تھملا نکالا جس پر رنگین لکھنؤ کی کڑی کی کڑی دور سے ہی نظر آ رہا تھا کہ یہ گڑھا حافی مشین سے کی گئی ہے۔ اس عورت نے تحلیہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کچھ کہا۔ پریشان عورت نے اس کے جواب میں ایک سوال کیا اور اس کا جواب ملنے پر اس نے باری باری تینوں عورتوں کی طرف دیکھا اور اشارات میں سر ہلادیا اور گہرا سانس لیتے ہوئے تیزی سے جانے کے لیے مڑ گئی۔

اس نے ایک بار پیچھے مڑ دیکھا۔ جوان عورت یوں مسکرا رہی تھی جیسے اس کی حوصلہ افزائی کر رہی ہو جبکہ درمیانی عمر کی عورت نے اس کو نے کی جانب اشارہ کیا جہاں وہ تینوں کھڑی ہوئی تھیں۔ اس اشارے کا مطلب یہی تھا کہ وہ تینوں اس کا اس جگہ پر اظہار کریں گی، پھر اس نے اوپر دیکھتے ہوئے سورج کی طرف اشارہ کیا اور پریشان حال عورت نے اپنی رفتار بڑھا دی۔

میں اپنی بیٹی سے اٹھی اور اس عورت کا تعاقب شروع کر دیا۔ میں اپنی عمر کی دوسری عورتوں سے زیادہ تیز چل سکتی تھی۔ میں نے اس عورت کو کینال اسٹریٹ پہنچنے سے پہلے ہی پکڑ لیا۔

”معاف کرنا۔“ میں نے کہا۔ ”میرا نام چن یونگ یں ہے۔ برائے مہربانی تم ان عورتوں کو کوئی رقم یا جیولری مت دینا۔“

وہ عورت یوں اچھلی جیسے میں نے اس کے منہ پر قبضہ کر دیا اور ہوا اور ہکلاتے ہوئے بولی۔ ”تم کون ہو؟“

”ابھی تو میں نے تمہیں اپنا نام بتایا ہے۔ البتہ ان عورتوں نے تم سے غلط بیانی کی ہے اور انہوں نے تمہیں اپنے اصل نام بھی نہیں بتائے۔ اس کے علاوہ انہوں نے تمہاری کسی عزیز ہستی پر سے جادو یا بددعا ختم کرنے کا جو وعدہ کیا ہے وہ بھی جھوٹ ہے۔ تمہاری پیاری ہستی کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہے۔“

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا

کے مطابق اس نام نہاد جادوگر نے کوہاں آنا ہی تھا۔ اس موٹی عورت نے صرف جنہیں دکھانے کے لیے فون کیا جبکہ جادوگر نے اپنے سل فون پر پہلے سے ہی سب باتیں سن رہی تھی اور وہاں آنے سے پہلے ہی اسے تمہارے بارے میں ساری تفصیل معلوم ہو چکی تھی اسی لیے جب اس نے وہ باتیں تمہارے سامنے دہرائیں تو جنہیں بہت حیرانی ہوئی اور تم بھی جنہیں کہ یہ سب اس نے اپنے علم سے معلوم کیا ہے اور اس طرح اس پر تمہارا اعتقاد اور پختہ ہو گیا۔

اس پریشان حال عورت کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور وہ بے چینی سے مجھ سے دیکھنے لگی۔

”اس مغرور عورت نے تم سے کہا کہ اپنی تمام قیمتی اشیاء، نقدی اور جہولری وغیرہ ایک بیگ میں رکھ کر لے آؤ۔“ میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”اب تم وہ چیزیں لے کر واپس اس جگہ جاؤ گی جہاں وہ عورتیں تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔ تم اپنی چیزوں کا تھیلا اس رنگین تھیلے میں رکھ دوں گی جو اس نے تمہیں دکھایا تھا اور جسے وہ پراسرار تھیلا کہہ رہی تھی۔ پھر تم سے آنکھیں بند کرنے کے لیے کہا جائے گا اور وہ اس پر کچھ پڑھ کر چھوٹے گی۔“

اس کے بعد وہ تھیلا یہ کہہ کر جنہیں واپس کر دیا جائے گا کہ اب یہ تمہارا الکی بیگ ہے۔ تم اسے گھر لے جاؤ اور کسی پاک صاف جگہ پر رکھ دینا اور اس کے چاروں طرف اگر بتی جلا دینا۔ خیال رہے کہ اس دوران گھر کا کوئی فرد وہاں نہ جائے۔ جب رات کا اندھیرا پھیل جائے اور دعا کو بارہ گھنٹے گزر جائیں تو تم اس بیگ میں سے اپنی چیزیں نکال لینا۔ اس وقت تک تمہارے بیٹے پر سے جادو کا اثر ختم ہو چکا ہو گا۔“

وہ عورت بھی لین لی کی طرح بے وقوف تھی اور ان عورتوں کی باتوں میں آکر اپنی قیمتی اشیاء اور نقدی لینے گھر جا رہی تھی کہ خوش قسمتی سے میں اسے لٹکی اور میں نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا۔ اب وہ اپنا ایک ہاتھ منہ پر رکھے دم بخود مجھ سے دیکھ رہی تھی۔

”یہ کھلی حماقت ہے۔“ میں نے اس سے کہا۔ ”کیا تم نے واقعی اس پر یقین کر لیا تھا لکی بیگ، بارہ گھنٹے بعد تھیلا کھولنا وغیرہ وغیرہ۔ اگر تم ایسا کر دو گی تو بیگ کھولنے پر جنہیں معلوم ہو گا کہ تمہاری سب چیزیں اور نقدی غائب ہو چکی ہے اور ان کی جگہ کھلی زیورات یا سامان کے ٹکڑے رکھے ہوئے ہیں۔“

”گھر جاؤ۔“ میں نے دوبارہ کہا۔ ”اور آج یہاں

کرم مجھے اپنے غیر شادی شدہ بیٹے کے مسائل نہ بتانا۔“ میں نے محض اندازے کی بنیاد پر فرض کر لیا تھا کہ اس پریشان حال عورت کا بیٹا غیر شادی شدہ ہو گا کیونکہ عموماً ایک عورت اپنے کنوارے بچوں کے بارے میں ہی سوچتی ہے۔ شادی کے بعد شوہر یا بیویاں ان کا بوجھ بنتے ہیں۔

بہر حال میرا اندازہ درست نکلا۔ اس عورت کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور اس نے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم بھی جادوگر تھی ہو؟“

”نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”اور وہ مغرور عورت جو بڑی خوب صورت کی جیکٹ پہنے جنہیں لوٹنے کے لیے سڑک کے اس کونے پر تمہارا انتظار کر رہی ہے، وہ بھی کوئی نجوی یا جادوگر تھی نہیں بلکہ وہ تین عورتیں دھوکے باز ہیں۔ انہوں نے تمہارا انتخاب اس لیے کیا کیونکہ تمہارے چہرے سے پریشانی لپک رہی تھی اور یہ پریشانی مجھ جیسے کسی فرد کو نظر آسکتی ہے جو لوگوں کو سمجھنے اور ان کے چہرے پڑھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔“

”پہلی عورت نے تمہاری پریشانی کا سبب جان کر تم سے ہمدردی جتائی اور تمہارا اعتماد حاصل کر لیا پھر اس کی نظر دوسری عورت پر پڑی۔ میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ اتفاقاً ہی اس فٹ پاتھر پر نہیں آئی ہوگی بلکہ یہ ان کے منصوبے کا حصہ تھا۔ جب پہلی عورت نے اس موٹی عورت کو دیکھ کر ہاتھ ہلاتا تو تم سے کہا کہ اس عورت کا ملنا خوش قسمتی ہے کیونکہ اس عورت کے بیٹے کے ساتھ بھی ایسا ہی مسئلہ ہو گیا تھا جو کسی نہ کسی طرح حل ہو گیا۔ شاید وہ جنہیں اس بارے میں کچھ بتا سکے۔“

”وہ دوسری عورت جب وہاں آئی اور اس نے تمہارا مسئلہ سنا تو اس نے اس بات سے اتفاق کیا کہ اس کے بیٹے کے ساتھ بھی تمہارا بیٹے والا مسئلہ ہی تھا۔ اس نے ایک جادوگر تھی سے مشورہ کیا تو اس نے بتایا کہ اس کے بیٹے پر کسی نے جادو کیا ہوا ہے۔ اس جادوگر نے جادو کا تود کیا اور اس کے بیٹے کا مسئلہ حل ہو گیا۔“

میں وہی کہانی اس عورت سے منسوب کر کے بیان کر رہی تھی جو لین لی نے مجھے سنائی تھی اور اب تک میں نے جو دیکھا اس کے مطابق یہ اس عورت پر پوری طرح فٹ ہو رہی تھی۔ میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”اس موٹی عورت نے پہلے تم سے کہا کہ شاید وہ جادوگر تھی آج چانکا ٹاؤن نہ آنے لیکن تمہارے منت ساجت کرنے پر اس نے اسے فون کر دیا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ پروگرام

ہلم کارڈن ریسٹورنٹ کے مالک تھے۔

میں نے اس کے آنے سے کچھ دیر پہلے ہی چائے منگوائی تھی۔ وہ ایک دراز قد عورت تھی اور اس نے سفید رنگ کی شرٹ پہن رکھی تھی جس کی آستینیں کہنوں تک مڑی ہوئی تھیں۔ اس روپ میں وہ مجھے اتنی اچھی لگی کہ میں نے سوچا اپنی بیٹی سے اس کا ذکر ضرور کروں گی۔

وہ مسکراتے ہوئے میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی اور بولی۔ ”ہاں مجھے یاد ہے۔ بچے اسے بابا جن کہتے تھے اور وہ ہمیں غافیاں دیا کرتا تھا۔ ہم سب اسے بہت پسند کرتے تھے۔“

”تمہارے لیے چائے بناؤں۔“ میں نے پوچھا۔
”یہ آئرن بدھا کھلاتی ہے یا اگر تم بکھر چکے ہو تو وہ مشکوایں لیتی ہوں۔“

”نہیں، یہی ٹھیک ہے۔“ وہ ایک بار پھر مسکرائی۔
”مجھے یہ چائے پسند ہے لیکن بہت ہی عجز میں اسے نہیں پیتیں۔“

”ہاں یہ سچ ہے گوکہ میں ہمیشہ یہی چائے پیتی ہوں۔“

”اگر تم بابا جن کی بیوہ ہو تو میں بھی اسکول میں تمہارے دوسرے بچے کی دوست تھی۔“ اس نے کہا۔

”میرے دونوں بڑے بیٹوں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔“ میں نے کہا لیکن یہ نہیں بتایا کہ دو بیٹے اب بھی غیر شادی شدہ ہیں کیونکہ نہ صرف چن زئی ہو بلکہ اس سے چھوٹی بہن بھی غیر شادی شدہ تھی گوکہ اولڈ جون کی فیملی بے وقوف نہیں تھی لیکن میں اپنے بچوں کو ان سے فاصلے پر رکھنا چاہتی تھی۔ ”تمہارے باپ نے ان کی شادی پر ہمارے گھر کے خط بھیجے تھے۔“

”ہاں، وہ خط میں نے ہی بھیجے تھے۔“

”تم نے؟“ میں حیرت سے بولی۔

”ہاں، کچھ معاملات میں وہ بے پروائی کر جاتے ہیں تو ان کی طرف سے مجھے وہ کام کرنا پڑتا ہے۔“

”اوہ اب سمجھی۔ کیا میں کل گریبات کر سکتی ہوں؟“

اس نے اثبات میں سر ہلایا تو میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”معاف کرنا، کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اب تمہارے والد بہت سے معاملات پر اس طرح توجہ نہیں دے رہے جیسی کہ انہیں دینی چاہیے۔“

چن زئی ہو کے چہرے پر شرمیلی آگئی۔ ”معافی چاہتی ہوں لیکن یہ بتانا ضروری ہے، ایک خطرہ ہمارے سروں پر

واپس مت آنا۔ تم ایک بڑے نقصان سے بچ گئی ہو۔ اگر تمہارا کوئی مسئلہ ہے تو اس کے حل کے لیے کسی مناسب آدمی سے مشورہ کرو۔ کسی جعلی عامل سے مدد لینے کی ضرورت نہیں۔“

میں کافی دور تک اس کے ساتھ چلتی رہی۔ وہ مکمل طور پر چمکرائی ہوئی لگ رہی تھی۔ وہ چند قدم چل کر واپس آئی اور مجھے دیکھتی رہی پھر واپس مڑ کر تیزی سے اپنے گھر کی جانب چل دی۔

میں واپس پارک میں آ کر اپنی بیٹی پر بیٹھ گئی اور موسیقی سننے کے ساتھ ساتھ ان تینوں عورتوں کو بھی دیکھتی رہی جو مڑک کے کھڑے کھڑی خوش کہنوں میں مصروف تھیں۔ آدھ گھنٹے بعد انہوں نے اپنی گھڑی دیکھنا شروع کر دی اور بیٹا لیس منٹ گزرنے کے بعد ان کے چہروں پر پریشانی نظر آنے لگی۔ انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں آپس میں کچھ کہا۔ ایک گھنٹے بعد وہ مکمل طور پر مایوس ہو چکی تھیں۔ انہوں نے آپس میں ملا جلا مشورہ کیا۔ ادھر ادھر دیکھا اور تیزی سے تین مختلف سمتوں میں روانہ ہو گئیں۔

اب مجھے اگلے روز سے پہلے دوبارہ میلمیری اسٹریٹ جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں گھر جانے کے لیے آگئی جہاں مجھے کچھ ضروری انتظامات کرنا تھے لیکن اپنی عمارت میں داخل ہونے سے پہلے میں نے ایک اسٹال سے آنے کے طوے کے گول بیڑے خریدے حالانکہ میں بھی بکھار ہی ان پر پیسے خرچ کرتی ہوں کیونکہ میرے اپنے بنائے ہوئے بیڑے ان سے اچھے ہوتے ہیں۔ تاہم اس روز میں نے جو کارنامہ انجام دیا، اسے دیکھتے ہوئے میں اس صافیت کی مستحق تھی۔ گھر پہنچ کر میں نے ایک فون کال کی اور اگلے روز کے لیے کسی سے ملاقات کا وقت طے کیا اور اس کے بعد بیڑے کھانے بیٹھ گئی جو میرے بنائے ہوئے بیڑوں کی طرح ہی خوش ذائقہ تھے۔

اگلے روز صبح کے وقت میں ڈریگن کے ویلٹی پارل پہنچ گئی جہاں مجھے کسی سے ملنا تھا۔ اس وقت وہاں پیچھے کے حصے میں دو عمر رسیدہ افراد بیٹھے ہوئے تھے جبکہ سامنے والے حصے میں ایک جوان شخص بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ میں نے دیوار کے ساتھ ایک چھتہ منتخب کیا کیونکہ میرا خیال تھا کہ میرا ملاقاتی وہاں زیادہ آرام محسوس کرے گا۔

”صبح بخیر چن زئی ہو۔“ میں نے کہا۔ ”تمہارے آنے کا بہت شکریہ۔ میرا نام چن یوگ یں ہے۔ شاید تم نے میرے مرحوم شوہر کا نام سنا ہو۔ وہ میلمیری اسٹریٹ پر واقع

منظلا رہا ہے۔ میرے شوہر نے ہمیشہ ایسی باتیں کہیں
واجبات اس اعتماد اور بھروسے پر ادا کیے کہ اولڈ جون کے
زیر انتظام یہاں کے معاملات خوش اسلوبی سے چلتے رہیں
تھے لیکن اب کسی کاروباری شخص کو یہ بھروسہ نہیں رہا، اگر کوئی
مسئلہ کھڑا ہوا تو یہ تیزی سے پھیلتا چلا جائے گا۔ اس صورت
حال پر قابو پاؤ ضروری ہے۔“

”جن یونگ بن، تمہیں بولنے میں احتیاط کرنی
چاہیے۔“

”میں سمجھتی ہوں اور یہ بھی جانتی ہوں کہ کس سے
بات کر رہی ہوں لیکن تمہیں یہ بتانا ضروری ہے کہ یہ مسئلہ
پہلے ہی سر اٹھا چکا ہے۔ مجھے اجازت دو کہ میں اس کی
وضاحت کر سکوں۔ میں ایک ایسی عورت کو جانتی ہوں جسے
تین دھوکے باز عورتوں نے سلیبری اسٹریٹ پر لوٹ لیا۔ اسی
گروہ نے چند روز بعد ایک اور عورت کو لوٹنے کی کوشش کی
لیکن میں نے اسے ناکام بنادیا۔“

میں نے لمحہ بھر توقف کیا پھر اس کی جانب دیکھتے
ہوئے بولی۔ ”مجھے یقین ہے کہ تم میرے الفاظ کی اہمیت سمجھ
گئی ہو گی۔ اس لیے مجھے معاف کر دینا اگر میری باتیں
ناگوار گزر رہیں۔ پہلی تو یہ کہ ان عورتوں کو سلیبری اسٹریٹ پر
یہ کارروائی نہیں کرنا چاہیے تھی۔ ماضی میں ان کی بھی یہ
جرات نہیں ہوئی۔ دوسری بات یہ کہ سلیبری اسٹریٹ پر لٹنے
والی عورت کو مجھ جیسی بوڑھی بیوہ کے پاس مدد کے لیے نہیں
آنا چاہیے تھا۔“

”جن زی ہونے مجھے غمور تے ہوئے کہا۔“ اس عورت
نے میرے باپ کو نہیں بتایا؟“

”کیوں؟ کوئی خاص وجہ؟“
”ہم نے اس پر گفتگو نہیں کی۔ شاید وہ سمجھتی تھی کہ
سلیبری اسٹریٹ پر اس کے ساتھ کوئی واردات نہیں ہو سکتی
لیکن جب ایسا ہو گیا تو اسے یقین تھا کہ اولڈ جون اس کی کوئی
مدد نہیں کر سکتا۔“

”لیکن اس نے سوچا کہ تم اس کی مدد کر سکتی ہو؟“
”وہ مجھ پر بھروسہ کرتی ہے۔“ میں اسے یہ بتانا نہیں
چاہ رہی تھی کہ دراصل وہ میری بیٹی سے مدد مانگنے آئی تھی
لیکن میں جانتی تھی کہ میری بیٹی بڑے مسئلے کرنے میں
دلچسپی لیتی ہے اور شاید وہ لیٹی کی کوئی مدد نہ کر سکے۔

”لیکن یہ میرا اپنا خیال ہے۔ تم یہ بات بھی ذہن میں
رکھو کہ اس نے پولیس میں بھی رپورٹ درج نہیں کروائی۔“

میں نے اس موضوع پر مزید بات نہیں کی کیونکہ میرا
مقصد واضح ہو چکا تھا حالانکہ لیٹی کے ساتھ جو واقعہ پیش
آیا اس کے باوجود چائنا ٹاؤن میں رہنے والے ارباب
اختیار سے رابطہ کرنے میں آسودہ نہیں تھے۔ یہ ایک تکلیف
وہ صورت حال تھی اور اسے تبدیل ہونا چاہیے تھا۔ جب
لوگ قانون نافذ کرنے والے اداروں پر بھروسہ کرنا چھوڑ
دیں تو اولڈ جون جیسے لوگوں کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے۔“

میں نے اپنے لیے جانے کا ایک اور کپ بتایا اور
چھوٹے چھوٹے ٹکڑے لینے لگی تاکہ مہمان کو میری باتوں پر
غور کرنے کا موقع مل جائے پھر میں نے ایک چھوٹا سا وقفہ
دیتے ہوئے کہا۔

”تم دیکھ رہی ہو کہ کیا صورت حال ہے۔ یہ سلسلہ
سلیبری اسٹریٹ تک پہنچ چکا ہے۔ کم از کم اس مشاعرہ عورت کو
میرے پاس آنے کے سوا کوئی راستہ نظر نہیں آیا۔ میں نے
ایک دفعہ تو اس دوسری عورت کو لٹنے سے بچایا لیکن میں
ساری زندگی سلیبری اسٹریٹ پر ان دھوکے باز عورتوں کو
روکنے میں نہیں گزر سکتی۔ اس کے علاوہ میں اس عورت کی
لوٹی ہوئی رقم واپس لانے کے قابل بھی نہیں ہوں۔“

میں نے اس کی پیالی میں اور جانے ڈالی اور مزید
چائے کا آرڈر دے دیا۔ اس نے ایک ٹکڑے لیا اور بولی۔
”میں تمہاری بات سمجھ رہی ہوں۔“

میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”جن زی ہو، میں
تمہارے جذبے کی قدر کرتی ہوں جو تمہیں اپنے باپ سے
درٹنے میں ملا ہے۔ تمہارے باپ نے اس برادری کے
لیے قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اس کی بڑی بیٹی
ہونے کی حیثیت سے تم نے فطری طور پر کچھ ذمے داریاں
سنجھ لی ہیں جیسے مبارک باد کے خطوط بھیجنا وغیرہ۔ مجھے
اس میں کوئی شک نہیں کہ تم اس کے علاوہ بھی کئی دوسرے
معاملات میں اپنے باپ کے لیے کارآمد ہو سکتی ہو۔ مجھے
یقین ہے کہ اب تمہارے لیے ایک بڑا کردار ادا کرنے کا
وقت آ گیا ہے۔ تمہارے باپ کی بہت عزت کی جاتی تھی
اور لوگ اس کا احترام کرتے ہیں۔ تم ہرگز یہ نہیں چاہو گی کہ
اس عزت و احترام میں کوئی کمی آئے اور لوگ پیٹہ پیچھے اس
کے بارے میں سرگوشاں کریں۔“

میں نے کمین بسکٹ منہ میں رکھا جبکہ جن زی ہونے
خاموش بیٹھی دیکھتی رہی۔

”اگر آئندہ چند دنوں میں مجھ جیسی کسی بوڑھی عورت
سے ان عورتوں کا سامنا ہو گیا اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب

”میں کچھ سمجھی نہیں۔“

”تمہارے سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ میں تمہیں اس کی فیس ادا کروں گی۔ برائے کرم مجھے وہ ڈنڈیاں دوادور کچھ ایسے الفاظ ادا کرو جن سے تمہاری پریشانی ظاہر ہو۔ بس اب شروع ہو جاؤ۔“

”کون مجھے چند لمحوں تک دیکھتی رہی جو ایک طرح سے صحیح تھا۔ اسے یہ ظاہر کرنا تھا کہ میں نے اسے کوئی ایسا سنجیدہ مسئلہ بتایا ہے جس سے کن کر اسے بھی صدمہ ہوا ہے اور میں نے بھی اپنے آپ کو پہلے سے زیادہ پریشان ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ پھر اس نے مجھے بانس کی ٹکڑی سے بنا ہوا پیالہ دیا اور میں اسے اس وقت تک بلاتی رہی جب تک اس میں پڑی ہوئی ڈنڈیاں آپس میں مل نہ جائیں۔ پھر میں نے آخری بار اسے زور سے بلایا اور ایک ڈنڈی اچھل کر باہر آن گری۔ میں نے اسے اٹھالیا۔ گون نے اسے دیکھا پھر اپنے سامنے رکھی ہوئی ایک کتاب کے صفحے پر انگلی پھیرنے لگی۔

”تین سادہ افراد۔“ اس نے پڑھا۔ ”ایک ذہین جنرل کے برابر۔“

”بہت خوب۔“ میں ہاتھ ہراتے ہوئے بولی۔ ”اس کی وضاحت کرو۔“

”میں تمہارے مسئلے کے بارے میں نہیں جانتی۔“
”مجھے کچھ اور بتاؤ۔“ میں نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا جیسے بہت خوف زدہ ہوں۔
”میں نہیں بتا سکتی۔“

”شکریہ، یہی بہت ہے۔“ میں اسٹول سے کھڑی ہو گئی اور اسے دس ڈالر کا ایک نوٹ پکڑا دیا۔ واقعی یہ بہت شرمناک معاوضہ تھا جو یہ عورتیں اپنی کواں کے عوض لیتی تھیں۔

ابھی میں دس قدم ہی گئی تھی کہ وہ جوان عورت میرے پاس آئی اور جیسا کہ مجھے توقع تھی۔ اس نے مجھ سے پوسٹ آفس کا راستہ پوچھا۔ میں نے اسے سمجھا دیا کہ وہاں تک کس طرح پہنچا جا سکتا ہے۔ پھر اس نے مجھے غور سے دیکھا اور ہمدردانہ لہجے میں بولی۔

”کیا تمہیں کوئی پریشانی ہے۔ تمہارے چہرے سے ایسا لگ رہا ہے۔“

میں نے مختصر الفاظوں میں ایک احمقانہ کہانی سنا دی کہ میں اپنے مرحوم شوہر کے غیر شادی شدہ بھائی کی حرکتوں کی وجہ سے بہت پریشان ہوں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ایسے

نہ ہو سکتے تو انہیں اندازہ ہو جائے گا کہ سلیبری اسٹریٹ پر ان کا خیر مقدم نہیں کیا جائے گا اور یہ ہم سب کے لیے فائدہ مند ہوگا۔ فوری طور پر کوئی ایسا قدم اٹھانے کی ضرورت ہے کہ یہ علاقہ ان عورتوں سے پاک ہو جائے۔“

وہ پھر بھی کافی دیر تک خاموش بیٹھی رہی۔ بالآخر اس نے کہا۔ ”اس مہمان نوازی اور مشورے کے لیے میں تمہارا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ اب مجھے چلنا چاہیے۔“ یہ کہہ کر وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کیا میں تمہیں ایک اور تجویز پیش کر سکتی ہوں؟“
چن زئی ہونے اثبات میں سر ہلادیا۔

”وہ سامنے بیٹھا وہ شخص تم میں کافی دلچسپی لے رہا ہے۔ کیا تم اسے جانتی ہو؟“

وہ کچھ حیران ہوئی لیکن اس نے اس شخص کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ”ہاں، مجھے بھی یہی لگ رہا ہے۔“

”میں سمجھتی ہوں کہ ایسے اور لوگ بھی ہوں گے جنہیں تم ضرورت پڑنے پر بلا سکو۔ بہر حال میں سمجھتی ہوں کہ ایسی صورت حال میں شاید جوان عورتیں تمہارے لیے زیادہ کارآمد ہو سکتی ہیں۔ ان کی موجودگی ایک واضح پیغام دے گی۔ تمہیں اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔“

اس نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ایک بار پھر تمہارا شکریہ۔“ یہ کہہ کر وہ ٹی پارلر سے باہر چلی گئی۔ اس کے فوراً بعد ہی وہ نو جوان شخص بھی وہاں سے چلا گیا۔ البتہ میں اس کے بعد بھی کچھ دیر وہاں بیٹھی چائے اور بسکٹ سے دل بہلاتی رہی۔

تین دن بعد میں نے ایک بار پھر اس جوان عورت کو سلیبری اسٹریٹ پر دیکھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی میں نے اپنے اوپر پریشانی طاری کر لی اور تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی قسمت کا حال بتانے والی کون کے اسٹال پر بیٹھ گئی۔ اس عورت کو میں کئی برسوں سے جانتی تھی۔

”چن یونگ یں۔“ اس نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ ”تم نے اس سے پہلے بھی مجھ سے مشورہ نہیں کیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ تمہیں روحانیت پر یقین ہے یا نہیں۔“

”مجھے روحانیت پر مکمل اعتقاد ہے لیکن تم پر بالکل نہیں۔ تم یہاں بیٹھ کر جو کچھ کر رہی ہو وہ مجھ کو اس کے لیے کوئی بات نہیں۔ فی الحال مجھے تمہارا اسہارا لینا ہوگا۔ تم اس طرح ظاہر کر دو جیسے میں تمہیں کوئی دردناک کہانی سن رہی ہوں۔ اس کے بعد میں یہ ڈنڈیاں ہلاؤں گی۔ یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ میں بہت بری صورت حال سے دوچار ہوں۔“

کسی شخص کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔

میری نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔

تین دن بعد میں لین کی کے ساتھ اپنے لیوٹک روم میں بیٹھی جاے لی ری می۔ لین کی کا چہرہ خوشی سے دھک رہا تھا کیونکہ ٹھوڑی دیر پہلے ہی میں نے اسے وہ رقم واپس کی جو ان عورتوں نے دھوکا دے کر اس سے تھمالی تھی۔

”کھڑپے ٹھکر یہ۔“ وہ مسلسل کہے جا رہی تھی۔ ”میری بیٹی نے بالکل صحیح مشورہ دیا تھا کہ میں تمہاری بیٹی سے مشورہ کروں۔ میں نہیں جانتی کہ اس نے یہ رقم کس طرح واپس لی لیکن بہر حال میری نظر میں اس نے ایک کارنامہ انجام دیا ہے۔“

”برائے مہربانی اگر میری بیٹی سے ملاقات ہو تو اس کا ذکر مت کرنا۔“ میں نے اسے ہدایت کی۔ اس نے یہ رقم حاصل کرنے کے لیے جو طریقہ اختیار کیا اس کے بارے میں وہ بات کرنا پسند نہیں کرے گی۔ بہر حال اب وہ ڈکیت عورتیں واپس نہیں آئیں گی۔ میٹری اسٹریٹ کا علاقہ دوبارہ محفوظ ہو چکا ہے۔“

اس نے کچھ کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”واقعی ہم اپنی اولاد کے معاملے میں بہت خوش قسمت ہیں۔“

”ہاں، یہ تو ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”جسہیں مظلوم ہے کہ ایک ذہن جہل تین عام انسانوں پر ہماری ہوتا ہے۔“

وہ چپکتے ہوئے بولی۔ ”اس کا کیا مطلب ہے؟“

”یہی کہ بیٹوں پر فخر کرنا اپنی جگہ لیکن بیٹی کی قدر کرنے میں کمی سمجھتی نہیں کرنی چاہیے اور نہ ہی راہ چلتے لوگوں سے اپنا مسئلہ بیان کرنا چاہیے۔ اس کے لیے بہتر ہے کہ کسی قابل اعتماد دوست سے مشورہ کر لیا جائے۔ اگر آئندہ تم نے ایسی کوئی حماقت کی تو میری بیٹی بھی تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکے گی۔“

”بالکل نہیں، مجھے بہت اچھا سبق مل گیا ہے۔“ وہ شرمندہ ہوتے ہوئے بولی۔

میں نے آخری وقت تک اس پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ یہ کارنامہ میں نے انجام دیا ہے اگر وہ اسے میری بیٹی کے کھاتے میں ڈال رہی تھی تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اچھا ہے اس طرح میری بیٹی کی سادہ اور شہرت میں اضافہ ہو جائے۔ سرائف رسانی میرا شوق ہے پیڑھ نہیں۔ اس لیے میں کسی سائنس یا صلے کے بارے میں نہیں سوچتی۔ لوگوں کے مسئلے مل کر کے مجھے جو خوشی ہوتی ہے اس کی کوئی قیمت نہیں۔

اس نے ایک بار پھر مجھ سے ہمدردی کا اظہار کیا اور پھر سامنے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اودہ تم کتنی خوش قسمت ہو۔“ یہ کہہ کر اس نے موٹی عورت کی طرف دیکھ کر ہاتھ بلایا جو اسی طرف آ رہی تھی۔ اس موٹی عورت نے میری کہانی سن کر کہا۔

”میرے ایک کزن کے ساتھ بھی یہی مسئلہ تھا جو تمہارے شوہر کے بھائی کو ہے۔ یہ ہمارے خاندان کی خوش قسمتی تھی کہ ایک جادوگر نے اس کا علاج کیا اور وہ بالکل ٹھیک ہو گیا۔ دراصل ایسے لوگوں کو کسی کی بددعا ہوتی ہے یا ان پر جادو کیا ہوتا ہے اور اس کا توڑ کوئی عامل یا جادوگر ہی کر سکتا ہے۔“

میں نے کہا کہ مجھے بھی اس جادوگر نے سے ملو اور اس نے شب ظہر کیا کہ شاید وہ چاٹا ناٹا نہ آ سکے۔ اس پر میں نے اس کی خوشامد شروع کر دی تو وہ مکاری سے بولی۔

”دیکھو کوشش کرتی ہوں۔ آگے تمہاری قسمت۔“

یہ کہہ کر اس نے کوئی نمبر ملایا اور مسکراتے ہوئے بولی۔ ”تم بہت خوش قسمت ہو، وہ جادوگر نے یہیں قریب میں ہے۔ ٹھوڑی دیر میں یہاں پہنچ جائے گی۔“

جب وہ تیسری عورت وہاں پہنچی تو اس نے مجھ سے کچھ پوچھے پھر میری کہانی سن کر وہ میرے سامنے دہرا دی جس پر میں نے معنوی حیرت کا اظہار کیا۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا اور پھر اپنی قیمتی گھڑی کو دیکھنے لگی۔ اس کے بعد اس نے اپنے بڑے پرس سے ایک زمین تھیلہ نکالا اور مجھے پکڑاتے ہوئے اس کے استعمال کے بارے میں ہدایات دینے لگی۔ اس کے مطابق مجھے گھر جا کر اپنی تمام قیمتی اشیاء اور نقدی اس تھیلے میں رکھنا تھی۔ ابھی وہ یہیں تک ہی پہنچی تھی کہ چار جوان ایتھلیٹ نما عورتوں نے ہمیں گھیر لیا۔

”گھر جاؤ۔“ ان میں سے ایک مجھ پر غرائی۔ ”ابھی فوراً۔۔۔۔۔“

میں تیزی کے ساتھ وہاں سے چل دی لیکن یارک کے آخری کونے پر جا کر رک گئی۔ تاکہ بقیہ حقائق دیکھ سکوں تاہم وہاں دیکھنے کے لیے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ انہوں نے ان تینوں عورتوں کو ایک کار میں بٹھا یا جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر وہی اخبار پڑھنے والا شخص براجمان تھا جسے میں نے ڈریکون کے ٹی پارلر میں دیکھا تھا۔ وہ چاروں عورتیں ایک دوسری کار میں سوار ہوئیں اور دونوں گاڑیاں لمحوں میں

سید ہا راستہ

سرور اکرام

راستے سامنے ہوتے ہیں... مگر حالات و واقعات کی یلغار انہیں نظروں سے اوجھل کر دیتی ہے... اس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا جیسے سناکت پانی کی سطح پر پتھر گر کر ہلچل مچا دیتا ہے... ایک واقعہ ہوا اور زندگی کا دھار ابدل ڈالا... وہ ان راہوں پر چل پڑا... جہاں سے واپسی نہیں ہوتی... مگر انہی خار خار راہوں پر ایک ایسا رہنما مل گیا جس نے اس کی واپسی کو ممکن کر دیا...

دو مختلف دنیاؤں سے تعلق رکھنے والے دوستوں کا ماجرا.....



اس کے ایک ساتھی نے بتایا تھا کہ اس مکان میں ایک بہت گھڑی پارٹی آئی ہے۔
وہ مکان بہت بڑا اور خوب صورت تھا۔ اس کے اندازے کے مطابق کم از کم دو ہزار گز پر پھیلا ہوا تھا۔
وہ پہلے بھی اس مکان کے سامنے سے گزرا تھا۔ اس نے مکان کی چار دیواری پر حقارت اور نفرت سے تھوک دیا تھا۔
کیسا غم تھا کہ کسی کے پاس سر چپانے کو جھونپڑا تک نہ

جاسوسی ڈائجسٹ 77 دسمبر 2018ء

ہوا اور کوئی دو ہزار گز کے عالی شان پتھکے میں رہتا ہو۔ نہ جانے لوگ اتنی دولت کہاں سے لے آتے ہیں۔ کئی کئی کروڑ کے مکان ہوتے ہیں۔

اس نے دیکھا تھا کہ ایسے مکانوں میں رہنے والے بہت کم افراد ہوا کرتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ تین چار بچے۔ دو میاں بیوی۔ بس۔ اس کے علاوہ ملازمین کی فوج۔ گل، مالی، شوگر، خانا ماں اور گھٹ پر پہرا دینے والے سب گارڈ، دو تین خوشوار سم کے کتے اور اندر گھڑی ہوتی تین چار گاڑیاں کتنی دولت ہوتی ہے۔ نئے ماڈل کی۔ کتنے پیسے ہوتے ہیں لوگوں کے پاس۔ دوسری طرف غریبوں کے گھر ہوتے ہیں۔

میاں بیوی کے علاوہ کم از کم چھ سات بچے، بیمار پڑے ہوئے ماں باپ، رشتے کی کوئی عورت یا مرد۔ دو کمرے ایک چھوٹا سا آٹمن۔ دروازے کے باہر بیٹا ہوا گھر۔ ہر طرف کچرے کے ڈھیر۔ یہ زندگی ہوتی ہے ان کی۔ سسکتی ہوئی..... چوٹ کھاتی ہوئی۔

شیدے کو اس مکان کے آباد ہونے کی خبر اس کے ایک ساتھی نے سنائی تھی۔ اس کا اصل نام رشید تھا۔ ایک شریفانہ نام لیکن وہ اب بھول چکا تھا کہ کسی وقت وہ رشیدی ہوا کرتا تھا۔ وہ اب شیدے تھا۔ ایک مانا ہوا چور۔

اس نے چوری کے فن کو درج پر پہنچا دیا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا۔ ”دیکھ بے ڈاکو کبھی مت بننا، چوری تک رہنا۔“

”وہ کیوں استاد؟“

”ڈاکو بننا ایک ظلم ہے۔ زیادتی ہے۔ ہتھیار رکھ کر تو ایک بچہ بھی شیر بن جاتا ہے۔ چوری ایک فن ہے۔ اس میں بہت سی باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ موسم کا، ہوا کا، موقع کی مناسبت کا۔ گھر کے اندر داخل ہو کر اپنے آپ کو چھپائے رکھنے کا۔ اگر مالک جاگ جائے تو اسے خوف زدہ کرنے کا۔ یاد رکھو، میں نے خوف زدہ کرنا کہا ہے۔ نہیں کہ گولی چلا کر جان سے مار دیا۔ اسی لیے میں اپنے پاس بھی بارود والے ہتھیار نہیں رکھتا۔ صرف ایک چاقو ہوتا ہے میرے پاس۔ اگر کبھی مڈ بھیڑ کی نوبت بھی آجائے تو زیادہ سے زیادہ کیا الزام لگے گا؟ یہی نا کہ چوری کی نیت سے داخل ہوا اور ایک بندے کو زخمی کر دیا۔ سال چھ مہینے کی سزا ہو جائے گی۔ جبکہ ہتھیار ساتھ رکھا ہو اور گولی چلا دی تو پکڑے جائے یہ موت کی سزا ہوتی ہے اور بندہ پکڑا ضرور جاتا ہے۔ خون بھی نہیں چھپتا، سمجھے۔“

یہ اس کا نظریہ تھا جس پر وہ عمل کرتا تھا اور اپنے ساتھیوں کو بھی اسی پر عمل کرنے کی ہدایت کرتا۔ اب اسے استاد کا درجہ حاصل ہو گیا تھا۔

جس مکان کی اسے خبر دی گئی تھی، وہ اس مکان کے سامنے سے کئی بار گزرا تھا اور ہر بار نفرت اور غصے کی ایک لہری اس کے بدن میں دوڑ جاتی تھی۔

اس کے پاس تو کچھ بھی نہیں تھا اور یہ کم بخت امیر لوگ اتنے بڑے بڑے مکانوں میں رہا کرتے ہیں۔ کیا زندگی ہوتی ہے۔ صاحب شام کو گھر واپس آئے۔ بیگم صاحبہ اسارٹ بن کر تیار۔ کیونکہ شام کی چائے ان کی جیم خانہ میں ہوا کرتی ہے۔

جہاں ان جیسے اور بھی کئی دوست آیا کرتے ہیں۔ ان کی بیگمات ہوتی ہیں۔ ان کے صاف سحرے صحت مند بچے ہوا کرتے ہیں جو جیم خانہ کے ٹینس کورٹ میں ٹینس کھیلنے چلے جاتے ہیں یا پھر جیم خانہ کے سوئمنگ پول میں سوئمنگ کرتے رہتے ہیں۔

اور جب ڈنر کا وقت ہوتا ہے تو اپنے ماں باپ کے پاس واپس آ جاتے ہیں۔ سونے کے لیے خوب صورت آرام دہ کمرے ہوا کرتے ہیں جن میں موسم کی شدت کا پتا ہی نہیں چلتا۔ گرمیوں میں ان کنڈیشن چلتا ہے اور سردیوں میں ہیٹر لگا دیے جاتے ہیں۔

کیا زندگی ہوتی ہے ان لوگوں کی اور ایک ہم لوگوں کی زندگی۔ محنت اور محرومیوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔

ایک طرف ہنستے کھیلنے، صحت مند بچے۔ اور دوسری طرف بیمار لاغر بچے۔ ایک وہ جن کے کھانے کی میزیں طرح طرح کے کھانوں سے بھری رہتی ہیں اور دوسری طرف وہ لوگ جو ایک وقت کھائیں تو دوسرے وقت کا فاقہ ہو جاتا ہے۔ بہت فرق تھا دونوں میں۔

شیدے اس مکان کو باہر سے دیکھ دیکھ کر حسد میں جلتا ہو گیا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ ایک بار اس گھر میں چوری ضرور کرے گا۔ اس گھر کے کیمینوں کو ایک صدمہ ضرور پہنچائے گا۔ وہ جانتا تھا کہ سمندر سے اگر دو چار بالٹی پانی نکال لیا جائے تو سمندر کا کچھ نہیں بگڑتا لیکن دوسری طرف وہ بھی جانتا تھا کہ اس قسم کے لوگوں میں مالی نقصان برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ چاہے وہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو۔ وہ اپنے ذرا سے نقصان پر بے چین ہو جاتے ہیں۔ داؤد لا کر نئے لگتے ہیں۔

اس نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ”دیکھ، اب ایک کام کر۔ ذرا اس مکان کی چھان بین کر کے بتا دے مجھے۔“

”کیسی چھان بین کرنی ہے استاد؟“

”اے چوری یوں ہی نہیں ہوتی۔ ہر طرف سے دیکھ

کی رانی کے پودے لگے ہوئے تھے جن کے پھولوں کی بھیجی بھی خوشبو پورے احاطے میں پھیلی ہوئی تھی۔ ایک غیر فطری سانسنا تھا۔

کہیں کوئی آواز نہیں۔ کھڑکیاں اور دروازے بند تھے۔ عقبی طرف کی ایک کھڑکی سے ہلکی سی روشنی باہر آرہی تھی۔ کہیں جھینگر بھی بول رہے تھے۔ احاطے میں بڑے بڑے درخت بھی لگے ہوئے تھے۔

شیدے نے آگے بڑھنا چاہا اسی وقت ایک درخت سے کوئی پرندہ سخت سی آواز نکال کر اپنے پروں کو پھڑپھڑاتا ہوا گزر گیا۔ شاید ایک جگہ کہ گیا تھا پھر خاموشی۔ کوئی ہانپل نہیں۔ اندر سے بھی کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ شاید گھر کے کئین بے خبر سو رہے تھے۔ شیدے کے انداز سے کے مطابق اس وقت دو بج رہے ہوں گے۔ وہ اس وقت بھی اپنے ساتھ سوائے ایک چاقو کے اور کچھ بھی نہیں لایا تھا۔

یہ رام پوری چاقو اس کے بہت کام آتا رہا تھا۔ وہ جب دھمکانے کے لیے اسے کوڑا کر کھولتا تو سامنے والا سم کر رہ جاتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ کسی پر اسے استعمال کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ صرف ایک بار وہ ایسا چھنسا تھا کہ استعمال کرنا ہی پڑا تھا لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ مخالف کو ہلکے سے زخم کے سوا اور کچھ نہ ہو۔

کچھ دیر آہٹ لینے کے بعد وہ کھڑکیوں کے نیچے نیچے سرکتا ہوا اس کھڑکی تک آگیا جہاں روشنی ہو رہی تھی۔ یہاں بھی سنا تھا۔ کوئی آواز نہیں۔ گلتا تھا گھر کے کئین ہانپل ہی بے فکر ہوں۔ اس نے دونوں پنچوں کے بل اٹھ کر اندر جھانکا۔

وہ ایک کچن تھا۔ بہت بڑا۔ اور ہر طرح کے جدید سامان سے آراستہ۔ کیا نہیں تھا اس کچن میں۔ فرنچ، ڈیپ فریژر، ایک اشیئنڈ پر جو سر مشینیں، خوب صورت چولہے۔ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ۔ دربان میں کھانے کی ایک میز۔ جس کے ارد گرد کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ شاید اس گھر کے کئین کچن میں ہی بیچہ کر کھانا کھا لیتے ہوں گے۔

کچن کی ٹیبل پر بہت سے پھل رکھے ہوئے تھے۔ ایک بڑی سی باسکٹ میں۔ شیدا بیہوش سے دیکھ سکتا تھا۔ امرود، سیب، کیلے، کیٹو اور بھی ایک دو چیزیں تھیں۔ اس وقت اسے اپنی چھوٹی بیٹی شانوا یاد آئی۔ وہ کئی دنوں سے کہہ رہی تھی۔ ”بابا! میرے لیے فروٹ لیتے آ، یاد کر کے۔“

وہ ایسا بد قسمت تھا کہ اپنی بیٹی کی ایک چھوٹی سی خواہش پوری کرنے کے لیے اسے کئی دن سوچنا پڑتا تھا اور ایک یہ لوگ تھے۔ جن کے کچن میں فروٹ یوں ہی پڑے ہوئے

بھال کرنی ہوتی ہے۔ پہلی بات تو یہ معلوم کرنی ہے کہ اس مکان میں گاڑ کتنے ہوتے ہیں۔ ان کی ڈیوٹی کس وقت ہوتی ہے۔ عام طور پر دو گارڈ رکھے جاتے ہیں۔ ایک دن کا ہوتا ہے دوسرا رات کا۔ یہ معلوم کر کہ رات والا کیا ساری رات گیٹ پر رہتا ہے یا سونے کے لیے اپنی کوشری میں چلا جاتا ہے؟

”ہاں! استاد گیٹ کے ساتھ ایک کوشری بنی ہوئی تو ہے۔“

”بس تو یہی معلوم کرنا ہے اور اس سے بھی ضروری چیز یہ ہے کہ اس مکان میں کتنے کتنے ہیں۔ ان کم بختوں کو نیند بھی کتوں کے بغیر نہیں آتی۔ اور ان کتوں کو کس وقت کھولا جاتا ہے۔ کس وقت بند کرتے ہیں۔ یہ ساری معلومات ضروری ہیں۔ سمجھے۔“

دو دن کے بعد اسے رپورٹ مل گئی تھی۔ ”نہیں استاد، ابھی تو اس مکان میں نہ تو کوئی گاڑ یا چوکیدار رکھا گیا ہے اور نہ ہی کوئی کتا ہے۔“

”جہیں کیسے معلوم کر سکتا بھی نہیں ہے؟“

”میں دو دن تک اسی مکان کے آس پاس بھٹکتا رہا ہوں۔ اس نے بتایا۔“ کسی بھی وقت کسی کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی نہیں دی۔ بہت ہی بے پروا قسم کے لوگ ہیں۔“

”چلو ان کی بے پروائی ہمارے کام آنے والی ہے۔“

شیدا اسکرار کر بولا۔

”نہیں، میرے ساتھ کوئی نہیں جائے گا۔“ شیدے نے کہا۔ ”اے تم لوگ کام بگاڑ دیتے ہو۔ جوش میں آجاتے ہو۔ تمھارا نکال لیتے ہو جبکہ اپنا اصول دوسرا ہے۔ ٹھنڈے دل سے کچ کچ کام کرو۔ اچھے بیروں سے نہیں بلکہ دماغ سے کام لو۔“

”جیسی تمھاری مرضی استاد۔“

”اے منہ مت لٹکا۔ تم لوگ اچھی طرح جانتے ہو کہ میں نے کبھی اس لیے نہیں کیا یا تم سب کو حوصلہ دیتا ہوں۔“

”یہ بات تو ہے۔“

شیدا اسی رات اس مکان کی چہار دیواری میں کود گیا۔ وہ بالکل بے فکر ہو کر کودا تھا۔

کوئی گیٹ پر نہیں تھا اور نہ ہی کسی کتے کی آواز سنائی دی تھی۔ ورنہ اب تک ہنگامہ ہو چکا ہوتا۔ پتا نہیں کیسے لوگ تھے۔ گھر کی حفاظت کا کوئی بندوبست ہی نہیں کیا تھا۔ ہر طرف اندھیرا۔ صرف ایک چھوٹا سا بلیب چہار دیواری کے ساتھ چل رہا تھا۔ سامنے والے کورڈور میں بھی اندھیرا تھا۔ اندر رات

کوریڈور میں بھی ایک بلب جل رہا تھا جس کی روشنی بہت ہلکی تھی۔ ایک کمراس کے سامنے دائیں ہاتھ پر تھا۔ وہ دروازے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کمرے میں بھی سناٹا تھا۔

اس پیشے میں اسے اتنی پریکٹس ہو گئی تھی کہ وہ ہلکی سے ہلکی سانسیں بھی سن لیتا تھا۔ کوئی آواز نہیں تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کمرہ خالی ہے۔ اس نے دروازے کو اندر کی طرف دھکیلا۔ دروازہ کھلتا چلا گیا۔ کمرہ خالی تھا۔ اس کا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔

اس نے اپنی جیب سے پھسل تار بج نکال لی۔ کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے اسے ایک الماری دکھائی دے گئی جو اس وقت بند تھی۔ اس کے لیے قفل کھولنا کوئی براہم نہیں تھی۔ اس نے قفل کھولنے کے اوزار سے الماری کھول لی۔ یہ ایک موٹا سا تار تھا جس کی مدد سے وہ پیچیدہ قفل بھی کھول لیا کرتا تھا۔ تار بج کی روشنی میں اسے الماری میں بہت سی چیزیں دکھائی دیں۔ زیادہ تر کپڑے تھے لیکن ایک جیولری باکس بھی تھا جس کو دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ باکس بند نہیں تھا اور اس میں جیولری بھری ہوئی تھی۔

اس کی تجربہ کار نگاہوں نے بھانپ لیا کہ یہ جیولری لاکھوں سے کم کی نہیں ہے۔ اس کا مشن مکمل ہو گیا تھا۔ اس نے توقع سے زیادہ حاصل کر لیا تھا۔ اب اسے لٹکانا چاہیے تھا۔ اس نے وہ جیولری باکس اٹھایا یہی تھا کہ اسی وقت کمرے میں روشنی ہو گئی۔

کسی نے کمرے کا بلب جلا دیا تھا۔ شیدے کے سامنے ایک اسی کی عمر کا یا شاید اس سے دو چار سال بڑی عمر کا ایسا آدمی کھڑا تھا جو گمبھا ہو چکا تھا۔ دولت مندی کے آثار اس کے چہرے پر تھے۔ اس نے ایک ٹائٹ کاڈن پہن رکھا تھا۔ یہ بھی امیروں کے چوچلے ہو کر تے ہیں۔

وہ شاید اس مکان کا مالک تھا۔ شیدا اس سے غصے کی سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے اچانک شیدے پر حملہ کر دیا۔ وہ اس سے غصہ کرتا ہو گیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے اٹھے ہوئے ایک زوردار آواز کے ساتھ فرش پر گر گئے۔

شیدے کو اس وقت اس بات کی آغوش ہو رہا تھا کہ وہ اپنے ساتھ کوئی ہتھیار کیوں نہیں لایا؟ درندہ اب تک ہتھول دکھا کر وہ اس مکان سے نکل چکا ہوتا۔

وہ شخص اگرچہ شیدے کی نسبت زیادہ طاقتور تھا لیکن شیدے کو اس وقت اپنی سلاخی کی فکر لگی ہوئی تھی اسی لیے وہ کھل کر لڑ رہا تھا۔

تھے اور بھی نہ جانے کیا کیا ہو گا۔

شیدے نے کھڑکی کے پائٹ کا اندازہ لگایا۔ حیرت انگیز طور پر اس کھڑکی کا ایک پٹ کھلا ہوا تھا۔ یعنی وہ بڑی آسانی سے اندر جاسکتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ آج کی اس واردات کے لیے قدرت خود ہی اس کے لیے آسانیاں پیدا کرتی جا رہی ہو۔

گیٹ پر کوئی چوکیدار نہیں۔ گھر میں کوئی کتا نہیں۔ اور اب کچن کی کھڑکی کا ایک پٹ کھلا ہوا۔ وہ بہت آسانی سے اندر جاسکتا تھا۔

وہ کچھ دیر تک یوں ہی کھڑا رہا۔ پھر اس نے کھڑکی کے پٹ کو دھکا دیا۔ کھڑکی اندر کی طرف کھلی چلی گئی۔ اب اندر جانے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ اس نے بیچوں کے بل کھڑے ہو کر کھڑکی کی گر تھائی اور ایک ہلکی سی چپ کے ساتھ اندر کود گیا۔

اس طرح کی پریکٹس تھی اسے۔ وہ کئی بار اسی طرح گھروں میں کود چکا تھا اور وہ بھی اس طرح کے ذرا سی بھی آواز نہ ہو۔ اس نے یہاں بھی احتیاط کی بھی بھر پوری وہ ایک طرف دیک کر کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر کھڑا ہالیکین کسی نے کچن کی طرف آنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ وہ گھر سٹائے میں ڈوبا رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے فریج کھول کر دیکھا۔ اس میں کھانے پینے کی بہت سی چیزیں بھری ہوئی تھیں۔ کیا نہیں تھا اس میں۔ بالائی، کسٹرو، مشائیاں، چکن کا سائمن، سب کچھ تھا۔ اس کے علاوہ جوس کے کئی ڈبے بھی تھے۔ انار کا جوس، آم کا جوس، انٹاس کا جوس اور اسٹراپیری کا جوس جو اس کی بیٹی کو بہت پسند تھا۔ شالو اس کی بھی فرمائش کیا کرتی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ اس گھر کے کینوں کو چگا کر ان سے پوچھے کہ آخر کیوں؟ کیوں تمہارے پاس دنیا بھر کی لہتیں ہیں اور ہمارے بچے کیوں ترستے رہتے ہیں؟ اس کا دل نہیں مانتا تو اس نے انار کے جوس کا ایک ڈبا اٹھایا۔ ڈبا خالی کر کے اس نے میز پر رکھ دیا۔ کچن میں تو اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا اور وہ مکان میں صرف کھانے پینے کی چیزیں لینے تو نہیں آیا تھا۔ اس کو دوسرے کمرے بھی دیکھنے تھے۔ مکان کی خاموشی یہ بتا رہی تھی کہ لیکن بے خبر سو رہے ہیں۔ وہ کچن سے باہر آ گیا۔ ایک کوریڈور تھا۔ ایک سرے سے دوسرے تک کمرے تھے۔

ان کمروں کے دروازے اندر سے بند تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس مکان میں آخر کتنے لوگ رہتے ہیں؟ وہ دے قدموں آگے بڑھتا رہا۔ اس کے جو تے بہت کام آتے تھے۔ روبرو والے جو بالکل آہٹ پیدا نہیں کرتے تھے۔

رفتار جانان

کسی زمانے کی بات ہے ایک شخص سخت بیمار ہو گیا۔ اس کے خمن بیٹے تھے۔ اس نے ان سے کہا کہ جاؤ قرعہ لے لے (15 میل دور) میرے لیے دوا لے آؤ۔ جو سب سے آخر میں پہنچا گا، میری جان کا دوا دار تھی وہی ہوگا۔ تینوں بھائی روانہ ہو گئے۔ ایک پیدل اور دوسرے نے گدھا گاڑی کا انتظام کیا۔ گدھا گاڑی والا دوسرے روز پہنچا تو دیکھا والد صاحب فوت ہو چکے ہیں۔ جو پیدل روانہ ہوا تھا، وہ چار دن بعد واپس آیا۔ تیسرے بھائی کا دور دور تک پتا نہ تھا۔ آخر پندرہ دن بعد وہ واپس آیا تو ہڈیوں کا مجرب بن چکا تھا۔

دونوں بھائیوں نے اس کو جانکاد ملنے کی مہارک یاد دی اور اس سے پوچھا کہ اس نے کس ذریعے سے ستر کیا جو اتنی دیر لگائی۔ تیسرے بھائی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”پنجر ریل گاڑی سے۔“

افتخار حسین، چیچہ وطنی

سے چڑے نکلے ہیں۔ آج اس نے چڑیا کے گھونسلے میں جمناک کر دیکھا تھا۔ وہاں کوئی انڈا نہیں تھا۔ آج اس کی بی بی کو چوٹ بھی لگی تھی۔ وغیرہ وغیرہ۔ اسی قسم کی کہانیاں کاشف کے پاس بھی ہوا کرتیں۔

دونوں بچپن کے دوست تھے۔ بہت بچپن کے۔ ایک ساتھ کھیلنے والے۔ ایک ساتھ اسکول جانے والے۔ یہ اور بات ہے کہ کاشف کا اسکول دوسرا تھا۔ رشید کا دوسرا رشید کا باپ حمید کاشف کے باپ کے گھر ملازم تھا۔

ایک قابل اعتماد ملازم۔ کاشف کا باپ حمید پر پورا بھروسہ کرتا تھا۔ اسی طرح حمید نے بھی کاشف کے باپ کے بھروسے کی لاج رکھی تھی۔ وہ پورے گھر کا نگہبان تھا۔ کاشف کی پیدائش اسی کے سامنے ہوئی تھی۔ حمید نے اس دوران پورے گھر کا خیال رکھا تھا۔

کاشف اور رشید شام ہوتے ہی کرکٹ کھیلنے سامنے والے گراؤنڈ میں پہنچ جاتے۔ کاشف کھیل میں بے ایمانی کیا کرتا۔ کئی بار آؤٹ ہونے کے باوجود ماننے سے انکار کر دیتا۔ اس وقت رشید اس سے ناراض ہو کر ایک طرف چل دیتا۔ ”جاؤ، اب میں تمہارے ساتھ نہیں کھیلوں گا۔ تم بہت بے

لطف کی بات یہ تھی کہ دونوں ہی کوئی آواز نہیں نکال رہے تھے۔ بس ایک خاموش جنگ ہو رہی تھی۔ اس جنگ میں شیدے کا پلڑا بھڑکی ہوئے والا ہی تھا کہ کسی عورت نے آواز دی۔ ”خبردار! پیچھے ہٹ جاؤ، ورنہ گولی بارودوں کی۔“

شیدا... چونک کر ایک طرف ہٹ گیا۔ کمرے کے دروازے پر ایک عورت ذلیل چیز پر بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک پستول تھا۔ وہ محذور تو تھی لیکن اس کے ہاتھ محذور نہیں تھے۔ اس نے بڑی مہارت سے پستول پکڑ رکھا تھا۔

وہ آدمی لبک کر اس عورت کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے پستول اس کے ہاتھ سے لے کر اس کا رخ شیدے کی طرف کر دیا اور اس عورت سے بولا۔ ”فریہ جاؤ۔ پولیس کون کر دو۔“

”جان، تم کنٹرول تو کر لو کہ؟“ اس عورت نے پوچھا۔

”ہاں، تم میری فکر مت کرو۔ میرے ہاتھ میں پستول ہے۔ اس نے ہوشیاری کرنے کی کوشش کی تو گولی چلا دوں گا، تم جاؤ۔“

اس عورت نے ذلیل چیز کا رخ بدلا اور اس کمرے سے باہر چلی گئی۔ شیدے کے لیے یہ بہت تشویش کا صورت حال تھی۔ اس کے پاس صرف ایک چاقو تھا۔ اس پستول کے سامنے اس کی کیا حقیقت تھی۔

شیدے اور وہ آدمی ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ دیکھتے رہے۔ آہستہ آہستہ جیسے دھند صاف ہوتی چلی جارہی ہو۔ شیدے نے اسے پہچان لیا تھا۔ پہلے افراتفری میں وہ اس کی طرف دھیان نہیں دے سکا تھا۔

”کاشف۔“ اس نے آواز دی۔

وہ آدمی اپنا نام سن کر چونک پڑا۔ ”کون، کون ہو تم؟“

”کبھی میں تیرا دوست ہوا کرتا تھا۔“ شیدے نے کہا۔

”ارے تو... رشید ہے۔“ وہ لہک اٹھا۔

”ہاں یار... میں رشید۔ لیکن اب شیدا... ہو گیا ہوں۔“

”میرے دوست تم نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے؟“

کاشف نے کہا۔ ”تم، تم چور کیسے ہو گئے؟“

شیدا... گہری نگاہوں سے کاشف کی طرف دیکھتا رہا۔

بہت کچھ تھا اس کے پاس کہنے کے لیے۔

☆☆☆

اس کے پاس تو ہمیشہ سے کہنے کے لیے بہت کچھ ہوا کرتا۔ آج اس کی عمری کے انڈوں سے دو پیارے پیارے

ایمانی کرتے ہو۔“

اس وقت کاشف دوزکراس کو منالیا کرتا۔ ”اچھا بھائی اب نہیں ہوگا۔ اب اگر میں آؤٹ ہوا تو آؤٹ ہو جاؤں گا۔“ اس کی بات سن کر رشید ہنس دیا۔ اس طرح ناراضی ختم ہو جاتی۔ دونوں پھر ایک دوسرے کے ساتھ کھینے لگتے۔ رشید کی ماں رشید کو نسخ کیا کرتی۔ ”دیکھ بیٹا، وہ پیسے والے لوگ ہیں۔ اس لڑکے کے ساتھ تیری اتنی دوستی اچھی نہیں ہے۔“

”کیا ہوا اماں، کاشف بہت اچھا ہے۔“ رشید کہتا۔ ”وہ میرا اتنا خیال بھی رکھتا ہے۔“

”بیٹا تیرا باپ اس کے گھر کا ملازم ہے۔“

”تم کیوں بچے کے دل میں ایسی ہے یہ سب ڈال رہی ہو، کھینے دو۔“ حمید کہا کرتا۔

اس کے بعد سے پھر کھیل شروع ہو جاتا۔ اکثر کاشف رشید کے گھر کھانا بھی کھا لیا کرتا۔ وہ کہا کرتا۔ ”چاچی! آپ کے ہاتھ میں اتنا میٹ ہے کہ میں بیٹا نہیں سکتا۔ ہمارا لگ جو کھانے بناتا ہے اس میں کوئی مزہ ہی نہیں ہے۔“

”بیٹا وہ بے چارہ اپنی نوکری کے لیے کھانے بناتا ہے۔ میں پیار کے لیے بناتی ہوں، یہ فرق ہے۔“

کاشف کے گھر میں کئی ملازم تھے لیکن جو حیثیت رشید کے باپ حمید کی تھی، وہ کسی کی نہیں تھی۔ ابھی بھی تو وہ گھر کے فیصلوں میں بھی اپنی رائے دیا کرتا تھا۔ اور اس کے فیصلوں کو اہمیت بھی دی جاتی تھی۔

اس گھر میں زندگی بہت سکون سے چل رہی تھی کہ اچانک سب کچھ بدل گیا۔

ایک لمحہ ہی ہوتا ہے جب پورا سینار بوبدل کر رہ جاتا ہے۔ کاشف کی ماں کے انتہائی قیمتی زیورات چوری ہو گئے۔ پورا جیولری باکس غائب ہو گیا تھا۔ پورے گھر میں ہنگامہ سا برپا ہو گیا تھا۔

ایسا پہلے کسی نہیں ہوا تھا۔ یہ اتفاق تھا کہ ان ہی دنوں حمید کو اپنے گاؤں والی چھوٹی سی زمین کو چھڑوانے کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی۔ اس نے کاشف کے باپ سے بات کی لیکن یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ ان دنوں کاشف کے باپ کے پاس بھی پیسے نہیں تھے۔

اسی دوران زیورات چوری ہو گئے اور نہ جانے کس طرح الزام حمید پر لگا دیا گیا۔ پولیس بھی بلائی گئی اور حمید کو پکڑ کر تھانے لے گئے۔ اس وقت رشید کی بے قراری دیکھنے والی تھی۔ وہ تپ تپ کر رہا تھا۔ رشید کی ماں کو سکتہ سا ہو گیا

تھا۔ اتنے برسوں کی وفاداری کا کیا صلہ ملتا تھا۔ کاشف بھی اپنے باپ سے ناراض ہو گیا لیکن کاشف کے باپ نے کوئی پروا نہیں کی۔۔۔ اور یہ بھی ہوا کہ وہ جیولری باکس تلاش کے بعد حمید کے گھر سے مل گیا۔ اگرچہ اس میں زیورات نہیں تھے جس کے بارے میں یہ خیال کیا گیا کہ حمید نے کہیں بیچ دیے ہیں اور باکس گھر میں رکھا رہ گیا ہے۔

رشید کے باپ کو ایک سال کی قید ہو گئی۔ یہ ان کی تباہی کا آغاز تھا۔ اس گھر میں صرف ماں بیٹے رہ گئے تھے۔ اب اس گھر میں رہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ کوارٹر بھی کاشف کے باپ کا دیا ہوا تھا۔ دونوں ماں بیٹا اس کوارٹر کو خالی کر کے چلے گئے۔ کسی نے بھی انہیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔ چلتے وقت رشید کا رو رو کر بُرا حال ہو رہا تھا۔ اس کا دوست اس سے پچھڑ گیا تھا۔

اس کے بعد ان دونوں کی زندگی برباد ہو کر رہ گئی۔ اس کی ماں کا بھی انتقال ہو گیا۔ باپ جیل میں تھا۔ رشید در بدر ہونے لگا۔ پھر یہ ہوا کہ رشید کو کچھ جرائم پیشہ مل گئے۔ انہوں نے رشید کو شیدا۔۔۔ بنایا۔ باپ کا بھی جیل میں انتقال ہو گیا۔ رشید نے دوبارہ کاشف سے ملنے کی کوشش نہیں کی اور اب ایک عرصے کے بعد دونوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔

☆☆☆

”میرے دوست! تم نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے؟“

کاشف نے کہا۔ ”میرا مطلب ہے کہ تم چوری کیوں کرنے لگے؟“

”مجھے اس حال کو تمہارے باپ نے پہنچایا ہے۔“

رشید پھٹ پڑا۔ ”میرا باپ ایک سیدھا سادہ آدمی تھا لیکن اس پر چوری کا الزام لگا دیا گیا۔“

اس دوران کاشف کی بیوی بھی اپنی چیز سمیٹتی ہوئی وہاں لے آئی۔ ”میں پولیس کو فون کر رہی ہوں۔“ اس نے بتایا۔ ”لیکن جواب نہیں مل رہا۔“

”اب رہنے دو ڈارنگ۔“ کاشف نے کہا۔ ”اب معاملہ کچھ اور ہو گیا ہے۔“

”ہاں، وہ تو میں بھی دیکھ رہی ہوں۔ تم نے اپنا پتول ایک طرف رکھ دیا ہے اور اس چور سے مکمل لکڑیاں کر رہے ہو۔“

”ڈارنگ یہ چور نہیں ہے۔ یہ میرا بیچن کا دوست ہے رشید۔ میں جس کے بارے میں کہیں بتاتا رہا ہوں۔“

”ارے تم تو اس کی بہت باتیں کرتے ہو، پھر یہ سب

English

بہتر جلد کے لیے
ایک نیچرل احساس



A Quality Product of
Sarwana & Sohesihm
Publishers

f SnScare t @SnScare

”اس لیے تاکم امیر ہو۔“
”نہیں اس لیے کہ میں تمہارا دوست ہوں۔“ کاشف نے کہا۔

”تم پیسے والے بہت خوش نصیب ہوتے ہو۔“ رشید نے ایک گہری سانس لی۔ ”جس کی چاہے مدد کرو۔ جس کو چاہے اپنے پیروں پر کھڑا کرو۔“

”خوش نصیب؟“ کاشف بھٹ پڑا۔ ”تم اسے خوش نصیبی کہتے ہو۔ میری بیوی محذور ہوئی ہے۔ ہمارے یہاں ایک بچہ پیدا ہوا تھا لیکن صرف تین سال کی عمر میں اللہ کے یہاں واپس چلا گیا۔ تم کو کیا معلوم کہ ہم کس کرب میں زندگی گزار رہے ہیں۔ دولت تو ہے ہمارے پاس۔ لیکن خود بتاؤ، کیا ہمیں سکون بھی ہے؟“

رشید خاموش ہو گیا۔ وہ اپنی آنکھوں سے کاشف کی بیوی کو دیکھ چکا تھا۔ وہ مکمل چیز پر ہوتی تھی۔ اس کے اعضا کام نہیں کرتے تھے اور اس نے بتایا تھا کہ اس کا بیٹا بھی اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ رشید نے گردن جھکا لی۔ زندگی سب کے لیے کچھ نہ کچھ اچھینیں رکھتی ہے۔

”میرے دوست۔“ کاشف نے کہا۔ ”میں نے تم کو بزنس کی آفر کی ہے۔ ایک بار پھر کھڑے ہوں کہ یہ کوئی احسان نہیں ہے۔ بلکہ ہماری وجہ سے تمہارا جو نقصان ہوا ہے، اس کا کچھ نہ کچھ ازالہ ہو سکے۔ کاروبار میں ترقی ہو اور جب تمہارے پاس پیسے آجائیں تو واپس کر دیتا۔“

”میں تیار ہوں۔“ رشید نے کہا۔

”تو پھر کل میرے دفتر آ جانا۔ میں ایسا ر بلڈنگ کی چوٹی منزل پر ہوتا ہوں۔ خرم فریڈرز کے نام سے دفتر ہے۔ خرم میرے مرحوم بچے کا نام۔“ کاشف کی آواز بھرا گئی تھی۔

رشید نے آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لیا۔ وہ بھی رو رہا تھا۔ دونوں دوست رورہے تھے۔ ایک عرصے کے بعد دونوں نے ایک دوسرے کے غلوں کی گہری غسوں کی تھی۔

”یاراب مجھے اجازت دے۔“ رشید نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

”تم اندر کیسے آئے تھے؟“ کاشف نے پوچھا۔

”مجھن کے راستے سے۔“ رشید نے بتایا۔

”لیکن اب تم سامنے والے گیٹ سے جاؤ گے۔“

کاشف نے کہا۔ ”تم آئے فلا راتے سے تھے لیکن تمہاری

واپسی سیدھا راستے سے ہوگی۔“

رشید مسکرا دیا۔ کاشف نے ایک بار پھر اسے گلے لگا لیا تھا۔

”کیا ہے؟“

”یہ ایک لمبی کہانی ہے۔“ کاشف نے کہا۔ ”تم اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو۔ اب مجھے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ تم بہت شکلی ہوئی ہو، جاؤ، میں آ رہا ہوں۔“

اس کی بیوی چیخ مچاتی ہوئی واپس چلی گئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد کاشف نے کہا۔ ”میرے دوست شاید تمہیں اس بات پر یقین نہ ہو لیکن ہم نے تم لوگوں کو تلاش کرنے کی بہت کوشش کی تھی لیکن جہاں بھی تلاش کیا گیا پتا چلا کہ تم لوگ وہاں سے جا چکے ہو۔“

”کیوں تلاش کر رہے تھے؟“ رشید نے پوچھا۔

”اس لیے کہ ہمیں پتا چل گیا تھا کہ اصل چور کون

ہے۔“ کاشف نے بتایا۔ ”وہ ہمارے ہی گھر کا ملازم تھا۔

سب تمہارے باپ سے چلتے تھے۔ اس لیے ایسی سازش کی

گئی تھی۔ ملازم نے سب قبول کر لیا تھا۔ میرے باپا کو اتنا

افسوس ہوا کہ وہ کئی دنوں تک بے چین رہے۔ پھر پاگوں کی

طرح تمہیں تلاش کرتے رہے لیکن تم لوگوں کا پتا نہیں چلا۔

اس دوران میرے باپا کا بھی انتقال ہو گیا۔ ان کا بزنس

میرے ہاتھ آ گیا۔ میں نے بزنس کو ترقی دی۔ اور اب اس

مقام پر ہوں۔“

”لیکن میں تو کسی مقام پر نہیں رہا۔“ رشید کی آواز میں

دکھ تھا۔

”تم بتاؤ تو کسی تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے؟“ کاشف

نے پوچھا۔

رشید نے اپنی کہانی سنا دی۔ ”تمہارے باپ نے یا

معاشرے نے کیا سلوک کیا تھا ہمارے ساتھ۔ اس دن کے

بعد سے میں نے سوچ لیا کہ میں امیروں کو لوٹا کروں گا۔ کیونکہ

یہ بے حس ہوتے ہیں۔ انہیں کسی کے دکھ درد سے کوئی واسطہ

نہیں ہوتا۔“

”تمہاری یہ سوچ غلط ہے رشید۔ یہ ایک نیکیو سوچ

ہے۔“

”جو تمہاری کے دہانے پر آ گیا ہو، اس کے لیے کیا نیکیو

اور کیا پوزیشن۔“ رشید نے کہا۔

”تم اگر چاہو تو اس ڈگر کو چھوڑ کر ایک سیدھی سادی

زندگی گزار سکتے ہو۔“ کاشف نے کہا۔ ”تم اگر جا ب نہیں کرنا

چاہتے تو نہ کرو، کوئی بزنس نہ کرو۔“

”بزنس؟“ رشید ہنس پڑا۔ ”میرے دوست بزنس کے

لیے رقم کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ میرے پاس نہیں ہے۔“

”میں دے سکتا ہوں۔“

نقلی ہیرو

جمال دستی

ایک قیدی کی زندگی کیسی ہوتی ہے... اس کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جس نے اسیری میں ایک طویل مدت گزاری ہو... کیوبا کی جیل میں گزارے گئے قسب و روز گنتی سے ماورا ہو چکے تھے... وہ عمر رفتہ کو پکار نہیں سکتا تھا وہ سنہرا وقت گزر چکا تھا... جذباتی... رومانی اور معاش کے بحرانی چھٹکوں نے اس کی ذہنی حالت کو تباہ و برباد کر دیا...

یاس زور زندگی میں خوشی کی معمولی رقم کی منتہی کی تون کا معاملہ

پرائیویٹ سرائف رساں دلی کوٹا اپنے گھر سے چھ ہلاک کے قاصدے پر داغ پارک میں پام کے درخت کے ساتھ کھڑا کم عمر لڑکوں کو فٹ بال کھیلتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ وہ لڑکے جوش کے عالم میں گیند پر بچھتے، اسے ٹھوکریں مارتے فریق مخالف کے گول تک لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ بعض اوقات وہ آپس میں کھرا کر گھاس پر گر جاتے لیکن فوراً ہی اٹھ کر وہ پارہ گیند کا چھسا کرنے لگ جاتے لیکن ابھی تک کوئی بھی فریق مخالف پر گول کرنے میں کامیاب

جاسوسی ڈائجسٹ « 85 » دسمبر 2018ء

رہی ہوں۔“

اس نے تماشاخیوں کی جانب اشارہ کیا۔ قطار کے آخری سرے پر وہ نوٹھی عورت ایک کیڑی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے پھولدار لباس اور چہرے پر سیاہ چشمہ لگا رکھا تھا۔ ولی نے اندازہ لگا یا کہ اس کی عمر پچھتر اور اسی کے درمیان ہوگی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ اور نظریں میدان پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے نواسے کو کھینٹا ہوا دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔

”وہ بالکل ٹھیک دکھائی دے رہی ہے۔“ ولی نے کہا۔ ”اور بہت خوش نظر آ رہی ہے۔“

اسرسلانے تاکید کرتے ہوئے کہا۔ ”ہاں ان دونوں وہ خاص طور پر بہت خوش ہے لیکن مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ جھوکا نہ کھا جائے جس سے اسے تکلیف پہنچے اور اس کی زندگی تاریک ہو جائے۔ اس کی وجہ سے اس کی موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔“

”بہتر ہوگا کہ تم مجھے پوری بات بتاؤ۔“ ولی نے کہا۔ وہ دونوں ایک فرحی بیچ پر بیٹھ گئے۔ مسز اسٹیوڈ نے دونوں ہاتھ اپنے گھٹنوں پر رکھے اور بولی۔ ”میرے والدین کا ستر وے اقدار میں آنے کے فوراً بعد ہی نوٹس کی دہائی کے شروع میں کیوبا سے بھاگ کر یہاں آ گئے تھے اور انہوں نے میاں کی میں رہائش اختیار کر لی۔ انہوں نے مل کر انشورنس کا کام شروع کیا اور اپنے ہم وطنوں کو خدمات فراہم کرنے لگے۔ بہت جلد ان کا روبرو جام گیا۔ جب وہ مضبوطی سے اپنے قدموں پر کھڑے ہو گئے تو ہم دونوں بہنوں کی پیدائش ہوئی۔ سب کچھ بہت ٹھیک چل رہا تھا۔ چند سال قبل وہ رہنما رہے ہیں لیکن ان کے پاس اتنا اثاثہ تھا کہ وہ بقیہ زندگی آرام سے گزار سکیں۔ وہ اپنا زیادہ وقت نواسے نوٹسوں کے ساتھ گزار رہے تھے۔“

”پھر کیا مسئلہ ہے؟“ ولی نے پوچھا۔ ”دو سال قبل میرے والد کو چانک بنی دل کا دورہ پڑا اور وہ انتقال کر گئے۔ میری ماں یہ صدمہ برداشت نہ کر سکی۔ اس نے اس کا گھر اٹھایا۔ وہ تکی باہنک روتی رہی پھر اسے گہری چپ گت مٹی اور اب وہ کافی عرصے سے بالکل خاموش ہے۔ اس کی حالت دیکھ کر ہمیں ڈر لگتا ہے کہ ہمیں وہ کچھ کر نہ بیٹھے۔ اس نے میرے یا میری بہن کے گھر شفٹ ہونے سے بھی انکار کر دیا کیونکہ وہ اس گھر کو چھوڑنا نہیں چاہتی جس سے اس کے شوہر کی یادیں وابستہ ہیں۔ اس لیے ہم زیادہ سے زیادہ وقت اس کے پاس گزارنے کی کوشش

نہیں ہوا تھا۔ گراؤنڈ کے باہر بیٹھے ہوئے والدین تالیاں بجا کر بچوں کا حوصلہ بڑھا رہے تھے اور آپس میں باتیں بھی کر رہے تھے۔ جب کوئی بچہ گیند کو لے کر آگے بڑھتا تو وہ تالیاں بجا کر اس کی حوصلہ افزائی کرتے۔

ولی جانتا تھا کہ فٹ بال کا کھیل امریکا میں کیوں مقبول ہو رہا ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا سات سالہ بچہ اتنا تھک جائے کہ رات کو اسے گہری اور بھرپور نیند آجائے اور آپ بے فکر ہو کر کوئی کتاب پڑھیں یا دانتوں سے شغل فرمائیں تو بچہ کو فٹ بال کھیلنے بھیج دیا کریں۔ ولی نے اپنے بچپن میں بہت زیادہ میں بال کھیلی تھی جس میں زیادہ بھاگ دوڑ نہیں ہوتی اس لیے اسے دیر سے نیند آتی تھی۔

ایک گول پوسٹ کے قریب کھلاڑی جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ سیٹی کی آواز آئی اور ریفری نے پیٹلی اسٹروک کا اشارہ دیا۔ ایک لڑکے نے مقررہ جگہ پر گیند کو ہٹ لگائی جو گول کے بجائے تماشاخیوں میں جا کر گری۔ ایک بار پھر حوصلہ افزائی کے لیے آوازیں بلند ہوئیں اور گول کرنے کی جدوجہد دوبارہ شروع ہوئی۔

”مسز کوسٹا؟“

ولی نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک عورت اس کی طرف چلی آ رہی تھی۔ اس کی عمر تقریباً چالیس سال ہوگی۔ چمکیلے سیاہ بال، پُرکشش چہرہ، اس نے ہلکے سبز رنگ کا بلاؤز، سیاہ چٹلون اور آرام دہ جوتے پہن رکھے تھے۔

”تم اسرسلانے کی ہو؟“

ولی کو دوسرے قبل مسز اسٹیوڈ کی فون کا موصول ہوئی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ شاید اسے ولی کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ ولی نے اس سے مسکے کے بارے میں پوچھا لیکن اس نے اصرار کیا کہ وہ سراغ رساں سے ذاتی طور پر ملاقات کرنا چاہتی ہے۔ شاید وہ ٹیکس فون پر اتنی وضاحت سے اپنا مسئلہ بیان نہ کر پائے۔ اس کا بیٹا دوپہر میں فٹ بال کھیلنے آ رہا تھا اور وہ جلد ولی کے گھر سے زیادہ دور نہیں تھی۔ اس لیے وہ اس عورت سے ملنے پر رضامند ہو گیا۔

”ان میں تمہارا لڑکا کون سا ہے؟“

وہ میدان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ”وہ جس نے نوٹس کی سبز شرٹ پہنی رہی ہے۔“ ولی نے اس چھوٹے سے لڑکے کو غور سے دیکھا۔ وہ بھی اپنی ماں کی طرح پُرکشش تھا۔

”لیکن میں نے اس کی وجہ سے تمہیں فون نہیں کیا۔ اصل میں اپنی ماں کے بارے میں تم سے بات کرنا چاہ

ہوتی چلی گئی۔ وہ میرے باپ کو بہت باور کھاتی تھی اور اب خدا نے اس کی جگہ لینے کے لیے ایک بندہ بھیج دیا تھا۔ وہ اپنا تقریباً سارا وقت ایک ساتھ گزارنے لگے اور اس سے ملنے کے صرف چھ ہفتوں بعد ہی میری ماں نے اعلان کر دیا کہ وہ دونوں اگلے مہینے شادی کر رہے ہیں۔ ہمیں بالکل بھی اندازہ نہیں کہ یہ شخص کون ہے۔ میری ماں کے پاس تھوڑی بہت دولت ہے اور وہ اپنی زندگی کے انتہائی نازک دور سے گزر رہی ہے۔ ہم صرف یہ یقین کرنا چاہتے ہیں کہ کوئی اس کی کمزوری سے فائدہ نہ اٹھائے۔“

”یعنی تم یہ چاہتی ہو کہ میں نارمن کروڑ کا پس منظر معلوم کروں۔“

وہ ہامی سے بولی۔ ”ہمارا خاندانی وکیل یہ کوشش کر چکا ہے لیکن کیوبا کی حکومت نے اس کے بارے میں کوئی معلومات نہیں دیں کہ وہ سیاسی قیدی تھا یا نہیں۔“

ولی کو اس پر کوئی حیرت نہیں ہوئی، عام طور پر کیوبا کی حکومت کسی سیاسی قیدی کی موجودگی کا اعتراف نہیں کرتی اور جیلوں میں بند تمام قیدیوں کو عام مجرم گردانتی ہے۔

”اس وکیل نے مقامی طور پر بھی اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی۔“ ارسلانے کہا۔ ”یہاں ایک سابق سیاسی قیدیوں کی تنظیم ہے لیکن انہوں نے اعتراف کیا کہ ان کے پاس تمام سیاسی قیدیوں کے بارے میں معلومات نہیں ہیں۔ کیوبا میں درجنوں کی تعداد میں ایسے مراکز ہیں جہاں زیر حراست قیدیوں کو رکھا جاتا ہے۔ انہیں پرانے ریکارڈ میں ایک این کروڑ کا نام ملا لیکن اس کے بارے میں مزید تفصیلات نہیں تھیں۔ وہاں موجود شخص کا کہنا ہے کہ اسے جزیرے کے مشرق میں واقع شہر۔۔۔

یہاں کے ایک چھوٹے سے مرکز میں رکھا گیا تھا۔ وکیل نے بتا دیا کہ اس شہر میں ایسا ایک ہی مرکز تھا لیکن وہ کسی ایسے شخص کو تلاش نہ کر سکا جو کروڑ کو جانتا ہو۔“

”کمزور کی فہمی کے بارے میں کیا جانتی ہو؟ یہاں کیوبا سے آئے ہوئے بہت سے لوگوں کے خاندان آباد ہیں۔ ان کے پاس اس کے بارے میں معلومات ہوں گی؟“

ارسلانے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اس کا کہنا ہے کہ وہ اکوٹا ہے۔ وہ بہت چھوٹا تھا جب اس کے والدین انتقال کر گئے اور دوران حراست اس کا دوسرے رشتے داروں سے بھی رابطہ ختم ہو گیا۔ یہاں اس کے خاندان کا کوئی فرد نہیں ہے۔“

کرتے ہیں تاکہ اس کا خیال رکھ سکیں۔“

وہ سانس لینے کے لیے رکی تو ولی نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”میرے باپ کا کئی سال پہلے انتقال ہو گیا تھا اور میری ماں بیوہ ہو گئی۔ میں اس کا دکھ بھگتا ہوں آگے چلو۔“

وہ پارک کے باہر دیکھتے ہوئے بولی۔ ”بالآخر ہم اور اس کی ایک پرانی دوست اسے قائل کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ وہ اپنا دل بھلانے کے لیے گھر سے باہر نکلا کرے۔“

اس نے اپنی اسی دوست کے ساتھ واک اور پیچ پر جانا شروع کر دیا پھر وہ اس کے کہنے پر بوڑھوں کے کیوبی سینٹر میں بھی جانے لگی جہاں بوڑھے افراد کے لیے مل بیٹھنے کے مواقع اور مختلف قسم کی تفریحات مہیا کی جاتی ہیں۔ اس کے وہاں جانے سے ہم دونوں بہنوں کو بہت سکون ملا۔ کیونکہ ہم کئی ماہ سے اس کے لیے پریشان تھے۔ بہر حال وہ واپس زندگی کی طرف لوٹ آئی۔“

”یہ تو بہت اچھا ہوا؟“

”ہاں، واقعی اچھا ہوا۔ ایک دن وہ کیوبی سینٹر میں ڈومینیکیل رہی تھی کہ ایک شخص کھیلنے کی نیت سے اس کی میز پر آکر بیٹھ گیا۔ اس کا نام نارمن کروڑ ہے۔ وہ میری ماں سے دس سال چھوٹا یعنی ساٹھ برس کا ہے اور بالکل میرے باپ کی طرح لمبا، چمکندہ اور مضبوط جسم کا مالک ہے۔ اس نے میری ماں کو بتایا کہ وہ حال ہی میں کیوبا سے آیا ہے۔ جب میری ماں نے پوچھا کہ اس نے وہاں سے آنے میں اتنی دیر کیوں کر دی تو اس نے بتایا کہ وہ دس برس سے سیاسی قیدی کے طور پر جیل میں بند تھا اور اسے حال ہی میں رہائی ملی ہے۔“

اس نے اپنی نظریں ولی پر جمادیں اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ”تم سمجھ سکتے ہو کہ میری ماں پر اس کا کیا اثر ہوا ہوگا۔ وہ کاسٹرو سے نفرت کرتی تھی اور اس کے سامنے وہ شخص بیٹھا ہوا تھا جس نے کاسٹرو کا مخالف ہونے کے پاداش میں اپنی زندگی کے بیس فیصد سال جیل میں گزار دیے۔ لاکھائوں میری ماں کے دل میں اس کی عزت بڑھ گئی۔“

ولی نے تائید میں سر ہلا دیا۔ وہ خود جلا وطنی کی زندگی گزار رہا تھا اور اسے معلوم تھا کہ میامی میں مقیم کیوبا سے آئے ہوئے لوگ سیاسی قیدیوں کا محاذ سے آئے ہوئے ہیروؤں کی طرح استقبال کرتے ہیں۔

ارسلانے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”دیر سے دیر سے میری ماں اس شخص کی محبت میں گرفتار

”گو کیا تمہیں ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے جو اس سے مل کر جان سکے کہ اپنے بارے میں وہ جو کہہ رہا ہے۔ اس میں کتنی صداقت ہے۔“
”میں نہیں جانتی کہ اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے؟“

دلی نے اسے اپنا ایک دن کا معاوضہ بتایا اور کہا کہ اس کام میں اسے کم از کم دو دن لگ سکتے ہیں۔ ارسلانے لمحہ بھر سوچنے کے بعد چپک لکھ کر اس کے حوالے کر دیا۔
”ٹھیک ہے۔ تم ستر کروڑ سے رابطہ کرو اور اسے بتاؤ کہ تمہاری فہمیلی کا ایک نمائندہ اس سے ملنا چاہتا ہے تاکہ شادی سے متعلق تمام امور طے کر لیے جائیں۔ اس سے کہو کہ وہ مجھے فون کرے۔“

وہ اس ملاقات سے فارغ ہونے کے بعد گھر گیا اور دوپہر کے کھانے کے لیے رات کا بچا ہوا چکن اور چاول گرم کرنے لگا۔ کھانے کے بعد اس نے لیپ ٹاپ کھولا اور گوگل پر کیوبا کے قیدیوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے لگا۔ اسے ایک ایسی فہرست مل گئی جس میں ہر صوبے کی جیلوں کی الگ الگ تفصیل درج تھی بلکہ کچھ جیلوں کی تصاویر بھی دی گئی تھیں۔ اس فہرست میں سو کے قریب جیلوں کے نام درج تھے اور ان میں سانچا گوصو کے لیے شہرسان سپاسٹین کا نام بھی شامل تھا۔ یہ ایک ڈبا نما عمارت کی تصویر تھی جس کی تمام کھڑکیوں میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ اس عمارت کے چاروں طرف ایک اونچا دیوار تھی جس کے اوپر خاردار تار لگے ہوئے تھے۔ اس کے چاروں کونوں پر محافظوں کی چوکیاں بنی ہوئی تھیں۔

دلی نے اس کے بعد سیاسی قیدیوں کے نام سے بنی ہوئی سائٹ دیکھیں۔ ان میں سیاسی قیدیوں کی طویل فہرستیں تھیں۔ اس کے باوجود یہ واضح کر دیا گیا تھا کہ یہ مکمل فہرستیں نہیں ہیں۔ مرتب کنندہ کا کہنا تھا کہ ان فہرستوں میں شامل کچھ لوگ سیاسی قیدی تھے لیکن انہیں دوسرے جرائم میں مزا ستانی مٹی یا سرے سے ان کے نام ہی ان فہرستوں میں شامل نہیں کیے گئے۔ اس کے باوجود دلی نے ان فہرستوں کو غور سے دیکھا لیکن ان میں اسے کہیں بھی نارسن کروڈ کا نام نظر نہیں آیا۔

اس کے بعد وہ دوسرے کاموں میں مصروف ہو گیا۔ وہ پرائیویٹ سراغ رساں ہونے کے علاوہ ایک لائٹنگ کلب کیلائٹ کا سیکورٹی چیف بھی تھا۔ یہ اس کے بھائی ٹونی کی

ملکیت تھا اور اس کا شمار شہر کے مقبول ترین کلب میں ہوتا تھا۔ خاص طور پر اختتام ہفتہ وہاں مل دھرنے کو جگہ نہیں ہوتی تھی۔ اس نے اگلا ایک گھنٹا کلب کے مختلف امور نمٹانے میں گزار دیا۔

ابھی وہ اس کام سے فارغ ہوا ہی تھا کہ اس کے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف سے کوئی مرد بول رہا تھا۔

”کیا میں سسر کو ستا سے مخاطب ہوں؟“
”ہاں، میں کو ستا ہی بول رہا ہوں۔“
”میرا نام نارسن کروڈ ہے۔ ارسلان اسٹیوڈیو نے کہا تھا کہ تم سے بات کر لوں۔ میرا خیال ہے کہ تم مجھ سے ملنا چاہ رہے ہو؟“

”ہاں، مجھے امید ہے کہ آج ہماری ملاقات ہو سکتی ہے۔ تمہارے لیے کون سا وقت مناسب رہے گا؟“

اس شخص نے سوچنے میں کئی سیکنڈ لگا دیے پھر وہ بولا۔
”ہاں، ہم آج ڈنر پر مل سکتے ہیں۔ عام طور پر میں ارسلان کی ماں لاڈلیا، کے ساتھ کھانا کھاتا ہوں لیکن آج اسے کسی اور جگہ جانا ہے۔ ہم اس ریسٹوران میں مل سکتے ہیں جو میرے گھر سے نزدیک ہے۔ اس کا نام کیٹے سانچا کو ہے۔“

”مجھے اس کا پتا معلوم ہے۔“
”کیا تم وہاں پانچ بجے آ سکتے ہو؟“ کروڈ نے کہا۔
دلی کا منہ بند نہ گیا۔ ڈنر کے لیے یہ وقت بالکل بھی مناسب نہیں تھا۔ خاص طور پر کیوبا بانی باشندوں کے لیے جو عموماً دیر سے کھانا کھاتے تھے۔

”میں جانتا ہوں کہ یہ بہت جلدی ہے۔ لیکن ہمیں جیل میں اسی وقت کھانا ملتا تھا اور مجھے اس کی عادت پڑ گئی ہے۔“

دلی نے اس سے بحث نہیں کی بلکہ اسے بتایا کہ وہ سیاہ شرٹ اور کریم ٹکڑی پتلون پہن کر آئے گا تاکہ وہ اسے پہچان سکے۔

وہ مقررہ وقت سے پانچ منٹ پہلے ریسٹوران پہنچ گیا۔ وہ ایک چھوٹا سا عام ریسٹوران تھا جس میں صرف بارہ میز بنی گئی ہوئی تھیں۔ دیواروں پر کیوبا کے شہر سانچا کو اور اس کے ساحل کی بلیک اینڈ وائٹ تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ نارسن کروڈ ٹھیک پانچ بجے وہاں پہنچا۔ ارسلان پہلے ہی اس کا حلیہ پتا چکی تھی۔ اس لیے دلی کو اسے پہچاننے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ اس کی عمر ساٹھ کے لگ بھگ ہوئی۔ قد چھ فٹ، چوڑے شانے، زرد چہرہ، جھپکے ہوئے گال اور چھوٹی آنکھیں۔ اس نے سیاہ دھاریوں والی سفید قمیض اور

مرتب کی گئی تھی۔

کر روز نے روٹی کا ٹوالہ منہ میں رکھا اور بیڑ کا گھونٹ لیتے ہوئے بولا۔ ”ہاں، ہم سب اسے جانتے ہیں۔ اس کی وجہ شہرت یہ تھی کہ اس نے ایک دفعہ جیل سے بھاگنے کی کوشش کی اور وقتی طور پر کامیاب رہا۔ اس نے کسی طرح ٹمک کا انتظام کر کے اچھی طرح اپنے پورے بدن پر لگا لیا جس کے نتیجے میں اسے خارش ہوئی اور جگہ جگہ سے خون رستے لگا چنانچہ اسے فوری علاج کے لیے ڈسپنری میں داخل کر دیا گیا۔ رات گئے اس نے جیل کا ڈاکٹر بن کر مقامی سول اسپتال کو نوں کیا کہ مریض کی حالت بہت خراب ہے۔ اس لیے اسے اسپتال لے جانے کے لیے ایسویٹس بھیجی جائے کیونکہ اس وقت ڈسپنری میں کوئی ڈاکٹر ڈیوٹی پر نہیں تھا۔ اس لیے دوسرے قیدیوں نے اسے ایسویٹس میں سوار کروایا اور اسپتال پہنچے ہی وہ فرا ہو گیا۔“

کر روز نے لمحہ بھر توقف کرنے کے بعد کہا۔ ”گوکہ اس کی اسکیم بہت شاندار تھی لیکن وہ پکڑا گیا۔ کیوں ایک جزیرہ ہے اور اسے وہاں سے نکلنے کے لیے کوئی کئی دنوں کی جیل سے بھاگے ہوئے قیدیوں کی ایک نشانی یہ ہے کہ ان کے چہرے غیر معمولی طور پر زرد ہوتے ہیں اس لیے وہ آسانی سے پکڑے جاتے ہیں۔ وہ اس لحاظ سے خوش قسمت تھا کہ اسے کم از کم دو راتیں اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ گزارنے کا موقع مل گیا۔ بہر حال دوبارہ پکڑے جانے کے بعد اسے طویل عرصے کے لیے قید تنہائی میں ڈال دیا گیا۔“

یہ کہہ کر کر روز نے بیڑ کا ایک گھونٹ لیا۔ ولی نے بھی اس کی تقلید کی۔ کر روز نے جو کچھ البرٹو کے بارے میں بتایا۔ اس میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ولی یہ سب کچھ پہلے ہی کمپیوٹر پر پڑھ چکا تھا۔

”مجھے بتایا گیا کہ تم نے جیل میں اپنی زندگی کے بیس سال گزار دیے۔“ ولی نے کہا۔

کر روز کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ”ہاں تقریباً، ہمارے پاس کیلنڈر نہیں تھا اور ہم کئی بھول جاتے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ عرصہ بیس سال سے زیادہ ہی رہا ہوگا۔“ ”اچھا جگ آزاد لیٹے پر ہمیں حیرت تو ہوئی ہوگی؟“ ”تمہیں اندازہ نہیں کہ جیل میں قیدیوں پر کیا کڑورتی ہے کیونکہ تم وہاں بھی نہیں رہے۔ میں کئی سالوں تک دوسرے قیدیوں کے ساتھ ایک کوشری میں سوتا رہا جہاں مجھے رات بھر ان کے خراپے، غراہٹ اور لڑنے جھگڑنے کی

سرئی رنگ کی چٹون پہن رکھی تھی۔

کر روز نے ولی کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مسٹر کوستا؟“

ولی نے کھڑے ہو کر اس سے ہاتھ ملا یا اور کر روز اس کے سامنے بیٹھنے کے بجائے بائیں جانب والی کرسی پر بیٹھ گیا پھر اس نے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں بھی دروازے کی طرف بیٹھ کر کے نہیں بیٹھتا۔“

”کیا اس کا تعلق طویل عرصے تک جیل میں رہنے سے ہے؟“

کر روز نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”نہیں، یہ عادت مجھے اس وقت پڑی جب میں کاسٹرو کا مخالف ہونے کی وجہ سے زیر زمین چلا گیا۔ اس کے بعد جیل میں بھی یہ عادت برقرار رہی۔ وہاں بھی کئی لوگ خطرناک ہو سکتے تھے۔ خاص طور پر محافظ۔“

ایک ویٹس منیو لے کر آئی اور کر روز اسے دیکھنے لگا۔ ”تمہارا جودل چاہے مگکوالو۔“ ولی نے کہا۔ ”آج کا کھانا میری طرف سے ہے۔“

کر روز کی آنکھیں جھپکے لگیں۔ اس نے منیو بند کیا اور جب ویٹس آئی تو اس نے جوس، سوپ، گوشت کے پارچے، چاول، پھلیاں اور بننے ہوئے گوشت کے علاوہ بیڑ بھی مگکوالو۔ ولی دیر سے کھانا کھاتا تھا۔ اس لیے اس نے اپنے لیے صرف بیڑ کا آرڈر دیا۔

ویٹس کے جانے کے بعد کر روز نے شراباٹے ہوئے کہا۔ ”میں بہت زیادہ گوشت کھاتا ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ صحت کے لیے ٹھیک نہیں ہے لیکن جیل میں مجھے کئی سال تک گوشت نہیں ملا۔ اس لیے اب میں اپنے آپ کو نہیں روک سکتا۔“

اس نے میز پر رکھی ہوئی باسکٹ میں ہاتھ ڈال کر ڈبل روٹی کا ایک ٹکڑا نکال لیا۔

”یہ بھی ہمیں بہت کم ملتی تھی۔“

”تم سان سیباستیان کی جیل میں تھے؟“

کر روز نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں، یہ درست ہے۔“

”کیا تم البرٹو راموس نام کے کسی سیاہی قیدی کو جانتے ہو؟“

یہ نام ولی نے اس فہرست سے تلاش کیا تھا جو کیوبا کی جیلوں میں انسانی حقوق کی خلاف ورزی کے حوالے سے

آوازیں سننا پڑیں۔ انہیں سوتے میں ڈراؤنے خواب آتے اور وہ چیختے نکلے۔ یہ تماشا ہر رات ہوتا تھا لیکن میں اس کا عادی ہو گیا تھا۔ اب میں آزاد ہوں اور تم جانتے ہو کہ میری آنکھ کیوں کھل جاتی ہے۔“

”وہ کیوں؟“

”خاموشی، اس کی وجہ سے میری آنکھ کھل جاتی ہے اور مجھے وہ آوازیں یاد آنے لگتی ہیں جن کا میں عادی ہو چکا ہوں۔ میں گھنٹوں بستر پر لیٹا کچھ سننے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔ یہ خاموشی مجھے پریشان اور خوف زدہ کر رہی ہے۔“

اس نے بیڑ کا ایک اور گھونٹ لیا پھر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا کہ میں دروازے کی طرف پیچ کر کے نہیں بیٹھ سکتا۔ اس کے علاوہ میں ہمیشہ اپنے موزے میں ایک چاقو رکھتا تھا جو میں نے خود ہی بنایا تھا۔ میں جزیہ چھوڑتے وقت اسے اپنے ساتھ ہی لے آیا تھا اور وہ اب بھی میرے پاس ہے۔ میں اسے اپنے آپ سے جدا نہیں کر سکتا۔“

وہ سانس لینے کے لیے رُکا پھر اس نے سڑک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ایک اور معاملہ سڑک پر چلنے کا ہے۔ جب میں یہاں آیا تو ایک یا دو بلاک چل کر واپس ہو جاتا تھا۔ مجھے لمبا فاصلہ طے کرنے میں کافی وقت لگا۔ اب میں دور تک جاتا ہوں لیکن اس کے باوجود یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ جیسے میں جیل سے بھاگ کر آیا ہوں اور کوئی میرا پیچھا کر رہا ہے یا مجھے کوئی گولی مار دے گا۔ لائیڈا کے ساتھ چلتے ہوئے یہ ڈرا ہستہ اور ہور ہوا ہے۔“

ولی نے مزید دو بوتلیں بیڑ کی منگوائیں اور بولا۔ ”کیا میامی میں تمہارا کسی ایسے شخص سے رابطہ ہے جو جیل میں تمہارے ساتھ تھا؟“

”کروڑ نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”جن لوگوں کے ساتھ میں جیل میں تھا، وہ مر چکے ہیں یا ابھی تک قید کاٹ رہے ہیں۔“

”انہوں نے تمہیں کیسے چھوڑ دیا؟“

”کروڑ نے بے حسی سے پہلو بدلا جیسے ولی نے کوئی انہونی بات کہہ دی ہو۔ ولی بھی لمحہ بھر کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔ کہیں کروڑ خبر تو نہیں بن گیا تھا اور دوسرے قیدیوں کے بارے میں جیل انتظامیہ کو اطلاعات پہنچانے لگا تھا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اکثر جیلوں میں ایسا ہوتا ہے لیکن کروڑ کی بے چینی کی یہ وجہ نہیں تھی اور اس کی وضاحت اس نے چند لمحوں بعد کر دی۔

”وہ قیدیوں کی تعداد میں کمی کر کے بچت کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ایسے قیدیوں کا انتخاب کیا جن کا ریکارڈ بے داغ تھا۔ میں نے دوران قید کسی احتجاج یا بھوک ہڑتال میں حصہ نہیں لیا۔ میرے کچھ ساتھی سیاسی قیدی اسے پسند نہیں کرتے تھے لیکن میں جلد از جلد جیل سے باہر آنا چاہ رہا تھا۔ اس کے باوجود اتنا عرصہ لگ گیا۔“ وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔

ولی سوچ رہا تھا کہ کیا کروڑ میامی یا کسی اور شہر میں مقیم اپنے جیل کے ساتھیوں کے بارے میں جانتا ہے لیکن وہ یہ نہیں چاہتا کہ ولی ان سے بات کرے کیونکہ وہ بھی اس کی تعریف نہیں کریں گے۔

”کروڑ کھانا ختم کر چکا تھا۔ ولی نے ویٹرس کو بلا کر ریل ادا کیا اور وہ دونوں دروازے کی طرف جانے لگے۔ ”کیا تم سمجھتے ہو مسٹر کروڑ کہ ہم دوبارہ ملاقات کر سکیں؟“ ولی نے کہا۔ ”میں تم سے شادی کے بارے میں کچھ معاملات پر گفتگو کرنا چاہ رہا تھا لیکن فی الوقت مجھے کسی اور جگہ جانا ہے۔“

گوکہ ابھی تک ولی نے شادی کی کوئی بات نہیں کی تھی لیکن اس پر کروڑ کو کوئی حیرانی نہیں ہوئی۔ وہ دونوں جانتے تھے کہ معاملات کسی رخ پر جارہے ہیں۔ ہونے والے دو لہا کی جانچ ہو رہی تھی۔ کروڑ نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔

”یہ میرے حق میں بہتر رہے گا۔“ کروڑ نے کہا۔ ”کیوں نا ہم کل دوپہر اس جگہ میں جہاں لوگ ڈوبیٹو کھیلنے آتے ہیں۔“

ولی یہ سمجھ گیا کہ وہ کس جگہ کی جانب اشارہ کر رہا ہے۔ وہ آٹھویں اسٹریٹ پر واقع ایک سایہ دار دالان تھا جہاں کیوبا کے عمر رسیدہ باشندے اپنا قومی کھیل کھیلنے آتے تھے۔

انہوں نے رخصت ہوتے وقت مصافحہ کیا۔ کروڑ نے اس کا ہاتھ پکڑے رکھا اور بولا۔ ”اطمینان کر لینا کہ کوئی تمہارا تعاقب تو نہیں کر رہا۔“

کیا یہ شخص اسے دوستانہ شور دے رہا تھا یا اس میں کوئی دھمکی چھپی ہوئی تھی۔ ولی کو فوراً اس کے چاقو کا خیال آیا جو وہ اپنے ساتھ جیل سے لے کر آیا تھا۔ وہ اس کے الفاظ پر غور کر رہا تھا کہ کروڑ نے اس کا ہاتھ چھوڑا اور وہاں سے چلا گیا۔

گھر آنے کے بعد ولی سستانے کی غرض سے عقبی پورچ میں بیٹھ گیا اور نارمن کروڑ نے اسے جو باتیں بتائی تھیں، ان کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس کے بعد ہی وہ

نقلی بیدو

سلویا نے اسے سائیکوس الونیو سے متصل ایک بڑی گلابی رنگ کی اپارٹمنٹ بلڈنگ کے بارے میں بتایا۔ ولی اس جگہ سے واقف تھا۔ ”تم وہاں جا کر ہلڈا کے بارے میں پوچھو۔ ہر کوئی اسے جانتا ہے۔ میں اسے فون کر کے بتا دوں گی کہ تم اس سے ملنے آ رہے ہو۔“

ولی نے ماں کا شکریہ ادا کر کے فون بند کر دیا پھر اس نے ان معلومات کا ایک پرنٹ آؤٹ نکالا جو اس نے سپاہستان کے بارے میں جمع کی تھیں اور ہلڈا سے ملنے روانہ ہو گیا۔

وہ سیزھیوں پر ہی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کی عمر ستر سال، چھوٹا قد اور بال سفید ہو چکے تھے۔ وہ اسے دوسری منزل پر واقع اپنے اپارٹمنٹ میں لے گئی۔ ولی جانتا تھا کہ کیو با سے جلاوطن ہو کر آنے والے ہمیشہ اپنے شہروں سے جڑے رہتے ہیں اور وہاں کی یادیں تازہ کرتے رہتے ہیں۔ اگلے ایک گھنٹے تک وہ ہلڈا سے وہاں کے لوگوں، مقامات اور واقعات کے بارے میں مختلف سوال کرتا رہا اور وہ اسے جواب دیتی رہی۔ اس نے ولی کو ایک ایلم میں دکھائی جس میں اس کی کئی بلیک اینڈ وائٹ تصویریں تھیں پھر اس نے ولی کے ایک سوال پر اپنا سلی فون اٹھایا اور سپاہستان میں مقیم اپنی ایک دوست اسیلیا مارینز سے اس کی بات کروائی۔

ولی اس سے پندرہ منٹ تک بات کرتا رہا اور اس دوران اس نے وہ سب کچھ معلوم کر لیا جو وہ چاہتا تھا پھر اس نے مسز سانچی کا شکریہ ادا کیا اور گھر کے لیے روانہ ہو گیا۔ گھر پہنچتے ہی اس نے اپنے ایک پرانے دوست فرنیسکو لاگوں کو فون کیا جو میا می پولیس میں سراغ رساں تھا۔ ولی بھی پرائیویٹ سراغ رساں بننے سے پہلے اس کے ساتھ کام کر چکا تھا۔ وہ دوسرے دن ملاقات پر متعلق ہو گئے۔

ولی نے اپنے لیے ایک اور میٹر کا گلاس بنایا اور عقبن پورج میں بیٹھ کر ہلڈا اور اس کی دوست نے جو کچھ بتایا تھا۔ اس پر غور کرنے لگا۔ اس دوران وہ اس شخص کے بارے میں بھی سوچتا رہا جو اپنے آپ کو نارمن کروڈ کہہ رہا تھا۔ جب وہ اپنے بستر پر سونے کے لیے لیٹا تب بھی وہ اسی بارے میں سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

کروڈ سے ملاقات کرنے کے لیے ولی مقررہ وقت سے چند منٹ پہلے ہی پہنچ گیا۔ وہ جگہ ڈیمینو پارک کے نام سے مشہور تھی۔ دراصل وہ تیس مربع فٹ کا مچن تھا جس کے

کوئی اگلا قدم اٹھا سکتا تھا۔ پھر اسے کچھ خیال آیا اور وہ اپنی ماں کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

اس کی بیوہ ماں سلویا اپنے ذاتی ہریل اسٹور کی مالک تھی جو آٹھویں اسٹریٹ پر اس کے گھر سے کئی بلاک کے فاصلے پر تھا۔ وہاں کئی لوگ اپنے پیچیدہ امراض کے علاج کے لیے آتے تھے جن میں زیادہ تر کیوبا کے باشندے تھے۔ یہ شکایات جسمانی، جذباتی، روحانی اور معاشی ہوتی تھیں۔ سلویا کے پاس ہر بیماری کا علاج تھا۔ وہ پوری توجہ سے مریض کا مسئلہ سنتی اور پھر اس کے علاج کے لیے جڑی بوٹیوں سے بنی دوا جو بن کر دیا پھر روحانی علاج کے لیے کسی سینٹ کا مجسمہ دیتی جو اس مرض کے لیے ماہر سمجھا جاتا تھا۔

اس کے مریض ڈاکٹر سے علاج کروانے کے باوجود اپنے روزمرہ مسائل کے حل کے لیے اسی کے پاس آتے تھے۔ وہ ان سے معمولی فیس لیتی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے پاس مریضوں کا جگمگا لگا رہتا تھا۔ ولی کا خیال تھا کہ ان برسوں کے دوران اس علاقے میں رہنے والی ہریلی اس کی ماں کے پاس علاج کے لیے آچکی تھی اور اسی لیے وہ وہاں رہنے والے ہر فرد کو جانتی تھی۔

سلویا نے فون اٹھایا اور ولی کا نمبر دیکھ کر بولی۔ ”بالآخر تمہیں ماں کو فون کرنے کا خیال آ ہی گیا۔“ اس نے ہسپانوی زبان میں کہا۔ ”کیونکہ تم میرے بجائے مجرموں اور دیگر اجنبیوں سے بات کرنے کو ترجیح دیتے ہو۔“

یہ اس کا شکایت کرنے کا مخصوص انداز تھا۔ چاہے وہ اسے کتنی ہی بار فون کیوں نہ کرے۔ ماں کی تسلی نہیں ہوتی تھی۔ ولی نے ہمیشہ کی طرح ماں سے معذرت کی اور اسے یقین دلایا کہ وہ دنیا میں سب سے زیادہ اسے چاہتا ہے پھر مطلب کی بات پراگمیا۔

”مما! تم کسی ایسے شخص کو جانتی ہو جو کیوبا کے شہر سپاہستان (Sebastian) سے آیا ہو۔ میں ایسے شخص سے ملنا چاہتا ہوں جو اس شہر سے اچھی طرح واقف ہو۔“ اس کی ماں کچھ دیر سوچتی رہی۔ اس کی یادداشت کے خانے میں کئی لوگوں کے نام اور ذاتی کہانیاں محفوظ تھیں۔ ایک منٹ بعد ہی اس کے ذہن میں ایک مناسب نام آ گیا۔

”تمہیں ہلڈا سانچی سے بات کرنی چاہیے۔ وہ کئی برس پہلے اسی شہر سے آئی تھی اور وہاں سے آنے والے ہر فرد کو جانتی ہے۔“

”میں اسے کہاں تلاش کروں؟“

پوتائی دیوتاؤں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں اور شہر کے سب لوگ وہاں ہسپانوی اور امریکی فلمیں دیکھنے آتے تھے۔
 کروڑوں نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ہم دیہاتی لوگ ہیں۔ فلمیں نہیں دیکھتے۔“

ولی نے سٹریٹر جا کر تے ہوئے کہا۔ ”حکومت نے تھیز کو اپنی تحویل میں لے لیا اور اس کی ماں سرکاری اسپتال میں نرس کے طور پر کام کرنے لگی۔ وہ اسپتال پرانے کیسٹوٹک چرچ کے بالکل برابر میں تھا۔“

کروڑ نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ وہاں ایک چرچ تھا اور بس۔“

ولی مسکراتے ہوئے بولا۔ ”ظاہر ہے، اس زمانے میں کیو باکے ہر شہر میں کم از کم ایک کیسٹوٹک چرچ ہوا کرتا تھا۔“

کروڑ نے ایک بار پھر کندھے اچکا دیے۔ ولی نے اس کے چہرے پر نظر نہیں جماتے ہوئے کہا۔ ”اب جو بات میں تم سے پوچھنے والا ہوں، وہ یقیناً تمہیں یاد ہوگی۔ اس عورت نے مجھے بتایا ہے کہ وہ جیل ایک پہاڑی پر ہے جو ساحل سے زیادہ دور نہیں۔“

کروڑ نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں، یہ وہیں ہے۔“

”اس عورت نے یہ بھی بتایا کہ کبھی میں ملیوں لڑکیاں ساحل پر آتی تھیں اور ان قیدیوں کو دیکھ کر ہاتھ ہلاتیں جو انہیں جیل کی کھڑکیوں سے دیکھ رہے ہوتے۔ جواب میں وہ بھی ان لڑکیوں کو اشارے کرتے اور ہنسیاں بجاتے۔“

کروڑ نے تائید کرتے ہوئے قہقہہ لگایا۔ ”ہاں، وہ اس کے عادی ہو گئے تھے۔“

”اس طرح تو تم لوگ ان کے دیوانے ہو گئے ہو گے اور تمہاری عقل بھی بڑھ رہی ہوگی۔“

کروڑ اپنی آنکھیں مٹھاتے ہوئے بولا۔ ”بالکل، خوب صورت لڑکیوں کو دیکھ کر ہر آدمی پاگل ہو جاتا ہے۔ وہ ہمیں دیکھ کر اشارے کرتیں اور طرح طرح کے پوز بتاتی تھیں۔ ان کا مقصد ہمیں پاگل بنانا تھا اور ہم بھی اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ پاتے تھے۔“

”میں اندازہ کر سکتا ہوں۔“ ولی نے آگے کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ ”لیج بٹ یہ کہ تم جو کچھ بتا رہے ہو، اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ اس عورت نے بتایا ہے کہ وہ لڑکیاں قیدیوں کو نہیں بلکہ واضح طور میں بیٹھے ہوئے محافظوں کو اشارے کرتی تھیں۔ قیدی تو جیل کی دیواروں

چاروں طرف لوہے کے تاروں کی باڑ اور اوپر سرخ ٹانگوں کی صحت تھی۔ اس چھت کے نیچے مونسے پلاسٹک کی میز بس رکھی ہوئی تھیں جو خاص طور پر ڈیمینو کھیلنے کے لیے بنائی گئی تھیں۔

دو پہر تک وہ تمام میزیں بھر جاتی تھیں اور کھیل میں حصہ لینے والے عام طور پر عمر رسیدہ مرد ہوتے تھے۔ بقیہ لوگ اپنی باری کا انتظار کرتے اور اس دوران کھیل پر تبصرہ بھی کرتے رہتے۔ صحن کے بالکل عقب میں دو میزیں ایسی تھیں جن کی اوپری سطح پر شلرچ بنی ہوئی تھی۔ یہ میزیں ان لوگوں کے لیے تھیں جو شلرچ کے کھیل میں دلچسپی رکھتے تھے۔ ان میں سے ایک میز خالی تھی۔ ولی اسی پر جا کر بیٹھ گیا۔

چتر منٹ بعد تار من کروڑ بھی آگیا اور دروازے کے سامنے منہ کر کے ولی کی میز پر بیٹھ گیا۔ اس نے وہی گزشتہ روز والا لباس پہن رکھا تھا۔ اس نے صحن کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”میں نے جیل میں یہ کھیل بہت کھیلا ہے۔ ہمارے پاس کرنے کے لیے اور کچھ نہیں تھا۔ اس لیے یہی کھیلتے رہتے تھے اور مجھے اس میں اچھی خاصی مہارت ہو گئی۔“

ولی نے چاروں طرف دیکھا اور پھر کروڑ پر نظر نہیں جما دیں۔ ”یہ مجھے ابھی معلوم ہوا ہے کہ تمہارے شہر میں میری ماں کا بھی کوئی واقف ہے۔“

ظاہر کروڑ نے کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی لیکن وہ تھوڑا محتاط ہو گیا۔ اس میز پر رکھے ہوئے کاغذوں پر نظر ڈالی اور ولی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”شاید میں اسے نہیں جانتا کیونکہ میری پرورش ایک چھوٹے سے قصبے میں ہوئی جو سپا ہیٹان سے بہت دور تھا۔ بچپن میں مجھے شہر آنے کا موقع نہیں ملا اور جب بڑے ہونے کے بعد آیا تو میرا سارا وقت جیل میں گزر گیا۔“

ولی نے اس پر نظر نہیں جماتے ہوئے کہا۔ ”اس نے مجھے بتایا ہے کہ وہ مٹی والی کے برابر والے اسکول میں پڑھتی تھی۔ اس کی عمارت پر سبز رنگ ہوا تھا اور اس کے سامنے سڑک پر ان ہیروؤں کے سفید مجسمے نصب تھے جنہوں نے اسپین کے خلاف آزادی کی جنگ میں حصہ لیا۔“

کروڑ نے کندھے اچکا تے ہوئے کہا۔ ”مجھے بالکل یاد نہیں۔“

”ان کی فٹبلی کاسیٹول اسکوائر میں سووی تھیز تھا جس کا نام اس نے سمجھنا بتایا۔ اس کی اندرونی دیواروں پر

گوئی مارنے کی ضرورت نہیں۔ صرف یہ آواز بلند اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ یہ شخص کیوبا کے قید خانے میں محافظ تھا۔ یہاں جو لوگ موجود ہیں، ان میں سے کچھ یا ان کے دوست رشتے دار ان جیلوں میں رہ چکے ہوں یا ان کے عزیز واقارب دوران قید مر گئے ہوں۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر میں نے بتا دیا تو ان کا کیا رد عمل ہوگا؟ کیا وہ تمہیں زندہ چھوڑ دیں گے؟“

اس شخص نے جال میں پھنسے ہوئے جانور کی طرح چاروں طرف دیکھا۔ وہ بیٹے میں نہار ہاتھ اور ڈر کے بارے اس پر کچھ غاری تھی۔ اس نے اپنی جگہ سے کوئی حرکت نہیں کی۔ ولی نے فریخی لاگوس کو اشارہ کیا جو ایک دوسرے آفسر کے ساتھ گیٹ پر کھڑا انتظار کر رہا تھا۔ وہ دونوں تیزی سے آئے اور اسے جھوٹی شناخت سے امریکا میں داخل ہونے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ دھوکا دہی کے الزامات اس کے علاوہ تھے۔ اب جیل کا سابق محافظ خود قیدی بن گیا تھا۔ اس نے آخری بار کھا جانے والی نظروں سے ولی کو دیکھا جس نے اس کا بتایا کھیل بگاڑ دیا تھا اور پولیس والوں کے ہمراہ وہاں سے چلا گیا۔

ارسلہ اور اس کے گھر والوں نے اس معاملے میں کافی حسدات دکھائی کہ وہ ولی نے ایک دن میں ہی اس جیل سازی کو بے نقاب کر دیا تھا لیکن انہوں نے اسے پورے ہتھے کا محاذ نہ دیا۔

چند دنوں بعد فریخی لاگوس نے ولی کو فون کر کے بتایا کہ اس جیل کے ایک سابق قیدی کے ذریعے مجرم کی شناخت ہو گئی ہے۔ اس کا اصل نام گارشیا ہے اور وہ درحقیقت سیاستدان کی جیل میں محافظ تھا۔ اس کے جرائم کی فہرست بہت طویل ہے اور حکام اس پر انسانی حقوق کی خلاف ورزی کا الزام عائد کرنے پر بھی غور کر رہے ہیں۔“

چند ہفتوں بعد ایک پارک میں ولی کی ارسلہ سے ملاقات ہوئی۔ اس نے پوچھا۔ ”تمہاری ماں کیسی ہے؟“
”بالکل شیک، وہ کسی دکھ کے بغیر اس رومانس کو بھلا چکی ہے اور تمہاری شکر گزار ہے کہ تم نے اسے ڈوبنے سے بچالیا۔“

ولی سوچنے لگا کہ آخر بڑی بی کو اس عمر میں عشق کے سستہ میں غوطہ لگانے کی ضرورت کیوں پیش آئی تھی جبکہ وہ وطنی جوانی میں بھی یہ تہمت نہیں کر پایا تھا۔

کے پیچھے بند تھے اور وہاں سے انہیں ساحل نظر نہیں آتا تھا اور نہ ہی لڑکیاں انہیں دیکھ سکتی تھیں۔ صرف وایج ٹاور میں بیٹھے ہوئے محافظوں کو ہی ساحل نظر آتا تھا۔ وہ لڑکیاں ان محافظوں سے نفرت کرتی تھیں کیونکہ ان کا کوئی نہ کوئی رشتے دار یا دوست جیل میں بند تھا۔ وہ انہیں لعنت دکھاتیں اور انہیں مختلف القاب سے نوازتیں۔“

کروز پتھر کے مانند بے تاب بیٹھا رہا۔ ولی نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ”نارمن کروڑ کا نام سیاسی قیدیوں کی فہرست میں ہے جو کئی سال تک اس جیل میں رہے۔ گزشتہ روز میری اس شہر میں رہنے والی ایک خاتون سز مارنے سے بات ہوئی جس کا بڑا بھائی اس جیل میں تھا۔ اب اس کا انتقال ہو چکا ہے۔ اس کے بھائی نے بتایا تھا کہ اس جیل میں نارمن کروڑ نامی ایک قیدی تھا جسے کئی برس پہلے مار دیا گیا۔ اس نے جیل سے فرار ہونے کی کوشش کی تھی لیکن پکڑا گیا اور محافظوں نے اس پر اتنا تشدد کیا کہ وہ جان کی بازی ہار گیا۔ اس کی کوئی بیٹی نہیں تھی۔ وہ اپنے والدین کی اگلی اولاد تھا جو پہلے ہی فوت ہو چکے تھے۔ اسے لاڈلوں کی طرح دفن کر دیا گیا۔ اسے یاد رکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ کچھ عرصے بعد بس اسے بھول گئے۔“

کروز کے ہونٹ سختی سے بچھ گئے۔ تاہم اس کی آنکھوں میں سوچ کی لہریں ابھر رہی تھیں پھر بھی وہ خاموش رہا۔ ولی نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”تم جیل کی زندگی کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہو کیونکہ تم سیاسی قیدی نہیں بلکہ جیل میں محافظ تھے۔ اس لیے تمہیں بہرہ ور نہیں بلکہ دل نہا جائے گا۔ ممکن ہے کہ تم بھی ان محافظوں میں شامل رہے ہو جنہوں نے بے پناہ تشدد کر کے نارمن کروڑ کو موت کے کھٹ اتار دیا تھا۔ تم جب یہاں آئے تو اس کی شناخت اختیار کر لی اور وہیں گئے۔ مجرم نے لائسنس اسٹیبز کے دل میں جگہ بنائی تاکہ شادی کر کے اس کی دولت پر ہاتھ صاف کر سکو۔ تم ایک دھوکے باز، مجرم اور شاید قاتل بھی ہو۔“

کروز نے اپنے دونوں ہاتھ میز پر رکھے اور کھڑا ہونے لگا۔

”کوئی حرکت نہ کرنا۔“ ولی نے حکم دیا اور اپنی جیل میں بندھا ہوا پتول نکالنے لگا۔

”تم مجھے گولی نہیں مار سکتے۔“ کروز نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

ولی نے چاروں طرف دیکھا اور کہنے لگا۔ ”مجھے



طہار حجابیڈیل

بیالیسویں قسط

انگلے

نیکی کر دریا میں ڈال... بات محاورے کی حد تک ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن خود غرضی اور سفاکی کے اس دور میں نیکی کرنے والے کو ہی کمر میں پتھر باندھ کر دریا میں ڈال دیا جاتا ہے۔ انسان بے لوث ہو اور سینے میں درد مند دل رکھتا ہو تو اس کے لیے قدم قدم پر بولناک آسیب منہ پھارے انتظار کر رہے ہوتے ہیں۔ سستیوں کے سرخیل اور جاگیر داری کے بے رحم سرغنہ لہو کے پیاسے ہو جاتے ہیں... اپنوں کی نگاہوں سے نفرت کے انگارے برسنے لگتے ہیں... امتحان در امتحان کے ایسے کڑے مراحل پیش آتے ہیں کہ عزم کمزور ہو تو مقابلہ کرنے والا خود ہی اندر سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتا چلا جاتا ہے لیکن حوصلہ جوان ہو تو پھر ہر سازش کی کوکھ سے دلیری اور دیانت کی نئی کہانی ابھرتی ہے۔ وطن کی منی سے پیار کرنے والے ایک بے خوف نوجوان کی داستان جسے ہر طرف سے وحشت و بربریت کے خون آشام سایوں نے گھیر لیا تھا مشرودہ ان پیاسی دلدلوں میں رکے بغیر دوڑتا ہی چلا گیا... افرورسوخ نوردرنگی کی رنجیریں بھی اس کے بڑھتے ہوئے قدم نہیں روک سکیں۔ وقت کی میزبان کو اس کے خونخوار حریفوں نے اپنے قدموں میں جھکا لیا تھا مگر وہ بارمان کر پسیا ہوئے وانور میں سے نہیں تھا...

میں ڈنمارک سے پاکستان کسی کی تلاش میں آتا تھا کہ یہ تلاش شروع ہونے سے پہلے ہی ایک ایسا واقعہ ہو گیا جس نے میری زندگی کو تباہ بالا کر دیا۔ میں نے سہراہ ایک لڑکی کو نکاح کر لیا تھا۔ مقامی پولیس نے مددگار کے بجائے مجرم ٹھہرایا اور میں نے جبر و نا انصافی کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جس نے مجھے جیل و داراب اور لالہ نظام جیسے خطرناک لوگوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ لوگ ایک قبضہ گروپ کے سرخیل تھے جو ان کے لیے جیل و داراب اور لالہ نظام جیسے خطرناک لوگوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ لوگ ایک قبضہ میرے سچا حریف تھے مگر زبردستی ان کی آباؤی زمین بھیجی جانے کو کشش کی جا رہی تھی۔ سچا کا چنا پڑا یہ اس جبر و برداشت نہ کر سکا اور گھیل داراب کے دست راست انسپٹر قیصر چودھری کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ اس جرات کی سزا اسے ملی کہ ان کی حویلی کو اس کی ماں اور بہن کا قہر سمیت جلا کر رکھ دیا گیا اور وہ خود دہشت گرد قرار پا کر جیل بھیج دیا گیا۔ انسپٹر قیصر اور لالہ نظام جیسے سفاک لوگ میرے تعاقب میں تھے، وہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ میں MMA کا پوری تیجی تھ، وطنی یورپ کے کئی بڑے بڑے کنگسٹر میرے ہاتھوں ذلت اٹھا چکے تھے۔ میں اپنی پچھلی زندگی سے بھاگ آیا تھا کہ میں وطن پہنچے ہی یہ زندگی پھر مجھے آواز دینے لگی۔ میں یہاں سے بیڑا ہار کے واپس ڈنمارک جا رہا تھا کہ ایک انہونی ہوئی۔ وہ جاوید کی حسن رکھنے والی لڑکی تھی مجھے نظر آئی جس کی تلاش میں۔ میں یہاں پہنچا تھا۔ اس کا نام تاجور تھا اور وہ اپنے گاؤں چاند کرمی میں نہایت پریشان کن حالات کا شکار تھی۔ میں اس کے گاؤں جا پہنچا اور ایک ٹریکٹر ڈرائیور کی حیثیت سے اس کے والد کے پاس ملازم ہو گیا۔ اتنی بلور مددگار میرے ساتھ تھا۔ تاجور کا فضا رفتہ مگھتر اسحاق اپنے ہنواؤں زمیندار عالمگیر اور میر ولایت کے ساتھ مل کر تاجور اور اس کے والد دونوں کے گرد گھیرا نگ کر رہا تھا۔ مقامی کھیر کے امام مولوی فدا کی موت میں بھی اسی زمین دار کا ہاتھ تھا۔ مولوی مکی کی بیٹی زینب ایک عجیب بیماری کا شکار تھی۔ وہ زمیندار عالمگیر کے گھر میں شیک رہتی لیکن جب اسے وہاں سے لایا جاتا تو اس کی حالت خیر ہونے لگتی۔ اسی دوران میں ایک خطرناک ڈاکو سہول نے گاؤں پر حملہ کیا۔ حملے میں عالمگیر کا چھوٹا بیٹا مارا گیا۔ میں تاجور کو حملہ آوروں سے بچا کر ایک محفوظ جگہ لے گیا۔ ہم دونوں نے کچھ اچھا وقت گزارا۔ واپس آنے کے بعد میں نے ہمیں بدل کر مولوی فدا سے ملاقات کی اور اس پیچھے جا پہنچا کہ عالمگیر وغیرہ نے زینب کو جان بوجھ کر بیمار کر رکھا ہے اور یوں مولوی صاحب کو بوجھ کر بیمار کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنی بیٹی کی جان بچانے کے لیے اسحاق کی حمایت کریں۔ مولوی صاحب کو دل کر دیا گیا۔ ایک گناہ ڈنی رو کر گاؤں کے خاتمے کے بعد ہم گھروں کی جانب گامزن تھے کہ میں اور تاجور سہول ڈاکو کے ڈیرے پر جا پہنچے۔ یہاں سہول کی ماں (مادھی نے) مجھے اپنا ہونے والا جوانی سکھا۔ جس کی پوری سہنا عرف مانی سے میری بات ملے تھی۔ یوں سہول سے ہماری جان بچ گئی۔ سہول کے ساتھ میرا مقابلہ طے پا چکا تھا کہ میرا ذہن ماضی میں جھپک گیا۔ جب میں ڈنمارک میں تھا اور ایک کمزور پاکستانی کو گورے اور انگریز فٹ بال سے بچانے ہوئے خود ایک طوفان کی لپیٹ میں آ گیا۔ وہ کھیلے لیکساری ٹینک کے لوگ تھے جس کا سرخ جہان ڈیر کر تھا۔ مجھ سے بدلہ لینے کے لیے انہوں نے میری یونیورسٹی دوست ڈیزنی کے ساتھ اجتماعی میل کھلا، پھر ڈیزنی کا تب ہوئی۔ اس واقعے کے بعد میری زندگی میں ایک انقلاب آ گیا پھر میرا رحمان مارشل آرٹ کی طرف ہو گیا اور اس ٹرننگ کی حیثیت سے MMA کی فائش میں تھلکا جاتا رہا اور دوسری طرف اسکاٹی ماسک کی ادب میں لیکساری ٹینک کے فٹ بالوں سے برسرِ کار رہا۔ اسی مارشل آرٹ کی بدولت میں نے سہول سے مقابلہ کیا اور سخت مقابلے کے بعد برابری کی بنیاد پر ہار مان کے سہول کا دل جیت لیا۔ سہول سے کہہ کر میں نے اتنی کوبلا لیا۔ سہول ایک حسین و شیرازہ منظر کو بنا جاتا لیکن کی طرح سہا سناور کر رہا ان فردوس (دڑے صاحب) کی خدمت میں تھے کے طور پر پیش کرنا چاہتا تھا۔ میں، اتنی اور جاناں ساتھ تھے۔ ہم ریان فردوس کے گل نما کھٹے پارا ہاؤس پہنچے۔ وہ ڈا صاحب اپنے دو بیٹوں کے ہمراہ بروٹائی سے پاکستان شفٹ ہوا تھا۔ بروٹائی میں اس کی خاندانی دشمنی چل رہی تھی۔ سہول کو پارا ہاؤس میں ٹکڑی کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ پارا ہاؤس میں کوئی بڑا بچہ نہیں رہا تھا۔ کونجنگ نے پتا چلا کہ بڑے صاحب کے دونوں بیٹوں میں زیر ظہر یا خطر پایا جاتا ہے۔ زینب والا معاملہ بھی اسی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ اسی وجہ سے زینب کو بھی انوکھا کر لیا گیا۔ ابراہیم اور کمال احمد کے لیے جو لڑکیاں تیار کی تھیں، وہ پارا ہاؤس پہنچ چکی تھیں۔ ایک تقریب میں دونوں لڑکیوں کی بروٹائی کی کئی توان میں ایک زینب کی۔ ابراہیم نے مجھ پر اور سہول پر احکام کا اظہار کیا تھا۔ ابراہیم نے بتایا کہ دونوں بھائیوں میں زیر ظہر یا خطر موجود ہے اسی لیے ان کے لیے لڑکیاں تیار کی گئی تھیں۔ میں نے ابراہیم کو گاہ کیا کہ زینب پوری طرح محفوظ تھیں کہ اور شادی کی صورت میں اسے تنہا بھیج دیا جائے۔ یہ سن کر ابراہیم پریشان ہو گیا۔ ادھر آقا جان جو پارا ہاؤس کا کارٹر تھا، دھماکے کو بجھانے میرے کہنے پر ابراہیم نے زینب کا خون ٹیٹ کر لیا تو حقیقت کھل کر سامنے آ گئی۔ اس تمام گل و غارت میں آقا جان لوٹ تھا کہ کوئی اس پر شک کرنے کو تیار نہ تھا۔ تعاقب کی ذہنیت کے بعد بروٹائی میں قائمین نے بڑی کارروائی کر کے دڑے صاحب کے برادر مکی کو مار ڈالا تھا۔ بڑی قسم صاحب کا روڈ کو بڑا حال تھا، ان حالات سے خبر دانا ہونے کے لیے میں اور سہول دڑے صاحب کے ساتھ بروٹائی جانے کے لیے تیار تھے۔ بروٹائی جانے سے پہلے میں ایک فٹ بال گروپ کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ایک ٹوٹل فاصلہ طے کر کے میں تاجور کی ایک ٹھکانہ پر گیا۔ وہاں گاؤں کے چھ لڑکے تھے کھیل رہے تھے۔ میرے سامنے وہ بیٹھے تھے۔ اپنی ہار کے بعد ایک دلیر لڑکا میرے سامنے کھار گیا اور میرا پیچھا کر رہا تھا پارا ہاؤس تک آ گیا۔ سب عرف سب کی کئی ٹالے کے لیے ہم اسے اپنے ساتھ بروٹائی لے آئے تھے۔

یہاں حالات بہت خراب تھے۔ ریان فردوس کا پیرائے زل قافل پارٹی بن چکا تھا۔ امریکن انجینی کے ساتھ بول کے پورے علاقے پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ فردوس بھی قسطنطنیہ کا پیرائے زل قافل پارٹی دار آفریم تھی۔ وہ اسٹریٹنگ کی حیثیت سے مجھے جان مٹی تھی۔ میں نے ہی ہم میں اس کے صراہ رہا۔ ریان فردوس کی پہلی بیوی اور اس کے بیٹے کی شورشیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ مجھے شروع ہی سے آقا جان پر شک تھا۔ اور اس کی سرگرمیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ رائے زل اور امریکن انجینی کی قوت نے کل پر حد واصل دیا تھا۔ افراتفری اور کل وفات گری نے اینٹ سے اینٹ بھادی تھی۔ اس حملے میں ریان فردوس اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ اب ریاست پر کل طور پر رائے زل کا قبضہ ہو چکا تھا۔ ہم سب بڑی مشکل سے جان بچانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ آقا جان اور رائے زل کے کارندے ہماری تلاش میں تھے۔ ابراہیم اور زینب کا برا حال تھا۔ میری ذات ان کے لیے بہت بڑا سہارا تھی۔ کمال اس جنگ میں جان سے دھو بیٹھا تھا۔ ہم زبردست متعبد تھے۔ مگر انتقام رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ جس لالچ میں ہم یہاں آئے تھے وہ اب بھی تک باہر موجودگی۔ آقا جان کے آدمیوں سے بچنے کے لیے اسے ٹھکانے کا نامزد رہا تھا۔ بن مشہور تاجدارک زبردست جنگ سے باہر نکل گئے۔ مگر باہر منت پھرا تھا۔ تاجدارک کھل کر ایک کھائی میں گر جاتا ہے۔ میں اور سیف اسے دھوڑنے جاتے ہیں مگر انجینی کے بچے چاہتے ہیں۔ بے تحاشہ تشدد دینے کے باوجود ہم قسطنطنیہ اور ابراہیم کا پتا نہیں بتاتے۔ سیف کی حالت بری تھی۔ مجھے اس کو اپنے ہاتھ سے زبردستے کے اذیت کم کرنا پڑی۔ مگر میرا اپنا حال بہت برا تھا۔ امریکی لوگ نے تشدد کی انتہا کر دی تھی۔ جامانی کے حالات روز بروز بدتر ہو رہے تھے۔ میں رائے زل کی قید سے رہائی پا چکا تھا۔ عوام کا سمندر میرے لیے بے چین تھا۔ وہ مجھے اپنا سربراہ مان بچے تھے۔ وہ آزادی کے لیے سر پریشان ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ ہمارا قتلے کا رخ اب ڈی پکس کی جانب تھا۔ پالی کی مدد سے پوری فیم اور عوام کا سمندر ڈی پکس کی جانب کا مزن تھا۔ ہر طرف گولیاں..... فلیگ اور عوام دھاڑا لڑاں گی۔ بالآخر فیم ہوئی عوام نے اپنے جوش، جذبہ اور جنوں سے کام لے کر رائے زل کے ساتھ قسطنطنیہ کا خاتمہ کر دیا۔ اب تخت کے حق دار قسطنطنیہ اور ابراہیم تھے۔ وطن آنے کے بعد تاجدار اپنے گھر چلی گئی اور میں داؤد و بھاجاؤ کے پاس قسطنطنیہ کا وطن آئے ہی اس دشمن نے مجھے دھوڑ ہی لیا جس سے میں پھپھکا پھرا ہوا تھا۔ ٹیکساری کیگ پاکستان آچکا تھا ہر طرف کل وفات گری پھیلا رہے تھے۔ ڈیٹھ اسکوڈ کے کارندے میری تلاش میں کئی حصوں لوگوں کی جان لے چکے تھے۔ اب ان کا خاتمہ ضروری ہو گیا تھا میں اور اینٹ نے ان کے ٹھکانے کا کوئج لگایا اور بہت ہوشیاری سے ان کے جشن والے دن رنگ میں بھگ ڈال دیا۔ اور جامانی سے خورسٹ آجکی تھی اور سجاد کو اپنا حتمی فیصلہ سنانا چاہتی تھی۔ ڈیٹھ اسکوڈ کا خاتمہ بے حد ضروری تھا۔ میں نے اینٹ کے ساتھ کل کران کے ٹھکانے کو تباہ کر دیا اور خود بھی بھٹل یعنی جان بچا لیا۔ اس مقام پر زبردست بلاست ہوا اور مجھے بھی مردہ سمجھ لیا گیا۔ ٹیکساری کیگ سے بچنے کا ایک ہی طریقہ سمجھ میں آیا کہ میں سب کی نظروں میں مردہ رہوں۔ اپنے چہرے پر بڑبڑی کے ذریعے تھیلیاں کر دے گا کہ میں ان میں اپنی ہی گناہ تھا۔ سیف کے گھر اور تاجدارک رسائی کے بعد میں مطمئن تھا کہ تاجدارک شادی داراب کی جلی میں طے پا چکی تھی۔ تاجدارک کے بغیر میری زندگی اور میری جی، میں اسے ساتھ لے آتا تھا مگر اچانک اینٹ کی آمد ہوئی، اس نے سیف کے حوالے سے غلط فہمیاں کر کے تاجدارک کو قتل کر دیا۔ وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ میں اینٹ کی اس حرکت پر حائل تھا۔ وہ بیاہ کے داراب ہاؤس جا چکی تھی۔ بالآخر ہم نے اینٹ کی فم کی کا کوئج لگایا۔ وہ ہاناوانی کے کالے لم کی زد میں تھا۔ ہاناوانی اپنے بیٹے کی موت کا بار بار ہم سب سے لینا چاہتی تھی۔ اس نے سجاد کے ہاتھوں اینٹ کا قتل کر دیا۔ سجاد نے اس کی انتہائی کارروائی سے بچنے کے لیے اپنی آنکھوں اور کانوں کو تباہ کر دیا تھا۔ ہاناوانی کے دہشت ناک حملے جاری تھے۔ اب وہ پردوں کے ذریعے ہمیں نیست و نابود کر دینا چاہتی تھی۔ ہاناوانی کا اگلا شمار تاجدارک تھا۔ وہ اسے شوہر کے ساتھ شہر سے باہر جا رہی تھی۔ حملے کا شدید خطرہ تھا۔ وہی ہو اور اسے میں پردوں کی بنیاد نے گاڑیوں کو تباہ کر دیا۔ میں تاجدارک اور اس کے شوہر کے ساتھ ایک کھوہ میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

میں نے کہا۔ ”میری رائے تو یہ ہے کہ آپ آرام سے یہاں پر نہیں۔ یہ یورپ کا مہاجر ترین ٹولا ہے۔ ان کی کسی بات پر بھی بھی اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔“
 ”بات اعتبار کی نہیں شاید اب“..... قسطنطنیہ نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ”یہ کلا میدان ہے۔ اگر یہ وعدے پر قائم نہیں رہیں گے تو ہم کہیں رہیں گے پھر دیوین طرف سے۔ کوئی طے کی۔ یہ بات یہ لوگ بھی ابھی طرح جانتے ہیں۔“
 اسی دوران میں ٹیلوں کے عقب سے ریڈ کیٹ کی لکار بھر گئی۔ ”اوچو ہے کی اولاد اب مل میں مٹی میں۔“
 بیٹی ہے۔ اگر اسے باپ کی اولاد دے تو باہر نکل۔ میں خالی ہاتھ ہوں اور انتظار کر رہی ہوں تیرا۔
 میں نے پکار کر کہا۔ ”قیامت کی نشانیاں ہیں۔ باپ کی اولاد کا قبضہ کون دے رہا ہے، جو خود پولیٹری فارم کے چوزوں کی طرح مشین کی پیدوار ہے۔ باپ تو کہہ رہی ہے کہ بھوتی ہے، میں کیا پتا کہ ہے یا نہیں۔“
 چھوٹے خاموشی رہی پھر وہ اپنی ریڈ کیٹ نے دیویری کا مظاہرہ کیا۔ وہ لیلے کی اوٹ سے نکل آئی۔ اسی کا سرگرم لپاس اس کے جسم سے چپکا ہوا تھا۔ بارش میں بیٹھنے کی وجہ سے وہ

جو جگہ ریڈ کیٹ اور قسطنطنیہ کے درمیان لڑائی کا میدان بننے والی تھی، وہ کھودے کے دہانے سے کم و بیش پینتیس میٹر دور تھی۔ ٹیلوں اور کچی پھٹی زمین کے درمیان یہ ایک نسبتاً ہموار قطعہ اراضی تھا..... جبکہ پتھریلی تھی اور جہاز جھنڈا بھی موجود تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں آٹنے سامنے تھیں۔ ایک یورپ کے خطرناک ترین گیٹ کے خطرناک ترین جنگ کی ہڈی تھی۔ ایک درجن پولیس والوں سمیت کئی نکل اس کے کھاتے میں تھے۔ بڑے بڑے اسٹریٹ فائٹر اس کی خوشخواری اور عیاری سے پناہ مانگتے تھے۔ دوسری جانب چامچی کی آڑ میں سرز کی چیف قسطنطنیہ تھی۔ اعلیٰ تربیت یافتہ، فتنہ حرب کی ماہر..... اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جوش اور جذبے سے بھری ہوئی۔

دونوں ایک دوسرے کے سامنے پہنچیں۔ ابھی قسطنطنیہ شاید پوری طرح مستعد بھی نہیں تھی کہ ریڈ کیٹ ایک چنگھاڑ کے ساتھ اس پر جا پڑی۔ قسطنطنیہ کو اس سے شاید اتنی جلدی کی توقع نہیں تھی۔ وہ پوری طرح اپنا دفاع نہیں کر سکی۔ اس کا دھکا لگنے سے دور جا کر گیٹ کے آگے اٹھا ضرور ہوا کہ وہ اس کے نیچے نہیں آئی۔ اس سے پہلے کہ ریڈ کیٹ دوبارہ جھٹ لگا کر اسے چھاپ لیتی، وہ تڑپ کر کھڑی ہو گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے اور داؤ لگا کر گرانے کی کوشش کرنے لگیں۔ یہ ایک زوردار مقابلہ تھا، دونوں میں سے کوئی بھی ہار ماننے کو تیار نہیں تھی۔ یکا یک قسطنطنیہ کا داؤ چل گیا اور اس نے اسے اپنے سر کے اوپر سے گزار کر سنگلاخ زمین پر پھینک دیا۔ ریڈ کیٹ پشت کے بل گری تھی اور اس نے یقیناً سخت چوٹ کھائی تھی مگر اس کی عیاری قابل دید تھی۔ گرتے ساتھ ہی اس نے ڈھلوان پر نیچے کی طرف کئی پلٹیاں کھائیں اور قسطنطنیہ کی زد سے دور نکل گئی۔

دونوں ایک مرتبہ پھر ایک دوسرے کے سامنے آئیں۔ شاید دونوں کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے مستقیم کھتا ہو کر کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکیں۔ کیونکہ دونوں میں سے کوئی بھی اتنی بلی نہیں تھی کہ اسے گرا کر اسے دو جا چا سکتا اور کوئی فرشی داؤ ہلاک لگا یا جاسکتا۔ دونوں نے ایک دوجے پر ٹھوکر دیا اور ٹکوں کی بارش کی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ ابھی دونوں میں سے کسی نے بھی خنجر نہیں نکالا۔ معا قسطنطنیہ کے ہوائے کٹ بال ریڈ کیٹ کی تھی میں آگئے۔ اس نے بچائی انداز میں چلاتے ہوئے قسطنطنیہ کے سر کو یوں پیچھے کی طرف موڑ دیا کہ اس کی گردن ٹوٹنے کا اندیشہ پیدا ہو گیا۔ رینگنے کے طور پر قسطنطنیہ نے بھی اپنا دایاں ہاتھ چلایا، لیکن

جسم کا حصہ ہی نظر آنے لگا تھا اور یوں لگتا تھا کہ اس نے جسم پر سرخ پینٹ کیا ہوا ہے۔ اس نے دونوں ہاتھ کھڑے کیے۔ اس کے ہاتھیں ہاتھ میں چھوٹی نال والی روسی رائل تھیں۔ اس نے ٹیس کے عالم میں یہ رائل پاس ہی ایک گہری کھائی میں پھینک دی..... تب اس نے اپنی کمر میں لگے ہولٹر میں سے سیاہ بٹل نکالا اور اسے بھی کھائی میں پھینک دیا۔ یقیناً یہ دونوں ہتھیار کھائی کے گھنے جھاڑ جھکاڑ میں کم ہو کر رہ گئے تھے۔

میں نے اسپرگمن کی ٹیلی اسکوپ سے دھیان کے ساتھ دیکھا۔ اب اس کے پاس کوئی ہتھیار نظر نہیں آ رہا تھا لیکن یقین کے ساتھ پھر بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اسی دوران میں قسطنطنیہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ کھودے کے باہر تھی۔ اس نے اپنی کمر سے بندھا ہوا ریوا اور، چڑے کے ہولٹر سمیت اتار کر پتھریلی زمین پر ڈال دیا۔ تب اچانک میری نظر ریڈ کیٹ کی ایک پنڈلی کے مقبے حصے کی طرف گئی۔ وہاں ایک ابھار تھا جو ٹیلی اسکوپ میں سے صاف نظر آ رہا تھا۔ یقیناً یہ وہی دندانے دار خنجر تھا جس کا ذکر پاشا نے بھی کیا تھا۔ میں نے کہا۔ ”نظر میں قسطنطنیہ! ابھی آپ آگے نہ جا لیں۔“ وہ ٹھٹک کر میری طرف دیکھنے لگی۔

میں نے ریڈ کیٹ کو مخاطب کر کے بلند آواز میں کہا۔ ”تم شروع میں ہی جھوٹی ثابت ہو رہی ہو۔ تمہاری پنڈلی سے خنجر بندھا ہوا ہے۔“

”تو پھر کیا ہے؟“ وہ چلا کر بولی۔ ”اپنی اس ساہتہ گرل فرینڈ سے کہو کہ وہ بھی لے آئے خنجر..... بلکہ اگر چاہتی ہے تو کوئی کوارٹلوار بھی لے آئے۔“

قسطنطنیہ نے جس آرمی ڈیگر سے ڈیز ہاؤنڈ کو کاری زخم لگائے تھے، وہ سامنے ہی ایک پتھر پر رکھا تھا۔ ریڈ کیٹ کی بات سن کر قسطنطنیہ مڑی اور وہ تیز دھار ڈیکر غلاف میں ڈال کر اپنی جراب میں آڈس لیا۔

”قسطنطنیہ..... ایک بار پھر سوچ لیں.....“ میرا فہرہ ادھورا ہی رہ گیا کیونکہ قسطنطنیہ جھٹ لگاتی ہوئی باہر نکل چکی تھی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور یہ وہی سرخی تھی جو ایک فطری جیگرو کے چہرے پر بوقت مبارزت نظر آتی ہے۔ تاجور اور سید کو کھڑکھوہ کے وسط میں کھڑے تھے اور سر آہستہ کیے عالم میں یہ صورت حال دیکھ رہے تھے..... بارش ہلکی تھی لیکن مسلسل برس رہی تھی۔ میں نے ایم جی تھری کے سامنے پوزیشن سنبھال لی اور پوری طرح الارٹ ہو کر بیٹھ گیا۔

جب ریڈ کیٹ، قسطنیہ پر تقریباً غالب آ چکی تھی، اس کا خنجر والا ہاتھ قسطنیہ کی گرفت میں آ گیا۔ قسطنیہ بھی سمجھ گئی تھی کہ یہ اس کے لیے اپنی زندگی بچانے کا آخری موقع ہے، وہ پوری جان کے ساتھ اس کی کلائی سے چٹ گئی.....

ریڈ کیٹ نے بے پناہ زور مارا اور یہی وقت تھا جب اس کی کلائی کی بڑی بڑی ٹوٹ گئی۔ وہ اتنے ہمایک انداز میں چلائی تھی کہ اس کی وجہ بڑی ٹوٹنے کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ دندائے دار خنجر اس کے ہاتھ سے گر کر جھاڑ جھکاڑ میں گم ہو گیا۔ قسطنیہ نے اپنے بوٹ کی زوردار شوکر اس کی پٹیلوں میں لگا کر اسے دور پیچک دیا۔ بھر دے دیوانی سی ہو کر اس شیطان زادی پر ہل پڑی۔ شیطان زادی کا لباس پھٹ چکا تھا اور مالائی جسم تقریباً عریان تھا مگر اسے اس عریانی کی کیا پروا ہو سکتی تھی۔ وہ بدستور چمکاڑ رہی تھی اور قسطنیہ کی مزاحمت کر رہی تھی۔ یہ بیچ قریباً سات بجے کا وقت تھا۔ بھی کبھی بجلی کی روشن لکیر آسمان پر ترپتی تھی اور پھر بادل گر جتے تھے۔ بارش کی ہلکی پھوار میں قرب و جوار کا منظر دور تک دکھائی دے رہا تھا۔ دونوں ماسٹر فائزر تھیں اور دونوں خالی ہاتھ ایک دوسرے سے برسر پیکار تھیں۔ (ان لہجوں میں مجھے اپنی اور سجاد کی یادگار لڑائی یاد آتی۔ وہ بھی کوٹلی کے ڈیرے پر ایسے ہی کر جتے برستے موسم میں ہوئی تھی)

قسطنیہ کو اب ریڈ کیٹ پر اپرینڈل چکا تھا۔ وجہ یہی تھی کہ کیٹ کا ایک بازو کام نہیں کر رہا تھا۔ وہ اس کی کوتاہیوں چلا کر پورا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اپنے بھائیوں کی طرح وہ بھی شراب، پانی کی طرح پیتی تھی۔ اس نشے نے شاید اس کے جسم میں عارضی طور پر اضافی توانائی پیدا کر رکھی تھی۔ اپنی ٹوٹی ہڈی کے باوجود وہ چمکاڑ رہی تھی اور پلٹ پلٹ کر قسطنیہ پر حملہ آور ہو رہی تھی۔ قسطنیہ کو بھی دندائے دار خنجر کے کی کٹ لگے تھے اور اس کا لباس خون آلود تھا۔

دفعتاً مجھے محسوس ہوا کہ ریڈ کیٹ مارا ماری کے دوران میں ایک خاص سمت میں بڑھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ یہ زمین میں دبا ہوا کٹی ٹن کا ایک سیای مائل پتھر تھا۔ بظاہر یوں لگتا تھا کہ وہ راہ فرار اختیار کر رہی ہے لیکن فرار ہونا ان ٹیٹ ٹیٹ بھیبھیب شیطانوں کی فحشیت میں نہیں تھا۔ ٹکایک میرے دماغ میں ایک جھماکا سا ہوا۔ کہیں قسطنیہ کی اس عیار حریف نے یہاں کچھ چھپا تو نہیں رکھا تھا۔ اگلے چار پانچ سیکنڈ میں میرا یہ اندیشہ بالکل درست ثابت ہو گیا۔ وہ جست لگا کر سیاہ پتھر کے پہلو میں گری۔ اس کی ایک ٹانگ ابھی تک قسطنیہ کی گرفت میں تھی۔ اس نے اپنا بایاں ہاتھ

اس کی حریف کے سر پر تو کوئی بال ہی نہیں تھا۔ اپنے ٹیٹ ٹیٹ بھیبھیب کی طرح اس کی کھوپڑی بھی مفاہٹ تھی۔ بٹنا کر قسطنیہ نے اس کے پہلو میں کبھی کی سخت ضرب لگا کی اور پھر اگلے پاؤں پیچھے ہٹ کر اسے ایک بڑے پتھر سے گھرا دیا۔ قسطنیہ کے بال ریڈ کیٹ کی گرفت سے نکل گئے اور تب ایم ایم اے کے اسٹائل میں قسطنیہ نے گھوم کر ایک شوکر ریڈ کیٹ کے قہو بڑے پر رسید کی۔ مارشل آرٹ کی اصطلاح میں اسے رائڈنگ گنگ کہتے ہیں اور یہ اکثر بڑی کارگر ثابت ہوتی ہے۔ ریڈ کیٹ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو یہ طوفانی ضرب کھا کر اٹھ نہ سکتا۔ لیکن وہ نہ صرف اٹھی بلکہ اس کے ہاتھ میں چمکیلا دندائے دار خنجر بھی نظر آنے لگا۔

اب یقیناً قسطنیہ کو بھی حق حاصل تھا کہ وہ فوجی ڈیکر نکال لیتی۔ وہ بھی تیزی سے اپنی پٹنڈی کی طرف مچلی.....

اور تب..... مجھ پر انکشاف ہوا کہ مارا ماری کے دوران میں خنجر دھار ڈھراس کی جراب کے اندر سے نکل چکا ہے۔ یہ قسطنیہ کے لیے ایک زبردست دھچکا تھا۔ ریڈ کیٹ کسی خوبی بلا کی طرح قسطنیہ پر چھینی۔ اس کا چمکیلا خنجر ایک روشن لکیر سی بناتا ہوا قسطنیہ کی گردن کے پاس سے گزرا۔ وہ بشل خود کو بچا سکتی تھی۔ ریڈ کیٹ دیوانہ دار قسطنیہ پر خنجر کے وار کرنے لگی۔ ہر بار بس یہی محسوس ہوا کہ خنجر کی نوک قسطنیہ کے جسم کو چیر ڈالے گی۔ ساتھ ساتھ وہ چمکاڑ رہی تھی۔ ”چھوڑو! کی نہیں..... مار ڈالو! کی کسی سونر کی اولاد..... میں تیری بوئیاں اڑا دوں گی۔“

قسطنیہ کسی بھی وقت جان سے جا سکتی تھی۔ ایک لپٹلے کے لیے میرے دل میں آیا کہ مداخلت کروں۔ اگر میں احتیاط سے فائزر کرتا تو قسطنیہ کو نقصان پہنچائے بغیر ریڈ کیٹ کو نشانہ بنا سکتا تھا مگر یہ لڑائی کے اصول کے خلاف تھا۔ میں اصول توڑتا تو پھر دوسری طرف سے بھی توڑا جا سکتا تھا۔

نیشنل بات تھی کہ شیطان زادے اپنی جدید رانکوں سمیت، لڑائی والی جگہ کے آس پاس موجود ہیں۔ ریڈ کیٹ نشانہ بنتی تو وہ قسطنیہ پر گولی چلانے میں ایک سیکنڈ کی تاخیر نہ کرتے۔ قسطنیہ کے جسم پر کئی چر کے لگ چکے تھے اور وہ بہت مشکل میں تھی..... مگر ایک فوجی کمانڈر کی استقامت اور آخری گولی تک لڑنے کا جذبہ اسے گرنے نہیں دے رہا تھا..... میں نے دیکھا تا جو بھی سکتے کے سے عالم میں یہ دلہوز منظر دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ برف کی طرح سفید تھا اور ہونٹ، بے ساختہ دعائیہ انداز میں ہلنے جا رہے تھے..... پھر شاید اس کی دعا قبول ہوئی تھی۔ عین اس وقت

آگے بڑھا یا۔

”قطبیا“ میں پکارا۔

سے خشک کر لی۔ اس دوران میں، میں کم از کم دو شیطان زادوں کو پٹ کر چکا تھا۔ ایک کی لاش ہمیں صاف دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے باوجود وہ آگے آتے چلے جا رہے تھے۔ ان کی بے غوثی یقینی غیر معمولی تھی۔

قطبیا اتنی شدید فائرنگ کر رہی تھی کہ دو تین منٹ میں ہی گولیوں والی باس نمابہٹی ایک چوتھائی رہ گئی۔ ہر طرف گولیوں کے گرم خول بکھر رہے تھے۔ مخالف سمت سے آنے والی گولیاں اب کھوکھے وسط تک پہنچ رہی تھیں۔ ہماری ضرورت کے سامان میں سے کئی اشیاء غارت ہو چکی تھیں۔

”دوسری پٹی لاؤں؟“ سعید کو کھرنے بلند آواز میں پوچھا۔

”ہاں، جلدی۔“ قطبیا نے اپنی ساری توجہ سامنے مرکوز رکھتے ہوئے کہا۔

سعید جبکہ کر چلتا ہوا عقی جسے میں گیا۔ اس کے پہنچنے سے پہلے ہی تاجور پٹی ٹھیکٹ کو کھوکھے وسط تک لا چکی تھی۔ وہاں سے سعید نے اسے ٹھیکٹ اور قطبیا کی طرف آیا۔ دو گولیاں سعید کی پشت میں لگیں اور سینے کی طرف سے شگاف کرتی ہوئی نکل گئیں۔ وہ پٹی کے اوپر ہی بے جان ہو کر گر گیا۔ تاجور کارنگ بالکل سفید ہو رہا تھا مگر اس نے یہ خوفناک منظر دیکھنے کے باوجود ہمت کی اور ایونیشن کی پٹی کی طرف بڑھی۔

”نہیں تاجور، آگے نہیں آنا۔“ میں نے بلند آواز میں اسے وارنگ دی۔

وہ ٹھٹک گئی اور اس کا ٹھٹکا درست تھا۔ کھوکھو کا وہ حصہ مکمل طور پر گولیوں کی زد میں آ چکا تھا۔

دوسری طرف قطبیا کے پاس فقط پچیس تیس راؤنڈ رہ گئے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ بھی گن کے چمبر میں چلے گئے۔

شیطان زادوں کے لکارے اب وہاں کے بالکل باس ستائی دے رہے تھے۔ میں سوچ رہی رہا تھا کہ کیا غرور..... دفعتاً وہ غیث، وحشی جانوروں کی طرح اندر گھس آئے۔ ان میں سے ایک نے اپنی رائفل قطبیا کے سر کی طرف پوائنٹ کی لیکن اس سے پہلے کہ وہ قطبیا کو شوٹ کرتا، میں نے ٹریگر دبا دیا۔ وہ جیسے آڑ کر ٹی فٹ پیچھے گرا۔ اس کے ساتھی کی رائفل شاید خالی ہو چکی تھی۔ اس نے اسے بیرل کی طرف سے پکڑ رکھا تھا۔ اگر میں جھکنے میں ایک لمحے کی تاخیر کرتا تو طوفانی ضرب ناقابلِ تلافی نقصان

لیکن اس کے لیے دیر ہو چکی تھی۔ کیٹ نے گھاس

کے اندر چھپا ہوا کوٹ پھل نکال لیا۔ یہ سراسر عیاری اور دھوکے بازی تھی۔ اس نے پھل قطبیا کی طرف سیدھا کیا..... اب سیکنڈ کے دسویں حصے کا انتظار بھی حاققت تھا۔

میں نے ایچ ایم قمری کا ٹریگر دبا دیا۔ یہ ایک سیکنڈ میں قریباً 18 راؤنڈ فائر کرتی تھی۔ گولیوں کی بو چھانڑ نے ریڈ کیٹ کی کھوپڑی اور گردن چمکا چور کر دی۔ دو سیکنڈ کے لیے جیسے

قرب و جوار پر سکتے سا طاری رہا، پھر دوسری طرف سے بھی فائرنگ شروع ہو گئی۔ قطبیا نے اس دوران میں بڑی حاضر دماغی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے خود کو ڈھلون پر لٹا رکھا اور

پلیٹاں کھائی ہوئی ایک چٹان کی اوٹ میں پھنک گئی۔ میں نے پوری گنجائش کے مطابق اسے کور فائر دیا۔ وہ جبکہ گردن پندرہ قدم بھاگی اور کھوکھے کے اندر گھسنے میں کامیاب ہو گئی۔

اپنی انچارج کی موت ملاحظہ کرنے کے بعد وہ تھ اسکوڈ کا ایلٹس ٹولاد دیوانہ سا ہو گیا۔ انہوں نے دو اطراف سے کھوکھو پر زوردار حملہ کر دیا۔ میں نے جوابی فائرنگ کرتے

ہوئے قطبیا سے بلند آواز میں پوچھا۔ ”وہ ٹھٹک تو ہے؟“ ”ہاں میں ٹھٹک ہوں..... لیکن یہ لوگ بہت فریب آچکے ہیں شاہ زائب ان کو روکنا پڑے گا۔“

وہ اپنے زعموں کی پروا کیے بغیر لپک کر میرے پاس پہنچ گئی اور ایچ ایم قمری کا کنٹرول مجھ سے لے لیا۔ مجھے بھی یہ بات تسلیم تھی کہ وہ اس گن کو مجھ سے بہتر استعمال کر سکتی

ہے۔ میں نے آٹھ ایم ایم کی آٹھ ٹھٹک سنبھال لی اور ڈٹ کر قطبیا کا ساتھ دینے لگا۔ یہ بڑا دھواں دھار معرکہ تھا۔

گولیاں مینڈ کی طرح برس رہی تھیں۔ ایلٹس زادے پچھھاڑ رہے تھے اور پوزیشنیں بدلتے ہوئے کھوکھو سے قریب تر آ رہے تھے۔

میں نے پہلی بار قطبیا کے چہرے پر پریشانی و ہراس کی پرچھائیاں دیکھیں۔ اس نے چٹا کر سعید کو کھوکھو مخاطب کیا۔ ”مجھے ایونیشن باس چاہیے..... جلدی کرو۔“

سعید کو کھوکھو ایک کونے میں سنا ہوا تھا، لیکن یہ بات وہ بھی جان چکا تھا کہ یہ نازک ترین مرحلہ ہے، اسے تھوڑی بہت ہمت کرنا پڑے گی۔ اس نے گولیوں والی پٹی پکڑی

اور اسے گھسیٹا ہوا قطبیا کے پہلو میں لے آیا۔ قطبیا نے ایک ہاتھ سے چابکدستی کے ساتھ پٹی کو

کھولا اور ایک ہی ہاتھ سے گولیوں والی بیٹل گن کے چمبر

تاجور نے چاقو پھینک دیا اور ہتھکڑیوں سے روئے لگی۔ اس کا سارا بدن تھر تھر کا پ رہا تھا۔ سرخ چہرہ ایک بار پھر لمحے کی طرح سفید ہوا شروع ہو گیا تھا۔ میں نے اسے اپنے ساتھ لگا کر پچکارا اور ساتھ ہی قسطنطنیہ کو اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھی اور تاجور کو اپنی ہاتھوں میں لے لیا۔ دارج اپنے فرشی بستر سے اٹھ کر بیٹھ گیا تھا اور شور مچا رہا تھا۔ کیونکہ وہ کافی قاصطے پر تھا لہذا اس کا شور مجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس زوردار ٹا کرے میں میرے ہاتھوں کا انگوٹھا پھر زخمی ہو گیا تھا۔ ناخن کے قریب سے ٹھوڑی سی جلد پھٹ گئی تھی اور خون نکل رہا تھا۔ یہ انگوٹھا جا بھئی کے جنگ و جدل میں زخمی ہوا تھا اور اس میں سے اب بھی کئی سی جلد پھٹ گئی تھی۔ بہر حال اب زیادہ چوٹ آئی تھی یوں محسوس ہوتا تھا کہ جوڑے کے پیچھے والی ہڈی کو بھی نقصان پہنچا ہے۔ بہر حال میں پلٹ کر تیزی سے بڑی گمن کے سامنے آن بیٹھا۔ دہانے سے باہر اب مزاحمت کے آثار دکھائی نہیں دیتے تھے۔ پھر بھی میں نے اٹلی ٹریگر پر رکھ لی اور پوری طرح چوکس ہو گیا۔ قسطنطنیہ نے تاجور کو اپنے ساتھ لگا رکھا تھا اور اسے تھپک رہی تھی۔ تاجور حیران نظروں سے بھی شیطان زادے کی لاش کو دیکھتی تھی اور کبھی اس خون آلود چاقو کو جو اس نے ابھی زمین پر پھینکا تھا۔ اسے جیسے خود پر بھروسہ نہیں ہو رہا تھا کہ اس نے یہ سب کچھ کیا ہے۔

میرے ایک مد مقابل کو قسطنطنیہ نے ریوالور سے شوٹ کیا تھا۔ وہ کھوہ کے فرش پر اوندھا پڑا تھا۔ تاہم اس کے جسم میں حرکت موجو تھی۔ ”یہ ابھی زندہ ہے قسطنطنیہ۔“ میں نے اٹلی سے اشارہ کیا۔

قسطنطنیہ نے بے دریغ ریوالور کی دو گولیاں مزید اس کے سر میں اتار دیں۔ پھر وہ سفید کھمکھر کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ پھلو کے بل پڑا تھا۔ ابھی سانس لے رہا تھا مگر جتنا خون اس کے جسم سے نکل چکا تھا، اس کا بچتا مجال تھا۔ قسطنطنیہ نے اسے سیدھا حایا اور اس کے زخموں کو دیکھنے لگی۔ زندگی بھر دوسروں کی مرہم ہٹنی کرنے والے نے خود ایسے کاری زخم کھائے تھے کہ اس کی مرہم ہٹنی ممکن نہیں تھی۔ ٹھوڑی سی دیر میں اس کی نبض مکمل طور پر ختم ہو گئی۔ پاشا کی طرح اس کی لاش کو بھی ایک کپڑے سے ڈھانپ دیا گیا۔

میں نے پکار کر کہا۔ ”آپ خود بھی زخمی ہیں قسطنطنیہ! اپنے زخموں کا خون بند کریں۔“

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ تاجور اس کے لیے جلدی سے میڈیکل باکس اٹھا لائی۔ کیٹ سے خونریز لڑائی

پہنچائی۔ میں اس شخص سے متعمم تھا ہو گیا۔ اسی دوران میں، میں نے دیکھا کہ قسطنطنیہ، تیسرے حملہ آور سے متعمم گھاٹی۔ اس نے اس کی رائفل کا بیرل دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اوپر اٹھا رکھا تھا۔ ایک طویل برست چلا اور کھوہ کی چھت سے بہت سا پتھر پلا ملبا اکھڑ کر پینچے گرا۔ جو شخص مجھ سے متعمم تھا، اس کے جسم میں وہی حیوانی قوت تھی جو ڈھچھ اسکوڑ کے شیطان زادوں کا خاصہ تھی۔ یہ شخص پلک جھپکنے میں دو تین افراد کا بھرتا بنا سکتا تھا لیکن اب وہ جانتا تھا کہ اس کا مقابلہ ایٹرن سے ہے۔ اس احساس نے اس کی توانائیوں کو جیسے آدھا کر ڈالا تھا۔ بے پناہ جوش میں ہونے کے باوجود وہ اندر سے ڈرا ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے جسم کے نازک ترین حصے کا دفاع نہیں کر سکا۔ میرے کھنکھنے کی ضرب اس کے سینے کی ساننے والی ہڈی کے نیچے لگی اور وہ کراہ کر پشت کے بل گرا۔ میری رائفل کا بیرل ابھی تک اس کے ہاتھوں میں تھا، وہ اس کا رخ اپنے سینے کی طرف سے ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ سینے پر لگنے والی چوٹ کی وجہ سے اس کی ناک سے خون جاری ہو گیا تھا۔ ایک لاش اور دو حملہ آور تو میرے سامنے تھے مگر میں اس چوتھے کو نہ دیکھ سکا جو ایک دندائے دار خنجر کے ساتھ میرے عقب سے آیا تھا۔ آہٹ پر میں نے ایک ساعت کے لیے پلٹ کر دیکھا تو وہ مجھ پر وار کرنے کے لیے خنجر سونت چکا تھا مگر پھر مجھے تاجور کے لہاس کی جھلک نظر آئی، وہ اس پر چھٹی تھی۔ اسی دوران میں قسطنطنیہ نے اپنے ریوالور سے اس شیطان زادے کو شوٹ کر دیا جس نے ابھی تک میری رائفل کا بیرل پکڑ رکھا تھا۔

میں نے مزید دیکھا اور حیران رہ گیا۔ تاجور نے چند گھنٹوں کے اندر دوسری مرتبہ زبردست جرأت دکھائی تھی۔ وہ ڈھچھ اسکوہے سرخ پوش دندنے کے اوپر گری ہوئی تھی اس نے لمبے پھل کا تیز دھار چاقو دونوں ہاتھوں سے تمام رکھا تھا اور پے در پے اس کے سینے اور گردن پر وار کر رہی تھی۔ اس بل و ہلے مجھے پنجاب کی محنت مند و شیزہ نظر آئی جو وقت پڑنے پر اپنے کھائے ہوئے دودھ مکھن کا حق ادا کرتی ہے اور دشمن کے سامنے دیوار بن جاتی ہے۔

درحقیقت تاجور نے عقب سے آکر اس شیطان زادے پر جو پہلا وار کیا تھا، اسی نے اس کی کچھ انتہا یاں نکال دی تھیں۔ اس کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکتے ہوئے میں نے بھی ایک گولی اس کے سینے میں اتار دی۔

”تاجور! پیچھے ہٹ جاؤ۔ یہ مر گیا ہے۔“ میں نے کہا اور اسے سمجھ کر اس سے دور ہٹایا۔

کہ اپنے حواس قائم نہیں رکھ سکا تھا۔ وہ بندی سے لڑھک کر زخمی ہوا تھا۔ اس کی صفا چٹ کھوپڑی خون سے رنگین تھی۔ اس کے دونوں بازوؤں پر عریاں لڑکیوں کے ٹیٹو بنے ہوئے تھے۔ میں نے اپنی پینٹ کی بلیٹ اتار کر سب سے پہلے اس کے ہاتھ اس کی پشت پر باندھے، پھر اسے بمشکل اپنے کندھے پر اٹھایا اس کی رائفل وغیرہ کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔۔۔۔۔ میں اسے کمرے میں لے آیا۔ اس نے ہولے ہولے کہا مرنے شروع کر دیا تھا۔ جیسے کوئی سویا ہوا عفریت آہستہ آہستہ بیدار ہو رہا ہو۔

تاجور دور کھڑی خوف زدہ نظروں سے اس کو دیکھ رہی تھی۔ دارج ہراساں لہجے میں بولا۔ ”اس کو یہاں کیوں لے آئے ہو؟ شوٹ کر دو اس کو فوراً۔“

قسطیانی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”مسٹر دارج! یہ تو تم لوگوں کے ساتھی ہیں۔ ان کے خلاف اتنا غصہ کیوں کر رہے ہو؟“

”تم کو اس بند کرو۔“ وہ گر جا پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”والدہ کا کچھ پتا چلا ہے؟“

”نہیں ابھی نہیں، لیکن حالات اب اچھے نہیں لگ رہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ ڈھسکواڈ والوں نے ٹھیکل کے سارے ساتھیوں کو مار ڈالا ہے۔ مرنے سے پہلے پاشانے بھی یہی بات بتائی تھی۔“

دارج دھاڑا۔ ”پاشانے والدہ کے بارے میں بھی کچھ نہ کچھ بتایا ہوگا۔ تم مجھ سے چمپا رہے ہو۔ مجھے بتاؤ کہ۔۔۔۔۔ وہ زندہ ہیں یا نہیں۔؟“

”مجھے لگتا ہے کہ ان کے بارے میں کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں سب سامنے آجائے گا۔“

اسی دوران میں تاجور پکار کر بولی۔ ”اس کو دیکھیں۔۔۔۔۔ وہ ہل رہا ہے۔“ تاجور کا اشارہ زخمی سرخ پوش کی طرف تھا۔

”گھبراہٹیں نہیں۔ اس کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔“ میں نے اسے تسلی دی۔

اسی دوران میں دارج نے اپنے طور پر کروٹ لینے کی ناکام کوشش کی اور بڑی طرح کراپنے لگا۔ تاجور لپک کر اس کے پاس پہنچ گئی۔ میں نے سرخ پوش کی تلاش لی۔ اس کے پاس سے ایک خنجر کے سوا اور کچھ نہیں ملا۔ مجھے سیل فون کی تلاش تھی اور وہ اس زندہ سرخ پوش کے علاوہ مردہ سرخ پوشوں کے پاس بھی نہیں تھا۔ بس دو کے پاس سے داک ٹاکی برآمد ہوئے تھے۔

کے دوران میں قسطیانی کو دغا دینے دار خنجر کے کئی چرے لگے تھے۔ ان میں دو چار پینٹ اور کندھوں پر بھی تھے۔ مجھے انہوں ہونے لگا کہ اگر اس نے بلیٹ پروف جیکٹ پہن رکھی ہوتی تو وہ ان زخموں سے بچ جاتی (کل دن کے وقت قسطیانی نے یہ جیکٹ زبردستی مجھے پہنا دی تھی)

میں نے اسپرنگمن پر سے ٹیلی اسکوپ اتاری اور اس سے آنکھ لگا کر ٹیلوں کا دور تک جائزہ لیا۔ بارش اب تھم گئی تھی اور اجالا سا محسوس ہو رہا تھا۔ مجھے اپنے ارد گرد دور دور تک کوئی حرکت نظر نہیں آئی۔

میں نے آٹھ ایم ایم رائفل پکڑی اور باہر نکلنے کا ارادہ کیا۔ قسطیانی پکاری۔ ”نہیں شاہ زائب۔ یہ خطرناک ہو گا۔ ہو سکتا ہے کہ کسی نے آس پاس گات لگا رکھی ہو۔“

”آپ بے فکر ہیں، میں احتیاط کروں گا۔“ میں نے کہا اور باہر نکل آیا۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ خطرناک ترین وقت گزر چکا ہے۔

ٹیلوں کی آڑ لیتا ہوا اور پھونک پھونک کر قدم رکھتا میں آگے بڑھا۔ میری انگلی بے ساختہ رائفل کے ٹریگر پر آگئی تھی اور یہ اچھا ہی تھا۔ میں بیچیں قدم دور آ کر جو بھی مجھے ایک جگہ سرخ لباس کی حرکت نظر آئی، میں نے بلا تامل گولی چلا دی۔ یہ بھی حملہ آوروں میں سے ہی ایک تھا۔ یہ پہلے سے زخمی تھا۔ لڑائی میں زخموں کو مارنے کے بجائے قید کیا جاتا ہے لیکن یہ ایسے زخمی تھے جن کو تلف کر دینا ہی بہتر حل تھا۔ اس شخص کے سینے میں ایک گولی پہلے سے موجود تھی، دو میں نے اتار دی تھیں۔ اب وہ بے جان تھا۔ میں نے اس کا شین بھلل اٹھا کر اپنی کمر میں ڈال لیا۔

کمرے کے دہانے کی طرف سے قسطیانی کی بلند آواز تھی۔ ”شاہ زائب! ادھر دائیں طرف بھی کچھ ہے۔“

میں نے قسطیانی کی بتائی ہوئی سمت میں دھیان سے دیکھا۔ یہاں بھی جھاڑ جھکاڑ کے پیچھے سرخ لباس کی جھلک نظر آئی۔ ”یہ لاش نہیں ہے شاہ زائب! اس میں حرکت ہے۔“ قسطیانی نے مزید اطلاع دی۔

میں نے ایک سنگل فائر اس سرخ لباس سے ڈیڑھ دو فٹ کے فاصلے پر کیا۔ لباس اپنی جگہ پر موجود رہا۔ اس کا مطلب تھا کہ یا تو یہ لاش ہے یا پھر شدید زخمی ہے۔ رائفل سوت کر میں قدم قدم اس کی طرف بڑھا۔ ڈھسکواڈ کا ایک سرخ پوش زخمی ہی تھا مگر اس کے جسم پر کہیں گولی وغیرہ نہیں لگی تھی۔ اس کے منہ اور جسم سے الکحل کے بھیکے اٹھ رہے تھے۔ غالباً لڑائی سے پہلے اس نے اتنی زیادہ پی لی تھی

ہمت اور طاقت سے بڑھ کر کوشش کی تھی اور میری جان بچائی تھی۔ وہ منظر ابھی تک میری نگاہوں کے سامنے تھا، جب وہ ایک خوف آمیز طیش کے عالم میں تھی اور دونوں ہاتھوں میں چاقو پکڑے، اندھا دھند شیطان زادے کو زخمی کر رہی تھی۔ بے شک بعد ازاں میری چلائی ہوئی گولی نے شیطان زادے کا کام تمام کیا تھا، لیکن زیادہ کام تو وہ کچلی تھی۔

بادل ایک بار پھر کچھ کہہ رہے تھے لیکن بادش تھی ہوئی تھی۔ قسطیائی اسکوپ سے ٹیلوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس کے جسم کے مختلف حصوں پر میڈیکل شپ چکی ہوئی تھی۔ کندھے پر آنے والا ایک زخم زیادہ گہرا تھا اور وہاں اسے باقاعدہ ڈریسنگ کرنا پڑی تھی۔

دفعہ تاجور کے چلانے کی آواز نے ہمیں متوجہ کر لیا۔ دارج کے بستر سے چند منٹ دور وہ کھوہ کی دیوار سے لگی کھڑی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ ڈھانپ رکھا تھا۔ دارج بھی شور مچا رہا تھا لیکن اس کی بات پوری طرح سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ چپ لپٹا اپنی ٹانگوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا اور خشک گیا۔ دارج کی مفلوج ٹانگوں پر خا کسٹری رنگ کا ایک نہایت بدناما چھبکلا بیٹھا تھا۔ وہ سائرس کی گرگٹ سے چھوٹا نہیں تھا۔ یقیناً وہ کھوہ ہی کی کسی درز سے نکل آیا تھا۔ دارج اپنی ٹانگوں کو حرکت دینے سے قاصر تھا اس لیے وہ ایلو پچا رہا تھا۔ ”تمنا کیا دیکھ رہی ہو۔“ وہ چلا یا۔

خوف کی پہلی لہر سے پھٹکنے کے بعد تاجور آگے بڑھی۔ اس نے زمین سے چپل اٹھائی اور اس کی ضرب سے پھٹکنے کو دور پھینک دیا۔ وہ جارحانہ انداز میں میری طرف آیا لیکن پھر مڑ کر ایک تاریک درز میں گھس گیا۔

مجھ گئے سے پہلے پھٹکنے نے دارج کے پاؤں پر کاٹا تھا اور وہاں سے خون رس رہا تھا۔ مرے کو مارے شاہ مدار والی بات ہوئی تھی۔ وہ پہلے ہی سر کی تکلیف سے عاجز ہو رہا تھا۔ بہر حال پاؤں کے زخم کی اسے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ اس کا پچھلا دھڑکتا ہوا ہراساں سے عاری تھا۔ خاص طور سے گھٹنوں تک تو اسے کاٹ بھی دیا جاتا تو کچھ پتہ نہ چلتا۔

اپنا خون دیکھ کر وہ ہلکا سا گھبرا گیا اور ہماری پروا کیے بغیر تاجور کو صلوّا تئیں سانے لگا پھر زہریلے لہجے میں بولا۔ ”تب تو ڈر نہیں آتا تھے جب چاقو نے گریا پڑی تھی اس مشنڈے پر۔ تب اتنی ہمت کہاں سے آگئی تھی۔“ تجھ میں؟“ دارج کے لہجے میں جو معنی خیزی تھی، وہ میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔

میں نے قسطیائی سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”ہمیں ایک بات ذہن میں رکھنی چاہیے۔ ہاناوانی والا خطرہ بدستور ہمارے ارد گرد موجود ہے۔ ہاناوانی کے حملے کے حوالے سے یہ کھوہ ہمارے لیے کسی بھی طرح محفوظ نہیں ہے۔“

”تو پھر کیا کرنا چاہیے؟“ قسطیائی نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ میں آگے جاؤں۔ لگ تو یہی رہا ہے کہ یہ ابلیسی ٹولا ختم ہو گیا ہے۔ ان کی گاڑیاں اور دیگر سامان وہیں پر موجود ہے۔ میں کم از کم ایک گاڑی کو یہاں کھوہ کے دہانے کے پاس لے آتا ہوں۔ ہم اس میں بیٹھنے کے بعد کم از کم ہاناوانی سے تو محفوظ ہو جائیں گے۔“

”تمہارا مطلب پرندوں کے متوقع حملے سے ہے؟“ میں نے اٹھات میں جواب دیا۔ وہ گن کے سامنے چوسک بیٹھی تھی۔ ”گاڑیوں بدستور سامنے لگی ہوئی تھیں۔ پُرسوج لہجے میں بولی۔ ”ابھی تو مڑی دیر ٹھہر جاؤ شاہ زائب! ہمیں جلد بازی نہیں کرنی چاہیے۔ ان کی حکارت تو ہم سب دیکھ ہی چکے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی ان گاڑیوں کے پاس گھات لگائے بیٹھا ہو۔“

میں نے کہا۔ ”قسطیائی! اس رسک سے زیادہ رسک پرندوں والا ہے۔“

ہمارے درمیان تو مڑی سی بحث ہوئی پھر اس نے مجھے آدھ کر لیا کہ ہم ابھی ایک آدھ گھنٹہ انتظار کریں۔

کھوہ کی اندرونی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ کتوں کی لاشوں کو تو میں کھوہ سے ہٹا چکا تھا مگر جان ڈیرک کے ان پالتو ”بھیر یوں“ کی لاشیں کھوہ کے اندر ہی تھیں۔ ہمارے پاس کوئی ایسا کپڑا ابھی نہیں تھا کہ انہیں ڈھانپا جاسکے۔ میں نے لاشوں کو ایک جگہ اکٹھا کیا۔ بارش اب ختم ہو چکی تھی۔ کسی کسی وقت سورج بھی اپنی جھلک دکھاتا تھا۔ یہ سچ قریباً نو بجے کا وقت تھا۔ میں نے کھوہ کے باہر سے کچھ جھاڑ جھکاڑ اکٹھا کیا اور ان کنکشنرز کی لاشوں پر ڈال دیا۔... کو تاہ قد بنارس کی پیشانی کے زخم میں انفیکشن ہو چکا تھا۔ وہ غشی کی سی حالت میں تھا اور اس کا جسم بخار میں پھنک رہا تھا۔ میں نے اسے بھی ایک طرف نرم پتھر پر ڈال دیا۔

تاجور مسلسل دارج کے سر ہانے موجود تھی اور وہ ابھی تک پوری طرح نارمل نہیں ہوئی تھی۔ شاید اسے خود بھی اس بات کا یقین نہیں تھا کہ وہ ایک کنکشنرز کا پیٹ بھاد کر اسے جہنم واصل کر چکی ہے۔ اس کے چہرے پر ابھی تک زرد پر چھائیاں رقص کر رہی تھیں۔ میری اور اس کی نگاہ ملی تو میری آنکھوں میں احسان مندی سم آئی۔ اس نے اپنی

نے قسطنطین کو کوتاہ قامت بنارس کی طرف سے ہوشیار رہنے کا کہا۔ کسی وقت مجھے شبہ ہوتا تھا کہ وہ ہم بے ہوشی کی حالت میں ہے لیکن خود کدستور بے ہوش ظاہر کر رہا ہے۔

میں ٹیلوں اور بڑے بڑے پتھروں کے عقب میں بڑی احتیاط سے چلتا ہوا ان تین گاڑیوں کی طرف بڑھا جنہیں شیطان زادوں نے نیلی کا پٹر دالوں کی نظر سے بچانے کے لیے کھنی جھاڑیوں میں چھپا دیا تھا۔ راستے میں مجھے مختلف جگہوں پر حریدین سرخ پوشوں کی لاشیں نظر آئیں۔ انہوں نے ریڈ کیٹ کی موت کے بعد کھوہ پر چوٹی انداز میں شدید حملہ کیا تھا۔ قسمت اچھی تھی کہ ہمارے پاس ایمری تھری تھی اور اسے چلانے کے لیے قسطنطین جیسی ماہر تھی۔ ہمیں رہتھنا ہوا، کہیں ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل چلتا ہوا اور کہیں جبک کر چلتا ہوا، میں بالآخر گاڑیوں کے قریب پہنچ گیا۔

یہاں کے مناظر تکلیف دہ تھے۔ سب سے پہلے میری نگاہ یاسین نیگم کے سر پر ہی پڑی۔ یہ کتا ہوا سر ایک چھوٹے سے پتھر تلے کڑے میں پڑا تھا۔ خون اور گرد و غبار میں اٹا ہوا یاسین نیگم کی آنکھوں میں دہشت آمیز حیرت منجمد نظر آ رہی تھی۔ چند کھیاں اس پر منڈلا رہی تھیں۔ تب میں اس کمرے میں پہنچا جہاں بھول پاشا، ایلسی ٹولے نے گھلے کے ساتھیوں اور ملازموں کا قتل عام کیا تھا۔ یہ سب کچھ تقریباً ویسا ہی تھا جیسے پاشا نے بتایا تھا۔ یہاں پتھروں کا بنا ہوا ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ شاید کسی وقت سیاحوں یا پھر کسی شکاری نے اسے اپنا مسکن بنایا تھا۔ اب اس کمرے میں سات آٹھ لاشیں اوپر تلے پڑی تھیں۔ خون فرش پر جم کر سیاہی مائل ہو چکا تھا اور لاشوں سے بدبو اٹھنا شروع ہو گئی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق ہر لاش پر گولیوں کے اوسطاً چھ سات سوراخ موجود تھے۔ یاس ہی ایک کھوہ نما جگہ بھی تھی۔ یہاں سگریٹ کے بے شمار ٹکڑوں اور شراب کی خالی بوتلوں کے قریب ایک دیہاتی لڑکی پڑی تھی۔ اس کے منہ میں کوئی پکڑا ٹھوس کر اوپر سے اسی کی اوڑھنی باندھ دی گئی تھی۔ لڑکی کے ہاتھ پاؤں بندھے تھے۔ یقیناً یہ وہی راہ گیر لڑکی تھی جسے ان شیطان زادوں نے راستے سے اٹھایا تھا۔ پاشا نے بتایا تھا کہ اس کے ساتھی مردے مندر کا پتا پوچھنے کے بعد اسے جگر گھونپ دیا گیا تھا۔ اب یہ بے چاری لڑکی بھی بے سدھ پڑی تھی۔ یہ مر چکی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی موت دم گھٹنے سے واقع ہوئی تھی۔ کسی کے منہ میں پکڑا ٹھوس دیا جائے اور کسی وجہ سے

وہ ڈھکے چھپے نظروں میں تاجور کو میرے ساتھ پرانے تعلق کا طعنہ دے رہا تھا۔ اسے بتا رہا تھا کہ اس نے اپنی جان صرف اس لیے خطرے میں ڈالی کہ وہ مجھے مرتا یا زخمی ہوتا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اب وہ صرف ایک چھپکے سے ڈر کر دور ہٹ گئی ہے۔

تاجور ہمیشہ کی طرح گم مسم کھڑی تھی۔ پھر وہ میڈیکل باکس کی طرف بڑھی اور وہاں سے روٹی وغیرہ نکالی تاکہ دارج کے پاؤں کے انگٹھے سے رسنے والا خون روک سکے۔ وہ قریب آئی تو دارج پھنکارا۔ ”رہنے دو یہ چوچلے..... بہنے دو خون۔ دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔“ اس کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے وہ تاجور کے سینے پر ٹانگ مار کر اسے دور پیچک دینا چاہتا ہو مگر ٹانگ مارنے کے قابل وہ کہاں تھا۔ اس نے بڑے حاکمانہ انداز میں مجھے اپنے قریب بلایا اور ایک بار پھر باہر کی صورت حال کے بارے میں دریافت کرنے لگا۔ وہ جلد سے جلد اس کھوہ سے نکل جانا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اپنی والدہ کے بارے میں بھی حقیقت جاننے کا خواہاں تھا۔

میں نے اس سے کہا۔ ”میں دس پندرہ منٹ تک باہر جا رہا ہوں۔ آنے کے بعد ہی تمہیں حتی طور پر کچھ بتا سکوں گا۔“

اس کے چہرے سے لگتا تھا کہ اس نے خود کو بھئی طور پر کسی بھی جبری خبر کے لیے تیار کر لیا ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو اپنے بزرگوں کی جدائی کا غیر معمولی صدمہ محسوس کرتے ہیں۔ ہاں اس کی آنکھوں میں فکر ضرور لہر رہا تھا۔ وہ مجھ سے یہ بھی جانتا چاہ رہا تھا کہ باہر موجود سارے سرخ پوش مارے گئے ہیں یا ابھی کوئی باقی ہے۔

میں نے کہا۔ ”دارج صاحب! میں کوئی غیب دان نہیں ہوں، نہ ہی کوئی ”جادو“ وغیرہ جانتا ہوں۔ ویسے بھی تم ”ان چیزوں“ کو مانتے ہی کب ہو۔ میں باہر جاؤں گا تو حقیقت کا پتا چلے گا۔“

وہ سمجھ گیا کہ میرا اشارہ خونی طوطوں اور چمکا دڑوں کی طرف ہے۔ بہر حال وہ اس سلسلے میں کچھ بولنا نہیں۔ جو کچھ پرسوں رات اس نے دیکھا تھا، اس کے بعد وہ کچھ بولنے کے قابل ہی نہیں تھا۔

تقریباً دس منٹ بعد میں باہر نکلنے کے لیے تیار تھا۔ بلٹ پروف جیکٹ ابھی تک میرے ہی جسم پر تھی۔ رائفل کے علاوہ ایک دندنا دار ہتھیار بھی میں نے بلٹ میں آؤس لیا۔ بارش بدستور تھی ہوئی تھی مگر بادل رگ رہے تھے۔ میں

اس کی ناک سے بھی اس کی سانس کو روانی نہ ملے تو اس کی موت یقینی ہو جاتی ہے۔

بد نصیب لڑکی کے جسم پر اس کی اوز صحنی ڈالتا ہوا میں آگے بڑھ گیا۔ ارد گرد کوئی شخص دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میرا یہ خیال درست نکلا تھا کہ اس شیطانی ٹولے کے پاس فقط چار ہی ڈیز ہاؤنڈز تھے جو کھوکھے اندر مارے جا چکے تھے۔

مختصر سے کمرے میں لاشوں کا جوڑ چڑا تھا، وہاں سے مجھے دو پتول ملے ان پر بھی خون کے چھینٹے موجود تھے۔ ان میں سے ایک پتول پاشا کا تھا اور اس پر ایک اسٹیکر لگا ہوا تھا۔ میں نے اسی اسٹیکر کی وجہ سے اسے پہچانا۔ مجھے اسلحے کے بجائے تیل فونز کی تلاش ہی اور وہ مجھے کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ ٹھوڑی سی تلاش کے بعد یہ سارے تیل فونز مجھے ایک شاہر میں مل گئے جو ڈبل کین گاڑی کے اندر رکھا تھا۔ آٹھ اسکوڈ والوں نے یہ سارے فون، کھیل کے ساتھیوں سے لے کر آف کر دیے تھے اور اس گاڑی میں رکھ دیے تھے۔ ان کے اپنے پاس جدید قسم کی واک ٹائیز اور ہیڈ فونز تھے۔

میں نے ڈبل کین کی چابی ایک نشست پر پڑی دیکھ لی۔ میں نے گاڑی کو اسٹارٹ کیا اور وہ ہوئی۔ جو ٹھوڑا بہت اسلحہ مجھے نظر آیا، وہ بھی میں نے گاڑی میں رکھ لیا۔ اس کے علاوہ کچھ کھانے پینے کی اشیا تھیں۔ یہ جگہ چھوڑنے سے پہلے میری نگاہ ایک بار پھر یا سکین بیگم کے کئے ہوئے سر اور اس کی باقیات پر پڑی۔ بھوکے ڈیز ہاؤنڈز نے بیگم کے جسم کے ٹکڑے کر ڈالے تھے۔ بارش اب بھی ہوئی تھی مین ممکن تھا کہ کچھ دیر میں چیل کو بے یہاں آن موجود ہوتے اور ان باقیات کو نوچنے کھوٹنے لگتے۔ میں گاڑی سے باہر نکلا۔ لوہے کے ایک راڈ کی مدد سے ان باقیات کو اس گڑھے میں پھینکا جہاں کتا ہوا سر پہلے سے موجود تھا۔ پھر بہت سے کنکر اور پتھر وغیرہ اس گڑھے میں بھر دیے۔ دوبارہ گاڑی میں سوار ہونے کے بعد میں نے اسے اس کھوکھے طرف بڑھا دیا جہاں قسطنیہ، تاجور اور دارج وغیرہ میرا انتظار کر رہے تھے۔ گاڑی جھپکولے کھاتی آہستہ آہستہ کھوکھے کی طرف بڑھنے لگی۔ میں ارد گرد سے پوری طرح ہوشیار تھا۔ ان کے علاوہ میری نگاہ بار بار آسمان کی طرف بھی اٹھ جاتی تھی۔ آسمان پر بھی۔۔۔ فی الحال کوئی خطرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ تاہم میں جانتا تھا کہ ہانا وانی زیادہ دیر خاموش نہیں رہے گی۔

میں کھوکھے سے پندرہ میں میٹر کی دوری پر پہنچ گیا۔ گاڑی اس سے آگے نہیں جا سکتی تھی۔ قسطنیہ بالکل الرٹ

پوزیشن میں کین کے سامنے بیٹھی تھی۔ مجھے گاڑی سے اترتے دیکھ کر اس کے چہرے پر اطمینان کے آثار نظر آئے۔ میں نے کہا۔ ”سب ٹھیک ہے قسطنیہ! اب ہم کچھ ریلیکس ہو سکتے ہیں۔“

”تیل فون ملا؟“ اس نے پوچھا۔
”ایک نہیں..... آٹھ دس ملے۔“ میں نے شاہر اس کی طرف بڑھایا۔

وہ ایک ایک کر کے انہیں آن کرنے لگی۔ کم از کم چار ایسے تھے جن میں چار جنگ موجودگی اور وہ آن ہو گئے۔ ”کیا صورت حال ہے وہاں کی؟“ قسطنیہ نے سرگوشی کے لہجے میں پوچھا۔

”پاشا ٹھیک کہتا تھا۔ یا سکین بیگم سمیت سب ختم ہو چکے ہیں۔ وہ لڑی بھی جیسے یہ پکڑ کر لائے تھے۔“

قسطنیہ نے ہونٹ سکیڑے۔ اسی دوران میں دارج کی گرج سائی دی۔ ”کیا خبر لائے ہو وہاں سے، ادھر آؤ..... بتاؤ مجھے۔“

میں نے اس کے پاس پہنچے ہوئے کہا۔ ”اچھی خبر نہیں ہے۔ بیگم صاحبہ..... فوج نہیں نکلیں..... انہوں نے کسی کو بھی نہیں چھوڑا۔ سب کو مار دیا ہے۔“
دارج کی آنکھوں میں سرخی دکھائی دینے لگی۔ وہ کچھ دیر چپ رہا پھر پوچھا کہ۔ ”کس نے جان لی ہے ان کی..... کون ڈنٹے دار ہے؟“

میں نے کہا۔ ”اگر تم سچ پوچھتے ہو دارج! تو اس کا ڈنٹے دار تمہارا اکزن کھیل ہی ہے۔ اسی نے ان خطرناک ترین ٹیکنکسروں سے گلے جوڑ کیا..... اور اس بات کو بھلا دیا کہ یہ ٹیسٹ ٹیوب شیطان اپنی ذات کے سوا کسی کے وفادار نہیں۔ تمہاری والدہ نے بھی غلطی کی۔ تمہارے سامنے میں نے انہیں کئی دفعہ کہا کہ وہ وہاں جانے کا ریسک نہ لیں اور اگر.....“

”بکواس بند کرو۔“ وہ میری بات کاٹ کر دھاڑا۔
”اس فساد کی اصل جڑ تو تم ہی ہو۔ تم خود کو میری ماں کی موت کی ذمہ داری سے علیحدہ نہیں کر سکتے..... نہیں کر سکتے۔“
اس نے فرسٹریشن کے عالم میں شیش کی ایک بوتل مجھ پر پھینکی جو میرے کندھے کے اوپر سے ہوتی ہوئی نیم بے ہوش بنارس کی کھوپڑی سے ٹکرائی اور نوٹ گئی۔ بنارس نے بڑی طرح گریہا شروع کر دیا تھا۔

اسی دوران میں آن ہونے والے فونز میں سے دو پر ایک ساتھ کال کے سنکٹ آنے لگے۔ میں لپک کر قسطنیہ کے

ساتھ یہاں جو کچھ ہوا ہے اسی شخص کی وجہ سے ہوا ہے۔
 ”کون ہے یہ؟“ بھائو نے پوچھا۔
 ”بنارس..... کیل داراب سے وفادار یاں بنھارہا ہے۔“

بھائو کو میری بات پر یقین نہیں آیا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید مجھے کوئی بڑی غلط فہمی ہوئی ہے لیکن جب میں نے کچھ تفصیل بتائی تو وہ ششدر رہ گیا۔ اسے یقین نہیں آیا۔ اس کا خیال تھا کہ انیق اور بھارہ کے بعد بنارس اس کے وفادار ترین ساتھیوں میں سے ہے۔

میں نے کہا۔ ”بھائو! آپ سے بڑھ کر کون جانتا ہوگا کہ پیسے میں بہت زیادہ طاقت ہوتی ہے..... اور اللہ کے فضل سے کلیل داراب کے پاس یہ طاقت بے شمار ہے۔“

میں نے مختصر لفظوں میں بھائو کو بتایا کہ کس طرح ہم نے بنارس کو اپنی مدد کے لیے فون کیا اور کس طرح وہ ٹیکساری گریک کے چوٹی قاتلوں کو لے کر ہمارے پاس پہنچ گیا۔ میں نے بھائو کو بتایا کہ ہم اس وقت کہاں اور کس حال میں ہیں۔

وہ بولا۔ ”میری اطلاع کے مطابق تو تمہاری تلاش کے لیے پولیس نے سارا زور برساتی تا لے کے شرق والے ایریا کی طرف لگا رکھا ہے۔“

”پولیس کو اس غلط فہمی میں بھی ٹیکساری والوں نے ہی ڈالا تھا۔ انہوں نے کلیل کے قریبی ساتھی پاشا کو گمن پوائنٹ پر رکھ کر اس سے کلیل کو فون کرایا تھا۔ پاشا اب ختم ہو چکا ہے۔ کلیل کے باقی سارے ساتھی بھی ٹیکساری ڈبچہ اسکاؤڈ نے مار ڈالے ہیں۔“

بھائو نے یہ سب کچھ حیرت کے عالم میں سنا۔ میں نے اسے اپنی موجودہ لوکیشن کے بارے میں کچھ نشانیاں بتائیں۔ بھائو نے کہا۔ ”اس علاقے کا ایک پرانا رہائشی میرے ساتھ ہے۔ اکثر شکار کھینے کے لیے سیکر کے علاقے میں جاتا رہتا ہے۔ ہم اسے ساتھ لے لیتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ہم ڈیڑھ دو گھنٹے میں تم تک پہنچ جائیں گے۔“

”بھائو! مجھے بس یہی کا پڑی کہ طرف سے ڈر ہے۔ موسم اب ٹھیک ہے۔ اگر یہی کا پڑنے علاقے پر دوبارہ پرواز شروع کر دی تو کلیل کے لوگ آپ سے پہلے ہم تک پہنچ سکتے ہیں۔“

”مگر شاہ زیب! تم اپنے طور پر وہاں سے نکلنے کی کوشش نہ کرنا۔ یہاں چپے چپے پر تمہاری تلاش ہو رہی

پاس پہنچا۔ آن ہونے والا ایک فون پاشا کا تھا اور اس پر جو کال آ رہی تھی وہ کسی اور کی نہیں علاقے کے طاقتور ترین سیاست دان کلیل داراب کی تھی۔ چنانچہ اس نے وہ اب تک کتنی دفعہ ان نمبر پر کال کر چکا تھا۔

”کیا خیال ہے، بات کرنی ہے؟“ قسطنطین نے میری طرف دیکھا۔

کچھ دیر سوچ کر میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”بہتر ہے کہ ہم ان فونز کو ابھی بند ہی رکھیں۔ یہ لوگ لوکیشن ٹریس کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ صرف ایک فون آن رکھتے ہیں اور داؤد بھائو کو پکڑ لیتے ہیں۔“

ہم نے آن ہونے والے فون پھر سے آف کر دیے۔ میں نے ایک فون پر داؤد بھائو کا خاص نمبر پریس کیا۔ ابھی آدھی میل ہی گئی تھی کہ کال ریسپونڈ ہو گئی۔ ”کون؟“ داؤد بھائو کی پاٹ دار آواز میرے کان میں گونجی۔

میں نے کہا۔ ”اگر آپ کے ارد گرد کوئی اور نہیں ہے تو آپ... مجھ سے بات کریں، میں شاہ زیب بول رہا ہوں۔“

دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ اس کا مطلب تھا کہ بھائو کے آس پاس کوئی موجود ہے۔ قدموں کی آہٹ ابھری۔ پھر دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔ تب بھائو کی بیانی آواز سنائی دی۔ ”شاہ زیب..... شاہ زیب، کہاں چلے گئے تھے تم؟ پورا پنجاب کنگال مارا ہے ہم نے۔ یہ کس نمبر سے بات کر رہے ہو؟ کہاں ہو تم؟“

”کہیں آپ کا نمبر چیک پر نہ ہو؟“
 ”نہیں..... یہ عام نمبر نہیں ہے۔ بے فکر ہو اور جلدی بناؤ تم خیریت سے تو ہو؟“

”آپ کہہ سکتے ہیں کہ خیریت سے ہوں، لیکن یہ خیریت زیادہ دیر تک نظر نہیں آتی۔ وہ ہانڈانی ہمارے ارد گرد منڈلا رہی ہے۔ آپ کو جلد از جلد ہم تک پہنچنا ہوگا۔“
 ”لیکن اس وقت کہاں ہو تم؟“

”پہلے آپ بتائیں آپ کہاں ہیں اور ایک بار پھر کنفرم کریں کہ آپ اکیلے ہیں۔“

”میں آج ہی کلر بھار سے چکوال آیا ہوں۔ یہاں ایک ہوٹل میں ہوں اور تم بار بار میرے اکیلے ہونے پر زور کیوں دے رہے ہو؟“

”آپ کے قریبی ساتھیوں میں ایک دو کالی بھیڑیں ضرور موجود ہیں۔ ان میں سے چھوٹے قد کی ایک بھیڑ اس وقت زخمی حالت میں میرے سامنے پڑی ہے۔ ہمارے

ہے۔ تم جہاں ہو وہاں زیادہ محفوظ ہو۔ ویسے بھی جب تک وہ حرامی دارج تمہارے قبضے میں ہے کھیل کے لوگ کوئی غلط قدم نہیں اٹھائیں گے۔ ہم بس دس پندرہ منٹ میں یہاں سے نکل رہے ہیں۔“

تھوڑی سی مزید دسکشن کے بعد میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔ میں نے داؤد بھاء کو بتا دیا تھا کہ میں فون آف کر رہا ہوں۔ شیک ایک گھنٹے بعد دوبارہ آن کرنا (جیسا کہ میں نے بتایا ہے مجھے اندیشہ تھا کہ ”آن فون“ کی وجہ سے کہیں ہماری لوکیشن ٹریس نہ کی جائے)

وہ ایک گھنٹا کا ٹکڑا خاصا دشوار تھا میری اور قسطنطین کی نگاہ بار بار آسان کی طرف اٹھ جاتی تھی۔ ہمارے لیے جو درد شدید خطرے سے ان کا تعلق نفا سے ہی تھا۔ پہلا خطرہ بلی کا پڑنا اور دوسرا ہاناوانی کے پھٹنا ٹکڑے پر بندوں کا۔

جیسے جیسے یہ ایک گھنٹا طے ہوا میں نے فون آن کر کے داؤد بھاء کے خاص نمبر پر رابطہ کیا۔ داؤد بھاء نے فوراً ہی کال ریسیو کی۔ اس نے کہا۔ ”شاہ زیب! آگے جانے کے سارے راستے بند ہیں۔ بہت سخت سکیورٹی ہے۔ تھوڑا سا تاخیر لگ جائے گا لیکن تم پریشان نہیں ہونا۔ شام ہونے تک میں کوئی نہ کوئی حل ڈھونڈ لوں گا۔“

میں نے کہا۔ ”بھاء! اگر زیادہ مشکل ہے تو پھر زیادہ ریسک نہ لیں۔ ہم یہاں سے نکل پڑتے ہیں۔ ہماری ٹیم دارج کے سر پر ہوگی تو کوئی ہمیں جک نہیں کرے گا پھر دیکھ لیں گے جو بھی ہوگا۔“

”لیکن ایسی صورت میں یہ لوگ تمہارا اور قسطنطین کا چھٹا نہیں چھوڑیں گے۔ گھبرا ڈال کر بیٹھ جائیں گے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ باسٹرڈ کھیل دار اب اپنے اس کزن دارج کی بھی پروا نہ کرے۔ ان سیاسی خاندانوں کے اندر اپنی دشمنیاں بھی تو چل رہی ہوتی ہیں۔ سکے بیٹے اپنے باپ کی لاش پر پاؤں رکھ کر خود کو اونچا کرنے کا سوچ رہے ہوتے ہیں۔“

”آپ کے خیال میں کتنا انتظار کرنا ہوگا ہمیں؟“

”یقیناً سے کچھ نہیں کہہ سکتا مگر میں بھی جانتا ہوں کہ اس وقت ایک ایک ہلی جیتی ہے، پھر وہ ذرا توقف سے بولا۔ ”عین ممکن ہے کہ میرے جو بندے تمہاری طرف آئیں، وہ پولیس کی گاڑی میں ہوں اور وردی بھی پولیس ہی کی ہو۔“

داؤد بھاء کو کافی جلدی میں محسوس ہوتا تھا۔ مجھے تھوڑی سی مزید تسلی دے کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

جب سے یہ ہاناوانی والی آفت سامنے آئی تھی، میرے اندر ایک عجیب بے چینی سی پیدا ہو گئی تھی۔ اگر میں یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ قریبی ساتھیوں پر بھی اعتماد کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ کیا پتا، کون کس وقت ہاناوانی کے ہتھے چڑھ جاتا۔ داؤد بھاء کسی معمولی شخص کا نام نہیں تھا اور نہ ہی اس پر ہاتھ ڈالنا کوئی آسان کام تھا لیکن ہمارے ارد گرد اتنی انہوئیاں ہو رہی تھیں کہ کچھ بھی یقیناً اڑتا قیاس نہیں تھا۔ میں ڈیٹا سین میں جو سامان اپنے ساتھ لایا تھا اس میں چند ٹن پیک جوس اور سکنس کے دو تین پیکٹ بھی تھے۔ یہ چیزیں ہمارے بالکل خالی معدوں کے لیے نا کافی تھیں۔ پھر بھی ان سے ہمیں کچھ سہارا ملا۔

دارج مسلسل تکلیف میں تھا۔ اب تو اس کی تیارواری کے لیے مسجد کو کھر بھی اس کے ارد گرد موجود نہیں تھا۔ دارج کا سارا غصہ اب تاجور پر ہی نکل رہا تھا۔ تاجور کے اپنے کندھے پر بھی شیک ٹھاک چوٹ آئی تھی۔ اس کے باوجود وہ اس کی دیکھ بھال میں لگی ہوئی تھی۔

وہ کروٹ بدلتا چاہ رہا تھا۔ تاجور اکیلی تو یہ کام نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے بے بسی سے میری طرف دیکھا۔ قسطنطین نے کمن کے سامنے پوزیشن لی ہوئی تھی اور وہاں سے اٹھنا نہیں چاہتی تھی۔ مجھے ہی تاجور کی مدد کے لیے جانا پڑا۔ میں نے دارج کے تاثرات دیکھے۔ اس سے پہلے اسے گوارا نہیں تھا کہ میں اس کے جسم کو ہاتھ لگاؤں لیکن اب تکلیف اس کے لیے ناقابل برداشت ہو رہی تھی۔ سچ کہتے ہیں کہ جب جان پر جتنی ہے تو آدھ دھرے رہ جاتے ہیں۔

”اجازت ہے؟“ میں نے دارج کے جسم کو ہاتھ لگانے سے پہلے پوچھا۔

وہ بس کراہ کر رہ گیا۔ میں نے اور تاجور نے اس کی کروٹ بدلنے کی کوشش کی تو اس کی تکلیف اور بڑھ گئی۔ وہ بلند آواز میں ہائے ہائے کرنے لگا۔ ”نہیں رہنے دو۔“ وہ پکارا۔

ہم نے اسے چھوڑ دیا۔ اس نے خونی نظروں سے مجھے دیکھا، جیسے اس کی ساری تکلیفوں کا ذمہ دار صرف اور صرف میں ہی ہوں۔

”کروٹ نہ بدلیں، ذرا ٹیک لگا کر بیٹھ جائیں۔“ تاجور نے کہا۔

میں نے ٹھیک باریک دیکھا کہ تاجور نے کوئی بات کی اور جواب میں اسے جھانپ نہیں سنا پڑی۔ اس نے مکروہ سا چہرہ بنایا اور بس اشارات میں سر ہلا دیا۔

انکاوے

لیکن شوہر کو بھی تو شوہر ہونا چاہیے ناں۔ یہ شخص تو ایک غصیلیا جانور ہے۔ یقین کرو میرے اختیار میں ہو تو ابھی پتھر پکڑوں اور اس کی چوٹیوں سے اس کا منہ توڑ دوں۔“

”پلیز آہستہ بولیں۔ اس نے سن لیا تو اپنی حالت کی پردا کیے بغیر بھڑکانا اور پھدکانا شروع کر دے گا۔“

نیلی کا پٹر کی آواز قریب آ رہی تھی۔ ابھی تک یہی گنگ رہا تھا کہ وہ اس کھوہ کے اوپر سے گزرے گا لیکن پھر اس نے اپنا رخ تبدیل کیا اور ایک دائرہ سا بننا تا ہوا شامل کی طرف چلا گیا۔ ہمارے متے ہوئے رگ پٹوں نے قدرے سکون محسوس کیا۔

میں نے ایک بار پھر موبائل آن کر لیا۔ ابھی میں ہماؤ کو فون کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ کال کا میوزک ابھرا۔ میں نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف داؤد ہماؤ کا ایک اہم کارندہ وارث لودھی بول رہا تھا۔ یہ بھی گینگ کے خطرناک ترین شوئرز میں سے ایک تھا۔ میں نے اس کی آواز پہچان لی، وہ یولا۔ ”السلام علیکم۔ ہم آپ کے قریب پہنچ گئے ہیں جی۔ تالا پار کر لیا ہے۔ وہ دو پہاڑیاں بھی نظر آئیں ہیں جن کا آپ نے بتایا تھا۔“

”ہماؤ کہاں ہیں؟“ میں نے پوچھا۔
”وہ ساتھ نہیں ہیں مگر سارا آرہیں ان کی گمرانی میں ہو رہا ہے۔ آپ بے فکر رہیں۔ ہم پولیس کی نوٹیوٹا جپ میں آ رہے ہیں۔ شاید ابھی دو چار منٹ میں آپ کو یہ نیلی جپ نظر آ جائے گی۔ آپ بالکل تیار رہیں۔ ہم فوراً یہاں سے نکلیں گے۔“

مختصر گفتگو کے بعد میں نے فون بند کیا اور اسپر گن کی ٹیلی اسکوپ سے آنکھ لگائی۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد دور نشیب میں رنگینی ہوئی نیلی جیب نظر آئی۔ جیت پر ابر چمکی لائٹ بھی دکھائی دے رہی تھی۔

”وہ آ رہے ہیں۔“ میں نے کہا۔
”کہیں پھر کوئی ڈان نہ ہو جائے۔“ قسطنیٰ نے خدشہ ظاہر کیا۔

”نہیں، اس مرتبہ دھوکا نہیں کھا میں گے۔“
میں نے ہماؤ کا تہہ ہار لیا۔ اس نے بھی تصدیق کی کہ وارث لودھی ایک ایس ایس پی کو گاڑی سمیت اغوا کر چکا ہے اور ایک گاڑی کے ساتھ ہمارے پاس پہنچ رہا ہے۔
ایس ایس پی کا اغوا کوئی معمولی اطلاع نہیں تھی۔ تاہم ہماؤ جیسے منکشف کے لیے یہ کوئی بہت دشوار کام بھی نہیں تھا۔ میں نے قسطنیٰ سے کہا۔ ”آپ اپنی گن کے سامنے

تاجور نے اس کے سر کے نیچے سے کٹن نکال کر کھوہ کی دیوار سے لٹایا پھر ہم دونوں اس کے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے اور اسے اوپر کی طرف کھینکے میں اس کی مدد کی۔ ہم دونوں کے سر آپس میں جڑ گئے۔ تاجور کے خدو خال اتنے قریب تھے کہ میں انہیں دیکھے بغیر نہ رہ سکا۔
ہاں..... یہی آنکھیں، یہی رخسار اور یہی ہونٹ بھی کتنا قریب تھے مجھ سے۔ اس کی سانس کی جانی پچھانی مہک دو سینکڑ کے لیے میرے منتھنوں سے نکل رہی اور مجھ پر کئی حسین یادوں کے در سے وا کر گئی۔

تاجور جیسے گڑا کردار ج کے سر کے نیچے کٹن درست کرنے لگی۔ قیمت تھی کہ اس موقع پر داراج کی آنکھیں بند تھیں، ورنہ وہ میری اس لمائی کیفیت کو دیکھ کر شاید خود پر ضبط نہ رکھ سکتا اور منہ سے انکارے نکالنا شروع کر دیتا۔

اچانک یہی کا پٹر کی مدم پھڑ پھڑا ہٹ نے ہمارے اندیشے پھر جان کر دیے۔ یہ پھڑ پھڑا ہٹ کافی فاصلے سے ابھری تھی مگر قریب آتی جا رہی تھی۔ میں فوراً قسطنیٰ کے پاس پہنچا اور ٹیلی اسکوپ سے آنکھ لگائی۔ سورج بادلوں کے پیچھے تھا۔ تاہم اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ مغرب کی طرف جھکا ہوا ہے۔ غالباً تاریکی پھیلنے سے پہلے یہی کا پٹر والے ایک آخری کوشش کرنا چاہتے تھے۔ میں نے کہا۔ ”قسطنیٰ! رخ ہماری طرف ہی ہے۔“

”اگر دیکھے گئے تو پھر؟“ قسطنیٰ نے پوچھا۔
”پھر بھی فوری طور پر تو کچھ نہیں ہوگا۔ یہاں کوئی ایسی جگہ تو نظر نہیں آتی جہاں یہ چا پر لینڈ کر سکے..... لیکن اگر ایسا ہی ہو گیا تو پھر ہمیں داراج کا سہارا لینا پڑے گا۔“ میں نے متقی خیر لہجے میں کہا۔

”تمہارا مطلب ہے کہ داراج کے سر پر رائل رکھنا پڑے گی؟“

”شاید ایسا ہی کرنا پڑے۔“ میں نے کہا۔
قسطنیٰ نے میری طرف دیکھا اور متقی خیر لہجے میں بولی۔ ”اگر ایسا ہوا تو مجھے یقین ہے کہ تاجور تم سے ناراض نہیں ہوگی بلکہ ہو سکتا ہے کہ وہ دل میں تھوڑی بہت خوشی بھی محسوس کرے۔“

”نہیں قسطنیٰ! آپ قطعاً اندازہ لگا رہی ہیں۔ ہمارے خط کی عورتیں شوہر سے وفاداری میں دوسروں سے ہمیشہ دو ہاتھ آگے رہی ہیں اور جاننے والے اس خوبی کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔“
”تم اس کو خوبی کہہ رہے ہو تو بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو

بالکل چوکس رہیں۔ جب تک پوری طرح تسلی نہ ہو جائے آپ وارث لودھی اور اس کے ساتھی کو نشانے پر رکھیں۔“

”اوکے“ اس نے جیسی سے اثبات میں سر ہلایا۔

خوراک کی کمی اور شدید ٹھکن کے باوجود وہ بالکل چوکس تھی۔ یقیناً یہ اس کی سخت فوجی ٹریننگ کے باعث تھا۔

ہم سے قریباً سو میٹر کے فاصلے پر پہنچ کر پولیس کی جیب رک گئی۔ یقیناً وہ لوگ ہماری پیمائش ہوئی جیب اور بائیں طرف کھڑی ڈبل کینن کو دیکھ چکے تھے۔ وہ تذبذب میں تھے کہ کس طرف جائیں۔ میں کھوہ سے باہر نکلا اور ایک کپڑا لہرا کر جیب سواروں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ فوراً ایک شخص جیب سے باہر آیا اور اس نے بھی میری طرف دیکھ کر دونوں ہاتھ لہرائے۔ میں نے ڈبل ڈول سے پہچان لیا۔ یہ وارث لودھی ہی تھا۔ اس نے سفید دھاریوں والی سیاہ شرٹ اور خاک کی چٹلون پہن کر رکھی تھی۔ تھوڑی سی لنگی ہوئی تو ندر اور نیم گنجا سر اس کی اہم نشانیات تھیں۔

جیب ایک بار پھر آگے بڑھی اور ہچکولے کھاتی، ڈنگماتی، ڈبل کینن کے پاس پہنچ کر رک گئی۔ ڈرائیونگ نشست پر ایک باوردی پولیس والا موجود تھا۔ وہ باہر نکلا تو یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ وہی ایس ایس پی تھا۔ یعنی وہ اپنی سرکاری جیب خود ڈرائیونگ کے یہاں تک لایا تھا۔ ایک تیسرا شخص اس بڑے ساتھی کی جیب کے پچھلے دروازے سے باہر نکلا۔ شلوار قمیص والا یہ دیکھتا تھا کہ یقیناً وہی مقامی شکاری تھا جسے بھاؤ نے رہنمائی کے لیے لودھی کے ساتھ بھیجا تھا۔

قسطینا بولی۔ ”اگر ایس ایس پی کو اغوا کیا گیا ہے تو پھر اسے گن پوائنٹ پر ہونا چاہیے تھا مگر یہ تو آزاد کھڑا ہے۔“

”ہاں، یہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔“

”لہٰذا یہاں بھی تو ہاناوانی کا کوئی داؤ نہیں چل گیا۔ میرا مطلب ہے داؤد بھاؤ تھوٹیک ہے ناں۔“ وہ ہلکے پھلکے لہجے میں بولی۔

”میرے خیال میں وہ ٹھیک ہے قسطینا، وہ اتنی آسانی سے کسی کے ہتھے چڑھنے والا شخص نہیں۔“

ایک دفعہ پھر اس سے رابطہ کر کے پوچھو کہ ایس ایس پی واقعی اغوا ہے یا لودھی کی مدد کر رہا ہے؟

میں نے ہاتھ کے اشارے سے لودھی وغیرہ کو کہا کہ وہ ابھی اپنی جگہ پر رکھیں۔ اس دوران میں، میں نے بھاؤ سے رابطہ کر لیا۔ میں نے ایس ایس پی والی سوال بھاؤ سے کیا تو وہ بولا۔ ”میں اس شے میں تو نہیں پڑ گئے کہ ہم پر بھی

ہاناوانی کا جادو چل گیا ہے؟“

اس نے میرے دل کی بات پکڑی تھی۔ میں نے کہا۔ ”جو کچھ ہمارے آس پاس ہو رہا ہے بھاؤ، اس نے دماغ کا فالو وہ بنا دیا ہے۔ ہر جگہ، ہر سین فریب دکھائی دیتا ہے۔“

”لیکن یہاں سب ٹھیک ٹھاک ہے شاہ زیب۔“

بھاؤ نے مستحکم لہجے میں کہا۔ ”پھر ذرا توقف سے بولا۔“

”دوسری بات تم نے یہ پوچھی ہے کہ ایس ایس پی اغوا ہوا یا تعاون کر رہا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ تعاون کر رہا ہے لیکن یہ تعاون بے وجہ نہیں ہے۔ ایس ایس پی کا پینا اس وقت میرے پاس ہے۔ میرے سامنے ہی صوفے پر بیٹھا آسو بہا رہا ہے۔ شاید تمہیں اس کی تھوڑی بہت آواز بھی آ رہی ہو۔“

میں نے غور کیا تو کسی کے فریاد کان آواز میں بولنے اور رونے کی تہم آواز سنا دی۔ کسی وقت یوں بھی لگتا تھا کہ بولنے والا جارحانہ انداز اختیار کر رہا ہے اور دھکا رہا ہے۔ بھاؤ متحی خیز لہجے میں بولا۔ ”مجھے بہنوں کا اگلو تا بھائی ہے اور سب سے آخر میں پیدا ہوا ہے۔ اندازہ لگا لو کتنا لاڈلا ہوگا۔ کان جا رہا تھا مگر ہم مہمان نوازی کے لیے پکڑ کر یہاں لے آئے ہیں۔ کچھ بھی نہیں کہیں گے اسے۔ جب تم لوگ محفوظ ٹھکانے پر پہنچ جاؤ گے تو یہ بھی صحیح سلامت اپنے گھر پہنچ جائے گا۔ کسی کو کانوں کا خبر نہیں ہوگی، کیا سمجھو؟“

میں سنانے میں رہ گیا۔ بھاؤ نے ہمیں یہاں سے بہ حفاظت نکالنے کے لیے ایک بڑا قدم اٹھایا تھا۔ ایسا قدم بھاؤ جیسا شخص ہی اٹھا سکتا تھا۔ ایسا شخص جس نے انتظامیہ کے اندر اپنی انتظامیہ بنا رکھی تھی۔ وہ تیس سال سے اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھر رہا تھا اور جو شخص اپنی جان ہتھیلی پر رکھتا ہے اس کو دوسروں کی جان پر اختیار حاصل ہونے لگتا ہے۔

سب کچھ اسی طرح ہوا جس طرح داؤد بھاؤ نے کہا تھا۔ یہ لوگ ایک اسٹریچر بھی ساتھ لے کر آئے تھے۔ اس اسٹریچر کے ذریعے پہلے دارج داراب کو اور پھر بنارس کو جیب کی عقبی نشستوں پر لٹایا گیا۔ شیطان زادے کو ہم نے بری طرح رسیوں میں جکڑ رکھا تھا۔ میں نے اسے کسی کھڑکی کی طرح اٹھا کر جیب کے عقبی خلا میں پیسٹک دیا۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونسا گیا تھا۔ پھر بھی وہ گالیاں بکتے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ وہ جب بھی تاجور کی طرف دیکھتا تھا اس کی آنکھوں میں ایک کمرہ چمک نظر آتی تھی۔ پھر تاجور، قسطینا اور میں بھی جیب میں سوار ہو گئے۔ سعید اور پاشا کی لاش سمیت باقی لاشوں کو فی الحال وہیں پڑا رہنے دیا گیا۔

لیکن ہمارے درمیان اب تک بس دو چار جلوں کا تبادلہ ہی ہوا تھا۔

فارس جان کے حوالے سے قسطنطین کی فکر مندی ایک فطری چیز تھی۔ اس نے سرگوشی میں مجھ سے کہا کہ میں لودمی سے فارس اور تادان کے بارے میں معلوم کروں۔ میں نے بھی ویسی سرگوشی کا انداز اختیار کر کے یہ سوال لودمی سے پوچھا۔ اس نے کہا۔ ”مجھے اس بارے میں کچھ زیادہ پتا نہیں..... اور نہ ہی شاید بھادو جی کو بے لکین ہی تو ملے ہے کہ وہ دونوں ان ٹیکساری والوں سے بچ نکلے ہیں۔“

”مگر اس وقت چکا ڈوئیں اُن کے پیچھے تھیں۔“

”خدا انھیں اسے ان کو کوئی حادثہ پیش آتا تو اب تک ان کی گاڑی کا سراغ مل چکا ہوتا۔ دو میل کا پٹر علاقے پر کئی دفعہ پرواز کر چکے ہیں۔“

میں کہہ سکتا تھا کہ ہم بھی تو بلی کا پٹر سے بچ رہے ہیں، لیکن خاموشی اختیار کی۔ قسطنطین سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے اسے اپنے اور لودمی کے درمیان ہونے والی گفتگو کا ترجمہ انگلش میں بتایا۔

قریباً ایک گھنٹے بعد ہماری جیب ایک نیم پختہ راستے پر پہنچی گئی۔ یہاں آتے ہی آفیسر تنویر خاں نے لودمی سے مشورہ کیا اور جیب کی ہیڈ لائٹس آن کر دیں۔ اس کے علاوہ اس نے سمجھتے ہوئے پہلی بوٹی ریو لوک لائٹ بھی روشن کر دی۔ روٹھی سے پہلے میری ہدایت پر تاجور نے دارج کو بین کلر کی ٹریل ڈوز دے دی تھی اور اب وہ نشست پر نیم بے ہوش کی سی کیفیت میں پڑا تھا۔ کوتاہ قد بنارس کی بھی کچھ ایسی ہی کیفیت تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ جیب میں سوار کرنے کے بعد میں نے اس کے ہاتھ ایک بار پھر پشت کی طرف باندھ دیے تھے۔ ہم سب کے ذہنوں میں ابھی تک پرنندوں اور چکا ڈوئیں والا ہینٹنک اندیشہ بھی موجود تھا۔ خاص طور پر تاجور ہر اسامی۔ وہ بار بار کھڑکی میں سے اوپر ابراؤد آسان کی طرف دیکھنے لگتی تھی۔

”ادھر کیا دیکھ رہی ہے منہ اٹھا اٹھا کر۔ نیچے دیکھ میری طرف۔“ دارج دانت پیس کرتا جوڑے مخاطب ہوا۔ وہ گڑبڑا کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ جیب کے جھکوں کی وجہ سے دارج کی ایک ٹانگ پچسل کرشت سے نیچے اتر گئی تھی۔ وہ اس قابل نہیں تھا کہ ٹانگ کو دوبارہ نشست پر لاسکے۔ تاجور نے اس کے پاؤں کو سہارا دیا اور ٹانگ کو دوبارہ نشست پر رکھا۔

وہ طیش کے عالم میں منہ ہی منہ میں پتا نہیں کیا

درمیانی عمر کے ایس ایس بی کا چہرہ پریشانیوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ وہ اس ”اُن چاہی کارروائی“ کو جلد از جلد مکمل کرنے کا خواہاں تھا۔ یہاں کے مناظر دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئی تھیں۔

بھادو کو پتا تھا کہ ہم تقریباً 72 گھنٹوں سے بھوکے پیاسے ہیں۔ جیب میں ہاٹ پائس کے اندر سینڈ وچز اور فلاسک میں چائے وغیرہ موجود تھی۔ ایک پاسک میں پھل تھے۔ لودمی نے سرگوشی میں مجھے بتایا۔ ”یہاں یہاں سے موٹروے پر پہنچتا ہے اور پھر سیدھا لاہور..... کہیں رکتا نہیں ہے۔“

”جانا کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”وہیں راوی فارم، جہاں آپ کے باقی ساتھی ہیں۔ بھادو جی نے بتایا ہے کہ آپ کے دوست سجاوِل صاحب کو بھی راوی فارم پہنچا دیا گیا ہے۔“

”ایس ایس بی سمیت راوی فارم کیسے جا میں گئے؟“ میں نے استفسار کیا۔

”اسے راستے میں ہی کہیں مار کر پھینک دیں گے۔“ وہ بولا۔

”کیا مطلب؟“

وہ مسکرایا۔ ”سوری جی، مذاق کر رہا ہوں۔ لاہور میں ہی بندر روڈ پر ایک جگہ مقرر ہے۔ وہاں ہم اس جیب کو اور اس پولیس افسر کو چھوڑ دیں گے اگر آپ نے دارج اور ان کی بیگم کو ہاں چھوڑنا ہوتا تو انہیں بھی چھوڑ دیں۔ ہم ایک دوسری اسٹیشن وین کے ذریعے راوی فارم پہنچیں گے۔ بعد میں پوری سلی ہونے کے بعد مہمان کو رخصت کر دیں گے۔ میرا مطلب ہے کہ ایس ایس بی کے بیٹے کی ”باعزت رہائی“ ہو جائے گی۔“

بھادو نے ایک مکمل پلان بنایا تھا..... اور کافی تیزی سے بنایا تھا۔ اپنی فیلڈ میں بھادو کی ذہانت اور تجربہ کاری ہر شے سے بالاتر تھی۔

کچھ ہی دیر بعد ہماری جیب ڈمگاتی، جھکولے کھاتی کھوہ سے روانہ ہو رہی تھی۔ اب شام کے سائے گہری تاریکی میں بدلنے لگے تھے، تاہم جیب کی ہیڈ لائٹس آن نہیں کی گئی تھیں۔ ڈرائیونگ خود ایس ایس بی کی کر رہا تھا۔ اس کا نام تنویر احمد خاں تھا۔ ٹیک لگا رہی تھی اور عام پولیس افسروں کے برعکس پڑا لکھا اور کچھ دھیمبا نظر آتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں گہری پریشانی مسلسل بھکروے لے رہی تھی۔ وہ مجھے مفروہ کی حیثیت سے اچھی طرح پہچان چکا تھا

بڑبڑانے لگا۔ غالباً اس نے تاجور سے ایک بار پھر اس کے کندھے کی چوٹ کے بارے میں نہیں پوچھا تھا۔ اسے بس اپنی ہی پڑی ہوئی تھی۔ اسے تکلیف دے کر اور تکلیف میں دیکھ کر شاید وہ سکون محسوس کرتا تھا..... اور یہ بھی کہا جاسکتا تھا کہ وہ تکلیف سہہ کر سکون محسوس کرتی ہے۔

وہ واقعہ یقیناً میرے لیے بھی تعجب خیز تھا۔ تاجور بھی لڑائی نے مجھے بھاننے کے لیے چاقو اٹھایا تھا اور اسے کئی مرتبہ کینکسر کے جسم میں گھونپا بھی تھا۔ غالباً یہی واقعہ تھا جس کے بعد سے دارج کا رویہ تاجور سے مزید درشت ہو گیا تھا۔ اسے وہ سب کچھ یقیناً زہر لگا تھا اور وہ اپنی زبان سے اس کا اظہار بھی کر چکا تھا۔

موٹروے پر پہنچے ہی اس سرکاری جیب کی رفتار 120 کلومیٹر کا ہندسہ چھوئے گی۔ ایس ایس پی تویر گا ہے بگا ہے جیب کا ہوٹو بھی آن کر دیتا تھا۔ موٹروے تک پہنچنے سے پہلے ہمیں ٹھہرنا تک راستے میں جگہ جگہ پولیس کے ٹاؤں کے ملے تھے۔ مشکوک گاڑیوں کو روک کر تلاشی بھی لی جا رہی تھی۔ اگر ہم سرکاری جیب میں نہ ہوتے اور پولیس آفیسر خود گاڑی ڈرائیو نہ کر رہا ہوتا تو ہم بھی ایسی طرح سفر نہیں کر سکتے تھے۔ اب موٹروے پر سفر کرتے ہوئے بھی ہمیں ہر طرح تحفظ کا احساس ہو رہا تھا۔ کئی جگہوں پر پولیس اہلکاروں نے ایس ایس پی کو سلیوٹ بھی کیا۔ اب کچھ پتا نہیں تھا کہ اس نے اس ہنگامی سفر کے لیے تویر احمد خاں کو بعد میں کیا جواز پیش کرنا تھا۔ اندازہ یہی تھا کہ اسے مجھے کو ساری حقیقت حال بتانا پڑے گی۔ ظاہر ہے کہ دارج داراب ہمارے ساتھ موجود تھا اور وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اگر وہ زندہ رہتا اور گلتا یہی تھا کہ زندہ رہ گیا تو پھر تویر احمد خاں کا بھید تو کھلتا تھا۔ یقین ممکن تھا کہ وہ ایک لاچار باپ کی حیثیت سے آنسو بہا تا اور ”چنڈ پڈری“ کا حوالہ دے کر اعلیٰ حکام کو رقم کھانے پر آمادہ کر لیتا۔

ہم رات ایک بجے کے لگ بھگ بخیریت لاہور پہنچ گئے۔ تاجور جانتی تھی کہ اب اسے ہم سے جدا ہونا پڑے گا۔ جوں جوں گاڑی بدلنے کا وقت قریب آ رہا تھا میں اس کے شفاف چہرے پر ایک ناقابل فہم کیفیت دیکھ رہا تھا۔ یہ اداسی، تکلیف اور پریشانی کی کوئی ملی جلی حالت تھی۔ آخر گاڑی بندر روڈ پر واقع اس مقررہ مقام پر پہنچ گئی جہاں ایک پرائیویٹ فرم کی ڈیوری وین ہمارے لیے تیار کھڑی تھی۔ اب پتا نہیں کہ یہ ڈیوری وین کی انہیں لیکن ہم نے اسی میں سوار ہو کر راوی قارم پہنچا تھا۔

بلند چار دیواری والے ایک ویران احاطے کے اندر ہم نے اپنا سامان اور اسلحہ وین کے اندر رکھ کر لیا۔ اس کے بعد بتارس کو دین میں پہنچایا گیا۔ آخر میں، میں نے کھڑی بنے شیطان زادے کو اٹھایا اور وین کی دوستیوں کے درمیان ٹھونس دیا۔

قسطینا جیب سے باہر کھڑی تھی اور تاجور سے بات کر رہی تھی۔ دونوں اس طرح کھڑی تھیں کہ جیب کے اندر لیٹا دارج داراب ان کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ میرے ساتھ رہنے کے بعد قسطینا کو اردو کے چند نئے پھوٹے الفاظ آ گئے تھے۔ وہ تاجور کے دونوں ہاتھ تمام کر بولی۔ ”تاجور! تو تم بہت اچھا..... دل کرتا ہاں پھر ملیں..... اگر تم..... اگر تو تم.....“ وہ اٹک کر رہ گئی۔ کچھ مزید کہنا چاہتی تھی لیکن الفاظ نے ساتھ نہیں دیا۔

اس نے پنٹ کی جیب سے ایک چھوٹی سے پرچی نکالی اور تاجور کی منجھ میں تھما دی۔ ”ہیئر ازمائی فون نمبر تو تم پر اس کرو..... اگر ہاں تو تم کو فون کرتا، تو تو میری سیکرٹا، پلیز پر اس..... پلیز.....“

قسطینا کے لیے میں ایسی التجا اور اپنائیت تھی کہ تاجور کواشات میں سر ملاتا ہی نہ تھی۔ ”نوفو..... ٹاٹ ان دس وے..... پر اس، ہینگ یور وینڈر آن مائی ہینڈ پلیز۔“ اس نے تاجور کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سر پر رکھ لیا۔

تاجور چند لمحوں کے لیے شدید ہنگامہ میں نظر آئی پھر اس نے سر ملاتا ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔“ قسطینا نے تاجور کو گلے لگایا لیکن بہت آہستگی سے۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا کندھا زخمی ہے اور قسطینا کو خود بھی چوٹیں لگی ہوئی تھیں۔ تاجور نے میری طرف دیکھا اور جیسے نگاہوں ہی نگاہوں میں خدا حافظ کا پھر وہ تیزی سے مڑی اور جیب میں لیے ہوئے اس شخص کی طرف چلی گئی جو کہنے کو تو اس کا محازی خدا تھا۔ مگر حقیقت میں انسان کے درجے کو بھی نہیں پہنچتا تھا۔ وہ شادی سے پہلے ہزار جان سے تاجور کی دلکشی پر فدا تھا لیکن اب اپنی ہر ناکامی، ہر تکلیف اور دکھ کا ذمہ دار تاجور کو سمجھتا تھا۔

خیلے رنگ کی سرکاری جیب تاجور، دارج اور ایس ایس پی تویر احمد خاں سمیت وہیں کھڑی رہی۔ بجاد ٹینگ کے دوسرے کنارے اس جیب کے پاس موجود رہے۔ ہم بند اسٹیشن وین میں اس ویران احاطے سے نکلے..... کر راوی قارم کی طرف روانہ ہو گئے۔ لومو اور اس کا شکاری ساتھی

احتیاط

لڑکا اور لڑکی پارک کے ایک گوشے میں بیچ پر
دیر سے خاموش بیٹھے ہوئے تھے یا دھرا دھر کی باتیں
کر رہے تھے۔ لڑکے میں کسی پیش دستی کا حوصلہ تھا نہ
ہمت۔

اسی دوران میں کتوں کا ایک جوڑا آوارہ گردی
کرتا ہوا وہاں آگلا۔ کتے نے سوچتے سوچتے کتیا کی
تھوحتی سے منہ لگا یا تو لڑکے کو فوری ایک بھانڈو سجھ گیا۔
اس نے جھپکتے ہوئے لڑکی سے کہا۔ ”تم برائے مانو
تو میں بھی۔۔۔“

لڑکی نے اس کی بات درمیان سے ہی اچک لی
اور بولی۔ ”ہاں، ہاں... ضرور... لیکن احتیاط
سے... کہیں کتیا تمہارا منہ نہ لوچ لے۔“

حسیر اقبال، کراچی

آگئے ہو۔“ وہ پُرجوش لہجے میں بولا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔
میں نے اسے بیٹھے بیٹھے گلے سے لگا یا۔ اُسے جذباتی
مناظر کچھ زیادہ پسند نہیں تھے پھر میری دوس پندرہ سیکنڈ تک
میرے گلے سے لگا رہا۔ تب خود کو جد کرتے ہوئے بولا۔
”اور کون کون ہے تمہارے ساتھ؟“

”فی الحال تو صرف قسطنطین ہے۔ امید ہے، باقی بھی
پہنچ جائیں گے۔“

قسطنطین نے آگے بڑھ کر سجاد کے دونوں ہاتھ
تھامے۔ انگلیں اور اردو کو باہم ملا کر اس کی خیر خیریت
دریافت کی۔

قسطنطین سے ملنے کے بعد سجاد نے ذرا سخت لہجے
میں مجھے مخاطب کیا اور بولا۔ ”تم نے مجھے بالکل ہی اپناج
سمجھ لیا ہے۔ ٹیکساریوں کے ساتھ اتنی بڑی کمر لے کر آ رہے
ہو، مجھے بتایا تک نہیں، چلو، میں تمہارے ساتھ نہیں جاسکتا
تھا لیکن کوئی مشورہ تو دے سکتا تھا۔“

میں نے کہا۔ ”تمہیں کس نے بتایا ہے کہ ہم
ٹیکساریوں سے کمر لے کر آ رہے ہیں؟“

”تمہارے داداؤ بھانڈے۔ اس نے فون پر بتایا ہے
کہ کلر کھارے آگے تمہارے اور ٹیکس والوں کے درمیان
زور کا ٹاکرا ہوا ہے۔ انہوں نے کئی دن سے تمہیں گھبرا ڈالا

بھی ہمارے ساتھ ہی دین میں موجود تھے۔ قسطنطین آخر تک
مڑ مڑ کر اس جیب کو دیکھتی رہی جس میں تاجور موجود تھی۔

☆☆☆

اب ہم راوی فارم میں تھے۔ بارڈر ایریا میں واقع
یہ فارم ہاؤس ہر طرح سے ایک محفوظ پناہ گاہ کی حیثیت رکھتا
تھا۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے باہر سے فارم ہاؤس کی عمارت
جیسی بھی تھی لیکن اندر یہاں آرامش و آرام کی ہر چیز میسر
تھی۔ وسیع رقبے کو ایک چار دیواری سے محفوظ کیا گیا تھا اور
اس چار دیواری میں بھیڑ بکریوں اور بھینسوں کے باڑے
تھے۔ بانس اور پاپلر کے درختوں کے درمیان پھولوں کے
وسیع تختے تھے۔ یہ پھول اور یہ درخت باڑوں اور پولٹری
فارم کی بُو باس کو رہائشی حصے کی طرف آنے سے روکتے
تھے۔ تجربہ کی آخری تاریخوں کی یہ ایک خشک اور خوشگوار
شب تھی۔ رات کے ڈھائی بجتے والے تھے۔ ہم سب سے
پہلے سجاد سے ملنا چاہتے تھے لیکن علم نہیں تھا کہ وہ جاگ رہا
ہے یا نہیں؟ لودھی نے فوراً پتا کر لیا۔ معلوم ہوا کہ وہ شام
سے ہی ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے سو گیا تھا مگر
بارہ بجے پھر جاگ گیا۔ سجاد، فارم ہاؤس کے اس چھوٹے
سے پورشن میں تھا جسے بھانڈو بوجھ ضرورت اسپتال کی شکل
دے دیتا تھا۔ یہاں ایک قابل ڈاکٹر، ایک کپاؤنڈر اور
ایک نرس ہمہ وقت موجود رہتے تھے۔ لودھی نے ہمیں بتایا
کہ اب پچھلے دو روز سے سجاد صاحب کی حالت کافی بہتر
ہے۔

ہم ایک کشادہ کمرے میں داخل ہوئے۔ یہاں
اے سی کی ٹیبلٹی مشین تک تھی۔ سجاد بیڈ پر نیم دراز تھا اور
ایک چھوٹے ٹیپ ریکارڈر پر پنجابی کی کوئی کافی سن رہا تھا۔
اس کی آنکھوں پر رنگ دار چشمہ تھا۔ ماشی کا یہ دنگ شخص
جس نے بڑے بڑے پختے خالوں کے سر جھکائے تھے اور
اپنی ایک نگاہ غلو انداز سے فرعون صفت لوگوں کا پتا پانی کیا
تھا، آج ایک معصوم معطل کی طرح ہری چادر والے اس بیڈ پر
لیٹا تھا۔ وہ پہلے سے کافی کمزور تھی ہو چکا تھا، تاہم اس کے
چہرے کا رعب داب اب بھی مکمل طور پر اوجھل نہیں ہوا تھا۔
ہمارے قدموں کی آہٹ نے اسے چونکنے پر مجبور کر
دیا۔ ”کون؟“ اس نے خشکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

میں بے آواز چلا اس کے بالکل پاس پہنچ گیا اور پھر
اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے چہرے پر رکھا۔
”شاہ زیب... تم... مجھے پہلے ہی لگ رہا تھا کہ تم

سنائی دیتا ہے۔

”خورشید اور بچہ خیریت سے ہیں؟“ میں نے سجاد کو سے پوچھا۔

”ہاں، فیض محمد سے فون پر رابطہ ہوتا رہتا ہے۔ اس کے مطابق وہ بالکل خیریت سے ہیں۔“

”لازمی کے اسی گھر میں ہیں؟“

”ہاں، وہ جگہ ان کے لیے بہت ٹھیک ہے۔“

میں نے کہا۔ ”اگر تم چاہتے ہو تو میں بھاء سے بات کرتا ہوں۔ خورشید اور سچے کو بھی یہاں فارم میں لے آتے ہیں۔“

”اس بارے میں، میں نے بھی سوچا تھا شاہ زیب مگر یہ خطرناک ہوگا۔ وہ جگہ بانادانی کی نظر میں آچکی ہے۔ اگر ہم خورشید کو وہاں سے نکال کر یہاں لانے کی کوشش کریں گے تو یہ جگہ بھی بانادانی کی نگاہ میں آجائے گی اور ایسا بالکل نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے یہ بات خورشید کو بھی سمجھا دی ہے۔ وہ پہلے کچھ دن تو روتی رہی ہے مگر اب اس نے خود کو سنبھال لیا ہے۔“

اسی دوران میں نسوانی قدموں کی تیز چاب سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا اور ٹھک گیا۔ مجھے زیب نظر آئی۔ چاند گرمی کے پیش امام مولوی فدا کی تخت جگر..... وہ قیمتی لباس میں تھی۔ کندھوں پر ایرانی شال لیے وہ تیزی سے میری طرف آ رہی تھی۔ قسطیابی اس کے ساتھ تھی۔ آتے ساتھ ہی وہ میرے گلے لگ گئی۔ اس کے دل کی گھبراہٹوں سے جیسے بے ساختہ آواز نکلی۔ ”بھائی جان۔“

میں نے اس کا سر چوم لیا۔ پھر اس کی آنکھوں میں چپکنے والے آنسو پونچھے۔ اسے پچکارتے ہوئے کہا۔ ”اب تم زیب نہیں ہو..... یور ہائی نس ہو۔ جاما جی کی خاتون اول۔ اور یہ جو خواتین اول ہوتی ہیں، اس طرح شوشوں کر کے روتی نہیں ہیں۔“

وہ مزید کہنے لگی اور دوبارہ میرے گلے لگ گئی۔ سجاد سے اجازت لے کر ہم باہر نکل آئے اور کور پڈر سے گزر کر ایک دوسرے کمرے میں آ گئے۔ ڈھائی تین سال پہلے کی وہ دھان پان سی زرد ٹوکڑی اب بھرے بھرے جسم کی ایک دلکش اور بادقار نو بیا ہوتا دکھائی دے رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ”گلتا ہے کہ ابراہیم نے تمہیں بہت اچھے طریقے سے رکھا ہوا ہے۔“

وہ ڈاڑھ مار گئی لیکن غوراً ہی اس کے کتابی چہرے

ہوا تھا۔ کل ایک سخت لڑائی کے بعد تم نے وہ گھبرا توڑا ہے اور فون پر رابطہ کر کے اس سارے معاملے کے بارے میں بتایا ہے۔“

میں نے گہری سانس لینے ہوئے کہا۔ ”مجھے گلتا ہے سجاد کہ داؤد بھاء نے تمہیں پوری بات نہیں بتائی۔ ہم ٹیکساری ٹینگ سے ٹکر لینے کے لیے نہیں گئے تھے۔“

”تو پھر بڑی ڈرائیو کرنے کے لیے نکلے ہوئے تھے؟“ سجاد نے طنز یہ انداز میں کہا۔

”نہیں یار، خواجہ بدگمان ہونے کی کوشش کر رہے ہو۔ ہم یہاں سے گئے تھے تاجور کے لیے اور دارج صاحب کے لیے۔“

”کیا مطلب؟“

میں نے اس کے لیے جوڑے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ (وہی ہاتھ جس کا ٹکڑا، فٹا کرنے کی طاقت رکھتا تھا) میں نے کہا۔ ”سجاد! تم جانتے ہو، دارج ایک بڑے ہندی اور گھمنڈی شخص کا نام ہے۔ وہ کسی کی بھی سستا سنا نہیں ہے۔ ہمیں پتا تھا کہ بانادانی اس وقت تاجور کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ اور تاجور کو چار دیواری کے اندر بندر ہونا چاہیے۔ لیکن دارج اُسے لے کر چل پڑا تھا کسی ٹھیکن پانی کے چشمے کی طرف۔ یہ لوگ بائی روڈ گھر بھار جا رہے تھے۔ ہمیں اس کے سوا کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ ان کے پیچھے رہ اس کی حفاظت کریں اور میں سمجھتا ہوں کہ ہم نے جو کیا، ہمیں وہی کرنا چاہیے تھا۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو۔ بانادانی نے کوئی حرکت کی ہے؟“

”اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ تم تک پوری خبریں نہیں پہنچی ہیں یا شاید تمہاری تیاری کی وجہ سے تمہیں ان خبروں سے دور رکھا گیا ہے۔“

پھر میں نے مختصر الفاظ میں سجاد کو بتایا کہ کلر بھار کے راستے میں کس طرح اچانک جنون زدہ طوطوں نے گاڑیوں کے قافلے پر خوفناک حملہ کیا اور وہاں کیا تباہی ہوئی۔ بعد ازاں مندر کے کھنڈر میں پیش آنے والے حیران کن واقعات کا مختصر تذکرہ بھی میں نے سجاد کے سامنے کیا۔ (کھوہ کے حالات تو وہ جان ہی چکا تھا) وہ سخت تعجب کے عالم میں سن رہا..... اور سرد ہوتا رہا۔

اس کی آنکھوں کا نقش ختم ہو چکا تھا..... مگر آنکھیں بھی تو ختم ہو چکی تھیں۔ بہر حال اس کی سماعت ٹھیک کام کر رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ بس ایک کان سے تمہارا سام

یہ تجربہ کی آخری تاریخوں کا ایک خوشگوار دن تھا۔ ہم دو پہر بارہ بجے کے قریب سوکراٹھے تھے۔ سب سے پہلے رضوان بی کی خیر خیریت دریافت کی تھی اور اب ایک اچھا برقع کرنے کے بعد ہم باغیچے میں بیٹھے تھے۔ چچا زاد ولید اور پہلوان حشمت سے بھی ملاقات ہو چکی تھی۔ کئی سال قبل میں گزرنے کے بعد ولید کو مکملی ہواؤں میں سانس لینا نصیب ہو رہا تھا۔ چند روز میں ہی اس کی صحت بحال ہونا شروع ہو گئی تھی۔ بہر حال پہلوان حشمت کچھ کمزور دکھائی دیا تھا۔ اس کی کمر پر چوٹ بھی آئی ہوئی تھی۔ پتا چلا کہ وہ سیزمیوں سے گرا ہے۔ اب بھی وہ کمرے میں لیٹا ہوا تھا۔

کھانے اور ٹھوڑی سے گپ شپ کے بعد میں پہلوان کے پاس پہنچا۔ اس نے کمرے سے باہر ایک پرچی چسپاں کر رکھی تھی۔ یہ دراصل کاغذ پر لکھا ہوا تعویذ تھا۔ ولید نے بتایا تھا کہ ایسی کئی پرچیاں پہلوان نے فارم ہاؤس میں مختلف جگہوں پر چسپاں کی ہوئی ہیں۔ ان پرچیوں کے ذریعے بدادراغ کو خیردار کیا گیا تھا کہ وہ بہر صورت اپنی خیریت کو مقدم جائیں۔ اور اس فارم ہاؤس کے آس پاس منڈلانے کی کوشش نہ کریں۔ کیونکہ یہ ساری جگہ بیڑیاں والے کے سایہ عاطفت میں ہے اور خلاف ورزی کرنے والی کوئی بھی شرارتی روح اپنے نقصان کی خود ڈتے دار ہوگی وغیرہ وغیرہ۔

پشت کی چوٹ کے باعث پہلوان کروٹ کے بل لیٹا تھا۔ میں نے کہا۔ ”جناب! یہ سیزمیوں سے گرنے والا سانحہ ہوا کس طرح؟“

وہ کراہ کر بولا۔ ”کیا اب میں تمہیں دوبارہ گر کر دکھاؤں؟“

”نہیں چاچا حشمت زبانی ہی بتا دیں۔“ وہ کچھ دیر تک بڑے بڑے منہ بتاتا رہا پھر بولا۔ ”تم شاید مذاق سمجھو لیکن حقیقت ہے کہ ہوائی چیزیں بڑی سیسبی ہوتی ہیں۔ اگر عامل زبردست ہو اور ان ہوائی چیزوں کو شرارت کرنے کا موقع نہ ملتا ہو تو وہ دوسوں کی بھل مار کر ہمارے دماغوں کے اندر صر جاتے ہیں۔ میں بھی ایک دوسرے میں پڑ گیا اور چوٹ لگو ابھی۔“

”سنا ہے کہ زینب کسی نوکرانی کو آوازیں دے رہی تھی۔ آپ نے سمجھا کہ وہ مدد کے لیے بلا رہی ہے۔ آپ جلدی میں سیزمیاں اترتے ہوئے گر گئے؟“

”ہاں، میں چھت پر تھا۔ زینب نے نوکرانی بھالو کو آواز دی اور اونچی آواز میں جھالو..... جھالو کہا۔ مجھ کو ایسا

پرغم کی لکیر کی کھینچ گئی۔ اس نے اتنی کی تاگہانی موت کا ذکر کیا اور اپنے غم کا اظہار کیا۔ اتنی کے بعد حاذق ذکری کی دردناک موت کا تذکرہ ہوا، پھر منگھو کا رخ سجاد کی طرف ہو گیا وہ بولی۔ ”جاہاجی کے لوگ آپ کے بعد جس شخص کا زیادہ ذکر کرتے ہیں وہ سجاد صاحب ہیں۔ رائے زل کا سر کاٹنے والا واقعہ لوگوں کے دلوں میں اتر چکا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”زینب! بے شک وہ ایک کارنامہ تھا لیکن اس کی سزا بھی تو سجاد کو بھگتنا پڑی ہے اور ابھی اس بانوائی نے پتا نہیں اور کیا طوفان اٹھاتا ہے۔“

وہ گم سم سی ہو گئی۔ جب میری طرف دیکھ کر بولی۔ ”سجاد صاحب کو اس حال میں دیکھ کر بہت دکھ ہوا ہے۔ کیا اب وہ کبھی نہیں دیکھ سکیں گے؟“

”زینب اس بارے میں تو ڈاکٹر ہی بھر بتا سکتے ہیں۔ بہر حال امید پروینا قائم ہے۔“

”ان کی بیوی خورسنہ، ان کے لیے اپنا سب کچھ چھوڑ چھا کر جاہاجی سے یہاں چلی آئی۔ اس بے چاری پر پتا نہیں کیا بیعت رہی ہوگی۔ میں نے کل سجاد صاحب سے کہا تھا کہ وہ خورسنہ اور بچے ڈیشان کر یہاں بلوا لیں مگر وہ نہیں مانے۔“

”ہاں زینب، وہ سمجھتا ہے کہ خورسنہ کو یہاں لے کر آنے میں خطرہ ہے۔“

وہ بولی۔ ”مجھے تو یہ بھی لگتا ہے بھائی جان..... کہ سجاد اپنی یہ بے بسی والی حالت خورسنہ کو دکھانا ہی نہیں چاہتے۔“

”ممکن ہے اس کے ذہن میں یہ بات بھی ہو۔“ میں نے تائید کی۔

وہ کچھ دیر معصومانہ انداز میں اپنی بیس قیمت انگلیوں کو اٹھیں میں گھمائی رہی۔ جیسے ان سے میل رہی ہو۔ تب اس کے چہرے پر تاسف کی نئی لہر ابھری۔ ”اور..... آپنی تاجور..... ان کی شش..... شادی ہوئی۔“ وہ عجیب دل گرفتہ لہجے میں بولی۔

قسطینا نے میرے تاثرات دیکھ کر فوراً موضوع بدلا اور زینب کو کندھوں سے تمام کر کہا۔ ”مجھے پتا ہے تم دونوں کے پاس کرنے کی بہت سی باتیں ہیں لیکن زینب! اس وقت شاہ زانپ بھی جیسے ماندے ہیں۔ کل آرام سے منگھو کرنا۔ میں بھی تمہیں بہت کچھ بتاؤں گی۔“

☆☆☆

فارم ہاؤس میں دور تک سنہری دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔

ٹاپتا ہے؟“
پہلوان نے خشک لہجے میں جواب دیا۔ ”تو تم کیا چاہت ہو کہ جہاں چوٹ لگی ہے وہاں کسی آنکھوں والے سے مالش کراؤں۔ اچھے پھلے سیانے ہو کر آج کیسی باتیں کر رہے ہو شاہ زیب۔ آخر پردہ اور ستر پوشی بھی کوئی چیز ہوت ہے۔“

میں اٹھ کر کھڑا ہوا۔ وہ بولا۔ ”تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد دوبارہ پکڑ لگا سکت ہو؟“
میں نے کہا۔ ”اب آ گیا ہوں۔ آپ جب کہیں گے سر کے بل آؤں گا اور آپ زیادہ ٹھنڈ کریں۔ اس فارم ہاؤس میں آپ پرندوں وغیرہ سے بالکل محفوظ ہیں اور جس باندری کی آپ بات کر رہے ہیں، وہ ماری جا چکی ہے۔“
پہلوان جی نے حیرانی ظاہر کی۔ ”یعنی وہ.....“

لوہی؟“
”جی ہاں، لمبی بات ہے۔ آپ مالش وغیرہ کرائیں پھر آپ کو تفصیل سے بتاؤں گا۔“

”یا اللہ شکر ہے..... یہ دوسو بڑے ناخباہر ہوت ہیں۔ مجھے توکل بھی شہر ہو گیا تھا کہ وہ باندری باغیچے میں پھر رہی ہے۔ بعد میں وہ ایک کتا نکلا۔ ٹھیک ہی کہوت ہیں کہ دودھ کا جلا نہ کھرا نہ کھاٹ کا۔“
میں نے تائیدی انداز میں سر ہلایا اور کرے سے نکل آیا۔

پہلوان بہت باغ و بہار شخصیت تھی۔ اس نہایت کشیدہ ماحول اور درگزرگوں حالات میں بھی اس سے مل کر موڈ میں بہتری محسوس ہوئی۔ پہلوان سے فارغ ہو کر میں میڈیکل رومز کی طرف گیا۔ میرے زخمی انگوٹھے میں ساری رات ہلکا درد ہوتا رہا تھا۔ یہاں بھاؤ نے خاصی لمبی سہولتوں کا انتظام کر رکھا تھا۔ ایکسرے مشین بھی موجود تھی۔ میرے بتانے پڑا کثرت نے انگوٹھے کا ایکسرے کیا اور تسلی دی۔ اس نے کہا کہ ہڈی میں ہیمز لائن فریکچر ہے۔ ہڈی اپنی جگہ سے ہل نہیں ہے۔ پچانوے فیصد امکان ہے کہ یہ آرام سے خود ہی ٹھیک ہو جائے گی۔ اس نے بیڈ تین کردی اور درد کے لیے میفین دی۔

میں سب سے زیادہ ٹھنڈی، فخر اور فارس کی طرف سے تھی۔ ابھی تک ان کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں تھی جس وقت ہم مندر سے نکلے تھے فخر کے پاس موبائل فون موجود تھا۔ بے شک اس کی چار جگہ ختم ہو چکی مگر وہ بعد میں چار جگہ کرکھی سکتا تھا لیکن اس کا فون آج تین روز

کروہ بچا لو..... بچا لو کہہ رہی ہے۔ ساتھ ہی دماغ میں یہ بات گھس گئی کہ شاید ان بد بخت طوطوں نے حملہ کر دیا ہے۔ میں تیزی سے سیڑھیاں اترا اور پھسل گیا۔ ”آف..... ہائے۔“ پہلوان نے ہلنے کی کوشش کی اور اپنی دھمکی کی ہڈی پر ہاتھ رکھا۔

میں نے کہا۔ ”گلتا ہے کہ آپ کو بچنے والی ہڈی پر چوٹ آئی ہے۔ یہاں تو شاید آپ کو ایک دفعہ پہلے ہی ضرب آئی تھی۔“

پہلوان نے آذرہ انداز میں اثبات میں سر ہلایا۔
میں نے کہا۔ ”آپ تو سیانے بیانے بندے ہیں جی۔ آپ کو جالو..... اور بچا لو میں فرق کا پتا ہی نہیں چلا؟“
”اسی کو تو دوسرے کہوت ہیں۔ یہ غم و سوسہ ایسا ہی ہوت ہے۔ دماغ میں شاید پہلے سے ڈرتا تھا اس لیے دھیان سیدھا طوطوں اور باندری وغیرہ کی طرف چلا گیا۔ وہ معصوم بچی (زیب) دودن پہلے ہی یہاں پہنچی تھی۔ میں نے سمجھا کہ آتے ساتھ ہی معیت میں شخص گئی ہے۔“ آف..... آہ..... وہ پھر کراہا۔

میں بمشکل اپنی مسکراہٹ کو چہرے پر چھپنے سے روک رہا تھا۔ پہلوان ہمیشہ قافیہ اور ردیف وغیرہ کی بات کرتا تھا۔ اب یہ بچا لو..... اور بچا لو ایک قافیہ ہی تھا جس کی وجہ سے پہلوان اس معیت میں چھٹا تھا۔ میں نے پیچیدہ صورت بنا کر پوچھا۔ ”اب کیا کر رہے ہیں، اس چوٹ کا؟“
”وہ کیا کہوت ہیں کہ چراغ تلے اورک کا سواد علاج کرنے والے کو اپنا علاج تم ہی فائدہ دیت ہے پھر بھی کچھ نہ کچھ فائدہ تو ہوا ہے۔ مالش ہو رہی ہے دو ناٹم۔“
”خود کر رہے ہیں مالش؟“ میں نے پوچھا۔

”یار! کیسی الوؤں جیسی بات کرت ہو۔ جہاں چوٹ لگی ہے وہاں میں خود مالش کیسے کر سکت ہوں۔ کسی سے کروا رہا ہوں۔“

اسی دوران میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ فارم ہاؤس کا ہی ایک دیلا چٹلا ملازم دواریں کھولا ہوا اندر داخل ہوا۔ پہلوان بولا۔ ”لو بڑی لمبی عمر ہے اس کی۔ آ گیا ہے مالش کرنے والا۔“

میں نے دھیان سے دیکھا۔ آنے والا ٹاپتا تھا۔ اس نے سلام کیا اور پھر اس الماری کی طرف بڑھا جہاں پہلوان نے اپنے چار بانجے خود ساختہ تیل اور مرہم وغیرہ شیشے کی بوتلوں میں رکھے ہوئے تھے۔

میں نے سرگوشی میں کہا۔ ”پہلوان جی..... لیکن یہ تو

ہوں۔ ساری زندگی بھاؤ جی کا غلام بن کر رہوں گا۔“
یہ شخص واقعی رجم کے قابل نہیں تھا۔ اس نے نکلیل داراب سے بیماری رجم لے کر ہماری زندگیوں کا سودا کیا تھا۔ اگر مندر سے واپسی پر جنونی چکا دوڑیں ہم پر نہ جھپٹیں اور ہمیں اس افراتفری کا فائدہ نہ ملتا تو پتا نہیں اس وقت ہم کس حشر سے دو چار ہو گئے ہوتے۔ میری لنگائی ہوئی چوٹ سے زخمی ہونے کے بعد بھی یہ ٹھکانا مسلسل مکر کرنے میں مصروف رہا تھا۔

میں اور قسطنطیا کمرے کے سامنے سے ہٹ گئے۔
”کیا خیال ہے، اس کو معافی مل جائے گی؟“ قسطنطیا نے مجھ سے پوچھا۔

”کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ داؤد بھاؤ اپنے اصولوں پر کڑا پھرا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 30 سال سے اتنا بڑا گیگ بخوبی چلا رہا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ شاید یہ پہلا موقع ہے جب گیگ کے اندر ایسی سنگین خداری ہوئی ہے۔“
قسطنطیا بولی۔ ”ابھی لو موسیٰ سے بات ہو رہی تھی۔ اس نے بتایا ہے کہ آج صبح بھاؤ نے گیگ کے تین اور بندوں کو گولی سے آڑا دیا ہے۔ ان کے بارے میں اس بتاؤں نے ہی بتایا ہے۔ وہ بھی اس کے ساتھ اس پلاننگ میں شریک تھے۔“

”اوہو، پھر تو یہ بھی نہیں بچے گا۔“ میں نے کہا۔
”مجھے تو ترس بھی آ رہا تھا اس پر۔ قد کاٹھ میں ایک بچہ ہی لگتا ہے۔ بچوں کی طرح ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا۔“
”مگر بہت خبیث قسم کا بچہ ہے۔ بچوں والی کھوپڑی میں ایک گھاگ بڑھے کھسٹ کا دماغ ہے۔ آپ نے دیکھا ہی ہوگا، کھوہ میں کس طرح اس نے اجاگ اپنا موبائل فون دارج تک پہنچایا اور دارج نے اس کے گلوے کر دیے۔“
قسطنطیا موضوع بدل کر بولی۔ ”تاوان کا پتا بھی چل گیا ہے۔ بتاؤں نے اسے اپنے ایک ہمراز سامی کے مکان میں رکھا ہوا تھا۔ تاوان کو وہاں سے نکال لیا گیا ہے۔ تھوڑی دیر میں پہنچ جائے گا یہاں۔“

”ایس ایس بی توخیر کا پتا نہیں کیا بتا ہے؟“
قسطنطیا بولی۔ ”لو موسیٰ نے بتایا ہے کہ ایس ایس بی کے بیٹے کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ اور تا جو بھی خیریت سے اسلام آباد پہنچ گئی ہے۔“

تا جو کے بارے میں اطلاع دے کر قسطنطیا گہری نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی جیسے میرا ربیعل جانتا چاہتی ہو۔ مجھے خاموش دیکھ کر دوبارہ گویا ہوئی۔ ”میں

گزرنے کے باوجود بالکل خاموش تھا۔

میں قسطنطیا کے پاس پہنچا۔ اس کی پیشانی اور کلاہوں وغیرہ پر بینڈنچ نظر آرہی تھی۔ یہ زخم اور کٹ اس خوبی لڑائی کی نشانی تھے جو جیلوں میں خطرناک قاتلہ ریڈ کیٹ اور اس فوجی کمانڈر قسطنطیا کے درمیان ہوئی تھی۔ وہ بائیسے کے قریب ایک روش پر ٹہل رہی تھی۔ میں اس سے فارس اور فخر کے حوالے سے ہی ڈکشن کرنا چاہ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا اس نے کہا۔ ”یہ آوازیں سن رہے ہو شاہ زائب؟“

میں نے دھیان سے سنا۔ عمارت کی عقیقی جانب کسی کمرے سے حال پکار سنائی دے رہی تھی۔ پول لگتا تھا کہ کوئی شخص سخت اذیت میں مبتلا ہے۔ ”کون ہے یہ؟“ میں نے پوچھا۔

”وہی خدا برا عظم۔۔۔۔۔ بنارس۔۔۔۔۔ اس سے پوچھ کچھ کی جا رہی ہے۔“
”لیکن وہ تو زخمی ہے، نیم بے ہوش لگ رہا تھا۔“
”لگ ہی رہا تھا ناں۔۔۔۔۔ حقیقت میں نہیں تھا، بڑا زبردست فخری ہے۔“

میں اور قسطنطیا ایک راہداری سے گزر کر اس کمرے کے سامنے پہنچے جہاں کوتاہ قد بنارس کی طبیعت صاف کی جا رہی تھی۔ ہم نے کھڑکی کی آہنی گرل میں سے دیکھا۔ بھاؤ گیگ کے تین خطرناک رکن، بنارس کو آڑے ہاتھوں لیے ہوئے تھے۔ منظر عجیب خیر تھا۔ بنارس کے سانولے جسم پر صرف ایک انڈرویزر تھا۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ اس کے سامنے پچاس۔۔۔۔۔ سو۔۔۔۔۔ اور پانچ سو والے کرسیوں کا ڈھیر سا بڑا تھا۔ بنارس کو یہ نوٹ کھانے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ اس کی ہاتھوں میں انگلیاں دے کر زبردستی اس کا منہ کھولا جاتا تھا اور نوٹ منہ میں گھسیڑ دیے جاتے تھے۔ پھر ایک مسواک منہ لکڑی سے نوٹوں کو اس کے منہ میں دھکیلا جاتا تھا۔ غالباً وہ کافی نوٹ لگ چکا تھا اور اب ایکائیاں لے رہا تھا۔

”اب مجھ سے نہیں ہوتا۔ میں مر جاؤں گا۔ خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔۔۔۔۔ بب۔۔۔۔۔ بس ایک دفعہ۔۔۔۔۔ بھاؤ جی سے میری بات کرادو۔“

”انہوں نے جوابات کرنی تھی، وہ کر چکے ہیں۔۔۔۔۔ اب یہ سارے نوٹ کھاؤ گے تو جان چھوٹے گی۔“ ایک شوٹر دھاڑا۔

”مجھ سے بہت بڑی غلطی ہو گئی۔ میں ہاتھ جوڑتا

”لودھی صاحب کی طرف سے آرڈر نہیں تھا اس لیے نہیں لائے۔“

”میرا خیال ہے کہ تم جلدی کرو، ورنہ یہ حرام زادہ اپنا بیخون پنا شروع کر دے گا۔“

”اور کوئی لڑکی بھی لاؤ..... لڑکی بھی لاؤ۔“ وہ وہیں سلاخوں میں پھنسا پھنس کر بدروح کی طرح چلتا۔

”نور کے بچے، پہلے اپنی گردن تو نکال لے۔ پھر تیری آگ بھی اچھی طرح ٹھنڈی کر تے ہیں۔“ میں نے کہا۔

وہ جتنی انداز میں بولا۔ ”وہ مکیاں مت دو۔ لڑکی لاؤ۔ وہی جس کی تصویر رسالے میں چھپی ہے۔ اس پر میرا حق ہے..... کیونکہ..... میں تم سب کمزوروں کو اپنے پاؤں کے نیچے مسل سکتا ہوں۔ تم سمیت جس نے میرا مقابلہ کرنا ہے میرے سامنے آجائے۔“

”مقابلے کی پیداوار، پہلے اپنی یہ منجوس گردن تو آزاد کرالے۔“ میں نے دانت پیس کر کہا اور ایک شوکر اس کے منہ پر ماری۔ اس کے منہ سے خون بہنے لگا مگر اسے مطلق پروا نہیں تھی۔ اس نے اپنے ہی پیٹے ہوئے ہونٹ کو چوستا شروع کر دیا۔

اسنے میں وارث لودھی بھی آکھا۔ میں نے اس کے ساتھ مل کر زور لگا دیا اور اس کی سانہ جیسی گردن سلاخوں میں سے نکالی۔ اس کی آنکھوں میں ایک حیوانی چمک ابھریں لے رہی تھی۔ اس چمک میں شراب کی پیاس یوں لٹکارا مارتی تھی جیسے بادلوں میں بجلی کڑکتی ہے۔

اس نے ابھی جو بات کہی تھی، اس نے میرے تن بدن میں آگ لگا دی تھی۔ اس نے تاجوری بات کی تھی۔ اس سے پہلے پاشا نے بھی مجھے بتایا تھا کہ ان سرخ پوش کینکسروں کے پاس تاجور کی کوئی تصویر ہے اور وہ اس حوالے سے آپس میں دوا بیات شرطیں لگا رہے ہیں۔

ایک دوران میں قادم ہاؤس کا ایک مالی (جو درحقیقت لیکسٹری تھا) ٹرائی دیکھتا ہوا پہنچ گیا۔ اس میں تیز دھکی 69 کی کئی بوتلیں موجود تھیں۔ شیطان زادے نے ان بوتلوں کی طرف یوں دیکھا جیسے کسی صحرا میں چار دن کا پیاسا، ٹھنڈے صاف پانی سے بھری پانی دیکھے۔ اس نے خوشی کا نعرہ مارا اور بڑے دھکے انداز میں نص شروع کر دیا۔

قسطینا سرگوشی میں بولی۔ ”یہ گندی بکواس کر رہا ہے۔“

نٹے میں آکر پتا نہیں اور کیا کیا کہے گا۔ میرا خیال ہے، شراب میں کچھ ملو ادب۔ بے ہوش ہو کر پڑا رہے گا۔“

کوئی فکر نہیں ہے اُس کی۔ دارج اس پر بڑا غضب ناک ہے..... کیونکہ مکوہ میں اس نے تمہاری جان بچانے کے لیے خطرہ مول لیا۔“

دارج کی غضب ناک سے جب اسے کوئی مسئلہ نہیں تو ہمیں کیوں ہوگا؟ میں نے بے پروائی سے کہا۔

”تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہے اس کے لیے؟“ وہ میری آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔

”نہیں قسطینا..... مجھے لگتا ہے کہ..... وہ میرے دل سے اتر چکی ہے..... اس نے مجھے اتنے دھم دیے ہیں کہ اب اس کے بارے میں کچھ سوچنے کو بھی دل نہیں چاہتا۔“

”بہت بڑا جھوٹ بول رہے ہو۔“ وہ پورے یقین سے بولی۔

ہماری گفتگو کو بریک لگ گئے کیونکہ ایک ملازم دوڑتا ہوا ہماری طرف آ رہا تھا۔ ”لودھی صاحب کہاں ہیں جناب؟“ اس نے ہولکا ہٹ میں ہم سے پوچھا۔

”کیوں کیا ہوا؟“

”وہ جی سرخ کپڑوں والا قیدی بہت دنگ بچارا ہے۔ اس نے اپنا سر لوہے کی سلاخوں میں پھنسا لیا ہے۔ کہیں مر ہی نہ جائے۔“

”کیا تکلیف ہے اُس کو؟“

”شراب مانگ رہا ہے جی..... اور انگریزی میں گندی گالیاں دے رہا ہے۔“

میں اور قسطینا بھاگتے ہوئے عمارت کے عقب میں اس لاک آپ میں پہنچے جہاں شیطان زادے کو بند کیا گیا تھا۔ یہ ایک مختصر کمر تھا۔ لوہے کا دروازہ تھا۔ صرف ایک کھڑکی تھی جس میں ”کاپر“ کے موٹے پانچ سلاخوں کی طرح لگے ہوئے تھے۔ محفوظ کرے کی وجہ سے رات کو بھی اس لیکسٹری کی ٹھکیں کھول دی گئی تھیں۔ اب اس کی حالت دیدنی تھی۔ غالباً ان سلاخوں سے ٹکرا کر اُس نے اپنا سارا جسم زخمی کیا ہوا تھا۔ اس نے زور لگا کر دو سلاخوں (پائپوں) کے درمیان گھنٹاں پیدا کرنے کی ناکام کوشش کی تھی اور اپنی گردن اس میں پھنسا لی تھی۔ اب وہ مکروہ آواز میں چلا رہا تھا اور شراب کا مطالبہ بھی جاری رکھے ہوئے تھا۔ ملازم نے کہا۔ ”اس کا نشہ تو نا ہوا ہے جی۔ چار گھنٹے سے ایک ہی بکواس کر رہا ہے اور کہتا ہے کہ بیوٹل نہ لاؤ، پورا کر بیٹ لے کر آؤ۔“

”تو لا دو کر بیٹ، ورنہ یہ مر جائے گا۔ تم لوگوں کے پاس شراب کی کیا کمی ہے۔“ میں نے کہا۔

میں پہنچیں گے۔ انہی نوٹوں کی بھوک تھی ناں تم کو؟ اب کھانا پڑے گا ان کو۔“

وہ ہلکانی لے کر بولا۔ ”مجھے پھر اپنی آجائے گی۔“
”تو پھر اپنی کرلو۔ جو ایسی سے نکل جائیں گے ان کا حساب نہیں ہوگا۔“

بھاؤ کے اشارے پر اس کے کارندوں نے ایک بار پھر بنارس کی باجھوں میں اٹھایاں ڈال کر اس کا منہ کھولا اور گلے ہوئے نوٹوں کے تھے اس کے منہ میں ٹھونسنے لگے۔ اسے آئی اور اس نے سب کچھ الٹ دیا۔ اس کا رنگ زرد تھا۔ محسوس ہوتا تھا کہ اسے دل کا دورہ پڑ جائے گا۔

میں نے انگلیش میں بھاؤ سے کہا۔ ”کہیں یہ مری نہ جائے۔ اگر معاف کرنا ہے تو پھر اسے کر دیجیے۔“

”معافی کی بات یہاں کون کر رہا ہے۔“ بھاؤ چٹانی لہجے میں بولا۔ ”میرے پاس غدار کے لیے کوئی معافی نہیں ہے۔“

لگ ہی رہا تھا کہ بنارس کا آخری وقت آچکا ہے لیکن موت اسے آسانی سے ملنے والی نہیں تھی۔

جب حیدر نوٹ بنارس کے منہ میں نہ ٹھونسنے جاسکے تو داؤد بھاؤ کے اشارے پر اسے اٹھا کر اس کا سر پلاسٹک کی پائٹی میں گھسیڑ دیا گیا۔ اب اس کی ٹانگیں اوپر اور سر بیتر اور نوٹوں کے ٹھوہے میں تھا۔ جیسے کوئی بچہ پائٹی میں کر گیا ہو اور دم کھٹنے کی وجہ سے تڑپ رہا ہو، اپنی ٹانگیں چلا رہا ہو۔ اس کی ٹانگیں بھی عجیب میزمری میزمری تھیں..... پاؤں بھی سانولے اور بھدے تھے۔ وہ گلے ہوئے نوٹوں کے راتب میں گردن تک ڈوبا ہوا تھا۔ اس کی سانس رکنے لگی تو اسے مزید پوچھ کچھ کے لیے پائٹی میں سے نکال لیا گیا۔

اچانک بنارس نے تڑپ کر خود کو چھڑایا اور کھلے دروازے سے باہر نکل کر بھاگ گیا۔ یہ اس کی سر اسر اضطرابی حرکت تھی۔ اس کے ہاتھ پست پر بندھے ہوئے تھے۔ وہ یہاں سے نکل کر کہاں جاسکتا تھا۔

”بھڑا دے۔“ داؤد بھاؤ گرجا۔
لودھی، اشرف اور دیگر کارندے اس کے پیچھے لگے۔ وہ بھاگ رہا تھا اور ساتھ ساتھ ہڈیاں دے رہا تھا۔ ”مجھے معاف کر دیں..... مجھ سے غلطی ہو گئی..... مجھے معاف کر دیں..... بس ایک بار۔“

اس کی ”معافی“ تو پہلے ہی بہت مشکل تھی، اب یوں بھاگ کر اس نے ناممکن بنائی تھی۔ وہ برآمدے کی طرف گیا تو سامنے سے دو سبز افراد اس پر بچھڑے، وہ رخ پھیر کر بائیں

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ میں نے تائید کی۔

میں نے لودھی کو ایک طرف لے جا کر اس حوالے سے ہدایت دی، اس کے علاوہ یہ دارنگ بھی دی کہ اس بندے کی حیثیت خطرناک ترین قیدی کی ہے کوئی اس کے کمرے میں جائے گا اور نہ کھڑکی سے زیادہ قریب ہوگا۔ دروازے اور کھڑکی کی اچھی طرح نگرانی کرنے کے بعد ہم اپنے رہائشی پورشن میں واپس آ گئے۔

میں کئی پریشانیوں میں گمراہ ہوا تھا پھر بھی شکار کاوتی زیادہ تھی کہ سر پہرے فوراً بعد نیند آ گئی۔ رات قریباً نو بجے کے لگ بھگ قسطنطنیہ نے چگایا۔ میں نے پوچھا۔ ”فارس اور فخر کے بارے میں کوئی اطلاع ہے؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا اور بولی۔ ”لیکن بھاؤ کے بارے میں اطلاع ہے۔ وہ یہاں آئے ہوئے ہیں۔“
”کہاں ہیں؟“

”پہلے تو رضوان اور سجاد کی عیادت کرنے میڈیکل رومز کی طرف گئے تھے۔ میرا خیال ہے کہ اب لودھی کے ساتھ اس کمرے میں ہیں جہاں اس باسٹرو بنارس کو رکھا گیا ہے۔“

میں بنارس والے کمرے میں پہنچا تو یوحیم داؤد بھاؤ کو ایک آرام دہ کرسی پر بیٹھ پایا۔ وہ پینٹ کوٹ میں تھا۔ سر پر ہیٹ بھی رکھا ہوا تھا۔ میں داؤد بھاؤ کو پہلی بار اسے پیش میں دیکھ رہا تھا۔ بھاؤ نے بس مجھ سے ہاتھ ملایا اور ایک بار پھر اپنی ساری توجہ بنارس پر مرکوز کر دی۔ کمرے کا منظر عجیب تھا۔ بنارس اسی طرح ایک انڈریوز میں لمبوس دیوار سے قید لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ پست پر بندھے ہوئے تھے۔ وہ نوٹ جو دو پہر کے وقت اسے کھلائے جا رہے تھے اب پلاسٹک کی ایک بڑی پائٹی میں پڑے تھے۔ انہیں غالباً کئی گھنٹے پہلے بیتر میں ڈوب دیا گیا تھا۔ اب وہ گل چکے تھے اور اس قابل ہو گئے تھے کہ انہیں لگا جائے اور بنارس وہ آدمے سے زیادہ نگل بھی چکا تھا مگر اب اس کی حالت بُری تھی۔ لگتا تھا کہ اسے قے ہونا شروع ہو جائے گی۔

وہ فریادی آواز میں بولا۔ ”معاف کر دیں بھاؤ جی۔ کبھی آپ کے خلاف نہیں جاؤں گا۔ اگر میری وسائیں تو..... میرے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالیں..... میری آنکھیں نکال لیں گوشت کا لوتھڑا بن کر آپ کے در پر پڑا ہوں گا۔“

”یہ بعد کی باتیں ہیں۔“ بھاؤ نے سفاک لہجے میں کہا۔ ”پہلے یہ سزا بھگتنا ہوگی یہ سارے نوٹ تمہارے پیٹ

ہے۔“

”میں نے ہی مارا ہے۔“ پھر میں نے اسے تھوڑی سی تفصیل بتائی۔ وہ میری رائے سے شفق نظر آنے لگی۔
کچھ دیر بعد مجھے گھورتی ہوئی بولی۔ ”تم چپ چپ لگ رہے ہو؟ بنارس کا افسوس تو نہیں ہو رہا؟“
”نہیں..... اس غیبت کی کم سے کم سزا موت ہی تھی۔“
”تو پھر؟“

”داؤد بھاؤ کچھ ناراض ہو گیا ہے۔ ایک دو سخت باتیں کہیں ہیں۔“

یہی وقت تھا جب میرے سیل فون کی بیل ہوئی۔ دوسری طرف داؤد بھاؤ ہی تھا۔ میں کال رٹہ نہ کر سکا ہوا لان کی طرف چلا گیا۔ وہ اپنی بھاری بھر کم آواز میں بولا۔
”میں تھوڑا سا جذباتی ہو گیا تھا۔ دوسروں کے سامنے تمہیں سخت ست کہہ دیا۔ بعد میں افسوس ہوا۔ دراصل ابھی میں اس ٹھگنے نورو کو زندہ رکھنا چاہتا تھا۔ اس کے مرنے کی وڈیو بنانا تھی مجھے تاکہ دوسروں کو عبرت ہو۔ تم اچھی طرح جانتے ہو ہمارے پروفیشن میں اس طرح کی مثالیں قائم کرنا پڑتی ہیں۔ بہر حال جو ہو گیا سو ہو گیا۔ تم بتاؤ کہ اب فخر اور تمہارے اس دوسرے دوست (فارس) کی تلاش کے لیے کیا کیا جائے۔ وہاں کلر کبار اور پچوال وغیرہ میں تو میرے ایک درجن بندے مسلسل ان کا کھون لگا رہے ہیں۔“

میں نے ذرا توقف سے کہا۔ ”میری رائے میں تو یہاں لاہور میں بھی آپ کو اپنی ڈوریاں بلا دینی چاہئیں۔“
”مگر مجھے لگتا ہے کہ لاہور سے زیادہ اسلام آباد کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ٹھیک داراب اور دارج داراب دونوں اس وقت اسلام آباد میں ہیں..... ویسے..... تمہاری بات بھی غلط نہیں ہے..... لاہور کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔“

داؤد بھاؤ کا انداز مفاہمانہ تھا۔ اس سے ڈسکشن کر کے میرا موڈ کچھ بہتر ہوا۔ پہلوان شمشٹ کی خبر گیری کی دوبارہ نہیں کی تھی..... مگر اب رات زیادہ ہو چکی تھی۔ میں نے سوچا صبح اس کی طرف جاؤں گا۔

اگلے روز دوپہر کے بعد پہلوان سے ملاقات ہوئی۔ وہ اسی طرح کروٹ کے بل لیٹا ہوا تھا۔ میں نے آواز دی۔
”چاچا شمشٹ کیسے ہیں؟“
جسم میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوئی۔ میں نے قریب

آکر پھر آواز دی لیکن جواب نہ دار۔ ایک دم خدشہ پیدا

کی طرف نکلا۔ یہ سارا حصہ روشن تھا۔ اگر بنارس کا خیال تھا کہ وہ کہیں چھپ کر بیٹھ جائے گا تو یہ نہ ہونے والی بات تھی۔ چار پانچ افراد اس کے پیچھے لپک رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں اسلحہ تھا مگر وہ گولی نہیں چلا رہے تھے۔ میں بھی اپنا سیل نکال کر باہر احاطے میں آ گیا تھا۔ بنارس کو اذیت سے بچانے کے لیے مجھے یہ موقع مناسب نظر آیا۔ جو نمکی وہ گاڑ دینا کی دوڑ حافی فٹ اونچی باڑ پھلانگ کر مویشی خانے کی طرف دوڑا میں نے اس پر فائر کیا۔ گولی اس کے سر کے پچھلے حصے میں لگی اور وہ کسی گیند کی طرح لڑھک کر ایک کیاری میں گرا۔

سب بھاگ کر اس کے قریب پہنچے۔ بھاؤ بھی باہر آچکا تھا۔ ”کس نے چلائی گولی؟“ وہ ہانڈا۔

سب میری طرف دیکھنے لگے۔ بھاؤ بھی لمبے ڈم بھرتا ہوا میرے قریب پہنچ گیا..... بنارس کو ایک نظر دیکھ کر ہی بتا چل جاتا تھا کہ وہ دارفانی سے گزر چکا ہے۔ اعشاریہ 38 کی گولی اس کا کام تمام کر چکی تھی۔

بھاؤ نے قبر ناک نظروں سے مجھے گھورا۔ ”شاہ زیب! یہ کیا کیا تم نے۔ کیوں شوٹ کر دیا ہے؟“
”مجھے لگا..... یہ نکل جائے گا۔“

”بکواس بند کر دو..... تم نے جان بوجھ کر کیا ہے ایسا۔“ بھاؤ کی آنکھوں سے شعلہ نکل رہے تھے۔

ایک لمحوں کے لیے لگا کہ وہ میرا گریبان پکڑ لے گا پھر وہ مڑا اور پاؤں پچھتا ہوا واپس برآمدے کی طرف چلا گیا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ بھاؤ نے مجھ سے اس لہجے میں بات کی تھی..... اور ایسا بلا وجہ نہیں ہوا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں نے کیا کیا ہے۔ وہ بنارس کو ابھی زندہ رکھنا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے آسان موت دے دی تھی۔

داؤد بھاؤ کے کئی اور ساتھی بھی مجھے گھور رہے تھے لیکن کسی نے کچھ کہا نہیں۔ لودھی کی ہدایت پر بنارس کی شیم برہنہ و خوجنگال لاش کو کیاری میں سے اٹھا لیا گیا اور برآمدے کی طرف لے جایا گیا۔ اس ”بھاگ دوڑ“ اور فائر کی آواز نے پورے قدام میں پھل سی پیدا کر دی تھی۔

میں اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ قسطنطنیہ نے مجھ سے پوچھا کہ بنارس کے ساتھ کیا ہوا ہے؟

میں نے ویسی آواز میں کہا۔ ”آپ کو اس پر ترس آیا تھا، اس لیے میں نے سوچا کہ اس کی تھوڑی سی مدد کر دی جائے۔“

”کس طرح کی مدد..... میں نے تو سنا ہے کہ مدد کریا

ہیں..... یہ سب ان ہی تعویذوں کا کرشمہ ہے کہ وہ اب تک ہم سے دور ہیں۔“

میں نے تائید میں سر ہلانے میں ہی عاقبت سمجھی۔

پہلوان شمت نے چند لمبے توقف کے بعد کہا۔

”دیے کمزور اور تیز نظروں سے یاد آیا کہ یہ جو منڈا میری

ماش کرت ہے، اس کی نظر میں بھی کچھ بڑ ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”نہ غیبیت پوری طرح تاہر نہیں ہے۔ مجھ کو شک

ہے کہ اس کو کچھ دھکا ہے۔“

میں نے مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا۔ ”آپ خود ہی

تو کہتے ہیں کہ شک اور وہم کا علاج حکیم لقمان کے پاس بھی

نہیں تھا۔“

”وہم کا علاج ناہیں ہوتا لیکن وہم دور کرنے کا علاج

تو ہوتا ہے نا۔ اور میں نے یہ علاج سوچ لیا ہے۔ شام

تک تمہیں بتاؤں گا۔“

اسی دوران میں میرے سل فون پر کال کا میوزک

آنے لگا۔ میں نے کال ایڈیڈ کی۔ دوسری طرف سے کوئی

آواز نہیں آئی۔ میں ”ہیلو، ہیلو“ کہتا ہوا کمرے سے باہر نکل

آیا..... ”ہیلو کون؟“ میں نے دوسرے بار پوچھا، پھر فون بند

ہو گیا۔

پتا نہیں کیوں جب بھی کوئی ایسا فون آتا تھا دل

خواہ مخواہ ”بچہ“ بننے لگتا تھا۔ میں سوچنے لگتا تھا کہ کہیں یہ تاجور

کا فون تو نہیں ہے..... کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وہ مجھ سے کوئی

خاص بات کہنا چاہتی ہو..... یا پھر اس کے دل کی گہرائی میں

اب بھی کہیں میرے لیے کسک موجود ہو۔ وہ بھی کسی وقت

بے ساختہ یادوں کے دھارے میں بہہ جاتی ہو؟ لیکن ہر بار

ایسا ہی ہوا تھا کہ بعد میں یہ فون کال کسی اور کی نکلتی تھی۔

سلسلہ منقطع ہونے کے بعد میں حجاد کی عیادت کے

لیے چلا گیا۔ اسے دیکھ کر دل جیسے ٹپکنے لگا تھا۔ اسے حوصلہ

تسل دینے کا کوئی لفظ بھی جو سمجھا نہیں تھا۔ ڈاکٹر کے مطابق

اس کی آنکھیں مستقل طور پر ضائع ہو چکی تھیں۔ میری

موجودگی کے دوران میں ہی حجاد کو خورسہ کا فون آ گیا۔ وہ

اس کی کال سننے میں مصروف ہوا تو میں اٹھ کر رضوان کے

پاس چلا گیا۔ اس کے جسم کے جن حصوں سے گوشت کاٹا گیا

تھا وہاں پلاسٹک سرجری اور اسکن گرافٹنگ کی ضرورت تھی۔

یہ سہولتیں یہاں تو مہیا نہیں ہو سکی تھیں۔ فی الوقت تو اسے

انتھار ہی کرنا تھا اور بید ریٹ کرنا تھا۔

دور کہیں عمارت کے عقبی حصے سے چلانے اور

ہوا۔ پہلوان جی کہیں چل ہی تو نہیں بے تھے۔ آگے جا کر دیکھا، اس کی آنکھیں مکلی ہوئی تھیں اور وہ حیات تھا۔ میری طرف دیکھ کر فرمایا۔ ”یارا عجیب نکلے ہو، ایک وظیفہ پڑھ رہا تھا۔ اب شروع اسٹارٹ سے پڑھنا پڑے گا۔ ایسے کاموں میں غفلت کرنا بہت خطرناک ہودت ہے۔ کچھ ہوائی چیزیں بالکل اُن پڑھ ہودت ہیں۔ وہ ان تعویذوں وغیرہ کو ناہیں پڑھ سکتیں جو ہم نے یہاں دروازوں پر چسپاں کر رکھے ہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے ہمیں کے سامنے رادھا ناچ رہی ہو۔ ایسی ہوائی چیزوں کے لیے ڈائریکٹ دفاع وغیرہ پڑھنے پڑتے ہیں۔“

میں پہلوان شمت کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔ حال چال پوچھا لیکن پہلوان کی سُٹی وہیں بندر یا لوسی اور اس کی موت والے واقعات پر اُچی ہوئی تھی۔ میں نے مختصر الفاظ میں پہلوان کے گوش گزار کیا کہ مندر میں اور پھر سون بکسر کی ایک کدو میں کیا واقعات پیش آئے۔ پہلوان جی تاجور کے حوالے سے بھی سوالات پوچھتے رہے۔ وہ کریڈ کریڈ کر یہ جاننے کی کوشش فرماتے رہے کہ اس ”پانچ روزہ ساتھ“ میں میرے اور تاجور کے درمیان کس طرح کی گفتگو ہوئی ہے۔ آخر میں ایک طویل سانس لے کر اسے دوشعر پڑھے۔

کہ گھاس ہوئی ہیں یہ آنکھیں تو ناحق

کہ ویران راہوں کو دیکھیں گے کب تک

خبر کوئی اچھی تو آتی نہیں ہے

بیکار دل دھڑکتا ہے ٹھکا ٹھکا ٹھکا

میں نے واہ واہ کہہ کر پہلوان کی تھوڑی سی دلجوئی کی

اور ٹھکا ٹھکا کی تعریف کی۔ وہ کھوئی کھوئی سی نظروں سے

کھڑکی سے باہر کا جائزہ لینے لگے۔ لگا ہیں اور پر آسمان کی

طرف اُچی ہوئی تھیں۔ فرمایا۔ ”دیکھو ابھی تک پرندوں کی

طرف سے خیر خیریت ہے۔ حالانکہ وہ ہمیں اور خاص طور

سے تمہیں اور قسطنطنیہ وغیرہ کو ہر طرف ڈھونڈتے پھرتے ہوں

گے۔“

”داؤد بھاؤ نے یہ جگہ بڑی اچھی چنی ہوئی ہے چاچا

شمت۔ یہ داؤد بارڈر کا علاقہ ہے۔ شہر سے دور۔ یہ جگہ

کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتی۔“

”لیکن ان ہوائی چیزوں کو سارے پلٹر آتے ہیں

شاہ زیب..... اور اب تو یہ ویسے بھی طوطوں اور چکا ڈوں

کے ہمیں میں ہیں۔ شاید تم کو معلوم ناہیں کہ دن کے وقت

چکا ڈوں کی نظر جتنی کمزور ہودت ہے، رات کو اتنی ہی تیز ہو

جات ہے۔ یہ اُڑتے وقت بہت دور دور تک دیکھ سکت

پکارنے کی کردہ آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میری طرح رضوان بھی ان آوازوں کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف کا سایہ ساہرا گیا بولا۔ ”شاہ زیب صاحب! یہ تو ٹیکساری کا کوئی شیطان لگتا ہے؟“

”ہاں..... باقی تو سارے وہاں ٹیلوں میں مارے گئے تھے۔ ان میں سے ایک کو پکڑ کر یہاں لاہور لے آئے ہیں۔ بڑی حفاظت سے ایک لاک آپ میں رکھا ہوا ہے۔“ رضوان کا خوف کچھ کم ہوا۔ اس نے پوچھا۔ ”اور ان کی وہ حرام زادی بہن..... جو رائے ونڈ والی کوشی میں دندنا تی پھرتی تھی؟“

”اس کا نام ریڈ کیٹ تھا۔ وہ بھی اپنے انجام کو پہنچ گئی ہے۔ اس میں اور قسطیہاں میں بڑے زور کارن پڑا تھا۔ اپنی بار سائے دیکھ کر اس نے عیاری کی اور میں نے اس کی کھوپڑی اڑا دی۔“

اس واقعے کی تفصیل نے رضوان کو خوش کیا۔ میری نگاہوں کے سامنے وہ منظر گھوم گیا، جب میں اور رضوان اسٹریچر نما کرسیوں سے بندھے ہوئے تھے۔ رات کی خاموشی میں ریڈ کیٹ پیچھے سے رضوان پر چڑھ دوڑی تھی۔ نیشے میں دھت وہ خود بخود رضوان کو اپنے ”ذہب“ پر لانے کی جارحانہ کوشش کرتی رہی تھی۔ بہر طور اب یہ سب کچھ ماضی کا حصہ بن چکا تھا۔

”اب اس شیطان زادے کا کیا کریں گے؟“ رضوان نے پوچھا۔

”اے مار کر اس کا پوسٹ مارٹم کریں گے اور دیکھیں گے کہ ان کی شیطانیت کس میٹرل سے بنی ہوئی ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”آپ مذاق کر رہے ہیں لیکن سچی بات تو یہی ہے کہ یہ سارے انسان نما جانور جتنی جلدی تلف ہو جائیں اتنا ہی بہتر ہے۔“

میں نے اس حوالے سے رضوان کو تسلی دی۔ وہ ذرا توقف کر کے بولا۔ ”قسطیہا صاحبہ صبح آئی تھیں میری عیادت کرنے۔ اتنی کم عمری میں وہ اپنے علاقے کی فوج کی کمان کر رہی ہیں، یہ بہت بڑی بات ہے۔“

”اپنے والد کی موت کے بعد اس کی شخصیت ایک بالکل مختلف سانچے میں ڈھل چکی ہے رضوان، اس کے سینے میں ایک فولادی دل دھڑکتا ہے۔“

”لیکن وہ کچھ رنجیدہ ہے بھی لگ رہی تھیں۔ شاید اس لیے کہ ابھی تک ان کے شوہر کا کچھ پتا نہیں چلا۔“

”ہاں، یہ ایک مختلف معاملہ ہے۔ کمانڈر فارس جان اور خرا بھی تک لاپتا ہیں لیکن ان کی تلاش جاری ہے۔ ویسے وہ دونوں ترنوالہ نہیں ہیں۔ ٹھیکل داراب اور اس کے کرائے کے ٹھوڈوں کو کتنی کا تاج بچا سکتے ہیں۔“

شام کو ایک بار پھر پہلوان حشمت کی طرف میرا جانا ہوا۔ جناب اسی طرح کروٹ کے بل لینے اخبار میں فلموں کے اشتہار دیکھ رہے تھے۔ ان کی چار پانی کے نیچے پانی کی طرف پانچ سو کا ایک نوٹ پڑا تھا۔ غالباً پہلوان جی کے ٹکے کے نیچے سے پھسل کر یہاں پہنچ گیا تھا۔ پہلوان کو ذرا ستانے کے لیے میں نے نوٹ اٹھا کر چب میں ڈال لیا۔

پہلوان اخبار دیکھنے میں اتنے مگن تھے کہ مجھے ٹھنکنا کر نہیں اپنی طرف متوجہ کرنا پڑا۔ انہوں نے بدک کر اخبار کو ایک طرف رکھ دیا۔ تجھیری انداز میں فرمایا۔ ”اخبار تو خبروں کے لیے ہوتے ہیں لیکن اس میں بھی ایسے واہیات اشتہار دے دیوت ہیں کہ لگتا ہے کہ ادنٹ کے منہ میں زیرہ دے دیا ہے۔“

”آپ کا مطلب ہے کہ اشتہار زیادہ ہونے چاہئیں؟“

”یار محاورے میں بات کر رہا ہوں۔ تمہاری اردو ابھی بھی کافی کمزور ہے۔“

میری کمزور اردو یہی بتا رہی تھی کہ ادنٹ کے منہ میں زیرہ کا مطلب ہوتا ہے ضرورت سے بہت کم، لیکن اگر میں یہ بات پہلوان سے کہتا تو پھر بہت لمبی بحث چمڑ جاتا تھی، لہذا خاموش رہنا ہی مناسب لگا۔

پہلوان جی سے ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔

زینب کی یہاں آمد اور اس کی آسودہ حالی نے پہلوان کو نہال کر دیا تھا۔ وہ چاند گڑھی کی جینی تھی اور چاند گڑھی کا ہر فرد ایک طرح سے پہلوان کے گھر کا فرد تھا۔ پہلوان نے سیف اور اس کی بے آسرا بہنوں کے حوالے سے بھی پوری خیر خبر رکھی ہوئی تھی۔ پہلوان کے توسط سے مجھے پتا چلا کہ

سیف کی بڑی بہن شازیہ کی شادی ہو گئی ہے۔ یوں شازیہ کی چھوٹی بہنوں کو اپنے خوش اخلاق جیسا اکبر کی شکل میں بھائیوں جیسا آسرا مل گیا ہے۔ سیف کے گھرانے کی خیر سلامتی کا سن کر مجھے دلی سکون ملا تھا۔ تاجور نے بھی تو بچھڑنے سے پہلے یہی کہا تھا کہ میں سیف کی بے آسرا فیملی کا خیال رکھوں، اگر اس فیملی کو کوئی تکلیف پہنچے گی تو یہ تکلیف وہ خود بھی محسوس کرے گی چاہے وہ کہیں بھی ہو۔

میری اور پہلوان کی اہلی پھلی گفتگو کے دوران میں

پہلوان جی ہکا بکا میری طرف دیکھتے چلے جا رہے تھے۔ میں نے کہا۔ ”آپ نے بڑی جلد بازی کی۔ کسی گناہ کے بغیر بے چارے کی درگت بتادی۔“

اب پہلوان کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس کے ساتھ ہی کمر کا درد بھی نمودر آیا۔ وہ کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے اور کراہتے ہوئے ایک کرسی پر فروزش ہو گئے۔ رنگ ایک دم ہی چلا پڑ گیا تھا اور آنکھوں سے شدید ترین ندامت جھانکنے لگی تھی۔ کچھ دیر تک خاموش رہ کر اپنی سانس درست کیں اور پھر فرمایا۔ ”یہ تو بہت بڑی زیادتی ہو گئی مجھ سے..... میں سمجھتا ہوں کہ تم نے بھی غلطی کی۔ اگر لوٹ اٹھا لیا تھا تو مجھے بتا دیتے۔“

”چاچا! مجھے کیا پتا تھا کہ آپ اس طرح ہند لگائے بیٹھے ہو..... اب تو جو ہوتا تھا ہو گیا۔“

”لیکن میں خود کو بالکل معاف نہیں کر سکوں گا۔“ پہلوان نے کہا اور پیشانی پر پسینے کی نمی دکھائی دینے لگی۔ پہلوان حشمت کی نرم دلی اور انسان دوستی ہر شے سے بالاتر تھی۔ اب وہ جو شدید قسم کی پیشانی محسوس کر رہے تھے وہ بھی ان کی انہی خوبیوں کی غماز تھا۔ ان کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اب وہ جلد از جلد ”معزوب“ کو تلاش کر کے اس سے معافی طلبی کرنا چاہتے ہیں۔ عین ممکن تھا کہ وہ اس کے پاؤں پر سر بھی رکھ دیتے۔

پہلوان حشمت کو ان کے حال پر چھوڑ کر میں اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ تیز ہوا چل رہی تھی۔ بھی کبھی بارش کے چھینٹے بھی پڑ جاتے تھے۔ یہ سردی کی پہلی دسک تھی۔ اکتوبر کا مہینہ بدلتے موسم کی نوید لا رہا تھا۔ موسم کی ایسی کروٹ دل و دماغ میں عجیب سا گداز جگا دیا کرتی ہے۔ ایسا گداز جس میں سوز اور اداسی کی ہلکی سی آنچ بھی ہوتی ہے۔ مجھے میرے بچھڑنے والے یاد آئے۔ میری چچا زاد بہن فائزہ اور بیٹی آمنہ۔ پھر زادقند نازک بدن جانان، جس کے رگ و پے میں شعریت رہی تھی اور جو اپنے دل میں فی دی کی ایک نامور اداکارہ بننے کی آرزو رکھتی تھی۔

اب وہ بردناتی سے آگے ایک جزیرے میں، پام کے بلند درختوں میں گھرے ہوئے کسی قبرستان میں سو رہی تھی.....

اور پھر بختاب کا رنگ رکھلا گبرو سیف..... جسے کبڈی میں کوئی پکڑ نہیں سکتا تھا۔ وہ ہر گرفت سے نکل جاتا تھا..... وہ میری گرفت سے بھی نکل گیا تھا اور نونو مٹی کے بچے سو گیا تھا اور پھر انیق..... چلیلا..... کھلڈر..... بظاہر ریشم کی طرح نرم لیکن دشمنوں کے لیے فولاد۔ میرا ہمدرد، میرا عکسار، اب

ہی پہلوان کا مایا بھی آ گیا۔ وہ اسی طرح دیواروں کو ٹھونک ہوا اندر داخل ہوا۔ سلام دعا کے بعد اس نے الماری کے اندر سے مطلوبہ تیل اور ہلدی میں بھگوئی ہوئی روٹی وغیرہ نکالی۔

پہلوان حشمت کی حالت پہلے سے یقیناً بہتر تھی۔ انہوں نے خود ہی کروٹ بدلی اور پھر تنکے سے تنک لگا کر بیٹھ گئے۔ میں نے سمجھا کہ وہ مائل کرانے کے لیے بیان وغیرہ اتارنا چاہ رہے ہیں مگر وہ تو دائیں بائیں جھاک رہے تھے اور بار بار چار پائی کے نیچے بھی دیکھ رہے تھے۔ جب ایک دم ان کے تاثرات بدل گئے۔ کمر درد کی پروا کیے بغیر وہ اٹھ کھڑے ہوئے تاہنا مایا کے گریبان پکڑ کر ایک جھانپڑ اس کے سر پر مارا۔

مایا نے فریاد بند کی۔ ”میں نے کیا کیا ہے؟ کیوں مار رہے ہیں مجھے؟“

پہلوان جی دھاڑے۔ ”فراڈ ہے..... چکر باز..... آؤ کا بیٹھا سمجھا ہوا ہے مجھے۔ تیری تو ایسی کی تھی۔ مجھ کو پہلے ہی شک تھا کہ تو پورا تاہنا نہیں ہے کچھ نہ کچھ نظر آت ہے تجھے۔“

مایا چلتا تا رہا لیکن اسی دوران میں دو تین مزید دوہتر اسے پڑ چکے تھے۔ پہلوان نے اڑکھ لگا کر اسے چار پائی پر گرایا اور اندھا دھند اس کے اوپر چڑھنے کی کوشش کی۔ ظاہر ہے کہ چار پائی نے ٹوٹا ہی تھا اور وہ ٹوٹ سکتی۔

ایک دم ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ کچھ دیر پہلے پانچ سو کا جو ٹھٹھ میں نے چار پائی کے پاس سے اٹھایا تھا، وہ پہلوان نے مایا کے ”تاہنا بنان“ چیک کرنے کے لیے جان بوجھ کر گرارکھا تھا۔ اب ٹوٹ کو اپنی جگہ موجود نہ پا کر پہلوان کو آنا فانا شدید پیش نے گھیر لیا تھا۔ میں بمشکل پہلوان اور مایا کے درمیان آیا اور پھر پانچ سو کا ٹوٹ پہلوان کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ پہلوان نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

میں نے کہا۔ ”چاچا حشمت! یہ دیکھو یہ رہا آپ کا ٹوٹ۔“

پہلوان کی گرفت ڈرا ذیلی ہوئی تو آفت زدہ ملازم پہلوان کے نیچے سے نکلنے میں کامیاب ہوا اور دیوانہ وار دروازے کی طرف لپکا۔ چونکھتے سے اس کی سخت مگر ہوئی۔ وہ لڑکھڑا کر لیکن اس نے وقت بالکل ضائع نہیں کیا اور دوبارہ اٹھ کر بھاگ گیا۔

”تاجور تم یہاں؟“ میں بمشکل کہہ سکا۔

اب تاجور نے اوڑھنی کا قلاب ہٹا دیا تھا اور چہرہ صاف نظر آرہا تھا۔ شرم، خوف اور دکھ کے احتراز نے اس کے دلکش چہرے کو ایک پیکا سارنگ دے دیا تھا۔ وہ خود کو بمشکل بولنے پر آمادہ کر سکی۔ ”داؤد صاحب! مجھے یہاں لے آئے ہیں۔“

”کہاں؟“ میں نے بے پناہ حیرت سے کہا۔

”اسلام آباد سے۔ وہاں دارج اسپتال میں داخل ہیں۔ میں ان کی دیکھ بھال کے لیے وہاں تھی۔“ دارج کا نام لیتے ہوئے تاجور کے چہرے پر ایک ناگوار سایہ سالہرا گیا۔

”تمہارا مطلب ہے تاجور..... کہ داؤد بھاؤ نے تمہیں وہاں سے انخوا کر یہاں پہنچایا ہے؟“

اس نے سر جھکا یا اور نفی میں ہلایا۔

میری حیرت بڑھتی جا رہی تھی..... ”تو اس کا مطلب ہے..... تمہاری..... اپنی مرضی..... مجھی.....؟“

وہ خاموش رہی۔ بس اس کا سر اسی طرح جھکا رہا۔ اس کا انداز گواہی دے رہا تھا کہ میرے اس سوال کا جواب بھی اثبات میں ہے۔ اس سے یہ مطلب بھی لیا جاسکتا تھا کہ داؤد بھاؤ اور تاجور میں رابطہ ہوا ہے اور تاجور نے اس سے مدد طلب کی ہے۔

وہ عجیب دھمی لہجے میں بولی۔ ”شاہ زیب! اب یہ سب برداشت کرنا میرے بس میں نہیں رہا۔ ان کا رویہ خراب سے خراب ہوتا جا رہا ہے۔ لگتا ہے کہ وہ اب اپنے ہوش و حواس میں ہی نہیں ہیں۔ یہاں تک کہ اپنی والدہ کی موت کا ڈنٹے دار بھی مجھے ہی گردان رہے ہیں۔ بیارہونے کے باوجود مجھ سے ایسا سلوک کر رہے ہیں کہ.....“ وہ قہرہ مکمل نہ کر سکی اور سسکی گئی۔ میں خاموش اور ساکت کھڑا تھا۔

کچھ دیر بعد تاجور نے جیسے دوبارہ اپنے اندر بولنے کی طاقت بھال کی اور عجیب باغیانہ لہجے میں کہا۔ ”میں اس شخص کے ساتھ اور نہیں رہ سکتی۔ میں نے بہت جھجلا ہے، اب اور نہیں جھیل سکتی۔ وہ میری برداشت آزمائے کے لیے ایک حد کے بعد دوسری حد مقرر کر دیتا ہے۔ م..... مجھے لگتا ہے کہ میں مزید اس کے ساتھ رہی تو اپنے ہوش و حواس بھی کھو بیٹھوں گی۔“

اس کے چہرے پر اب زردی کے بجائے سرخی تھی۔ وہ پھلکی بار دارج کے لیے ”آپ اور ان“ کی جگہ ”وہ اور اس“ کے الفاظ استعمال کر رہی تھی۔ میرے ذہن میں آیا کہ

میرے پاس خطہ اس کی یادیں تھیں..... اور وہ قرض تھا جو وہ میرے اوپر چڑھا گیا تھا۔ اپنی جان کا قرض..... اور پھر تاجور..... بے شک وہ زندہ سلامت تھی اور اس کی سلامتی مجھے ہر شے سے بڑھ کر عزیز تھی، لیکن وہ بھی تو میری زندگی سے نکل چکی تھی، اس سے وابستہ بے شمار خوشیوں و شیریں یادیں ہوا کے جموں میں بس کر آئیں اور اکتوبر کی اس خشک رات میں میرے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ گئیں..... میرے سینے کی بھڑکتی ہوئی آگ میں اپنے ہاتھ تاپنے لگیں..... جیسے وہ یادیں نہ ہوں، شہرے ہوئے دیہاتی بچے ہوں۔

میں اسی طرح دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا۔ تجڑ ہوا کی وجہ سے کمرے میں لگے ہوئے دوا زنجی سیدھی چلی گئیں جھپکاتے ہوئے محسوس ہوئے تھے۔ غنودگی کی مجھ پر طاری ہونے لگی۔ اسی غنودگی میں تجڑیل اور تصور کا مکمل بھی جاری رہا۔

اچانک دروازے پر کسی نے بھاری ہاتھ سے دستک دی۔ میں نے وال کلاک دیکھا۔ رات کے بارہ بج چکے تھے، اس وقت کون ہو سکتا تھا۔ ”کون؟“ میں نے بلند آواز میں پوچھا۔

”میں ہوں شاہ زیب! دروازہ کھولو۔“ داؤد بھاؤ کی آواز نے مجھے بڑی طرح چونکا دیا۔ پتا نہیں کہ وہ کب یہاں فارم ہاؤس میں واپس آئے تھے۔

میں نے چنل کھینٹی اور جلدی سے جا کر دروازہ کھولا۔ داؤد بھاؤ ہمیشہ کی طرح پینٹ کوٹ میں تھے۔ ان کے ساتھ ایک لڑکی جو میرا پاپا چادر میں لپیٹی ہوئی تھی۔

میں نے سوالیہ نظروں سے بھاؤ کی طرف دیکھا۔ وہ بہت کم مسکراتے تھے لیکن عجیب انداز میں ہلکی سی مسکان ان کے ہونٹوں تک آئی۔ بولے۔ ”یہ تم سے ملنے آئی ہے۔ بات کرو اس سے۔“ پھر انہوں نے لڑکی کو اشارہ کیا کہ وہ قدم اٹھا کر ذرا آگے چلی ہوئی میرے کمرے میں چلی آئی۔

داؤد بھاؤ نے مفتی خیر انداز میں میری طرف دیکھا اور کچھ کہے بغیر دوسری طرف چلے گئے۔ میں چند سیکنڈ تک تدبیب کے عالم میں بھی لوکی اور کبھی داؤد بھاؤ کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر دروازہ بند کیا اور لڑکی کی طرف متوجہ ہوا۔ اب وہ روشنی میں تھی۔ اس کی طرف دیکھ کر مجھے اپنے ارد گرد کی ہر شے دکھانے کے سامنے کوئی محسوس ہوئی..... وہ تاجور تھی..... اس کی طویل اوڑھنی بارش سے بھیگی ہوئی تھی، وہ کچھ سردی..... اور کچھ شاید اضطراب کی وجہ سے لرز رہی تھی۔

انگاہ

میرے جسم سے بہت تھا۔ اس کے ریشی رخسار میری گردن کو اور میرے چہرے کو چھو رہے تھے۔ اس کے بالوں کی لٹیں..... اس کے چہرے پر نہیں میرے چہرے پر جھول رہی تھیں۔

اچانک میں نے ایک شدید دھچکا سا محسوس کیا۔ میں اسی طرح دیوار سے ٹک لگائے بیٹھا تھا۔ باہر سرکش ہوا میں چٹکھاڑ رہی تھیں۔ کمرے میں میرے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ فنودہ حالت میں دیوار سے ٹک لگائے لگائے میرا تصور مجھے کہیں کا کہیں لے گیا تھا۔ یہ تصور اتنا طاقتور تھا کہ مجھے ہر منظر نگاہوں کے سامنے دکھائی دیا تھا۔

میں نے ایک گہری دکھ بھری سانس لی اور اپنی خالی ہاتھوں کو دیکھا۔ اب میری ان ہاتھوں تک کس نے آتا تھا؟ جس نے آتا تھا اس میں اتنی ہمت نہیں تھی۔ وہ معاشرے سے اور اپنے حالات سے ٹکرا نہیں سکتی تھی۔ وہ اپنی ایک غلطی اور غلط فہمی کی وجہ سے ایک جذباتی فیصلہ کر گزری تھی۔ اب اس جذباتی فیصلے کی سزا اس کے ساتھ ساتھ مجھے بھی بھگتنا تھی۔ شاید ایسی لیے شاعر نے کہا تھا.....

یہ جدائیوں کے راستے بڑی دور تک لے گئے ہیں

جو گیا پھر نہ آیا میری بات مان جاؤ
اچانک میرے سب فون پر کال کے سکتل آئے۔ میں نے کال ریسیو کی اور دوسری طرف کی آواز سن کر جیسے اچھل پڑا۔ یہ فخر بول رہا تھا..... ہاں یہ فخر ہی تھا۔

”فخر کہاں ہو تم؟ خیریت سے تو ہو؟“ میں نے بیجانی انداز میں پوچھا۔

”ابھی تک تو خیریت سے ہوں..... آئندہ کا کچھ کہہ نہیں سکتا..... لیکن سب سے پہلے مجھے ایک بات بتائیں..... آپ نے فارس جان کو تو نہیں دیکھا؟“

”نہیں فخر، لیکن وہ تو تمہارے ہی ساتھ تھا۔“ میں نے تعجب سے کہا۔

”وہ ہمارے ساتھ نہیں تھا شاید زب اور اگر تھا بھی تو اب نہیں ہے۔“ فخر کے لہجے سے گہرا دکھ جھلک رہا تھا۔ ایک دم میں کانپ گیا۔ ”کیا کہہ رہے ہو فخر، کل کر بتاؤ۔“

وہ دلی دلی اور ہانپی ہوئی سی آواز میں بولا۔ ”ایک بات بڑے دھیان سے سن لو شاہ زب اور دوسروں کو بھی بتا دو۔ فارس جان کی طرف سے پوری طرح چوکس رہیں۔ وہ ہمارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے..... اور وہ کسی بھی

دارج کے زیادہ بڑے روئے کی وجہ شاید وہ واقعہ بھی ہے جب چند دن پہلے تاجور نے کھوہ میں میری جان بچانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

ذہن میں بہت سے سوالات چٹکھاڑ رہے تھے..... لیکن وہ ابھی تک کمرے کے وسط میں گیلی چادر اوڑھے کھڑی تھی اور کانپ رہی تھی۔ میں نے اس کے لیے بستر سے صاف چادر اتاری اور اس سے کہا کہ وہ اپنی گیلی چادر بدل لے۔

چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد اس نے گیلی چادر جسم سے علیحدہ کر دی اور دوسری چادر کی طرف ہاتھ بڑھائے۔ یہ تین چار سیکنڈ کا وقفہ میری نگاہ کے لیے خیرہ کر گیا۔ بہت عرصہ ہوا میں نے تاجور کو توجہ سے دیکھنا چھوڑ دیا تھا لیکن وہ جو کچھ تھی اس کو تو کوئی بدل نہیں سکتا تھا۔ ایک بیابان ہونے کے باوجود وہ ایک واہیات شخص کی دسترس میں ہونے کے باوجود وہ اب بھی چاند گرمی کی الہذا رہی تھی۔

ذرا نرم ہال..... چاند سی پیشانی..... گہری سیاہ آنکھیں..... کانوں میں گول آؤریزے جو کل رنگ رخساروں پر ڈکھکاتے تھے اور اس کے نیچے لمبی شفاف گردن.....

کشادہ شانوں کی وجہ سے گردن کی خوب صورتی میں اضافہ ہوتا تھا اور اس میں ہیرے کی ایک ”جین“ جھلکتی تھی۔ وہ ہاف سیلیدو الی کڑھائی دار سیاہ لباس میں تھی۔ بازوؤں کو سٹیک مرمر سے تھپتھپ دی جا سکتی تھی، مگر سٹیک مرمر میں ایک نظر نواز سرخی کا ٹکس تو نہیں ہوتا اور نہ اس کے بے مثل چمک ہوتی ہے۔

سیرت پاؤہ کی شاعر کی غزل تھی..... کسی ماہر فن مصور کی تصویر تھی..... اس شاہکار تصویر پر بس ایک چھوٹا سا عارضی دھماکا نظر آرہا تھا..... یہ اس کے کندھے کا وہ ڈھم تھا جو چند روز پہلے کھوہ میں ڈیز ہاؤنڈز کی پورش کے وقت لگا تھا۔ وہاں ایک بیڑی تاج نظر آ رہی تھی۔

میں نے دیکھا تاجور کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ اس کی ناک سرخ ہوئی جا رہی تھی۔ کچھ عجیب سی کیفیت تھی اس کے چہرے پر۔ پھر وہ بیجانی انداز میں میری طرف بڑھی اور میری ہاتھوں میں آگئی۔ سبک کر بولی۔ ”میں اب اس جنونی کے ساتھ اور نہیں رہ سکتی۔ مجھے کہیں لے جائیں شاہ زب! کہیں بہت دور..... جہاں اس کی آواز مجھ تک نہ پہنچ سکے..... جہاں اس کی ہوا بھی مجھے نہ چھو سکے..... پلیز شاہ زب۔“

وہ مجھ سے یوں چٹنی ہوئی تھی، جیسے ڈوبنے والا زندگی بچانے کے لیے کسی سہارے سے چپٹا ہے۔ اس کا گداز جسم

وقت تم لوگوں کو اپنے آس پاس نظر آسکتا ہے۔“ اس نے ایک لمحہ توقف کیا اور مجھے لہجے میں بولا۔ ”تم خلیک سمجھ رہے ہو شاہ زیب! وہ ہاناوانی کا شکار ہو چکا ہے..... میں اس وقت..... تمہیں زیادہ تفصیل نہیں بتا سکتا۔ کیونکہ خود بھی مصیبت میں ہوں۔ بس یہ جان لو کہ فارس جان ایک ایسے گائیڈ میزائل کی طرح ہے جسے ہاناوانی نے ہم لوگوں کی طرف چھوڑا ہے۔“

میں سنا نے میں تھا اور فخر کی آواز سن رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ فخر کہیں چھپا ہوا ہے اور اس کے ارد گرد کسی طرح کا خطرہ موجود ہے۔

میں نے کہا۔ ”فخر، تم اس وقت کہاں ہو؟“

وہ بولا۔ ”میں ہاناوانی کے تنخواہ دار قاتلوں سے چھپتا چھپاتا یہاں بارڈر کی طرف نکل آیا ہوں لیکن اب مجھے فارم ہاؤس کے راستے کا پتا نہیں چل رہا۔ میرے پاؤں پر چوٹ بھی لگی ہوئی ہے۔ میرا منگھوک حلیہ دیکھ کر کچھ دیہاتیوں نے میرا پیچھا کیا۔ میں یہاں ایک ٹیوب ویل کے کمرے میں پرانی کے ڈیمیر میں چھپا ہوا ہوں۔ میرا اندازہ تو یہی ہے کہ یہ جگہ فارم ہاؤس سے بہت زیادہ دور نہیں ہے۔“ وہ بڑی طرح کھانسنے لگا۔

میں نے کہا۔ ”خلیک ہے فخر، تم اپنی جگہ موجود رہو۔ میں ایک مقامی بندے کو بلاتا ہوں۔ تم اسے اپنی لوکیشن کے بارے میں بتاؤ۔ میرا خیال ہے کہ ہم تمہیں جلد ڈھونڈ لیں گے.....“

”خلیک ہے شاہ زیب! میں انتظار کرتا ہوں۔ فون آن ہے لیکن ایک بار پھر فارس کی طرف سے خبردار کر رہا ہوں۔“

”اوکے، میں تمہیں دوبارہ کال کرتا ہوں۔“ میں نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

فارس کا سن کر سینے میں چنگاریاں سی چھوٹ گئی تھیں۔ فخر کی باتوں سے اشارہ ملتا تھا کہ وہ ہاناوانی کے مہلک ٹرانس کا شکار ہو چکا ہے لیکن سوچنے کی بات یہ تھی کہ کیا وہ یہاں فارم ہاؤس تک پہنچ سکتا ہے۔ فخر اور فارس صرف ایک بار اس فارم ہاؤس میں آئے تھے اور پھر یہاں سے میرے ساتھ ہی کلرک ہار کی طرف گئے تھے۔ اگر فخر کو اس الگ تھلک فارم ہاؤس کا راستہ یاد نہیں رہا تھا تو یقیناً ممکن تھا کہ فارس کو بھی یاد نہ رہا ہو۔

میں فارم ہاؤس کے ہیڈ مانی اشرف اتچونک پہنچا۔ اتچونک نے کوئی یہاں کا ہیڈ مانی تھا لیکن حقیقت میں وہ کراچی

اور حیدر آباد میں تین چار قتل کرنے کے بعد یہاں پایا جا رہا تھا۔ اس فارم ہاؤس کے تقریباً سارے ملازم ہی اپنی اپنی جگہ ”پہنچی ہوئی ہستیاں“ تھے۔ میں نے فون پر اچھوکی بات فخر سے کرائی۔ فخر نے جو نشانیاں بتائیں ان کے ذریعے اچھونے دونٹ کے اندر ہی اس کی لوکیشن کا اندازہ لگا لیا۔

داؤد بھادڑ تو فارم ہاؤس میں موجود نہیں تھا۔ میں نے لودھی کو ساری صورت حال بتائی۔ لودھی نے فوراً ایک جیب مہیا کر دی۔ لودھی کا کہنا تھا کہ وہ اتچونک وغیرہ کے ساتھ جا کر خود فخر کو لے آتا ہے لیکن میں نے خود جانا مناسب سمجھا۔ بہر حال جانے سے پہلے میں نے ہماری دل کے ساتھ لودھی کو فارس جان کے حوالے سے آگاہ کر دیا۔ لودھی، فارس جان کو شکل سے نہیں جانتا تھا لہذا مزید احتیاط کے لیے ضروری تھا کہ میں قسطنطیا کو بھی صورت حال سے بے خبر نہ رکھتا۔ یہ ایک دشواری کا کام تھا۔ میں قسطنطیا کے پاس پہنچا اور تھوڑی سی تشہید باندھنے کے بعد اسے مناسب لفظوں میں وہ بات بتادی جو کچھ وہ پہلے فخر نے مجھے بتائی تھی۔

قسطنطیا کے چہرے پر کئی رنگ آکر گزر گئے لیکن آخری رنگ قوت برداشت اور حوصلہ مندی کا تھا۔ وہ ایک بے مثل کمانڈر تھی اور اپنے اندر ایک فولادی دل رکھتی تھی۔ تبسمیر لہجے میں بولی۔ ”شاہ زائب! کیا فخر نے..... خود..... فارس کو اس حالت میں دیکھا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”قسطنطیا! میری اس سے زیادہ بات نہیں ہو سکی۔ وہ خود بھی خطرے میں ہے۔ اس کے علاوہ وہ زخمی بھی ہے اور شدید بخار میں چپک رہا ہے مگر اس کی بات سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے خود فارس کو دیکھا ہے۔“ قسطنطیا نے ایک آہ بھری۔

میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔ ”قسطنطیا! یہ بات تو آپ بھی اچھی طرح سمجھ رہی ہیں کہ ہاناوانی کا ٹرانس کوئی مستقل چیز نہیں ہے..... اگر ٹرانس کا شکار ہونے والا زیادہ دیر تک ہاناوانی سے دور رہتا ہے تو پھر وہ اس کے ٹرانس سے نکل جاتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ایشیہ سے مستقل فون پر رابطہ رکھتی تھی..... میرے خیال میں پرندوں والی صورت حال بھی آپ کی نظر سے اوجھل نہیں ہوگی۔“

قسطنطیا نے سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھا۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”مندرجہ ذیل خانے میں طوطے مسلسل ہمارے ارد گرد موجود رہے۔

دھیرے دھیرے وہ ہمیشہ کمزور پرگنی جو ہاناوانی نے انہیں دے رکھی تھی..... اور میرے خیال میں یہی وجہ تھی کہ جب

تھا اور اس کے عقب میں فخر موجود تھا۔ وہ اپنی ایک ٹانگ پر زور دے کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا لباس میلہ پھیلا تھا اور سر پر بھی چوٹ کے آثار تھے۔ اس کا چہرہ سو جا سوتا تھا۔ وہ میرے گلے لگ گیا۔ وہ زخمی ٹانگ پر بوجھ نہیں ڈال پا رہا تھا۔ میں نے اس کا بازو اپنے کندھے سے اوپر رکھ کر اسے سہارا دیا اور آہستہ آہستہ چلا تاہو اوروازے کی طرف بڑھا۔

”اگر زیادہ مسئلہ ہے تو تمہیں اٹھالیتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”نہیں، میں ٹھیک ہوں۔“ فخر نے بوجھل آواز میں جواب دیا۔

اچانک رائل کے دو بہرل میری کمر سے آن لگے۔ اس کے ساتھ ہی ایک بڑی نارنج بھی روشن ہو گئی تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ یہ پینٹ شرٹ والے دو افراد تھے جن کے ہاتھوں میں جدید آٹونیک رائلٹیں تھیں۔ ایک تیسرے شخص نے اپنی رائلٹ اشرف عرف اچھو کے سر سے لگا دی تھی۔ نارنج بھی اسی شخص کے ہاتھ میں تھی۔

میں نے حیرت کے عالم میں فخر کی طرف دیکھا۔ اس کے سوجے سوجے چہرے پر بھج بھج سارنگ تھا۔ آنکھوں میں اجنبیت لٹکارتے مار رہی تھی۔ یہی لمحے تھے جب مجھ پر ایک اور حیرت ناک انکشاف ہوا۔ فخر کا جو بازو میرے کندھے پر دھرا تھا۔ اب وہ صرف میرے کندھے پر نہیں تھا۔ فخر نے اسے موڑ کر میری گردن کے گرد کس دیا تھا۔ اس کی یہ گرفت سخت سے سخت ہوتی چلی جا رہی تھی۔ میں نے تیزی سے اپنے پر بلا مسل کی طرف ہاتھ بڑھانا چاہا لیکن فخر نے پھرتی سے میری کلائی جکڑ لی۔

”نہیں..... نہیں..... تمہارا کھیل ختم ہو گیا شاہ زیب۔“ وہ بھنکارا۔

سینکڑ کے دوسوں حصے میں یہ بات میری سمجھ میں آگئی کہ یہ کیا ماجرا ہوا ہے۔ فخر دکار ہو چکا تھا۔

اچانک فار ہوا اور میں نے اشرف عرف اچھو کو کئے ہوئے شبیر کی طرح زمین پر گرے دیکھا، اسے شوٹ کرنے والے شخص نے بھی اپنی رائلٹ کا رخ میری طرف پھیر دیا۔ اپنے دونوں ساتھیوں کی طرح وہ بھی نقاب میں تھا۔ دہاڑ کر بولا۔ ”چالاکی دکھاؤ گے تو تم بھی مارے جاؤ گے۔“

دو تین سینکڑ کے لیے میں واقعی سکتہ زدہ رہ گیا تھا۔ میرے قدموں میں اچھو کی بے حرکت لاش پڑی تھی۔ کہیں خون کا قطرہ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن گولی یقیناً اس کے دماغ

ہم بنارس کے ساتھ شمشان گھاٹ کی طرف سے نکلے تو پرندوں نے ہماری طرف رخ نہیں کیا..... اس کا مطلب ہے کہ اگر ہم فارس جان تک پہنچ جاتے ہیں اور انشاء اللہ..... پنچیس کے تو پھر فارس جان زیادہ دیر اس بلا کے زیر اثر نہیں رہے گا۔“

قسطیلا کو تسلی دینے کے بعد میں، اشرف عرف اچھو اور دو دیگر افراد کے ساتھ جپ میں آ بیٹھا اور فارم ہاؤس سے روانہ ہوا۔ یہ رات کوئی ایک بجے کا گھل تھا۔ بارش بند ہو چکی تھی مگر تیر خنڈی ہوا اسی طرح فرائے بھر رہی تھی۔ اس علاقے کی پولیس میں بھی اچھو کا اثر درسون تھا۔ اسے اس امر کی مطلق پروا نہیں تھی کہ کہیں گشت کرتی ہوئی پولیس سے آہنا سامنا ہو جائے گا۔ ویسے بھی جس طرح کا موسم تھا اس کی ملاحات کا امکان کم ہی تھا۔

جپ پہلے نیم پختہ راستے پر پھنک لے کھاتی رہی، پھر ایک خشک ڈیک نالے کے ساتھ ساتھ چلتی ایک کچے راستے پر آ گئی۔ دونوں طرف کیت اور درخت تھے۔ یہ سفر میری توقع سے زیادہ طویل ثابت ہوا۔ بالآخر ہم ایک دورا ہے پر پہنچ گئے۔ اچھو نے اپنی پاٹ دار آواز میں کہا۔ ”سر جی! میرا خیال ہے کہ ایک بار آپ پھرفون کر کے تصدیق کر لیں کہ بائیں طرف ہی مڑنا ہے نا؟“

میں نے فخر سے دوبارہ کال ملائی اور تصدیق کی۔ ہم ٹھیک جا رہے تھے اور اس ڈیرے کے قریب پہنچ چکے تھے جہاں ٹیوب ویل کے کمرے میں زخمی فخر نے خود کو پھپھار کھا تھا۔

قریباً پانچ منٹ بعد ہم اس چھوٹے سے ڈیرے پر پہنچ چکے تھے۔ وہ مکمل طور پر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ بالکل خاموشی تھی، بس تیز ہوا کی ساکھیں ساکھیں جھجکھجکھ کر رہی تھیں۔ وغیرہ کے درختوں کو دو بیوانہ اور جھونے پر مجبور کر رہی تھی۔ اچھو خود ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ اس نے ڈیرے پر پہنچنے سے پہلے ہی گاڑی کی ہیڈ لائٹس آف کر دی تھیں۔ پھر اس نے انجن بھی بند کر دیا۔ کچھ آگے جا کر گاڑی رک گئی۔ میں اور اچھو نیچے اترے اور احتیاط سے ٹیوب ویل والے کمرے کی طرف بڑھے۔ اچھو کے ہاتھ میں چھوٹی نال کی رائلٹ تھی۔ ہم دروازے سے دو قدم دور ہی تھے کہ اندر سے فخر کی بھرائی ہوئی آواز ابھری ”آ جاؤ شاہ زیب، میں نے دیکھ لیا ہے۔“

میں نے پٹل نارنج روشن کی اور کوٹھڑی نما کمرے میں چلا گیا۔ یہاں ڈیزل کی بوتلی۔ ایک طرف پرالی کا ڈھیر

میں گھس چکی تھی۔

میا۔ وہاں اپنی ہندسی ہوئی تھی۔ میں نے آنکھیں پوری کھولیں۔ ہمت جمع کی اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ایسا کرنے سے سر پھوڑے کی طرح دکھنے لگا۔ یہ قریباً بارہ فٹ ضرب سولفٹ کا ایک چوکور کمرہ تھا۔ صرف ایک کھڑکی اور ایک آہنی دروازہ نظر آرہا تھا۔ میرے جسم پر وہی لباس تھا جو میں نے قارم ہاؤس سے روانہ ہوتے وقت پہنا ہوا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اب میرے پاؤں میں جوتے نہیں تھے۔ پاؤں کی طرف دھیان کیا تو یہ انکشاف بھی ہوا کہ میرا ایک ٹخا اسٹیل کی ایک چمکدار زنجیر میں جکڑا ہوا ہے۔ یہ خاصی طویل زنجیر تھی اور کسی اٹوٹے کی طرح بل کھا کر کمرے کے فرش پر پڑی تھی۔

بے ہوش ہونے سے پہلے کے سارے خیالات ایک دم ہزار ہا کردار غم میں گھس آئے۔ غم کی کال..... ہمارا قارم ہاؤس سے نکل کر ٹیوب ویل تک پہنچنا..... وہاں غم کے بارے میں خوفناک انکشاف۔ اشرف عرف اچھو کا مارا جانا اور پھر اندھا دھند فائرنگ۔

میں کھڑا ہو گیا اور آہنی دروازے تک پہنچا۔ چاروں طرف خاموشی تھی۔ میں نے دروازے کو ہاتھوں سے کوٹ ڈالا اور پلٹے آواز سے پکارا۔ ”کوئی ہے..... کوئی ہے یہاں؟“

بار بار کی رُشور دسک کے باوجود کسی طرح کا رد عمل ظاہر نہیں ہوا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہ پوری جگہ خالی ہے۔ آہنی دروازے کے بالکل نیچے ایک چھوٹا مشطیل خلا نظر آرہا تھا۔ اس خلا کو باہر سے بند کیا اور کھولا جاسکتا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ خلا کھانا وغیرہ اندر پہنچانے کے لیے ہے اور ابھی چند گھنٹے پہلے ہی بنایا گیا ہے۔ لوہے کی کنگک اور ویلڈنگ وغیرہ کی نشانیاں فرش پر دکھائی دے رہی تھیں۔

تھوڑی دیر مزید دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد میں فرش گدے پر آکر بیٹھ گیا۔ یہ کمرہ قسم کے فرنیچر سے خالی تھا۔ ایک سائز پر چھوٹا دروازہ نظر آرہا تھا جو یقیناً داش روم کا تھا..... یہ احساس ہے حد خوفناک تھا کہ میں ایک بار پھر خطرناک ساحرہ بانادانی کے قبضے میں آچکا ہوں۔ یکا یک غم کا خیال ذہن میں آیا اور دل رنج و دم سے بھر گیا۔ اب اس بات میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ وہ بھی بانادانی کا شکار ہو چکا ہے اور شاید اسی عمارت میں کہیں، ایسے ہی پابہ زنجیر موجود ہے۔

کتنا زبردست ہچکا دیا گیا تھا۔ فرانس کی حالت میں فخر نے ہمیں فارس جان کی طرف سے خبردار کیا تھا اور ہماری

تب مجھ پر انکشاف ہوا کہ دو مزید نقاب پوش ڈیرے میں جیسے ہوئے تھے۔ اچھو کو شوٹ کرنے والا ان سے مخاطب ہو کر حکم یہ انداز میں بولا۔ ”پکڑو باقیوں کو بھی۔“

باقیوں سے اس کی مراد وہی دو افراد تھے جو میرے اور اچھو کے ساتھ قارم ہاؤس سے یہاں پہنچے تھے۔ نقاب پوش ہماری جیب کی طرف بڑھے۔ یہی وقت تھا جب جیب کی طرف سے فائرنگ شروع ہو گئی۔ یقیناً اچھو کے دونوں ساتھیوں نے خطرہ بھانپ کر مزاحمت شروع کر دی تھی۔ آنا فائدہ دونوں طرف سے فائرنگ شروع ہو گئی۔

اچھو کو شوٹ کرنے والا نقاب پوش چلا یا۔ ”یہ جانے نہ پائیں۔“

میں نے ایک بار پھر فخر کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ اپنے فلوادی باز کا کھنچہ اس نے میری گردن کے گرد اور سخت کر دیا تھا اور یہ کھنچہ نہ بھی ہوتا تو مزاحمت کی کوشش ایک بڑی حماقت ہی کہلاتی۔ تین رائفلوں کے بے لول میرے سر اور کمرے سے لگے ہوئے تھے۔

اس دوران میں اندازہ ہوا کہ اچھو کے ساتھی جان بچانے کے لیے موقع سے فرار ہو رہے ہیں۔ اچھو کو گولی مارنے والا پھر دھاڑا۔ ”بھائی نہ دینا۔ جھڑی کا ٹاز برسٹ کرو۔“ فائرنگ کے دھماکوں سے قرب و جوار لرز رہے تھے۔ اندازہ یہی ہو رہا تھا کہ اچھو کے ساتھی موقع سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

یہی وقت تھا جب عقب سے میرے سر پر نہایت شدید ضرب لگائی گئی۔ لگا ہوں کے سامنے آن گت ستارے ناسخ گئے۔ دوسری ضرب نے مجھے ہوش دھواس سے بیگانہ کر دیا۔ ہوش کھونے سے پہلے جو آخری خیال میرے ذہن میں چمکا وہ یہی تھا کہ فارس شکار نہیں ہوا۔ فخر شکار ہوا ہے..... لیکن فارس کے سلسلے میں جو غلطی پھیل چکی تھی؟؟؟ پھر ہر خیال اندیرے میں ڈوب گیا۔

☆☆☆

میرے حواس بحال ہونا شروع ہوئے تو مجھے لگا کہ میں کافی دیر دنیا و بائینہا سے بے خبر رہا ہوں۔ ارد گرد کی ہر شے دھندلائی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ میں کسی چٹائی پر ہوں۔ سر کے عقبی حصے سے درد کی نیسیں اٹھ رہی تھیں۔ پکوں پر جیسے منوں بوجھ تھا۔ میں اپنا ہاتھ سر کی طرف لے

تھوڑی سی پیاس بھی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اپنی ٹھوڑی پر ہاتھ پھیرا اور شیوہ کی صورت حال سے اپنی بے ہوشی کا دورانیہ جاننے کی کوشش کی..... لیکن کچھ خاص آئیڈیا نہیں ہو سکا۔

اسی دوران میں مجھے پہلی بار قدموں کی چاپ سنا کی دی۔ میں نے ٹھکری سے جھانکا سوچی سوچی آنکھوں والا ایک ہٹا کٹا ملائشین اپنی طرف آتا دکھائی دیا اور اس امر کی تصدیق ہو گئی کہ میں ہاناوانی کے جال میں ہی ہوں۔ ملائشین کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی جس میں دو برگر اور کوئلہ ڈربک وغیرہ رکھے تھے۔ اس نے دروازے کے پتیلے خلا سے بے ٹرے اندر کھسکا دی اور خشک لہجے میں بولا۔ ”کھا لو..... اور اس کے علاوہ کسی چیز کی ضرورت ہے تو بتاؤ۔“

وہ انگشت میں بولا تھا۔ میں نے بھی انگشت میں کہا۔ ”ایک عدد پتول کی ضرورت ہے تاکہ میں تمہاری والدہ محترمہ کی کھوپڑی میں سوراخ کر سکوں۔ جا کر اسے بتاؤ کہ میں اس کے بے حرام کے لئے نہیں کھاؤں گا۔ میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”وہ کیڑے کوڑوں سے بات نہیں کرتیں..... پس انہیں اپنے جوتے سے سلٹی ہیں لیکن ان کے جوتے سے مسئلے جانے کا شرف بھی شاید نہیں حاصل نہیں ہو سکے گا۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں تمہارا اپنا ہی کوئی باسٹرڈ سامی ڈلت کی موت مارے گا۔“

وہ جیسے آتا تھا، ویسے ہی اپنے بھاری کولہے مٹکا ہوا واپس چلا گیا۔ اس عمارت کی چھتیں بندھ گئیں اور قدموں کی چاپ بھی ان کے نیچے گونجتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

میں نے ایک بار پھر دروازہ کھٹکھٹانا شروع کیا اور ہاناوانی کو مصلواتیں سنائیں..... لیکن کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہوا۔ مجھے یہاں یہ بھی اندازہ نہیں ہوا پار ہاتھ کر کیا وقت ہوا ہے۔ یہ دن ہے یا رات ہے؟ میں لاہور میں ہوں یا کہیں اور؟ ہاناوانی یہاں موجود ہے یا کہیں دوسری جگہ پانی جاری ہے۔ ان گنت سوالات تھے مگر جواب کوئی نہیں تھا۔ ذرا خاموشی ہوئی تو میں نے دھیان سے سنا..... اور مجھے ایک سنسنی خیز آواز سنا کی دی۔ یہ خوب صورت رنگین طوطوں کی آواز تھی۔ وہی طوطے جو ہمارے لیے خوریزی اور دہشت کی علامت بن چکے تھے وہ اسی عمارت میں کہیں موجود تھے۔ شاید کسی کمرے یا بڑے خیمے میں بند تھے۔ نئے نئے طوطوں کی یہ ہمیں باریک آوازیں بڑی دلکش

پوری کی پوری توجہ فارس جان کی طرف چلی گئی تھی۔ یہ سوچ ذہن میں آئی ہی نہیں تھی کہ کفر کے ساتھ بھی تو کچھ برا ہو سکتا ہے۔ اس چال سے ہمیں دہرا نقصان ہوا تھا۔ فارم ہاؤس سے روانہ ہوتے وقت میں نے قسطنطنیہ کے علاوہ لودھی وغیرہ کو بھی فارس کی طرف سے الٹ کر دیا تھا۔ اب اس صورت حال کے سبب فارس کو بھی کوئی نقصان پہنچ سکتا تھا اور یہ بات عین ممکن تھی کہ فارس، ہاناوانی کے ہتھے نہ چڑھا ہو اور بالکل نابل ہو.....

یہاں ایک اور سوال بھی ابھرتا تھا کہ ٹرانس میں آنے کے بعد کفر نے مجھے کیوں ٹیوب دیل والے ڈیرے پر بلایا، وہ خود فارم ہاؤس تک کیوں نہ پہنچ گیا؟ اس کا جواب ذرا سی کوشش سے سمجھ میں آ گیا۔ کفر کو واقعی فارم ہاؤس کا راستہ نہیں یاد تھا۔ اگر راستہ یاد ہوتا تو صرف وہی نہیں، ہاناوانی اور اس کے خونخوار ساتھی بھی فارم ہاؤس پہنچ گئے ہوتے۔ اب تو صرف میں ان کی دسترس میں آیا تھا۔ وہ فارم ہاؤس پہنچ جاتے تو میرے علاوہ قسطنطنیہ، پہلوان شہت اور زینب وغیرہ بھی ان کے نشانے پر آ جاتے..... بہر طور اب بھی فارم ہاؤس کے لیے خطرہ بدستور موجود تھا۔ ہاناوانی اور اس کی ٹیم بارڈر یا تک تو پہنچ ہی چکی تھی۔

دوسرا اور زیادہ بھڑکتا ہوا سوال یہ تھا کہ میرے یہاں پہنچ جانے کے بعد، اب کیا ہوگا؟ اس کا جواب یہی تھا کہ اب ہاناوانی سے میرا سامنا ہونے والا تھا اور غالب امکان یہی تھا کہ وہ مجھے جان سے نہیں مارے گی بلکہ اپنے مہلک ٹرانس میں لینے کی کوشش کرے گی تاکہ اپنی ”نخوس قسم“ کے مطابق وہ اپنے مذموم مقاصد پورے کر سکے۔ وہ میرے ہی ذمے لیے فارم ہاؤس تک پہنچنے کی کامیاب کوشش بھی کر سکتی تھی۔ میرا دھیان سجاد کی طرف چلا گیا اور میں اندر سے مل گیا۔ اس نے ہاناوانی سے بیٹنے کے لیے اپنی آنکھوں کی قربانی دی تھی اور اپنے کانوں کو بھی بے حد لیری سے داؤ پر لگا دیا تھا..... کیا..... بڑا وقت آپ نے مجھے بھی ایسا ہی کچھ کرنا پڑے گا؟

مجھے اس وقت کچھ معلوم نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں اور میرے ارد گرد جو لوگ ہیں وہ کون ہیں..... ہاں جب میں نے دروازہ کھٹکھٹایا تھا اور بلند آواز میں پکارا تھا تو اتنا اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ یہ ایک وسیع عمارت ہے۔ میرے لیے ایک معیار بھی تھا کہ میں کتنا عرصہ بے ہوش رہا ہوں۔ سر کی چونٹیں گہری تھیں اور اس کا اندازہ میری شرٹ کے کالر پر موجود خون کے دھبوں سے بھی ہو جاتا تھا۔ مجھے بھوک اور

ہوا کرتی ہیں لیکن اس وقت یہ آوازیں شہد کی قاتل مکیوں سے زیادہ مہلک اور خوفناک محسوس ہوئیں۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہاں مجھے کس طرح کے حالات پیش آنے والے ہیں، نہ ہی مجھے خبر کے بارے میں کچھ اطلاع تھی۔ حالانکہ مجھے یقین تھا کہ خبری اسی جھپٹ تلے نہیں موجود ہوگا۔ کس حال میں ہوگا؟ اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ یہاں کے انتظامات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ مجھے تا دیر یہاں رکے جانے کی پلاننگ ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ ہاناوانی سے ملاقات کے بارے میں بھی فی الحال کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔

بہر حال ہاناوانی سے ملاقات کی بابت میرا خیال غلط ثابت ہو گیا۔ اس لاک آپ میں میں نے قریباً پندرہ سولہ گھنٹے گزارے تھے جب سوچی آنکھوں والا ملائیکین دو دیکر ملا بھیٹر کے ساتھ میرے لاک آپ کے سامنے آن موجود ہوا۔ ایک مختصر اور متنازعہ گفتگو کے ساتھ تھا۔ اس کے بعد بے مروتی میں لوڈ ڈائل ایم جی تھی۔

سوچی آنکھوں والے ملائیکین نے مجھے سے کہا۔ ”مدر مادام (ہاناوانی) تم سے ملنا چاہتی ہیں۔ ہم تمہیں ان کے پاس لے کر جا رہے ہیں لیکن اس کے لیے تمہیں اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنی جھکڑی لگوانا ہوگی۔ دروازے کے نیچے والے خلا کے پاس اٹنے ہو کر بیٹھ جاؤ تاکہ تمہیں جھکڑی لگائی جا سکے۔“

میں نے کہا۔ ”اور اگر میں انکار کر دوں تو؟“ وہ بے پروائی سے بولا۔ ”تو پھر ہمارے پاس جنگی کتوں اور نوروں وغیرہ کو گن کے ذریعے بے ہوش کرنے کے لیے آنکھیں بھی موجود ہے۔“

میں جانتا تھا کہ ان لوگوں کے ساتھ بحث فضول اور وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے۔ میں نے ان کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے اپنی جھکڑی لگوائی۔ مجھے جدید راتھوں کے سامنے میں ایک کوریڈر سے گزارا کیا۔ بلند و بالا چھت والے اس طویل کوریڈر کے ہر حصے سے امارت اور شان و شوکت چمکتی تھی۔ بالآخر ہم ایک وسیع ہال کمرے میں پہنچے۔ یہاں روشنی اور اندھیرے کا عجیب سا امتزاج تھا۔ میری نگاہ سب سے پہلے جس چیز پر پڑی وہ ہاناوانی کے آنجنابی بیٹے رائے زلی کی ایک بہت بڑی پورٹریٹ تھی جو سامنے والی بلند دیوار پر آویزاں تھی۔ پورٹریٹ سے ذرا آگے ایک اسٹیج تھا جس کو سرخ رنگ کے مٹکی پڑے سے ڈھانپا گیا تھا۔ اس اسٹیج پر ایک شاندار زرنکار کرسی رکھی

تھی۔ اسے دیکھتے ہی جاماچی کے کچھ پرانے روح فرسا مناظر میری نگاہوں میں محسوس ہو گئے۔ ایسی ہی ایک کرسی پر بیٹھ کر اس خطرناک ترین ساحرہ نے مجھ پر اپنی نظروں کا مہلک جادو چلانے کی کوشش کی تھی۔ وہ دست رنگہ جھنڈو غیر مرئی سازوں کا بیچانی شور، وہ رقص کرتی ہوئی عریاں پر چھانیاں، میں کچھ بھی بھولا نہیں تھا۔

دفعہ میری نگاہ چھت کی طرف گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی سیاہ جھار لری چھت کے ساتھ جھول رہی ہے لیکن پھر یہ جان کر ایک کراہتی سی جاتی کہ یہ جھار نہیں تھی۔ درجنوں چمک دڑیں جس جھپٹ میں موجود تھیں کتوں کے ساتھ اپنی لنگی ہوئی تھیں۔ بڑے سائز کی ایک بالکل سیاہ بلی زرنکار کرسی کے قریب خاموش بیٹھی تھی۔ وہ کسی لیو پاڑ کی طرح دکھائی دیتی تھی مگر اس کے کھڑے کان، دور سے بالکل سینکوں کی طرح لگتے تھے۔ وہ اپنی آنکھوں میں خونخوار چمک لیے میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسٹیج کے ارد گرد قریباً چھ مٹھی محفوظ موجود تھے اور جھمکوں کی طرح ساکت کھڑے تھے۔ ان کی شکلیں دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ گرے فورس کے سفاک گارڈز ہیں۔

گھڑی کی سوئیوں آگے کو سر کر رہی تھیں اور اس وسیع ہال میں موجود ہر جاندار وہ جان شے جیسے ہاناوانی کی منتظر تھی۔ بالآخر ایک دبیز پردے کے عقب سے وہ نمودار ہوئی۔ وہ ایک ٹینگلوں لبادے میں تھی۔ اس کی آنکھوں پر ہمیشہ کی طرح ایک سیاہ چشمہ نظر آ رہا تھا۔ اس کے وجود کے گرد اسراریت کا ایک ہالہ سا محسوس ہوتا تھا۔ میں نے دھیان سے دیکھا اس کے دونوں کندھوں پر گھنے سرپوں اور لمبی گردنوں والے دو گلدے بیٹھے تھے۔ جب وہ اسٹیج کی سیز جیوں پر پہنچی تو یہ دونوں گلدے خود بخود پھڑپھڑا کر بلند چھت کے کسی تاریک حصے میں اوجھل ہو گئے۔ ہاناوانی بڑی حکمت سے اپنی کرسی پر فروکش ہوئی۔ کچھ دیر تک سیاہ چشمے کے عقب سے مجھے گھورنی رہی پھر زہر سے لٹھری ہوئی کڑک دار آواز میں بولی۔ ”تو آخر وہاں پہنچ ہی گئے، جہاں تمہیں پہنچنا چاہیے تھا۔“

میرے دل نے گواہی دی۔ شاہ زیب! تم اپنی زندگی کے بدترین امتحان سے دو چار ہونے والے ہو۔

خونریزی اور بربریت کے خلاف
صف آرا نوجوان کی کھلی جنگ
باقی واقعات ایند ماہ پڑھیے

کرسمس سے ایک ہفتہ قبل، کیری نے دھماکا کر کے
مجھے شدید شش و پنج میں مبتلا کر دیا۔ سب سے زیادہ تکلیف
وہ بات تو یہ تھی کہ اس کی فرمائش کے باوجود میں اب پھر سے
موٹا نہیں ہو سکتا تھا۔ کسی جیلی بھرے تیلے کی طرح تھل تھل
کرتی تو نہ کب کی غائب ہو چکی تھی۔
”یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں.....“ وہ چکی بجاتے ہوئے
بولی۔ ”تم کوئی تکیہ بہ آسانی رکھ سکتے ہو۔“
”میں ہی کیوں؟“ میں نے کراہتے ہوئے کہا۔

براسانتا

مظہر سلیم ہاشمی

سال کا آخری مہینہ دسمبر دنیا بھر میں کرسمس کے تہوار کی وجہ
سے اہم گردانا جاتا ہے... آغاز ہی سے تیاریاں شروع ہو جاتی
ہیں... کرسمس کے حوالے سے ایک یادگار... دلچسپ... ہنستی
مسکراتی تحریر... سانتا کلاز کی شرارتوں... اداؤں اور لبادے
میں چھپے ایک اور شخص کی نرالی خوبیوں کے انکشاف...

خوشیوں بھرے لمحات میں باپ اور بیٹے کی مجرمانہ ملی بھگت.....



”وہ تو بس میری ڈرامے بازی ہوتی ہے۔“ میں نے فخریہ لہجے میں کہا۔

”تو اتنی دیر سے اور کیا کہہ رہی ہوں تم سے۔“ وہ روہانی آواز میں بولی۔ ”اگر تم یہی ڈرامے بازی بچوں کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کے لیے استعمال کرلو تو تو کتنی اچھی بات ہوگی۔ نکلی بھی کماد گے اور غریبوں کی دعا بھی بھی لو گے۔ شام پانچ سے نو، صرف چار گھنٹے دے کر تم ان غریبوں کا بھلا کر سکتے ہو۔ صرف چار گھنٹے۔ کیا بہت زیادہ مانگ لیا تم سے؟“

اس کی آنکھیں مجھے قائل کرتے کرتے ڈبڈبامنی تھیں۔۔۔۔۔ ان کو راجہ جیل آنکھوں میں دیکھتے ہوئے میرا دل بھی ڈوبنے لگا۔

”اچھا ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ لیکن میں سانا کا لباس پہن کر نقلی داڑھی مونچھ نہیں لگاؤں گا۔“ میں نے احسانِ عظیم کرنے والے انداز میں کہا۔ یہ حقیقت تھی کہ میں کسی بھی معاملے میں اسے انکار نہیں کر سکتا تھا لیکن اپنی ناک اونچی رکھنے کے لیے اس کو خوب زچ ضرور کرتا تھا۔

جواباً وہ کچھ نہ بولی۔ بس بڑی بڑی نیلی آنکھوں سے یک ٹک مجھے دھمکتی رہی۔ الفاظ اس کی زبان سے ادا ہونے کے بجائے آنکھوں سے اپنا تذہب عیاں کر رہے تھے۔ ”نہیں۔۔۔۔۔ بالکل نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”اب

سانا کلاز بن کر مجھے نہ ہی تک پیٹ پر باندھنا ہے اور نہ ہی ان بچوں کو گود میں بٹھا کر فرمائش پوری کرنی ہیں۔“ کیری خاموشی سے میری بک بک جھک سنی رہی البتہ اس نے اپنی نظریں مجھ پر سے ہٹانے کی زحمت نہیں کی۔

☆☆☆

”ہو۔۔۔۔۔ ہو۔۔۔۔۔“ میں نے اونچی آواز میں کہا تو میری گود میں بیٹھی بچی کی گول گول آنکھیں پھیل کر مزید بڑی ہوئیں۔

اس کی آنکھیں دیکھ کر مجھے کیری کی آنکھیں یاد آئیں جن کی بدولت میں اس وقت سانا کلاز بننے کی مصیبت میں گرفتار تھا۔

”کیا آپ اصلی والے سانا کلاز ہو؟“ اس نے مصیبت سے سوال کیا۔

”ہاں جی۔ بالکل اصلی والا۔ اور تم کون ہو؟“ ”میلیسا۔۔۔۔۔“

”یہ تو بہت پیارا نام ہے۔ تم کتنے سال کی ہو

”پہلی بات۔۔۔۔۔ میں تفریحی کمیٹی کی صدر ہوں اور اداکاروں کے چٹاؤ کی ڈتے داری مجھ پر عائد ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ میں جتنے بھی لوگوں کو جانتی ہوں، ان میں تم سب سے لمبے چوڑے اور سب سے زیادہ بذلہ سچ ہو۔“ اس نے مشکل الفاظ میں مجھے مسخرہ کہا۔

”ہو۔۔۔۔۔ ہو۔۔۔۔۔“ میں نے سانا کی نقل کرتے ہوئے اس کا مذاق اڑایا۔

”ہم یہ سب ایک نیک مقصد کے لیے کر رہے ہیں۔ بلکہ بہت سارے فلاحی کاموں کے لیے اس موقع پر چندہ اکٹھا کیا جائے گا۔“

”جیسے کہ؟“ میں نے اس کی بات کاٹی۔

”جیسے کہ جیم بچوں کے لیے۔ بے گھر افراد کی بہبود کے لیے اور اس کے علاوہ تین مزید فلاحی تنظیموں کے لیے۔ اتنے سوالات کیوں کر رہے ہو، آخر تمہاری تہوار منانے کی حس کہاں غائب ہو گئی ہے؟“ وہ جھجھلاتے ہوئے بولی۔

”وہ حس تو بک کی مرچکی ہے۔۔۔۔۔ تم اب ہارٹ سے بات کیوں نہیں کرتی؟“ میں نے اپنے پارٹنر کا نام بھجوز کیا۔

”اب ہارٹ۔۔۔۔۔ تم مذاق کر رہے ہو؟“

”پھر کوئی اور چلے گا۔؟ بلکہ کوئی بھی اور چلے گا۔۔۔۔۔“ میں نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔

”صرف تم چلو گے۔“ کیری نے قطعیت سے کہا۔

”ہونہ۔ بالکل نہیں۔“ میں نے منہ پٹاتے ہوئے کہا۔ ”میں تم سے شدید عبت کرتا ہوں۔ زندگی کی آخری سانس تک تمہیں چاہوں گا۔ تمہارے لیے چاند تارے تو ڈلاؤں گا۔ لیکن یہ سانا کلاز بننے کا بے وقوفانہ کام کبھی نہیں کروں گا۔“

”اب تم اسکرودج بننے کی ناکام کوشش کر رہے ہو۔“ اس نے کرکس بریاد کرنے والے ایک مشہور کردار کا حوالہ دیتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ ہاں میں اسکرودج ہوں۔۔۔۔۔ وہ بن جاؤں گا لیکن مونٹا سانا نہیں بنوں گا۔“

”تم ہی بنو گے سانا۔ میں جانتی ہوں تمہیں بچے بہت اچھے لگتے ہیں۔“ وہ جھمکانہ۔۔۔۔۔ لہجے میں بولی۔

”اب یہ کتنا ترین خیال کہاں سے آیا کہ مجھے بچے اچھے لگتے ہیں؟“

”میں تمہیں بچوں کے ساتھ دیکھ چکی ہوں۔ بالکل ہی بدلی ہوئی شخصیت ہو جاتی ہے تمہاری۔“ وہ مسکرائی۔

ایک کونے میں بے سنج پر میں اس وقت تکی داڑھی
 مونچھ لگائے، لال لبادہ اوڑھے اور بیٹ کے ساتھ کھڑے
 پیٹ پر باندھے..... ایک تخت نما کرسی پر براجمان تھا۔
 میرے ارد گرد روٹی کی مٹی برف بکھری تھی، ایک بڑے
 سے تھیلے میں بچوں کے لیے رنگ برنگ پینکٹ میں تحفے
 رکھے تھے جبکہ ایک جانب گتے کو کاٹ کر چکلیاں پنڈیر تیار
 کیا گیا تھا۔ یونوں کے لبادے میں دو عدد خواتین میری مدد
 کر رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر چھائی مسکراہٹ اتنی ہی
 مصنوعی تھی جتنی میری سفید داڑھی مونچھ..... لیکن ان کی
 حالت مجھ سے زیادہ خراب تھی۔

ایک طرف اتنی زیادہ تعداد میں بچے قطار باندھ کر
 کھڑے تھے کہ بہود آبادی والے دیکھتے ہی صدمے کا شکار
 ہو جاتے..... ان میں کچھ اپنے والدین کے ساتھ تھے جبکہ
 بیشتر تنہا کھڑے تھے کہ کب موقع ملے اور وہ سنانا کی کود
 میں بیٹھ کر اپنی دلی خواہشات کا اظہار کر سکیں۔

سانتا سوٹ کے اندر میں پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔
 اس کی وجہ گرمی یا نکل نہیں تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ہر
 نگاہ مجھ پر ہی جمی ہو اور بچوں کے علاوہ ہر شخص اپنے حلق میں
 قہقہے دبائے بیٹھا ہو۔ مضحکہ خیز صورت حال تھی..... میرے
 بچپان لیے جانے کا امکان بہت کم تھا لیکن پھر بھی میں
 پریشان تھا۔ کیری کو میں نے قسم دی تھی کہ وہ بے راہ کسی پر
 آشکار نہیں کرے گی کہ سنانا کے بہروپ میں کون تھا.....
 خاص طور پر میرے پائرنر ایمر ہارٹ کو۔ وہ جان جاتا تو
 گھنٹوں میرا مذاق بناتے رکھتا۔ محفل میں موجود لوگوں میں
 سے بیشکل پندرہ میرے واقف کار تھے..... اور وہ بھی
 پرائیویٹ سکیورٹی گارڈز لیکن پھر بھی میں اپنی مکنت سبکی کے
 خیال سے پریشان تھا۔

میں ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے کسی کو بیچ چہرے پر
 اچانک برہنہ کھڑا کر دیا جائے۔ میرے ذہن میں یہی خیال
 گردش کر رہا تھا کہ میڈیا والوں میں سے کسی نے پہچان کر
 میری تصویر چھاپ دی تو کیا ہوگا؟ اگر ایمر ہارٹ میرا
 بہروپ پہچان گیا تو؟ یا میرے نام نہاد دوست بارنی اور
 جوڈی فالکمران لگا بیٹھے تو کتنا مذاق اڑائیں گے۔

ایک اور بچہ میری گود میں بیٹھنے کو آمادہ تھا۔ میرے
 چہرے پر ایک خود کار مسکراہٹ نمودار ہوئی اور میں نے کن
 آنکھوں سے دتلی کلائی میں وقت دیکھا۔ آف خدا یا..... میں
 جس کو ڈیڑھ گھنٹہ سمجھ رہا تھا وہ صرف چالیس منٹ تھے.....
 ابھی مجھے مزید تین گھنٹے سے زائد وقت اس بے ہنگم علیے میں

میلیسا؟ میں نے پوچھا۔

”چھ سال اور ساڑھے کی.....“ اس نے جواب دیا۔
 ”یعنی ساڑھے چھ سال کی.....“ میں اس کی گرامر مع
 کیے بغیر نہ رہ سکا۔ ”تو سنانا کو بتاؤ کہ تمہیں کرسس کے تحفے
 کے لیے کیا چاہیے؟“
 ”ایک گڑیا.....“

”واہ..... یعنی گڑیا کو بھی گڑیا چاہیے.....“

”ہاں جی..... اور بڑی والی چاہیے۔“ اس نے اپنے
 فرمائشی پروگرام کو آگے بڑھایا۔ ”اور اس میں ایک خاص
 بات بھی ہونی چاہیے.....“

”کیا خاص بات؟“ میں اضطراری طور پر پوچھنے کی
 غلطی کر بیٹھا۔

”مجھے وہ والی گڑیا چاہیے جس کو پانی پلاؤ تو پی جائے
 اور بعد میں پیٹ دباؤ تو سوسوگی کر دے.....“

”ہو..... ہو..... ہو.....“ میں اس خواہش پر کراہ کر
 رہ گیا۔

گولڈن گیٹ پارک کے عقب میں واقع، لادیل
 ہائی اسکول کے ممتاز نیم ہال میں اس وقت کرسس چندہ اکٹھا
 کرنے کی مدد میں فیملی کا لامنتظر کیا گیا تھا۔ سان فرانسکو
 کے آدھے درجن سے زائد تجارتی ادارے اس کو اسپانسر کر
 رہے تھے۔ بیٹس اینڈ کارپوریشنز ایجنسی بھی ان میں سے ایک
 تھی جہاں کیری بطور سینئر کا پی رائٹر کام کرتی تھی۔ مختلف
 کمپنیوں کے تعاون کے باعث کافی رنگ رنگ ماحول بن چکا
 تھا۔ ڈیکوریشن کمپنی نے ہال کو سجانے میں کوئی دقیقہ
 فرو گذاشت نہ رکھا تھا۔ ایک کونے میں بڑا سادرخت تھا
 جسے سجانے کے لیے سرخ و سبز ققوں کا بے دریغ استعمال کیا
 گیا تھا اور ساتھ میں مصنوعی برف بکھیر دی گئی تھی۔ اسٹاف
 ممبرز کو یونوں والے لباس کے ساتھ مصنوعی کپیلے کان بھی
 پہنائے گئے تھے جو کہ کافی مضحکہ خیز لگ رہے تھے۔

اپنی سکرز سے گونجتے مذہبی گیت ماحول میں تقدس
 جگانے میں ناکام تھے کیونکہ لوگ اپنی ہی جہلوں میں
 مصروف تھے۔ دیواروں کے ساتھ اسٹال بنے تھے جہاں
 کرسس کی روانی چٹائیاں بھی ہوتی تھیں اور دیگر کھانے کے
 لوازمات بھی دستیاب تھے۔ بہت ساری گھر لہی اشیاء اور
 کھلونوں کا ڈھیر بھی تھا جو کہ چندے میں اکٹھے کیے گئے
 تھے۔ بالغان کے لیے کچھ کھیل تماشوں کے ساتھ ایک
 جانب پینے پلانے کے لیے بار کا ڈنبر بھی موجود تھا اور بچوں
 کے لیے..... میں بطور تماشا دستیاب تھا۔

گزارنا تھا۔

نیا بچہ میرے گھٹنے پر بیٹھ گیا۔ جب وہ ایسا کر رہا تھا تو ایک اور بچہ قطار سے اُپک اُپک کر دیکھنے لگا۔ پھر اچانک ہی وہ غرغراتی ہوئی آدازیں کھلانے لگا۔ اس کے ساتھ کھڑا بچہ چلا یا۔۔۔۔۔

”اف گندہ۔۔۔۔۔ یہ تو اٹنی کرنے لگا ہے۔“

خوش قسمتی سے تیار بچے کی ماں ساتھ ہی اور وہ اسے کوئی بھی کارروائی کرنے کے لیے ہی ’برف زار کی حسین دایوں‘ سے اچک کر دواش رومز کی جانب لے گئی۔ اگر وہ قطار کے بجائے میری گود میں ہوتا تو؟ اس سوچ کے آتے ہی میں ایک جھرجھری لے کر رہ گیا۔

میں نے اس دوران میں بے چینی سے پہلو بدلا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ بطور سائنس مبرا بھانڈا پھوٹے اور سب کے استہزا کا نشانہ بنوں۔ بار بار پہلو بدلنے سے وہ اس غلط فہمی کا شکار بھی ہو سکتے تھے کہ شاید سائنس فطرت کی پکار کو دے دے بیٹھا ہے۔ میں نے سوچا کہ کہیں میری کیفیت میلیسا کی لڑیا جیسی نہ ہو جائے کہ پیٹ دیا گیا اور۔۔۔۔۔

”کیری کی پٹنی۔۔۔۔۔ چھوڑو گام نہیں تمہیں۔“ میں نے اپنے خیالات کی پرواز کو روکا تاکہ گود میں بیٹھے بچے کی فرمائش نہ سکوں۔

”تم سائنس کا زانیہ ہو۔۔۔۔۔“ تاریخی بالوں والے بچے نے مجھ پر انکشاف کرنے والے انداز میں کہا۔

”نہیں تو۔۔۔۔۔ میں ہی سائنس ہوں۔ کیا میں تمہیں سائنس نہیں لگتا؟“

”نہیں۔۔۔۔۔“ اس نے بدتمیزی سے جواب دیا۔ ”تمہارا منہ بالکل بھی لال نہیں ہے اور ناک بھی چیری جیسی نہیں۔۔۔۔۔“

”بیٹا۔۔۔۔۔ تمہارا نام کیا ہے؟“ میں اپنا غصہ دباتے ہوئے مسکرایا۔

”رون لیکن سب مجھے روٹی پکارتے ہیں۔۔۔۔۔ اور تم بالکل بھی موٹے نہیں ہو۔“ یہ بات وہ میرے منہ بے کے دوران کہتا تو بہتر تھا لیکن اس بار یہ سننے پر مجھے کوئی خوشی نہیں ہوئی۔

”دیکھو میں موٹا ہوں۔۔۔۔۔ ہو۔۔۔۔۔ ہو۔۔۔۔۔“

میں نے اپنا کلیہ بندھا ہوا پیٹ ہلایا۔

”تم نہیں ہو۔۔۔۔۔“

”روٹی بیٹا۔۔۔۔۔ تم کو کرسس کے لیے کیا محمد درکار ہے؟“ میں نے اپنا غصہ پیٹتے ہوئے بات تبدیل کی۔

”وہ میں تمہیں کیوں بتاؤں؟ تم ایک جعلی سائنس

ہو۔۔۔۔۔ مجھے تمہارے بے کار جتنے نہیں چاہئیں۔ میں اپنے لیے کھلونے خود خرید سکتا ہوں۔“ وہ مسلسل بولتا رہا۔

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔۔۔۔۔“ میں نے اب اس سے نجات حاصل کرنے کا سوچا۔

”ویسے بھی میں سائنس کا زار پر یقین نہیں رکھتا۔۔۔۔۔“ وہ بولا۔

وہ تقریباً نو سال کا ہوگا۔ بدتمیز ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھوں میں مکاری بھی بسی ہوئی تھی۔ بڑے ہو کر وہ یقیناً کوئی کھانا ابردار قاتل بننا۔ یا پھر شاید سیاست داں بنی بن جاتا۔

”بیٹا۔۔۔۔۔ اگر تمہیں سائنس سے بات نہیں کرنی تو۔۔۔۔۔“ میں نے غصہ خنڈا کرنے کے لیے ایک گہری سانس لی اور پھر کہا۔ ”سائنس کی گود سے اُتر جاؤ تاکہ دوسرے بچوں اور بچیوں کو موقع مل سکے۔“

”نہیں۔۔۔۔۔“ وہ چلا یا اور بغیر کسی وارننگ کے میرے پیٹ میں ایک زوردار مکا بڑ دیا۔ ”ہا۔۔۔۔۔“ مجھے پہلے ہی پتا تھا کہ تم نے کلیہ باندھا ہوا ہے۔۔۔۔۔

”سائنس کی گود سے اُتر جاؤ روٹی۔۔۔۔۔“ میں نے نرمی سے کہا۔

”نہیں۔۔۔۔۔“ پھر ایک نقلی انکار آیا، مقام شکر تھا کہ گھونسا نہیں آیا تھا۔

میں تھوڑا جھک کر اس کے قریب ہو گیا تاکہ اس کے علاوہ میری بات کوئی دوسرا نہ سن پائے۔

”سائنس کی گود سے اُتر جاؤ ورنہ سائنس اپنا کلیہ پیٹ سے اتار کر تمہارے حلق میں گھسیڑ دے گا اور تمہاری بک بک سے عمر بھر کے لیے نجات مل جائے گی۔“

کوئی پانچ سینکڑ تک ہم پلکیں جھپکاتے بنا ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھتے رہے۔

”کینہ۔۔۔۔۔“ گالی تو اس نے نہایت غلیظ دی تھی لیکن اپنی خفت مٹانے کے لیے میں صرف اتنا ہی بتا سکتا ہوں۔ گالی دینے کے بعد وہ وہاں سے رونچہ پھر گیا۔

میں نے اپنے چہرے پر ایک بار پھر مصنوعی مسکان طاری کی اور بونے کے بہروپ والی اپنی مددگار لڑکی سے کہا۔

”اگلے بچے کو بلاؤ۔“

”مجھے ایک ٹیک چاہیے۔۔۔۔۔ اصلی والا۔۔۔۔۔ اور اس میں میزائل بھی ہوں تاکہ میں جہاں بھی بھیجوں وہ جگہ تمہیں

ماری ہے کہ ادھر سے سنائی دینا بند ہو چکا ہے..... ایک سوکھو کے موٹے بچے نے میرے پاؤں پر ایسے وزن ڈالا ہے کہ میری ایک آدھ انگلی تو شہید ہو چکی ہوگی..... ایک نے تو کھٹنا مار کر میرے اور تمہارے مستقبل کو تار یک کرنے کی کوشش بھی کی اور ابھی کوئی تین منٹ پہلے روٹی نامی ایک زیر تربیت غنڈے نے میرے پیٹ میں نہ صرف کھونسا مارا ہے بلکہ مجھے..... بھی کہا ہے۔" میں نے روانی میں اصل گالی بتائی تو کیری کے کان سرخ ہو گئے۔

"او..... میرا بچہ مارا سانا....."

"مذاق اڑا رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"حقیقت یہ ہے کہ....." وہ بولی۔ "میشر بچے تم سے بے حد خوش ہیں۔ میں نے چند والدین کو دوسروں سے کہتے سنا بھی ہے کہ بوڑھا سانا بہت اچھا ہے۔"

"اچھا جی....." میں نے منہ بتاتے ہوئے کاک ٹیل کا گھونٹ لیا۔ مشکوک بھوری چیز کی موجودگی کے باوجود اس کا ذائقہ بُرا نہیں تھا۔ "اور کتنی دیر اس بوڑھے سانا کو اچھا بننے کی کوشش کرنی ہوگی؟"

"بس ڈھائی گھنٹے مزید....."

"اوه خدا یا..... میں نہیں کر پاؤں گا....." میں نے ایک بار پھر شکایت کی جو ایک بار پھر ان کی کردی گئی۔

"اب ڈرامے نہ کرو....." وہ بولی۔ "ضرورت مندوں کے لیے ہم نے اچھی رقم اکٹھی کر لی ہے۔ تمہارے علاوہ سب پارٹی سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ خیر..... تمہارے اور مسز سامن کے علاوہ سب....."

"مسز سامن کون؟" میری جاسوسانہ رگ پھڑک اٹھی۔

"وہی ریڈولف سامن کی بیوی..... جو کارپوریٹ اتارنی ہے۔ بے چاری کا پرس کھو گیا ہے جس میں اس کے سارے کریڈٹ کارڈ اور تقریباً دو سو ڈالر لکیش تھا۔"

"اس سے کہو کہ میری جگہ آکر سانا بن جائے ابھی کے ابھی..... میں دو سو کے بجائے تین سو ڈالر دے دوں گا۔"

"میرے خیال میں سانا کا پھندا تمہارے گلے میں ہی مناسب لگتا ہے۔" وہ مجھے سرزنش کرنے کے انداز میں بولی اور مزکر جوم کی طرف روانہ ہوئی۔

"ایسے جملے روٹی کے آس پاس مت بولنا....." میں نے پیچھے سے آواز دی۔ "کیا پتا اس کو گل جیرا ہونے کے لیے نیا منسوبیل جائے؟"

نہیں ہو جائے....." اگلا بچہ کوئی جتنی جونی معلوم ہوتا تھا جو شاید اپنا اسکول یا پھر حساب کے بچہ کا گھر تباہ کرنا چاہتا تھا۔ میں اس کی فرمائشیں بے توجہی سے سن رہا تھا جب کیری اپنے ہاتھوں میں ایک کپ لیے نمودار ہوئی۔

اس نے دور سے ہی مجھے انگلی کے اشارے سے بلایا جیسے اپنی قوتِ تخیل کی حد جانچ رہی ہو، میں نے اپنی مددگار بولی سے کہا۔

"میں چھوٹے سے وقفے کے بعد آتا ہوں..... اس بچے کو کوئی گلابی بالوں والی گڑیا دے دو....." بچے کے چہرے پر بھانکنا تاثرات کو نظر انداز کرتے ہوئے میں اپنی لنگی تو دھسنا لٹا خراماں خراماں کیری کے پاس پہنچ گیا۔

وہ اپنے کاسٹیم میں میری نسبت بہت بھاری لگ رہی تھی۔ وہ اپنی معصوم و دلکش لگ رہی تھی کہ میں دیکھتا رہ گیا..... یہ بات تو ذہن سے بالکل ہی محو ہو گئی تھی کہ میں اس سے ناراض تھا۔ وہ ایک فرشتے کے بہروپ میں تھی.....

سفید لبادے نے اس کے پورے بدن کو لپیٹا ہوا تھا اور سن فوٹل سے بنے اس کے پر بالکل اصلی معلوم ہو رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے پرستان کی پری میرا دل لوٹنے کے لیے مجسم ہو گئی ہو..... وہ اپراٹھی کہ کوئی حور..... لیکن جو بھی تھی اس پر مر کر میں جنت جانے کو دل و جان سے راضی تھا۔

اس نے میرے گلے منہ کو نظر انداز کرتے ہوئے کب میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ یہ کوئی کاک ٹیل مشروب تھا جس کی سطح پر عجیب بھوری چیز تیر رہی تھی۔

"میں نے سوچا کہ تم بھی کرکس کی کسی سوغات سے محفوظ ہو لو....." وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"میں تو کرکس کی سوغات سے ہر وقت محفوظ ہونے کے لیے تیار ہوں..... تم نے کچھ ملایا ہے اس میں؟" میں نے آنکھ دباتے ہوئے پوچھا۔

"بالکل بھی نہیں..... تم کب سے پینے پلانے لگے؟" اس کے لہجے میں ناگواری تھی۔

"جب سے میں اس منحوس تخت پر براجمان ہوا ہوں....." میں نے آج پر اپنی سانا کلاز والی کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اوه..... اب اتنی بھی بُری صورت حال نہیں ہے....." اس نے میری شکایت کو چٹکیوں میں اڑاتے ہوئے کہا۔

"نہیں ہے....." میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"ایک پانچ سالہ بچی نے میرے کان میں اتنی اونچی چیخ

”آپ کا نام کیا ہے؟“ میں نے ایک ایک لفظ
جپاے ہوئے کہا۔
”تم کو کیا کرتا ہے؟“ وہ ہنک کر بولا۔

”تم بڑے جانے پہچانے سے لگ رہے ہو۔“
میں نے تکلف پر طرف کرتے ہوئے کہا۔ ”بہت زیادہ
جانے پہچانے۔۔۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے ہم پہلے کسی مل چکے
ہیں۔“

میری بات سن کر وہ ہنک رہا تھا۔ ”میرا نام کیا ہے؟“
تکنا شروع کیا جیسے میری تسلی داؤمی موجودگیوں کے پار دیکھ رہا
ہو۔ پھر آہستہ آہستہ اس نے پلٹیں جھپکائیں۔ اس کے
چہرے سے غصیلے باپ والے سارے تاثرات اچانک ہی
غائب ہو گئے اور اس کی جگہ خوف آمیز گھبراہٹ نے لے
لی۔ خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے اس نے پیچھے کی
جانب قدم اٹھایا۔

”اوہ پاپا۔۔۔ مکا مار کے اس کی جی گل کر دو۔“
چھوٹا غنڈا اپنے باپ کے رویے میں آنے والی تبدیلی سے
بے خبر تھا۔

”جو اس بند کر دو۔۔۔“ وہ اپنے بیٹے سے مخاطب
ہوا۔ ”بھول جاؤ کہ ہمارے بیچ کچھ ہوا ہے۔ ٹھیک
ہے؟“ دوسری بات مجھ سے کہتے ہوئے اس نے اپنے بیٹے
کا بازو پکڑا اور تقریباً گھمٹا ہوا اس سے دور لے گیا۔ اس
کے احتیاج کے باوجود وہ اسے ساتھ لے کر لوگوں کے جھوم
میں گھس گیا۔

میں ان کو جاتے دیکھ ہی رہا تھا کہ میرے ذہن میں
ایک جھماکا ہوا۔ میں تصور کی آنکھ سے ایک بغیر موجود
والے اور جوان شخص کو دیکھ رہا تھا جو کہ روٹی کا باپ تھا۔ جیل
کے قیدیوں والی وردی پہنے وہ تصویر بنوار رہا تھا اور اس کا نام
اور قیدی نمبر اس کی چھائی پر لکھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ میں روٹی
کے باپ کو برسوں پہلے سے جانتا تھا۔ ایک چوری کی
داروات جو مسخ ڈاکے کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ میں نے
اسی سلسلے میں اسے گرفتار کیا تھا۔

روٹی کے باپ کا نام مارکی داٹرز تھا جو کہ ایک ماہر
جب تراش اور چور تھا۔ اس نے اپنی نامعقول زندگی میں
صرف ایک شخص کو ہی فائدہ پہنچایا تھا جو کہ وہ خود تھا۔ اپنی
حرکات کے باعث جیل جا چکا تھا اور اب ایک فیملی گالا
کرکس پارٹی، جو کہ چندہ انشا کرنے کی خاطر متعقد کی گئی
تھی، میں اس کی موجودگی کسی گڑباز کا پیش خیمہ لگ رہی تھی۔
’بے چاری کا پرس کھو گیا ہے جس میں اس کے

مجھے اپنی سنگھاسن نما کرسی پر تخت نشین ہوئے ابھی
چند لمبے ہی ہوئے تھے کہ وہ چھوٹا غنڈا ایک بار پھر سے
نمودار ہو گیا۔ روٹی اس بار اکیلا نہیں تھا۔۔۔ جھاڑ جھکار جیسی
بڑی موجودگیوں، سرسبز سوٹ اور مضبوط سیاہ غصیلہ۔۔۔ شخص بھی
اس کے ساتھ تھا۔ وہ دونوں باقی سب کو دھکیلے ہوئے اسٹیج پر
چڑھ آئے۔ میری مددگار روٹی نے بریوں جیسی ایک نئی
لڑکی کو اٹھا رکھا تھا اور وہ ان کو۔۔۔ دیکھ کر گھبرا کے پیچھے ہٹ
گئی۔

”تمہاری ہمت کیسے ہوئی میرے بیٹے کو دھمکانے
کی؟“ پھل میرے پاس آکر پست لیکن قہقہے آواز میں
غرایا۔

’وائے قسمت۔۔۔ میں نے دل ہی دل میں خود کو
کوسا۔ اس سارے تماشے میں ایک عدد باولے باپ کی کمی
تھی، وہ بھی پوری ہو گئی۔‘

”مجھے جواب دو۔۔۔ میرے بیٹے کے حلق میں نیکی
گھسیڑنے کی دھمکی دینے کی تمہاری جرات کیسے ہوئی؟“
”اس نے پہلے میرے پیٹ میں مکا مارا تھا۔“ میں
نے آہستگی سے کہا۔

”تو؟ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔۔۔ تمہیں اس
پر میرے بیٹے کو ڈرانے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ میں تو خود
تمہارے پیٹ میں کھوسنا رسید کرنے کا سوچ رہا ہوں۔“
”مارو پاپا مارو۔“ روٹی نے ہرجوش انداز میں
کہا۔ اس تسلی سنانا کو گھوسنا مار کے اس کے دانت توڑ دو۔۔۔“

”میری باری ہے۔۔۔ مجھے ساتھ سے ملتا ہے۔ اب
میری باری ہے۔“ پاس موجود نئی لڑکی نے رونا شروع کر
دیا۔ وہ بھی مل والیوم پر۔

”تمہاری باری بھی آجائے گی۔ پریشان نہ
ہو۔۔۔“ مددگار روٹی نے اس کو پکڑنے کی کوشش کی۔

”بیچے سے معافی مانگو۔ پھر ہم یہاں سے چلے
جا سکیں گے۔“ روٹی کا باپ بولا۔

”نہیں پاپا۔۔۔ ایک کھوسنا تو مارو۔۔۔“ روٹی نے فوراً
کہا۔

”آپ اپنا نام بتانا پسند کریں گے؟“ میں نے روٹی
کے باپ کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

میری بات سن کر وہ ایک لمبے کے لیے ساکت رہ
گیا۔

”ہوں۔۔۔ کیا؟“ دو تین سیکنڈ کی غائب دماغی کے
بعد اس کے منہ سے یہی الفاظ نکلے۔

ان سب نے با آواز بلند نعرے لگانے شروع کر دیے۔۔۔۔۔
”دیکھو۔۔۔ دیکھو کون آیا؟“

”سانتا آیا۔۔۔ سانتا آیا۔۔۔۔۔“

مارکی اگرچہ موٹی خاتون سے الجھا ہوا تھا لیکن اس نعرے بازی سے وہ چونک اٹھا۔ اس نے دیکھ لیا کہ میں اس سے فقط بیس قدموں کے فاصلے پر ہوں اور شاید میری نیت بھی فوراً بھانپ گیا تھا۔ اس کا چہرہ دھواں ہو گیا اور وہ موٹی عورت کی گرفت سے آزاد ہونے کی جگہ دوڑ میں مصروف ہو گیا جو کسی چونک کی طرح اس سے چٹ مٹی تھی۔

میں اس سے چند قدم ہی دور تھا جب اس نے فیصلہ کر لیا کہ اس کیلی کا لودہ اتار دے تاکہ اس کا جشن بنا کر ہی رہے گا۔ اس نے روٹی کی کھائی کو چھوڑ دیا۔

”بھاگو روٹی۔۔۔۔۔“ یہ کہتے ساتھ ہی اس نے اب اپنے آزاد ہاتھ کا گھونسا موٹی عورت کی تہ دار ٹھوڑی پر رسید کر دیا۔

غریب خاتون نے نہ صرف اس کا بازو چھوڑ دیا بلکہ وہ تھوڑا کر گر گئی تھی تو ساتھ کھڑے تین چار لوگوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا اور کئی ہاتھ جیروں والی بلا کی صورت وہ سب فرش پر ڈھیر ہو گئے۔ سب لوگ پریشان ہو کر چلانے لگے۔ ایک آواز تو ایسی چٹھاؤنی ہوئی تھی کہ جیسے کسی نے سب خراش سازن بجا دیو۔ سب لوگ دہاں سے پیچھے ہٹنے لگے اور مارکی دائرہ کھلا رستہ پا کر تیزی سے راہ فرار اختیار کرنے لگی۔

میں نے تعاقب جاری رکھا۔۔۔۔۔ پیچھے بچاتے اور چوں پاں چوں پاں کرتے، میں اسے بالکل بھی نہ چکڑ پاتا اگر وہ پیچھے مڑ کر مجھے دیکھتے ہوئے اپنے ہی قدموں سے رہٹ کر پیچھے نہ گر جاتا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہونے لگا تھا کہ میں اس کے سر پر ہتھی گیا۔

”بس تمہاری دوڑ یہاں تک ہی تھی مارکی۔۔۔۔۔“ میں دونوں ہاتھوں کا دباؤ اس پر ڈالتے ہوئے بولا۔ میری بات کا جواب اس نے میرے غٹنے پر ایک ٹھوکر مار کر دیا اور خود کو میری گرفت سے آزاد کرالیا۔ میں درو سے چلا رہا تھا اور وہ فرار ہو رہا تھا۔ میں نے نکل داتے ہوئے پیچھا پھر شروع کر دیا۔ جتنا زیم میں چھٹنے چلانے کی آوازیں بازداشت بن کر گونج رہی تھیں۔۔۔۔۔ بھانسنے دوڑنے اور نکلنے کی آوازیں ان کے علاوہ تھیں۔

ایک عورت مارکی کے راستے میں آئی تو اس نے اپنا رخ فوڈ اسٹال کی جانب کر لیا۔ میں نے بھی اپنا رخ تبدیل

سارے کریڈٹ کارڈ اور تقریباً دو سو ڈالر کی شے تھیں۔ یعنی کہ یہ اب یہاں اپنے ہاتھ کی صفائی دکھانے کے لیے آیا ہے، گیری کی کئی بات یاد آئی تو میں نے نتیجہ اخذ کیا۔

مجھے اچ پر ہی رکنا چاہیے تھا۔ مجھے اپنی بونی مددگار لڑکیوں سے کہنا چاہیے تھا کہ وہ جا کر سیکورٹی والوں کو مطلع کریں۔۔۔۔۔ جبکہ مجھے اپنے سنگھاسن پر بیٹھ کر آنے والے بچوں کو بوگی کھانا سنانا چاہیے تھیں۔۔۔۔۔ لیکن ان میں سے کچھ بھی نہیں ہوا۔ کسی کا ٹھہرے والی طرح میں نے معاملے کو اپنے ہاتھ میں لینے کا فیصلہ کر لیا۔ نہایت احمق شخص کی طرح میں مارکی کے پیچھے دوڑا جبکہ میرے پیچھے تھی پری کے روٹنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

”سانتا سے ملتا ہے۔۔۔۔۔ مجھے سانتا سے ملتا ہے۔“

جشن سے لطف اندوز ہونے والوں کو تعداد کافی زیادہ تھی۔ خاطر خواہ لوگ تھے اور میں مارکی دائرہ یا اس کے بیٹے روٹی کو نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ ان کی سست داخلی دروازے کی جانب تھی سو میں نے بھی اسی جانب قدم بڑھا دیے۔ میرے ریز کے جوتے ایک نمبر چھوٹے ہونے کی وجہ سے تنگ کر رہے تھے جس کی وجہ سے میں جب بھی تیز چلتا تو پھردکتا ہوا محسوس ہوتا تھا، اس پر متاثر اور کدو جتنے فرش پر عجیب چوں پاں کی آوازیں نکال رہے تھے۔ ہر بار میرے پھدکنے پر چوں پاں کی آوازیں آتی تھیں۔ دھکم پیل اختیار کرتے میں راستہ بتا رہا تھا تو کافی ناگوار باتیں سننے کو ملیں۔

”سانتا۔۔۔۔۔ اپنے ہاتھوں کو تو بائیں رکھو۔۔۔۔۔“ ایک نوجوان نے سرخ ہوتے ہوئے کہا۔ میں یقیناً اس بات پر قہقہے لگا تا لیکن ابھی میرے ذہن پر صرف مارکی دائرہ سوار تھا۔

میں مشرقی دیوار کے ساتھ لگے کھانے کے اسٹال کے پاس پہنچا تو دائرہ پھر سے نظر آیا جو کہ آخری اسٹال کے پاس کھڑا تھا۔ ایک ہاتھ میں اس نے روٹی کی کھائی کو مضبوطی سے تھام رکھا تھا جبکہ دوسرا ہاتھ وہ لال کپڑوں والی ایک موٹی عورت سے چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ غالب امکان تھا کہ جلدی میں وہ اس عورت سے جا ٹکرایا تھا اور اس کی کافی کپڑوں پر گرا دی تھی۔۔۔۔۔ اب وہ عورت اسے آسانی سے معاف کرنے پر بالکل بھی آمادہ نہیں تھی اور متواتر صلواتیں سنارہی تھی۔

میں چھٹنے پھنساتے اور چوں پاں کی آوازیں نکالتے ایک اور جھمکے سے راستہ بتاتے ہوئے باہر نکلا۔ مجھے دیکھ کر

لی۔

”اُٹھ ایا۔۔۔۔۔“ ان میں سے ایک نے کہا۔ ”ہو کیا ہے آخر؟“

”میں نہیں جانتا۔۔۔۔۔“ دوسرا بولا۔ ”لیکن ایک بات یقینی ہے۔۔۔۔۔ سناٹا پاگل ہو گیا ہے۔“

☆☆☆

فٹ بال کوچ کے آفس میں تین افراد موجود تھے لیکن پھر بھی گہری خاموشی طاری تھی۔ ان میں سے دو تو میں اور مارکی واٹز تھے جبکہ تیسرا سکیورٹی گارڈز میں سے ایک تھا۔ ہم سب سان فرانسسکو پولیس آفیسرز کے انتظار میں تھے۔ ہماری ہنگامہ آرائی کو پندرہ منٹ سے زیادہ وقت بیت چکا تھا۔ مارکی اب ہوش میں تھا لیکن اس کی کیفیت بالکل بد حالوں جیسی تھی۔ گارڈز ہماری ہیئت کذائی پر بمشکل اپنی ہنسی پر قابو پا رہا تھا۔ جبکہ میں شور بے میں بیٹھے سناٹا کلاز کے کپڑے پہن کر چند خراشوں اور معمولی زخموں کے ساتھ سخت شرمندگی محسوس کر رہا تھا، اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔ میں اپنے کپڑے کی کھری کے گھر ہی اتار آیا تھا اور وہاں سے ہی سناٹا کا بھیج بھرا تھا۔

میرے اور مارکی کے درمیان موجود میز پر ایک بیئرے اور مینوٹیل سے مزین بروچ، نایاب پلاٹینم سگریٹ کیس اور سونے کی ٹائی پن کے ساتھ ساتھ پچاس ڈالر کے تین کڑک نوٹ بھی دھرے تھے۔ یہ سب چیزیں مارکی نے بڑے سلیقے سے اپنی جیکٹ کی اندرونی جیب میں چھپا رکھی تھیں جنہیں میں نے گاڑی کی مدد سے باہر نکال لیا تھا۔ میں نے دوپٹی سے بروچ کو ہاتھ لگا یا۔

”سچ چور پکڑا ہے۔۔۔۔۔“ اکیلا بروچ ہی کئی ہزار ڈالر کا ہوگا۔۔۔۔۔“ گارڈ بھی اپنے اشتیاق پر قابو نہ پاسکا تو بولا۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ مارکی نے بھی چپ سادھے میں عافیت جانی اور خاموش رہا۔

میرے اور مارکی کے مکمل تماشے سے کچھ دیر قبل ہی ٹائی پن اور تین پچاس کے نوٹ کے مالک نے ان کے غائب ہونے کی شکایت سکیورٹی گارڈز کو درج کرائی تھی۔ بروچ اور سگریٹ کیس بالکان کی جانب سے ابھی تک گمشدگی کی کوئی اطلاع نہیں تھی۔ یہی بات ثابت کرتی تھی کہ مارکی کتنا باہر جیب کسرا تھا۔ بہر حال امید تھی کہ اب کی بار وہ ایک بار پھر لیے عرصے کے لیے جیل جائے گا۔

وہ اپنی ٹھوڑی کو سینے سے لگائے کھڑا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر میری جانب دیکھا۔ ”میرا بیٹا۔۔۔۔۔“ وہ آہستہ سے

کیا اور اب میں بالکل اس کے مقابل آ گیا تھا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ ڈال دیا۔ وہ تیزی سے مڑا اور میرے چہرے پر کوئی نرم مہکی ہوئی چیز دے ماری۔۔۔۔۔ وہ شور بے میں ڈوبا گوشت کا بڑا ٹکڑا تھا جس میں سے پارچے کاٹ کر پارٹی کے لوگ کھا رہے تھے۔

اس نے میرے منہ پر پکا ہوا گوشت دے مارا تھا۔ اس شام کی تمام ذلاتوں میں یہ ذلت سب سے بڑی محسوس ہوئی۔ سناٹا کا روپ دھارنا کم برا تھا کہ ایک بھاگتے چور کی لنگوٹی کے بجائے گوشت کا ٹکڑا بھی منہ پر ملانچے کے مانند کھانا پڑ گیا۔ میں دھاڑ کر رہ گیا اور اپنے چہرے اور آنکھوں سے وہ گوشت کا شور بہ اتارنے لگا۔ میری نقلی داڑھی سوچھ اگرچہ اس معاملے میں ایک بڑی رکاوٹ تھی لیکن میں نے پھر بھی چھلانگ لگا لی اور مارکی کو اپنے دونوں بازوؤں میں جکڑ لیا۔ میرا ارادہ تھا کہ ایسے دو چار چکر دے کر زمین پر گر ادوں گا لیکن وہ میری توقع سے زیادہ جاندار نکلا۔

ہم دونوں ایک دوسرے کو خاک چٹوانے کی آرزو میں کوئی دو منٹ تک بغل گیر ہو کر تاحے رہے اور ہمارے رقص کا اختتام ایسے ہوا کہ دونوں ایک ٹوڈ اسٹائل کی میز سے جا ٹکرائے۔۔۔۔۔ سالن، پلٹین، بیج اور ٹوٹی ہوئی میز وغیرہ ہمارے ساتھ ہی زمین پر راہر گر گر گئے۔

مارکی کراہتا ہوا میرے نیچے سے نکلا اور تقریباً لڑھکتا ہوا اس سارے بردار خاٹے سے باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے سیواوٹ کے کپڑے سے نجات حاصل کرتے ہی اس کی ٹانگ کو پکڑا اور پھرتی سے اپنا منہ بچایا کیونکہ اس نے کسی گدھے کی طرح دوٹی جھاڑ دی تھی۔ میں نے اسے مزید متوجہ نہ دیا اور گھسٹ کر اپنے پاس پہنچ لیا۔ اب وہ میرے نیچے تھا۔۔۔۔۔ میں نے کچھ کارآمد ضربیں اسے لگائیں تو وہ ڈھیلا پڑ گیا۔ بلکہ کسی حد تک بے ہوش بھی ہو گیا۔

میں سیدھا ہو کر بیٹھا تو بڑی طرح ہانپ رہا تھا۔۔۔۔۔ شور بے نے میری سفید براق داڑھی کو پیلا کر دیا تھا۔ میرے حواس جب قابو میں آئے تو احساس ہوا کہ ابھی بھی ہال میں کرسی کے مذہبی نغمے ابھیر کر گونج رہے تھے۔۔۔۔۔ اور لوگوں کے ہٹکا پکڑے کے بعد حیرت آئینہ چمکیاں بھی چل رہی تھیں۔ اس سے پہلے کہ اخباری فوٹو گرافر آکر میری اور میرے شکاری تصویر بناتا یا پھر کیری سکیورٹی گارڈز کے ساتھ ہم تک پہنچتی، میں نے دو افراد کو گفتگو سن

سال کا آخری شمارہ..... خاص شمارہ

بہترین تحریریں، لا جواب رد واداور
اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

کراچی
ماہنامہ
سرگزشت

شمارہ دسمبر 2018ء
کی جھلکیاں

باغی قلمکار

اس مصنف کی داستان جس کی کہانیوں کو برا
کہا جاتا تھا پھر بھی سب اسے ہی پڑھتے تھے

گولڈن گزل

ایک سپر ہٹ اداکارہ کا زندگی نامہ
جسے پڑھ کر آپ چونک جائیں گے

رکشے والا

غربت کے بوجھ تلے دبے ایک انقلاب
برپا کر دینے والے کی داستان زلیست

فریبی

ایک دلچسپ جج بیانی جو سبق آموز بھی ہے

شمشال سے ثور

اپریل 2016ء سے شروع ہونے
والے مقبول سفر نامے کی آخری قسط

رکشے والا

بہت سی جج بیانیاں، نئی داستانیں، سچے
واقعات۔ وہ سب کچھ جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں

مخاطب ہوا جیسے ابھی یہ بات یاد آئی ہو، وہ بھاگ گیا؟“
”نہیں..... ایک گاڑی نے اسے بھی پکڑ لیا تھا۔“
”صحیح..... اب وہ کہاں ہے؟“

”ہمارے آس پاس ہی ہے..... تمہیں اس کے
بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں..... میں نے
درستی سے کہا۔“

”مجھے اسے ساتھ نہیں لانا چاہیے تھا.....“ وہ ایک
گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔
”پھر لائے کیوں تھے؟“

”دکسرس کا موقع تھا اور یہ قریب بچوں کے لیے ہی
منفعد کی گئی تھی۔ روٹی اور میں زیادہ ٹھوٹے پھرتے نہیں
ہیں۔ خاص طور پر جب سے اس کی ماں اپنے آشنا کے ساتھ
فرار ہوئی ہے.....“ آخری الفاظ کہتے کہتے اس کی آواز
نہایت مدہم ہو گئی۔

”آں ہاں.....“ میں نے کہا۔ ”اور تم نے سوچا ہوگا
کہ بچے کو ساتھ لاکر اپنی چوریوں پر پردہ ڈالنے کا موقع
آسانی سے مل جائے گا۔“

اس نے کندھے اچکائے۔ ”مجھے قطعاً امید نہیں تھی کہ
تم جسے کسی بندے سے سامنا ہو جائے گا۔ ویسے بھی ایک نئی
سراسر اس کا کیا کام کہ وہ سامنا کلاز کا ہمیں بنا کر بچوں کو
دل بہلاتا پھرے؟“

”میں یہ سوال اب تک سیکڑوں بار خود سے کر چکا
ہوں.....“ میں نے منہ بتایا۔

”اب ایسی کسی بات کی میں توقع کر بھی کیسے سکتا تھا۔
روٹی میرے پاس منہ بسوتا آیا کہ سامنا نے اسے بھیکے حلق
میں گھسیڑنے کی دھمکی دی ہے۔ اب بتاؤ میں کیا کرتا؟ میں
اپنا کام مٹا چکا تھا اور واپس نکلنے والا تھا..... لیکن میں اپنے
معصوم بچے کو دی گئی کسی گھٹیا شخص کی دھمکی کیسے برداشت
کرتا؟ میں ایک باپ بھی تو ہوں.....“ اس نے ایک اور
گہری سانس خارج کی۔ ”کاش میں کسی کا باپ نہ
ہوتا.....“

”اور پرس کا کیا کیا ماری؟“ میں نے اس کی
جذباتیت کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔
”کیا؟“

”پرس..... جس میں تقریباً دو سو ڈالر کیش تھا۔ وہ
کدھر ہے؟“ میں نے سوال کی وضاحت کی۔
”کیا.....؟“ اس نے پھر سے استغابیہ انداز میں
سوال کیا۔

خند برقرار تھی۔

”اگر تم نے اپنی جیمیں خالی نہ کیں تو مجھے زبردستی کرنا پڑے گی۔“

”مجھے ایک وکیل چاہیے۔“ اس نے اکھڑے لہجے میں پسپائی اختیار کی۔

”تم اتنے جھوٹے ہو کہ تمہیں کوئی وکیل نہیں دیا جاسکتا۔ اب اپنی جیمیں خالی کرتے ہو کہ لگاؤں ایک طمانچہ۔“ میں نے لہجے میں خوفناکی سموتے ہوئے کہا۔

رونی نے گہری نگاہوں سے مجھے دیکھا اور میں نے اسے ایک بار پھر ہماری نظروں کا مقابلہ ہو رہا تھا۔

”اگر تم نے مجھے مارا تو یہ پولیس کا تشدد ہوگا۔ اور تمہیں اس کی سزا ملے گی۔“ اس نے اپنی عمر سے بڑی بات کی۔ نو سال کا ہو کر وہ چالیس سال کا بننے کی کوشش کر رہا تھا۔

”ایک بات دھیان سے سن لو۔“ میں نے غرا تے ہوئے کہا۔ ”میں پولیس والا نہیں ہوں۔ یہ آخری موقع ہے بچے۔ اپنی جیمیں خالی کر دو نہ۔“

”آہ۔“ اس نے ناپوی سے کہا مگر اپنی جیمیں خالی کر دیں۔

اس کے پاس سبز سائمن کا پرس موجود نہیں تھا البتہ دو سوڈالر کے نوٹ ضرور تھے بلکہ دو سو چار ڈالر تھے۔ مجھے تمہارے بے کار کھلونے نہیں چاہیے ہیں۔ میں اپنے لیے کھلونے خود خرید سکتا ہوں۔ اس کی کبھی ہوئی بات ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ بے شک وہ ان پیسوں سے اپنے لیے بہت سے کھلونے لے سکتا تھا۔ لیکن درحقیقت دکھ اور تکلیف ہی اس کا مقصد رہتی۔

”تم نے پرس کے ساتھ کیا کیا روٹی؟“ میں نے پوچھا۔

”کون سا پرس؟“

”کہیں پاس ہی چھپک دیا تھا؟“

”میں نہیں جانتا، تم کیا کہہ رہے ہو۔“ وہ اب بھی انکاری تھا۔

”اچھا۔ چلو یہ بتاؤ کہ پھر تمہارے پاس اتنے سارے پیسے کہاں سے آئے؟“ میں نے انداز بدل کر کہا۔

”زمین پر پڑے ملے۔“

”اوں ہوں۔ یہ سبز سائمن کے پرس میں تھے۔“ میں نے اس کی بات کی تردید کی۔

”وہ کون ہے؟“ اس کے انداز میں بے ساختگی تھی

”تم نے صرف یہی مال تو آج نہیں اڑایا۔“ میں نے میز پر رکھے سامان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تم نے سبز سائمن کے پرس پر بھی ہاتھ صاف کیا۔ جو تمہارے پاس سے برآمد نہیں ہوا اور نہ ہی اس میں موجود دو سوڈالر۔ پھر تم نے ان کے ساتھ کیا کیا؟“

”میں نے کوئی پرس چوری نہیں کیا۔“ وہ بولا۔ ”خیر کم از کم آج کے دن۔ تو بالکل نہیں۔“

”مارکی۔“ میرے انداز میں واضح تنبیہ تھی۔ ”میں قسم کھاتا ہوں۔ باقی سارا سامان بلاشبہ میں نے ہی اڑایا ہے۔ لیکن یہ بات سو فیصد سچ ہے کہ میں نے آج کی تاریخ میں کوئی پرس چوری نہیں کیا۔“ وہ تیزی سے بولا۔

میں نے تیز نظروں سے اسے گھورا لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اس کی آواز میں صداقت کا شور واضح محسوس کیا جاسکتا تھا۔ اور بظاہر کوئی وجہ بھی نہیں تھی کہ وہ پرس کی چوری سے منکر ہوتا۔

کیا واقعی سبز سائمن اپنا پرس کہیں اور رکھ کر کوئی بھی تھیں؟ اگر یہ سچ تھا تو میری مارکی کے ساتھ کی کئی بھاگ دوڑ محض اس شک پر مبنی تھی کہ وہ ایک سزایافتہ مجرم تھا۔ میں نے شرمساری کی سرفرازی اپنے چہرے پر چھپتی ہوئی محسوس کی۔ اگر آج اس نے اپنے ہاتھ کی صفائی نہ کھائی ہوتی تو؟ اب جتنا بڑا چندہ مل گیا رہا تھا تب اس سے کہیں بڑا بے وقوف ثابت ہوتا۔

اس سے پہلے کہ میں شرمندگی کے سیلاب میں بہہ جاتا ایک یاد نے دماغ پر دستک دی۔ شرمندہ ہونے کے بجائے میں نے اس بات پر غور کرنا شروع تو حقیقت واضح ہوئی چلی گئی۔

”وہ مارا۔“ میں نے جوش سے سوچا۔ میں بالکل صحیح خطوط پر سوچ رہا تھا۔ سبز سائمن کا پرس کہیں کھو یا نہیں تھا بلکہ چوری ہوا تھا۔ اور میں چور سے واقف تھا۔ چور کو پکڑنے کی ہمیشہ خوشی ہوتی ہے لیکن اس بار صورت حال بالکل مختلف تھی۔ میں گہرا تاسف محسوس کر رہا تھا۔ میں اس کے بالکل سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

”اپنی جیمیں خالی کر دو۔“ میں نے کہا۔

”کس لیے؟“ جواب آیا۔

”کیونکہ میں تمہیں ایسا کرنے کے لیے کہہ رہا ہوں۔“

”اور میں تمہارا کہنا کس لیے مانوں۔“ اب بھی

”اگر میں نے تمہیں سنا بننے کا نہ کہا ہوتا تو یہ سب

تماشا ہی نہ ہوتا۔“

”تم نے مجھے مجبور نہیں کیا تھا۔ میں خود بھی تمہاری اور مستحق بچوں کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ میں خود کو قصور وار سمجھتا ہوں۔ مجھے ماری و اثر کا معاملہ خوش اسلوبی سے حل کرنا چاہیے تھا۔ یہ تماشا نہ ہوتا تو چندے کی مد میں کافی رقم اکٹھی ہو سکتی تھی۔ مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے تقریب کا اتنا برا انجام ہوا۔“ میں نے دل کا غبار نکالا۔

وہ کچھ دیر تو خاموشی سے میری باتیں سن رہی پھر اسی خاموشی سے میری جانب جھکی اور ایک بڑے جوش بوسے سے نواز دیا۔

”یہ کس خوشی میں.....؟“ میں نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

”تمہارے انسان ہونے کی خوشی میں.....“ وہ بھی مسکرائی۔ ”تم ہر وقت شکایتیں کرتے رہتے ہو لیکن تم میں انسانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ ایک بچے کے لیے جو اتنا اداس ہو جائے۔ وہ دل کا بُرا انسان ہو ہی نہیں سکتا۔“

”بُرا سنا تو ہو سکتا ہے.....؟“ میں نے ٹکڑا لگا یا۔

”بالکل ہو سکتا ہے لیکن.....“ اس نے کہا اور دیوار گیر گھڑی کو دیکھتے ہوئے اٹھ گئی۔ ”چوبیس تاریخ ہو چکی ہے۔ اور کرس کا تحفہ تمہیں وقت سے پہلے ہی دیا جا سکتا ہے۔“

”کیا تحفہ.....؟“ میں نے اشتیاق سے آنکھیں پٹپٹائیں۔

”اوہ..... تمہیں پسند آئے گا تحفہ۔“ وہ خواب گاہ کی جانب جاتے ہوئے بولی۔ ”میں تیار ہو رہی ہوں۔ پانچ منٹ سے پہلے نہیں آتا۔“

میں نے اسے تین منٹ ہی دیے۔ اس دوران مجھ پر روٹی کے سلسلے میں جوشال طاری تھا وہ ختم ہو چکا تھا۔ ایک مجرم باپ کے بجائے اسلامی مرکز میں وہ بچہ کافی بہتر تعلیم حاصل کر سکتا تھا۔ وہاں وہ اپنی صلاحیتوں کو مثبت انداز میں نکھار سکتا تھا۔

”تم تیار ہو یا نہیں.....“ میں نے خواب گاہ کے دروازے پر کہا۔ ”بُرا سنا آ رہا ہے۔“

ایک خراب سنا بننے میں آخر حرج ہی کیا تھا جبکہ میں جانتا تھا کہ سراغ رساں تو میں بہت ہی اچھا ہوں۔

جیسے وہ پہلے سے اس سب کی تیاری کر چکا ہو۔

”تمہارے باپ نے تمہیں یہ سب کرنے کے لیے کیا پھر تم نے خود سے ہی ناور خیال سوچ لیا تھا؟“

اب کی بار سوال بالکل نشانے پر بیٹھا تھا۔ وہ اپنی مسکراہٹ نہ چھپا سکا۔

”میں بہت چالاک ہوں.....“ اس نے کہا۔

”بڑے ہو کر میں بالکل اپنے پا پا جیسا بنوں گا۔“

”بالکل صحیح کہہ رہے ہو۔“ میں نے تاسف سے کہا۔ ”پھل اپنے درخت سے زیادہ دور تو نہیں گرا کرتے۔“

☆☆☆

رات آدمی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ میں کیری کے کمر پر اس کے لیونگ روم میں کاؤچ پر اس کے ساتھ ہی

نیم ورزا۔۔۔ ٹیک لگائے، آنکھیں موندے۔۔۔ نڈھال پڑا تھا۔ سر میں شدید درد جبکہ دل میں دکھ غم کی لہریں موجزن تھیں۔ آج کا دن بہت تھکا دینے والا ثابت ہوا تھا۔

میری ساری پریشانیاں اور بے عزتی ایک طرف لیکن ایک نو سالہ بچے، چاہے وہ چھوٹا غذا ہی کیوں نہ ہو، کو جب شعبہ

اصلاح برائے بچکان والے لے جائیں تو افسوس تو ہوتا ہی ہے۔ ایک جانب باپ کو پولیس گرفتار کر رہی تھی اور دوسری

جانب بیٹا اصلاحی مرکز جا رہا ہو تو کافی تکلیف دہ منظر ہوتا ہے۔ سارے تہوار کا مزہ کر کر اہو گیا تھا۔

میری تذلیل کا ابھی خاتمہ نہیں ہوا تھا۔۔۔ آج کے تماشے کی تصاویر جب اخبار و رسائل میں آئیں گی تو لوگوں کو

بذائقہ اڑانے کا ایک اور موقع مل جائے گا۔ پولیس کے ساتھ وہاں نصف درجن اخباری نمائندے جتنازم پہنچ گئے

تھے۔ اب میرے پارٹنر ایمر ہارٹ اور دوستوں کو پتا چلنا

یعنی تھا کہ سنا کلاز کا روپ دھارے میں ہی ایکشن ہیرو بنا ہوا تھا۔ ہفتوں تک اب میری تفحیک اسی بات پر ہوئی تھی۔

کیری کو غالباً میرے سر درد کا اندازہ ہو گیا تھا اس لیے اس نے اپنی ترقی اٹھیلوں سے میری کنپٹیوں پر مساج

کرنا شروع کر دیا۔ جاوہد تھا اس کے ہاتھوں میں کہ میں نے فوراً ہی درد میں آرام محسوس کیا۔ البتہ تاسف ابھی بھی برقرار

تھا۔ شاید مساج سے آپ دکھ کو کم نہیں کر سکتے۔

”تم مجھے تو اس سب کا ذمے دار نہیں سمجھ رہے؟“ اس نے میرا سر سہلانے کے کچھ دیر بعد پوچھا۔

”تمہیں کیوں قصور وار سمجھوں؟“

دہرا کھیل

اعتراف از سلیم و صلی

ہنگامہ بھاگنے والے اس شور و صدا سے یکسر لاعلم ہوتے ہیں... جو اس کے نتیجے میں بلند ہوتا ہے... دہشت گردی پھیلانے والے دشمنوں کے ناپاک عزائم... وہ اپنی شورشیں بڑھا رہے تھے... اہل چمن کو برباد کر دینا چاہتے تھے... مگر ابھی اس چمن کے باغبان مستعد و متحرک تھے... وہ اس آگ کو روکنے کی کوششوں میں تھے... جو لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی...

دیکھیں۔۔۔ شرمانے سل فون کا کیمرا دوسری طرف گھمایا اور بے لباس پڑی اس عورت اور لڑکی کو شوکیا۔ دوسری طرف موجود شخص چلا یا۔

”چھوڑ دو انہیں کتے۔ انہوں نے کچھ نہیں بگاڑا تمہارا۔ مجھ سے جتنے مرضی میسے لے لو پر انہیں چھوڑ دو۔“ ”نہ جی۔ پیسہ تو ہم دینے کو تیار تھے مگر جناب نے میری بات نہیں مانی۔ اب کچھ تماشا ہونا چاہیے۔“ اس کے ساتھ ہی ان دونوں کو اشارہ کیا۔ وہ عورت اور لڑکی پر ٹوٹ پڑے تھے۔ انہوں نے ان کے منہ سے شیپ ہٹا دی۔ ان کے منہ سے ٹکڑی والی جینیں، انسان کے روپ میں ان درندوں کے اشتعال میں اضافہ کر رہی تھیں۔ یہ شیطانی کھیل تیس منٹ جاری رہا۔ شرما کے ساتھ کھڑا شخص اس سارے کھیل کی ویڈیو بنا رہا تھا۔

”بس بس، میرے شیر و... بس کرو۔ جناب کو زندہ واپس کرنی ہیں یہ۔“ شرمانے اشارہ کیا۔ وہ دونوں بڑی مشکل سے ان سے علیحدہ ہوئے۔ لڑکی کے منہ سے سسکیاں نکل رہی تھیں۔

”اب کیا پروگرام ہے جناب کا۔ ہماری بات ماننی ہے یا یہ ویڈیو دکھا دوں سب کو؟“ شرما کی بات سن کر دوسری طرف موجود شخص نے روتے ہوئے کہا۔ ”منکھور ہے۔“ شرمانے ”یس“ کہہ کر کال بند کر دی۔

☆☆☆

بارڈر سے تقریباً آٹھ کلومیٹر پیچھے اس مکان میں اس وقت پانچ افراد موجود تھے۔ ایک بائیس سال کی لڑکی اور پچاس کے قریب عورت چار پائی پر بندھی پڑی تھیں۔ ان کے چہروں پر خوف کے تاثرات تھے اور منہ پر شیپ لگی ہوئی تھی جبکہ ان کے سامنے بیٹھا شخص اس ساری صورت حال سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ان دونوں کو دو دن پہلے دارالحکومت سے اغوا کیا گیا تھا اور پولیس کے علاوہ انہیں گروپ بھی ان کی تلاش میں تھا۔

”کیا خیال ہے، کچھ مزہ کیا جائے؟“ سامنے بیٹھے شخص جس کو سب شرما جی کہہ کر پکار رہے تھے، نے انگلیں میں ساتھ بیٹھے ہوئے ساگھی سے کہا جس نے سگراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس نے سیٹی بجا کی اور دروازے سے دو حیرت انگیز جمات کے آدمی کمرے میں داخل ہوئے۔

”تم دونوں کافی دنوں سے بھوکے ہو۔ آج تمہارے لیے کھانا لایا ہوں۔“ اس نے سامنے بندھی پڑی ماں بیٹی کی طرف اشارہ کیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ان کی طرف بڑھے۔

”آں... ہاں۔ ابھی دو منٹ رکھو... اس تماشے کو کہیں اور بھی دکھانا ہے۔“ اس نے اشارے سے منع کیا اور سامنے پڑا اپنا سل فون اٹھا کر وائس ایپ لاگ ان کی۔ نمبر غیر ملکی تھا۔ تقریباً دس منٹ بعد ایک شخص سامنے ویڈیو کال پر موجود تھا۔ اسے دیکھتے ہی شرمانے کہا۔

”تو تمہیں میرا بیج مل گیا تھا۔ چلو آؤ کچھ دیر تماشا



اٹھا۔ کچھ دیر بعد لڑکے نے فرے لگانے کے بعد پیچھے بیٹھ گئے۔ شہیر احمد اب تقریب کا اختتام کر رہا تھا کہ اس کا ایک اسٹج کی داہمیں جانب سے ایک شخص نکلا۔ وہ بھاگتا ہوا اسٹج کے سامنے آیا۔ اس نے منہ پر نقاب چڑھا رکھا تھا۔ چند سیکنڈ کا کھیل تھا۔ اس نے جیب سے پستل نکالا اور صرف دس فٹ کی دوری سے نشانہ باندھ کر گولی چلائی۔ شہیر احمد نے بروقت حرکت کی۔ گولی اس کے بائیں بازو کو چھوئی ہوئی نکل گئی۔ نقاب پوش کو دوسری گولی چلانے کا موقع ملتا تو شاہد شہیر احمد کی یہ اختتامی تقریر اس کی زندگی کی بھی آخری تقریر بن جاتی مگر شہیر احمد کے ساتھ آپا ایک باڈی گارڈ کیلکی کی تیزی سے حرکت میں آیا، اس نے اسٹج سے جب لگا کر نقاب پوش کو دبوچ لیا۔ وہ دوسری گولی چلانا چاہتا تھا مگر ناکام رہا۔ باڈی گارڈ جو کہ تربیت یافتہ شخص تھا، اس نے بھرتی سے اس کا ہاتھ مروڑ دیا۔ پستل اس کے ہاتھ سے گر گیا تھا۔ گارڈ نے اس کے سر کے پچھلے حصے پر وار کیا۔ وہ تڑپا اور بے ہوش ہوئے۔ پہلے نقاب پوش نے دیکھا۔ کئی لوگ اس کی طرف دوڑ رہے تھے۔

شہیر احمد کو اسپتال لے جایا گیا۔ زخم زیادہ گہرا نہیں تھا۔ گولی بس چھوئی ہوئی گزری تھی۔ اسپتال سے فارغ ہو کر

کالج میں ہونے والی اس تقریب کی اختتامی تقریر علاقے کے ایم این اے صاحب کو کرنی تھی۔ تقریب کا میزبان اس وقت ان کی تعریف میں زمین آسمان ایک کر رہا تھا۔ ”آج ہمارے درمیان موجود ہے وہ شخصیت جس نے اس کالج کو بہت کچھ دیا ہے۔ کرکٹ کے میدان سے لے کر برقی آنے والی کلاس کے لیے جو الگ الگ کمرے موجود ہیں، ان سب کی منظوری ہمیں جناب شہیر احمد صاحب نے لے کر دی ہے۔ یہ پورا کالج پچھلے پانچ سال میں چمک اٹھا ہے۔ ہمیں فخر ہے اپنے علاقے کی اس عظیم شخصیت پر۔ میں اس پر دعوت دوں گا جناب شہیر احمد صاحب کو.....“ شہیر احمد پُر دھار انداز میں چلا ہوا اسٹج کی جانب بڑھا۔ اس کی شخصیت میں کچھ ایسی بات تھی جو سامنے والے کو مرعوب کر دیتی۔ مانگ سنبھال کر اس نے کئی کلمات کے بعد بولنا شروع کیا۔ یہ روایتی سیاست دانوں والی تقریر تھی جس میں اپنی حکومت کی تعریف اور نئی آنے والی حکومت پر تنقید کی جارہی تھی۔

اسی دوران ایک لڑکا کھڑا ہوا۔ اسے پہلے سے سمجھایا گیا تھا۔ اس کے منہ سے بلند آواز میں نکلا۔ ”شہیر احمد“ باقی لڑکوں کی آواز بلند ہوئی۔ ”زندہ باد“ کالج نعروں سے گونج

سب لوگوں کے ساتھ وقت گزارنے کے لیے میں اور میری بیٹی بھی آپ سب کے ساتھ ہوگی۔ اس کے علاوہ آپ کے چاروں بچہ زخمی ہوں گے۔ ٹرپ کے انتظامات مکمل کر لیے ہیں آپ سب محنت سے پڑھیں اور ویمبر ٹیسٹ دیں۔ اس کے بعد چھٹیں گے نئے سال کو خوش آمدید کہنے ہمارے ملک کے خوبصورت ترین علاقے میں۔“ تالیوں کی گونج میں ہی اس نے اپنا اعلان ختم کیا اور گھر واپس آ گیا۔ صبا اس کی خستہ بیٹی تھی۔ وہ سینڈ ایٹر کی طالب علم تھی۔ اسے دیکھتے ہی وہ اس کے پاس آ گئی۔

”ڈیڈ، ممانے مج سے کہہ رکھا ہے کہ میرے لیے سر پرانے اور بتائیں وہیں کیا ہے؟“ اس نے شکایتی نظروں سے باپ کی طرف دیکھا۔

”وہ یہ کہ..... بتا دوں؟“ عبداللہ خان نے سونے پر بیٹھے ہوئے شرارتی نظروں سے بیٹی کی طرف دیکھا۔

”ڈیڈ.....“ وہ مسوئی غصے سے اسے دیکھنے لگی۔

”اچھا بتاتا ہوں۔ تو بیٹا جی آپ کی سالگرہ کب ہے

بھلا؟“

”اتنیس دسمبر۔“ صبا نے جواب دیا۔

”تو اس بار آپ کی سالگرہ منانے ہم چارہ ہیں بل اسٹیشن۔ وہیں نئے سال کو خوش آمدید بھی کہنا ہے۔“ صبا ”یاہو“ کانفرہ لگا کر اس سے لپٹ گئی۔

☆☆☆

تیس دسمبر کی صبح پانچ بجے جب دھند نے پورے شہر کو گھیر لیا تھا تب بچوں کی بس اسکول سے روانہ ہوئی۔ اتنی سخت سردی میں صبح اس وقت اٹھنا بچوں کے لیے مشکل تھا کہ میر کے جوش نے انہیں سب بھلادیا تھا۔ چار گھنٹے بعد وہ ایک ویران سڑک سے گزر رہے تھے۔ بس ڈرائیور نے ان کے مشورے سے یہ راستہ اختیار کیا تھا کیونکہ اس روڈ سے فاصلہ زیادہ مگر ٹریفک کم تھا۔ تیس بجے، چار اساتذہ جن میں ایک لڑکی شامل تھی اور پوری کے علاوہ ڈرائیور اور اس کا ساتھی شامل تھے۔ یہ سب لوگ بس میں سوار تھے اور سفر خوشگوار ماحول میں جاری تھا۔ بچے ارد گرد مناظر دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ بس کے آگے عبداللہ خان کی ذاتی گاڑی تھی جس میں ڈرائیور کے علاوہ عبداللہ خان، اس کی بیوی زرین اور بیٹی صبا سفر کر رہے تھے۔ نئے سال کو خوش آمدید کہنے وہ بھی ان بچوں کے ساتھ مل اسٹیشن جارہے تھے۔ ٹھنڈی ہوا اور بادلوں کی وجہ سے موسم کی شدت میں اضافہ ہو رہا تھا۔

”ڈیڈ اور کتنا سفر ہے؟ میں تھک گئی ہوں۔“ صبا کی

وہ گھر پہنچا تو کئی وی جیل کے نمائندے موجود تھے۔ جھلن کے باوجود شبیر ان سے ملنے چلا گیا۔ ٹھوڑی دیر بعد وہ سب کے سامنے ایک مرتبہ پھر تقریر میں مصروف تھا۔ ”یہ میرے لوگوں کی دعا میں ہیں جو آج میں یہاں موجود ہوں۔ میری زندگی انہی کے لیے ہے۔ میں ان کی خدمت کروں گا، یہ لوگ جتنے مرضی چاہے قاتل بھی ہیں۔ میری جان بھی اپنے علاقے کے عوام پر قربان ہے۔ میں جانتا ہوں اس حملے کا کیا مقصد تھا۔ حکومت اپنے لوگوں کے ساتھ میں ہوگی تو جان کی ضمانت کسی کے پاس نہیں۔ مجھ پر قاتلانہ حملہ کرنے والے کو پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ اب میں دیکھتا ہوں اس سے بچ کیسے اگلاتے ہیں۔ میں عام لوگوں کی طرح انصاف چاہتا ہوں اور اگر نہ ملتا تو ہم سڑکوں پر نکلیں گے۔ ہم شہر بند کریں گے..... عوام میرے ساتھ ہے، میں کسی سے نہیں ڈرتا۔“ سرخ رنگ کی بریکنگ نیوز کے ساتھ اب اس کا بیان بھی دکھایا جا رہا تھا۔ لوگ ٹی وی کے سامنے بیٹھے اس کے الفاظ پر غور کر رہے تھے۔

☆☆☆

اسٹیشن بچوں کے اسکول میں ویمبر ٹیسٹ کے شیڈول کا اعلان کیا جا رہا تھا۔ اسکول کے مالک عبداللہ خان اپنی مصروفیت میں سے وقت نکال کر ان بچوں کے لیے آئے تھے۔ یہ اسکول انہی کے پیسوں سے بنا تھا اور ہر سال ان کی کمائی کا ایک حصہ اس اسکول پر خرچ کیا جاتا تھا۔ اس اسکول کی انتظامیہ پورے شہر میں سے محذور.... اور غریب بچے وصول کران کی مالی مدد کے علاوہ انہیں تعلیم جیسی نعمت سے نوازتی تھی.... یونیفارم سے لے کر کبس تک.... یہ اسکول مکمل فری تھا۔ عبداللہ خان کے علاوہ شہر کے چند مشہور بزنس مین بھی اس اسکول کے لیے فنڈ ڈیتے رہتے تھے۔ اسکول کے پرنسپل پرویز احمد شیڈول کا اعلان کرنے کے بعد بولے۔ ”ہمسارے اسکول کے پیارے بچوں کے لیے آج ہمارے پیارے دوست اور اس اسکول کے مالک عبداللہ خان صاحب ایک سر پرانے لائے ہیں۔“ بچوں نے خوشی سے تالیاں بجا دیں۔ عبداللہ خان اٹھا اور آج پراگر بولا۔

”پیارے بچو... اس باد ویمبر ٹیسٹ ختم ہونے کے بعد آپ کو سات دن کی چھٹیاں دی جائیں گی....“ پھر تیس دسمبر کو، ہم چھٹیں گے گھوٹے۔ آپ سب کو لے جائیں گے ایک مل اسٹیشن پر جہاں آپ سب خوب انجوائے کریں گے۔“ پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

”اس پورے ٹرپ کی نگرانی کرنے کے لیے اور آپ

دہراکھیل

آگے بڑھی اور باقی نقاب پوش اسکول کے بچوں سے بھری بس میں سوار ہو گئے۔ یہاں بھی پہلا شکار ڈرائیور بنا جبکہ دوسری گولی اس کے پھلپر کی جان لے گئی۔ ان بچوں کی چیخوں سے بس گونج اٹھی۔ اس دیرانے میں بس اور کار کو روکنا ان کی پلاننگ میں شامل تھا۔ بمشکل دس منٹ لگے ہوں گے انہیں اپنا کام مکمل کرنے میں۔ کار کے پیچھے بس روانہ ہو گئی۔ سفر پہلے کی طرح شروع ہو چکا تھا مگر منزل کا طلم کسی کو نہ تھا۔

☆☆☆

تقریباً دو گھنٹے بعد یہ سفر ختم ہوا۔ بچوں کے علاوہ باقی سب کی آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھی گئی تھی۔ گاڑی سے اترتے ہی ٹھنڈ کا احساس بڑھ گیا تھا۔ کچھ دیر پہلے ہی اس علاقے میں بارش رکی تھی۔ ان کی منزل پرانا ہوتا تھا جو پچھلے تین سالوں سے بند پڑا تھا۔ نامعلوم وجوہات کی بنا پر بند ہونے والے اس ہوٹل کا مالک ملک سے باہر تھا جبکہ اس کے بیٹے کو اتنی فرصت نہ تھی کہ وہ اس کوچ ویتا یا اس کی دیکھ بھال کرتا۔ عبداللہ خان، زرین اور سہا کو دوسری منزل پر ایک کمرے میں بند کیا گیا جبکہ بچوں اور اسکول ٹیچر ڈو-نچو-ی کمرے میں بند کر دیا گیا۔ ان کی آنکھوں سے سیاہ پٹی ہٹ چکی تھی۔ یہاں ان نقاب پوش افراد کے تین ساتھی پہلے سے موجود تھے۔

”ان کو کتنے دن رکنا ہے یہاں پاس؟“ ایک نے

سوال کیا۔

”اتیس کی رات بارہ بجے تک۔ نیا سال آتے ہی ہمارا کام مکمل ہو جائے گا۔“ اس کا لہجہ صاف نہ تھا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا پتل ساقی کو تھام دیا اور جیب سے ایک جدید ترین سیل فون نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ سب سے پہلے وہ بچوں کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے ویڈیو بنانا شروع کر دی۔ وہ سب حیرت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ ویڈیو بنانے کے ساتھ ساتھ وہ پیغام بھی ریکارڈ کر رہا تھا۔

”یہ تمہیں۔۔۔۔۔۔ اسکول ٹیچرز اور ان کا ساتھی باورچی ہمارے قبضے میں ہیں۔ ہم ان کو ابھی ایک سیکنڈ میں مار سکتے ہیں۔ ایسے۔۔۔۔۔۔“ اس نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا جس نے ایک سیکنڈ میں باورچی کے سر میں گولی اتار دی۔ بچوں کی چیخیں نکل گئیں۔ بچوں کے ساتھ آئی ان کی ٹیچر حسابے ہوش ہو گئی۔ یہ تمام مناظر سیل فون میں ریکارڈ ہو رہے تھے۔

”ان کے علاوہ ہمارے پاس تین تحفے اور بھی ہیں۔“

آواز نے کافی دیر سے چھائی خاموشی توڑی۔ وہ نازک طبیعت کی لڑکی تھی اور پہلی بار گاڑی میں اتنا لبا سخر کر رہی تھی۔

”ابھی تین گھنٹے اور لگیں گے۔“ عبداللہ خان نے اطلاع دی۔

”اف ڈیڈ میں نے تو کہا تھا گاڑی میں سفر مشکل ہے۔“ صبا نے تھک کر یک لگائی۔

”بھئی میں نے نقش کر دیا ہے تھے مگر آپ کی ممانے گاڑی میں چلنے کی فرمائش کر دی۔“ اس نے شکایتی نظروں سے زرین کی طرف دیکھا جس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”میں نے سو جان معصوم بچوں کے ساتھ چلتے ہیں ویسے بھی قدرتی مناظر دیکھنے کا اچھا موقع ہے۔“

”ہمما اڑ پورٹ سے آگے بھی قدرتی مناظر ہوتے ہیں۔“ اس نے آنکھیں موند لیں۔ گاڑی میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی لیکن یہ زیادہ دیر برقرار نہ رہی۔ ان کی گاڑی کے سامنے دو کاریں آ کر رکیں۔ اچانک بریک لگانے کی وجہ سے ان سب کا جسم جھکا کھٹا گیا۔ سامنے والی گاڑیوں میں سے تقریباً آٹھ بندے اترے۔ ان سب نے جھروں پر نقاب چڑھا رکھا تھا اور سب کے ہاتھ میں جدید ساخت کا اسلحہ دکھائی دیتا تھا۔ صبا نے آنکھیں کھول کر سامنے دیکھا۔ خوف سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

”ڈیڈ کیون لوگ ہیں؟“ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ اس سوال کا جواب عبداللہ خان کے پاس نہ تھا۔ اس نے ڈیش بورڈ کھولا اور ریو اور نکالنے کی کوشش کی مگر تب تک ”دھامیں“ کی آواز گونج چکی تھی۔ گولی ان کے ڈرائیور کی گردن میں لگی۔ اسے ترپے کا وقت بھی نہ ملا۔ شاید انہیں خوفزدہ کرنے کے لیے تھا۔ زرین اور صبا کی چیخوں نے پہلے بچادی۔ ریو اور عبداللہ خان کے ہاتھ سے گر گیا۔ سامنے والی گاڑیوں سے اترنے والے نقاب پوش میں سے دو بھاگتے ہوئے ان کی طرف بڑھے۔ ان کی چلائی گئی آگلی دو گولیوں نے ان کی کار کے شیشے توڑ دیے تھے البتہ وہ تینوں کسی نقصان سے محفوظ رہے تھے۔ آنے والوں میں سے ایک نے ٹوٹے شیشوں میں سے اندر ہاتھ ڈال کر لاکھ کھولا اور ڈرائیور تک سیٹ پر بیٹھ گیا جبکہ دوسرا صبا اور زرین کے ساتھ بیٹھ چکا تھا۔ ”خبردار کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔“ دھمکی سن کر مزاحمت کی سوچ بھی ان کے دماغ میں نہیں آ سکی۔ وہ لوگ مکمل تیاری سے آئے تھے۔ ان کی گاڑی ایک جھٹکے سے

یہ کہتے ہوئے پاس دوسری منزل کی طرف چل دیا جہاں عبداللہ خان اور اس کی چلی موجود تھی۔ اس نے ان تینوں کی ویڈیو بنائی اور دوبارہ بولنے لگا۔

”حکومت کے پاس صرف ایک دن کی مہلت ہے۔ اکتیس دسمبر شام سات بجے تک دس کروڑ روپے اور ہمارا ساتھی وسم جو کچھ دن پہلے شبیر احمد پر حملہ کرتے ہوئے گرفتار ہوا ہے، اسے رہا کر دیا جائے ورنہ سات بج کر ایک منٹ پر ہم ان سب کو آڑا دیں گے۔“ ویڈیو میسج ریکارڈ ہوتے ہی اس نے سیل فون آف کیا۔ عبداللہ خان نے اس سے کہا۔

”بچے معذور ہیں اور یہاں سخت سردی ہے۔ ان کو سردی سے بچنے والی جیکٹس دے دینا، بس میں موجود ہیں۔“ پاس نے غور کر اسے دیکھا۔

”مرنے والے جاگے سردی سے۔ فی الحال تو اس سے بچنے کا سوچو۔“ اس نے ساتھی کے ہاتھ سے پکڑ کر سیل اسے دکھایا۔ وہ خاموش ہو گیا۔ شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ یہاں بجلی کا انتظام نہ تھا۔ البتہ انہوں نے جزیئر لگا رکھے تھے۔ تھوڑی دیر بعد سب کمروں میں ایک ایک بلب روشن تھا۔ ان سب کو کھانے کے لیے چند بسکٹ اور چائے کا ایک ایک کپ دیا گیا۔ سوائے چند لوگوں کے... کسی نے بھی ان چیزوں کو ہاتھ نہ لگایا۔ آٹھ بجتے ہی پاس وہاں سے روانہ ہو گیا۔ تقریباً ایک گھنٹے کے سفر کے بعد اس نے اپنی گاڑی ایک جگہ روکی اور وہاں اپ آں کر کے ریکارڈنگ کی ویڈیو ایک نیوز چینل کے وائس ایپ پر بھیج دی۔ یہی نہیں بلکہ یہ ویڈیو اگلے چند منٹ میں ٹی وی کے کئی میگزین اور گروپس میں اپلوڈ ہو چکی تھی۔ سم پر انٹرنیٹ کی سہولت موجود نہ تھی۔ اس نے اس کام کے لیے ایک وائی فائی ڈیوائس کا استعمال کیا تھا۔ اپنا کام مکمل کرنے کے بعد وہ بڑبڑایا۔

”اب ہو گا تم لوگوں کا جینا حرام۔“ اور واپس ہوئی کی جانب بڑھ گیا جس کے گیٹ پر اب بھی دھندلے الفاظ میں اس کا نام چمک رہا تھا۔ ”دی وائنٹ شی ہوئی (سفید شہر)۔“

☆☆☆

اس رات گیارہ بجے سے کچھ دیر پہلے بریکنگ نیوز نے ٹی وی دیکھنے والے لوگوں کو چونکا دیا۔ ”ٹرپ پر جانے والے ایتھلس بچے اغوا۔ شہر کے مشہور بزنس مین اور فلاچی کاموں کی وجہ سے مشہور ہونے والے عبداللہ خان کا خاندان بھی ان کے ساتھ اغوا کر لیا گیا۔ دیکھیں اغوا کرنے والوں کا ویڈیو میسج۔“ اس کے ساتھ ہی ٹی وی کی اسکرین پر پاس کا ریکارڈنگ کیا گیا ویڈیو میسج دکھائی دینے

لگا۔ باورچی کے قتل ہونے کا منظر دھندلا دکھایا مگر ملک بھر میں ہنگامہ برپا کرنے کے لیے باقی کا ویڈیو میسج کافی تھا۔ ان بچوں کے والدین نیوز چینل پر دکھائی دینے لگے۔ یہ سب لوگڑ مڈل کلاس لوگ تھے۔ ان کے رونے کے مناظر عوام کے جذبات کو ابھارنے اور نیوز چینل کی ریٹنگ میں اضافے کا باعث بن رہے تھے۔ اس وقت ایتھلس یونٹ کی ٹیم مینٹنگ روم میں سر جوڑ کر بیٹھی تھی۔ ان کا لیڈر کیپٹن جبران احمد تھا جس کا چہرہ اس وقت جذبات سے عاری تھا۔

”سب سے پہلے ہمیں فیس بک اکاؤنٹ اور وہ سیل نمبر ٹریس کرنا ہے جس سے ویڈیو میسج بھیجا گیا ہے۔ اس کی لوکیشن ملے کے بعد ہی ہم کچھ کر سکتے ہیں۔“ اس نے سراٹھا کر اپنی ٹیم کی طرف دیکھا۔ یہ سب لوگ تربیت یافتہ اور ایسے کاموں کا تجربہ رکھتے تھے۔ جس موبائل نمبر سے نیوز چینل کو وائس ایپ کیا گیا تھا وہ ان کے پاس تھا۔ چند منٹ میں ہی انہوں نے لوکیشن نکال لی۔ اس کے ساتھ ہی ٹیم بک اکاؤنٹ جس کے ذریعے ویڈیو پوسٹ سوشل میڈیا پر پھیلانی گئی تھی، وہ بھی ٹریس کر لیا گیا۔ یہ چند دن پہلے بنایا گیا اکاؤنٹ تھا جس کی لوکیشن ٹریس کرنے میں دس منٹ لگے۔ دونوں لوکیشنز ایک ہی جگہ کی تھیں۔ کیپٹن جبران نے لوکیشن دیکھتے ہی چونک کر سر اٹھایا۔

”عمیر یہ تو تمہارا ایریا لگتا ہے مجھے۔ ذرا دیکھو۔“ عمیر نے لیپ ٹاپ کی اسکرین پر دکھائی دینے والا نقشہ غور سے دیکھا۔

”یس سر، یہ میرا ہی علاقہ ہے مگر جس جگہ سرخ نشان لگا ہے وہاں تو ویرانہ ہے۔ آبادی اس سے تقریباً تیس گلو میٹر پیچھے ہے۔“ عمیر کی بات سن کر جبران کے منہ سے ”ہم“ نکلا۔

”تیس بچے، چار میچرز اور تین افراد ہیں عبداللہ خان کی فیملی کے۔ نوکل سینیٹس لوگ ان کے پاس ہیں مطلب اس علاقے میں سو گلو میٹر کی ریج میں کہیں نہ ہیں ان کے پاس محفوظ جگہ ہے جہاں ان سب کو رکھا گیا ہے۔“ اس نے اندازہ لگایا جو کہ حقیقت کے قریب تھا۔ وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ”آبادی میں تو ظاہر ہے وہ جا نہیں سکتے۔ یہاں ایسا کوئی ریست ہاؤس یا کوئی اور عمارت جو خالی پڑی ہو؟“ اس نے دوبارہ عمیر کی طرف دیکھا۔

”میرا نہیں خیال سر۔ ایک ہوٹل ہے مگر آبادی کے بالکل پاس ہے اور وہ بھی عام عام۔ جس میں ان سب کو قید رکھنا ناممکن ہے۔“ یہ کہتے ہوئے عمیر چونک گیا۔ ”ایک منٹ سر،

دہراکھیل

باس بے پنی سے گھڑی دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے ہی وہ اپنا کام مکمل کر چکے تھے۔ ہوٹل کے چاروں طرف ہم فکس کر دیے گئے تھے۔ ان کا ریوٹ اس کے پاس تھا۔ ایک شیٹن رہاتے ہی پورا ہوٹل اڑ جاتا۔ تقریباً دو بجے کے قریب اس کے نمبر پر ایک میسج آیا۔

”وہ آرہے ہیں۔“ اس کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔ وہ تیزی سے حرکت میں آیا اور اس کمرے میں گھس گیا جہاں بچوں اور ننچر زکور کھا گیا تھا۔ اس نے میجر مس حنا کو بازو میں جکڑ کر اٹھالیا۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔

”لگتے کہاں لے جا رہے ہو مجھے؟“ وہ پچھلائی۔

اسے اپنی موت صاف نظر آرہی تھی۔ باس نے اس کی کٹنی پر ہلکے رکھ دیا۔

”چپ چاپ آگے بڑھو ورنہ.....“ وہ اس ”ورنہ“ کا مطلب جانتی تھی۔ لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے اس نے بے کسی سے سب کو دیکھا۔ کچھ دیر بعد باس اسے لے کر ہوٹل کی چھت پر تھا۔ سردی ان کی ہڈیوں میں اتر رہی تھی۔ حنا کانپ رہی تھی، سردی سے زیادہ خوف کی شدت سے۔ باس کی نظریں سامنے دیکھ رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد اسے ہوٹل کے پیچھے موجود پہاڑی پر ہلچل محسوس ہوئی۔ وہ ہوشیار

آبادی سے آگے کوئی ساٹھ ستر کلو میٹر دور یہی سڑک دائیں جانب مڑ رہی ہے۔ ذرا وہ علاقہ دواہن کریں۔“ کیپٹن جبران نے لیپ ٹاپ کی اسکرین پر انگلی گھمائی۔ اب کی بار نقشہ مطلوبہ چلے گا تھا۔

”میرا خیال ہے وہ یہاں ہیں۔“ عمیر نے پُر جوش لہجے میں کہتے ہوئے نقشہ زوم کیا اور ”وائٹ شی“ ہوٹل پر انگلی رکھ دی۔

”وائٹ شی ہوٹل؟ اس کا نام میں سن چکا ہوں مگر میرا خیال ہے یہ تو کافی عرصہ پہلے بند ہو چکا ہے۔“

”جی سر یہ بند ہے اور ویران پڑا ہے۔ کچھ پُر اسرار واقعات کی وجہ سے تین سال پہلے بند کر دیا گیا تھا۔ اسی فیصد چانس ہے وہ یہیں ہوں گے۔“ اس نے تفصیل بتائی۔

”پُر اسرار واقعات؟“

”تفصیل نہیں معلوم مگر ایسا کچھ تھا جس کی وجہ سے وہاں کوئی گا کہ رات نہیں گزارتا تھا۔“

”ہائی پائیس وہیں پہنچ کر ہوں گی، تیار ہو جائیں سب۔ ہمیں روانہ ہونا ہے۔“ کیپٹن جبران اچانک ہی کھڑا ہو گیا۔

☆☆☆

پراسرار حویلی

بھیدوں بھری زندگی کے دلچسپ انکشافات آخری صفحات پر **نشور ہادی** کا انوکھا انداز

انتقام

ماضی کے پوشیدہ گوشوں کی فسون گری اور بند درپچوں میں پنہاں راز و نیاز..... تاریخی صفحات پر **علی اختر** کے قلم کا جادو

رنگ آسمان

زہریلے سانپوں اور گہری چالوں پر مشتمل خوفناک اور عبرت ناک واقعات کا سنگم..... **ایے آراجپوت** کے خیالات کی پرواز

وقت

خوشگوار مستقبل کی آس اور کرہ ناک ماضی کی بھول بھلیوں میں گم شدہ لمحات کا احاطہ کرتے وقت کی نگاریاں۔ **حسام بٹ** کے قلم کا جادو

2018 کے آخری شمارے کا ایک جٹاک

نویسورت کہانیوں کا مجموعہ

سینس ڈائجسٹ

ماہنامہ

مزید

خلیوں کی محنت

محنت شہر چٹن

اور

لگ مشہور حیات کی تحریک داری

تنویر دھاض : شاہ ذہین رضوان سلیم انور دھرم عباس

محمد طاہر عمیر اور نادہہ نورد کی نویسورت کہانیاں

جاسوسی ڈائجسٹ 147 دسمبر 2018ء

ہو گیا۔ تین افراد ریختے ہوئے ہوئی کی جانب بڑھ رہے تھے۔ باس ہٹا۔

”لو جی منیجر صاحب آگئے آپ کے چاہنے والے۔“ اس کے ساتھ ہی ویرانہ کوئی چلنے کی آواز سے گونج اٹھا۔ حتیٰ کہ کھوپڑی میں سوراخ ہو چکا تھا۔ باس نے بجلی کی سی تیزی سے اسے چھت سے نیچے پھینک دیا اور ساتھ ہی بھاگتا ہوا گراؤنڈ فلور پر آ گیا۔ اس نے اپنا سیل فون نکالا اور اپنا منیجر دینے لگا۔

”حکومت نے کمانڈوز کو بھیج کر اچھا نہیں کیا۔ ان کا کسی بھی قسم کا ایکشن یہاں موجود سب لوگوں کی جان خطرے میں ڈال سکتا ہے۔ ایک گھنٹہ میں نے دے دیا ہے، امید ہے پسند آئے گا۔“ اب کی بار یہ ڈیڑھ حکومت اور فورس کے چند اہم لوگوں کے نمبر پر واٹس ایپ ہوئی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے باس کے پاس ان لوگوں کی پوری فون ڈائریکٹری ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ یہاں موجود اس کے لوگ کسی بھی قسم کے ایکشن کے لیے تیار کھڑے تھے۔ اس نے بلند آواز میں پکارا۔

”کمانڈو آگئے ہیں۔ تیار ہو۔“ تھوڑی دیر بعد اس کے اشارے پر ایک نقاب پوش نے ہوائی فائرنگ شروع کر دی۔ ہر سو بچوں کی ڈر کے مارے نکلنے والی چیخیں گونج رہی تھیں۔

☆☆☆

کیپٹن جبران نے سب کو رکنے کا اشارہ دے دیا۔ ”انہیں معلوم ہے ہماری آمد کے بارے میں۔“ اشارہ پاتے ہی سب رک گئے۔ دونوں جوان حتیٰ لاش اٹھالائے تھے۔

”کون ہے یہ؟“ اس نے پوچھا۔ ”بچوں کے ساتھ منیجرز تھے انہی میں سے ہے کوئی۔“ جبران نے اسے لاش پیچھے جانے کا اشارہ کیا۔

”آخر کیا چاہتے ہیں یہ لوگ؟“ وہ بڑبڑایا۔ منیجرز ہونے میں کچھ ہی وقت باقی تھا۔ ہوئی کے آس پاس خون کی بومبوس ہورہی تھی۔ ”عمیر؟“ اس نے پکارا۔ ”کیس سر؟“

”پڑا سر اور واقعات کوئی دے ہوئے تھے اس ہوئی میں؟“ کچھ علم ہے؟“ اس کا سوال سن کر عمیر نے کچھ دیر سوچا۔

”بس تھوڑا بہت جانتا ہوں سر۔ پورے علاقے میں یہ ہوئی آسیب زدہ مشہور تھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے یہاں ہر سال کی آخری رات میں کچھ ہوتا تھا۔ کسی کا قتل یا کوئی اور واقعہ۔“ جبران چونک گیا۔

”آج آئیں دسبر ہے مطلب آج کی رات کچھ ہو گا۔“

”جی سر مگر پچھلے تین سال سے یہ ہوئی بند پڑا ہے اور ایسا کوئی واقعہ بھی پیش نہیں آیا۔“

”وہ تو ظاہر ہے جب کوئی ہوگا نہیں تو کچھ ہوگا کیسے؟“ خیر..... جبران واپس چلا گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے پونٹ کے انچارج سے رابطہ کیا۔

”سر، ہمیں کمانڈو ایکشن کا موقع نہیں ملا۔ انہیں ہماری آمد کی خبر ہوگئی تھی۔ ایک منیجر کو مار دیا گیا ہے اور لگتا ہے ان کا ارادہ کچھ اور ہے۔ مجھے ان کے مطالبے کی تفصیل اور اس ہوئی کے مالک کے بارے میں معلومات درکار ہے۔“ منیجر ہونے میں کچھ ہی دیر باقی تھی۔ انچارج نے جواب دیا۔

”ان کا مطالبہ صاف ہے دس کروڑ روپے اور اپنے ساتھی کی رہائی مگر ایک اہم پوائنٹ۔ شبیر احمد پر حملہ کرنے والا پیشہ ور قاتل تھا۔ وہ کوئی ایسا شخص نہیں جس کے لیے اتنی بڑی کارروائی کی جائے۔ ان کا مقصد کچھ اور ہے جس کی وجہ سے وہ اتنا خون بہا رہے ہیں۔“

”سر، اہم ہو یا نہ ہو۔ اس کے بدلے میں قیمتی لوگوں کی جانیں خطرے میں ہیں، ان اجیشل بچوں میں سے ایک بھی مر گیا تو میڈیا اور عوام ہمیں معاف نہیں کریں گے۔ میرا نہیں خیال ان کی ڈیمانڈ پوری کرنے میں کوئی حرج ہے۔“

”کیپٹن ہمارا کام یہ فیصلہ کرنا نہیں۔“ اس بار جواب درشت لہجے میں..... دیا گیا۔ ”یہ فیصلہ حکومت پر چھوڑ دو۔ اگر ایکشن کی گنجائش ہے تو بتاؤ۔“

”ابھی تک ایسی کوئی صورت نظر نہیں آئی۔ البتہ ہوئی کے بارے میں سننے میں آرہا ہے کہ یہ آسیب زدہ تھا جس کی وجہ سے بند کر دیا گیا تھا۔ یہاں ہر سال کی آخری رات کچھ ہوتا تھا۔ قتل یا کوئی واقعہ۔“ جبران نے جواب دیا۔

”اوکے۔“ منیجر سات بجے تک حکومت کا کوئی اہم بندہ وہاں ہوگا باقی کام منیجر ہی ہو سکے گا تب تک کوئی ایسا کارروائی نہ کی جائے جس سے بچوں کی جان کو خطرہ ہو۔ میں ہوئی کے مالک کی تفصیل حاصل کرتا ہوں۔ دیش آل۔“ بات مکمل کرنے کے بعد وہ واپس اپنی پوزیشن پر آ گیا۔ اب وہ بس صرف انتظار کر سکتے تھے۔

☆☆☆

حکومت کا اہم عہدیدار سات کے بجائے آٹھ بجے وہاں پہنچا۔ حسب روایت اس کے ساتھ پولیس کی چار گاڑیاں اور ذاتی گاڑی کی دو ٹوپی ہائی کس موجود تھیں۔

دہراکھیل

مجرم کو جیل سے نکالنا آسان کام نہیں۔ کیم کی شام سات بجے تک تمہارے دونوں مطالبے مان لیے جائیں گے۔ اس کی بات سن کر باس ہٹا۔

”میری بات مان لی جائے گی یا پہلے کی طرح کمانڈو ایکشن ہوگا۔“ اس کے کچھ میں زہر تھا۔ ”میں ان چالاکیوں کو سمجھ رہا ہوں، میرے ساتھ کھیل کھیلنے کی ضرورت نہیں۔“ ”دیکھو ہماری مجبوری کو سمجھو۔ دس کروڑ روپے کا مسئلہ نہیں مگر دس کم کی رہائی ایک مشکل کام ہے، ہمیں وقت دو۔“ اس بار باس نے سوچتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہم..... ٹھیک ہے بارہ گھنٹے کا وقت ہے۔ کیم کی صبح سات بجے تک مگر ایک اور بات۔ دس کروڑ روپے۔ ہمارے ساتھی دس کم کی رہائی اور شہر تک محفوظ راستہ۔ بچے ہمارے ساتھ رہیں گے۔ شہر جا کر چھوڑ دیا جائے گا۔ میری دونوں ڈیمانڈز پوری ہونے تک پولیس اور یہ اسپیشل یونٹ والے ہوٹل سے سوئفٹ دور رہیں گے۔“ سیکریٹری نے سر ہلا دیا۔ ”ہمیں منظور ہے۔“

”مگنڈ۔ کپڑے پہنو اور نکل جاؤ۔“ سیکریٹری نے کپڑے پہنے اور باہر نکل گیا۔ وہاں آکر اس نے سعید اور جبران کو تفصیل بتائی۔ جب تک میڈیا کی ٹیمیں وہاں پہنچ چکی تھیں۔ گاڑیوں کو ہوٹل سے سوئفٹ پیچھے لے جایا گیا۔ رپورٹر اور کیرمائن ان کے پیچھے تھے۔ سعید نے پانچ منٹ کا وقت انہیں دے کر تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کیا۔ ”سر، کیا حکومت ان کے مطالبے مان لے گی؟ دس کم کی قتل کیس میں مطلوب تھا، کیا اسے چھوڑ دیا جائے گا؟“ رپورٹر کی آواز گونجی۔

”حکومت ابھی فیصلہ کر رہی ہے، آپ.... بہتری کی امید رکھیں۔“

”کیا بچوں کا اغوا اور سیکورٹی اداروں کی بے بسی آپ کی حکومت کی ناکامی کا منہ پوچھتا ثبوت نہیں؟“ ”نوشہ۔“ اس نے غصے سے جواب دیا۔

”جس قاتل کی رہائی کا مطالبہ کیا گیا ہے، اس نے اپوزیشن لیڈر پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ شیر احمد نے الزام لگایا ہے کہ سب آپ کی پارٹی کی سازش تھی۔ کیا سازش میں بچوں کا اغوا بھی شامل تھا؟“ اس بار سوال برداشت سے باہر تھا۔

”تیس معذور بچوں کی جان خطرے میں ہے اور آپ لوگ الزام تراشی میں لگے ہوئے ہیں۔ شرم آتی چاہے آپ جیسے لوگوں کو۔“ سعید پھٹ پڑا۔ ”میں یہاں سوالوں کا

گاڑی سے اتر کر اس نے کیمپن جبران سے ہاتھ ملایا۔ ”کیمپن جبران، کیا چوبیس ہے؟“

”بہت خراب۔ خون پانی کی طرح بہا رہے ہیں۔ اب تک تقریباً چار نکل کر چکے ہیں اور لگتا ہے مزید بھی کریں گے۔ بچوں کی جان سخت خطرے میں ہے۔“ اسی دوران آنے والے عہدیدار سعید اصغر کے سیکریٹری نے اس کے کان میں کچھ کہا۔ اس نے سر ہلا کر جبران کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”دو مزید ویڈیوز آپ لوڈ کر دی ہیں اس نے۔ سوئفٹ میڈیا پر ڈر اور دہشت نہ پھیلے اس وجہ سے ہم نے اس کے اکاؤنٹ ہلاک کئے ہیں مگر اب کی بار سنے اکاؤنٹس سے سامنے آئی ہیں اور کچھ اہم شخصیات کے نمبر پر بھی وائس ایپ کی گئی ہیں۔ چاروں طرف ہم لگے ہوئے ہیں۔ ان حالات میں میرا خیال ہے ان سے بات کرنا بے معنی ہے۔“

”بات کی جاسکتی ہے۔ ہمیں ایک دن کا وقت مزید مل جائے تو شاید کچھ بات بن جائے۔“ اس نے پرامید نظروں سے سعید کی طرف دیکھا۔

”ٹھیک ہے ہمیں بھی وقت لینے کی ہدایات کی گئی ہیں، میں ان کے سرغنہ سے بات کرنے کی کوشش کر رہا ہوں وائس ایپ پر بھیج دیے ہیں۔ ہو سکتا ہے ملنے کے لیے تیار ہو جائے۔“ اور ٹھوڑی دیر بعد جواب مل گیا۔

”ایک آدمی اندر آجائے۔ کمانڈو میں سے نہ ہو۔ ہاتھ کھڑے ہوں کسی قسم کی چالاکیاں جواب خطرناک ہوگا۔“ سعید اور جبران نے کچھ دیر مشورہ کیا اور آخر سعید کے سیکریٹری کو ہوٹل میں بھیج دیا گیا۔ نوجوان سیکریٹری کچھ خوفزدہ تھا۔

جبران نے اس کا حوصلہ بڑھایا اور وہ ہوٹل کی جانب بڑھ گیا۔ اس نے ہاتھ میں ہوا میں اٹھارے تھے اور دل کی دھڑکن اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد جب وہ گیٹ کے سامنے پہنچا تو گیٹ کھول دیا گیا۔ اس کی مکمل تلاشی لی گئی۔ سارے کپڑے اتارنے کے بعد اسے ایسے اندر جانا پڑا۔ سردی کی شدت سے وہ کانپ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ باس کے سامنے موجود تھا۔

”تم مجھے لوگوں کا منہ ل چکا تھا۔ میں پہلے ہی یہ بات بتا چکا ہوں کہ آج شام سات بجے کے بعد ایک منٹ کی بھی دیر ہوئی تو میں سب کو آڑووں کا پھر تمہارا بات کرنے کا وقت مانگتا میری سمجھ سے باہر ہے۔“ باس کا لہجہ سفاک تھا۔ ایک سرد لہر اس کے پورے جسم میں دوڑ گئی۔

”حکومت چوبیس گھنٹے کی مہلت چاہتی ہے۔ ایک

جواب دینے آیا ہوں، مجرم نہیں جو آپ کی عدالت میں کھڑا رہوں۔ مزید کوئی بات ہوئی تو آپ کو آگاہ کر دیا جائے گا۔“ وہ تیز قدم اٹھاتا ہوا اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔ جہاں جبران ہوئی کے مالک کے بیٹے کے ساتھ موجود تھا۔

”عبید علی، احسان علی کے بیٹے ہیں۔ اس ہوئی کے مالک۔“ جبران نے اس کو تعارف کروایا۔ ”عبید، کیا آپ سعید صاحب کے سامنے ہوئی کی تفصیل بتائیں گے؟“ عبید نے سر ہلایا اور مجھے لہجہ میں بولنے لگا۔

☆☆☆

سات سال پہلے جب احسان کا کاروبار عروج پر تھا تب اس نے مختلف شہروں میں اپنے نام کے کئی ہوٹل تعمیر کئے۔ احسان ہوٹل کی شاخیں پورے ملک میں پھیلی ہوئی تھیں۔ انہی دنوں احسان اپنے خاندان کے ساتھ اس علاقے کی سیر کرنے آیا۔ راستے میں گاڑی خراب ہونے کی وجہ سے اسے یہاں رکتا پڑا۔ تب یہاں ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا جس میں کوئی ایک آدھ سیاح ٹھہر جاتا اور نہ اکثر لوگ کھانا کھانے کے بعد اپنا سفر آگے جاری رکھتے تھے۔ احسان کو یہ لوکیشن اتنی پسند آئی کہ اس نے وہ ہوٹل خرید لیا اور ”وائٹ سٹی“ کے نام سے نیا ہوٹل تعمیر کیا۔ پہلے کی نسبت یہ ہوٹل شاندار تھا۔ کروڑوں روپے خرچ کر کے یہاں ہر قسم کی سہولیات پہنچائی تھیں۔ ہر سال کئی لوگ یہاں ٹھہرتے تھے۔ شروع میں ایسا لگ رہا تھا جیسے وائٹ سٹی کمائی میں شہر کے بڑے بڑے ہوٹل کو پیچھے چھوڑ دے گا مگر پہلے سال کے بعد لگاتار تین سال اس ہوٹل میں انیسویں دسمبر کی رات کچھ پراسرار واقعات رونما ہوئے۔

پہلے واقعے میں ہوئی کے دو ملازمین مردہ پائے گئے۔ ان پر کسی قسم کا تشدد نہیں کیا گیا تھا۔ ٹھیک ایک سال بعد سال کی آخری رات کو ہوئی کے جنرل مینجر اچانک بند ہو گئے۔ بجلی وہاں تھی نہیں، اس لیے آدھا کھٹا ہوٹل اندھیرے میں ڈوبا۔ جب جنرل مینجر ٹھیک کیے گئے تو دو مختلف کمروں میں پانچ آدمی مردہ پائے گئے۔ ان کی موت پراسرار تھی۔ تیسرے سال بھی بالکل اسی طرح ہوا اور اس بار نشانہ بننے والوں میں ہوئی کا منیجر بھی شامل تھا۔ ٹوٹن چار افراد اس سال قتل ہوئے۔ گیارہ لوگوں کی موت کے بعد ہوئی بند کر دیا گیا۔ ان واقعات کے کھوج کے لیے پولیس کئی ماہ وہاں رہی مگر کوئی ثبوت یا قاتل کا کوئی نشان نہ ملا۔ تین سال سے یہ ہوئی بند پڑا تھا۔ احسان نے جس سے ہوئی خریدی تھی، اس

سے بھی اس بارے میں جاننے کی کوشش کی مگر وہ صرف اتنا بتا سکا کہ کئی سال پہلے یہاں ایک پھلی رکھی تھی اور سال کی آخری رات مردے شراب پی کر اپنی بیوی سے جھگڑا کیا تھا جس کے بعد اس نے بیوی اور دو بچوں کو مار دیا تھا۔ وہ خود پراسرار طور پر غائب ہو گیا تھا۔ اس واقعے کے بعد لوگ اکثر رات کو ہوئی میں ڈر جاتے تھے۔ انہیں چھین سنا دیتی تھیں اور کمرے کی لائٹ بھی اچانک بند ہو جاتی۔ کسی کے قدموں کی آواز بھی گونجتی تھی۔

☆☆☆

اور ایسا اب بھی تھا۔ آج بھی سال کی آخری رات تھی۔ رات کے دس بج چکے تھے۔ صبا ماں کی گود میں سر رکھے لیٹی ہوئی تھی۔ اچانک ان کے کمرے میں موجود لائٹ بند ہو گئی۔ عبداللہ خان چونک گیا۔

”اسے کیا ہوا؟“ وہ بڑبڑایا۔ اس نے اٹھ کر لائٹ آن کرنے کی کوشش کی مگر اندھیرے میں کچھ دکھائی نہ دیا۔ وہ ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ صبا کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ باہر سے بھاگ کر کوئی اندر آیا۔

”کیوں چیخ رہی ہو، کیا ہو گیا تھا؟“ اس کے ساتھ ہی اس کے منہ سے گالی نکلی۔ عبداللہ خان کھڑا ہو گیا۔

”لگتا کچھ نہیں، میں گر گیا تھا لائٹ آن نہیں ہو رہی۔“ وہ آگے بڑھا۔ اس نے ہاتھ میں موجود ٹارچ کی روشنی سے لائٹ آن کی۔ ابھی وہ باہر نکلا ہی تھا کہ لائٹ دوبارہ بند ہو گئی۔

”اسے بڑھے، یہ کھیل نہ کھیل بیٹیں مار کے پیسہ دوں گا۔“ وہ چیخا ہوا دوبارہ اندر گھسنے ہی لگا تھا کہ دروازے سے اسے کسی نے پیچھے ٹھکسٹ لیا۔ اس کے منہ پر اتنی مضبوطی سے ہاتھ رکھا گیا تھا کہ وہ چیخ بھی نہ سکا۔

☆☆☆

گیٹ پر موجود وہ دونوں اپنی ڈیوٹی دے رہے تھے۔ اچانک ایک رک گیا۔

”کیا ہوا؟“ دوسرے نے پوچھا۔ رکنے والے نے انگلی کا اشارہ کیا۔

”جل جلدی کر لے۔ باس آنے والا ہے یہاں۔“ وہ سر ہلاتا ہوا ایک سائیز پر بڑھ گیا۔ ابھی وہ کچھ ہی دور گیا تھا کہ اس کے کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا۔ اس نے چونک کر پیچھے دیکھا۔

”لگتا کون ہے یہاں؟“ مگر پیچھے کوئی موجود نہ تھا۔ وہ واپس طرف مڑ گیا۔ ابھی چند قدم ہی اٹھائے تھے کہ اس

”رک جائیں سر۔“ وہ رک گیا۔ ابھی وہ ٹیچرز ہوٹل کے گیٹ سے دس پندرہ فٹ پیچھے ہی تھے کہ ان میں سے ایک گر گیا۔ اسے اسٹیج پر نکلنے سے نشانہ بنایا گیا تھا۔ باقی دونوں کی موت بھی یقینی تھی۔ اور وہی ہوا۔ اگلی گولی نے ایک کی گردن میں سوراخ کر دیا۔ جبران بھی کر دوسرے کو نیچے لیٹنے کا کہہ رہا تھا مگر خوف نے شاید اس کے کان بند کر دیے تھے۔ ایک اور گولی۔ ایک اور لاش۔ جبران کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ برہنہ لاشیں وہیں پڑی تھیں۔

”سر، ان کے سرخند کا ایک اور منیج ملا ہے۔“ سیکریٹری کی آواز سنائی دی۔ جبران ایک جھٹکے سے سعید کی جانب بڑھا۔

”ان سے جب آپ لوگوں کی بات ہو چکی تھی تو اب یہ کیوں کر رہا ہے ایسا۔“
”اس لیے۔“ اس نے نقاب پوش لباس کا ویڈیو منیج اس کے آگے کر دیا۔

”میرے دو بندے غائب ہیں۔ لگتا ہے حکومت مجھے سنجیدہ نہیں لے رہی۔ میں اپنی بات پر قائم ہوں کل سات بجے تک میری ڈیمانڈ زپوری کر دیں۔ میں بچوں کو چھوڑ دوں گا لیکن اب کوئی اور کمانڈر اندر کھسا تو اگلی باری عبداللہ خان اور اس کی جنگلی کی ہوگی۔“ جبران نے دانت پیسے۔

”یہ ذرا ہار کر رہا ہے ہم میں سے کوئی بھی اندر نہیں گھسا۔“ پانچ بج چکے تھے۔ اندر حرا سمجھ رہا تھا۔ یہاں سے کوئی بھی واپس نہیں گیا تھا۔ سعید نے بھی اپنی گاڑی میں رات گزاری تھی۔ جبران کی بات سن کر اس نے رخ بدلے میں جواب دیا۔

”مجھے لگتا ہے کچھ نہ کچھ ہوا ہے ورنہ وہ اپنی بات پر قائم تھا۔“ جبران نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔
”سر میں اپنی پوری ٹیم کا ڈنڈے دار ہوں ہم میں سے کوئی بھی ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔“ اسی دوران عمیر نے جبران کے کان میں کچھ کہا۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس نے سعید اصغر جانب دیکھ کر کہا۔

”سال کی آخری رات تھی۔ کہیں ہوٹل میں ہونے والے واقعات دہرائے تو نہیں جا رہے؟“ سعید بھی چونک گیا۔

”ایسا بالکل ممکن ہے۔ اس بار پاس سے میں خود بات کرنے جاتا ہوں لیکن دسم کی موت کا کیسے بتایا جائے؟“ اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہ تھا۔ وقت گزر رہا تھا اور

کے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ بے ہوش ہونے سے پہلے اسے آخری احساس ہوا۔ کوئی اسے کندھے پر اٹھا رہا تھا۔

☆☆☆

دسم کو جیل سے نکالنا ضروری ہو گیا تھا۔ پولیس نے چند ضروری کام مکمل کیے اور اسے پولیس دین میں بٹھا کر شہر سے روانہ ہو گئے۔ جس دین میں دسم سوار تھا، اس کے آگے کچھے پولیس کی گاڑیاں دوڑ رہی تھیں۔ سخت سکیورٹی میں اسے شہر سے باہر لایا گیا۔ رات کا ایک بج چکا تھا۔ نئے سال کو خوش آمدید کہنے کے لیے لوگ ابھی تک سڑکوں پر موجود تھے۔ ایک گاڑی پولیس کی گاڑیوں سے دو کلومیٹر کا فاصلہ رکھ کر ان کے تعاقب میں تھی۔ شہر سے باہر آتے ہی اس گاڑی نے فاصلہ کم کرنا شروع کر دیا۔ اس میں چار افراد سوار تھے اور وہ ہر قسم کے اسلحے سے لیس تھے۔ اچانک پولیس کی دین ایک جھٹکا کھا کر رک گئی۔ اس کا ٹائر دھماکے سے پھٹ گیا تھا۔ ٹھیک اسی وقت سڑک کے دائیں اور بائیں جانب سے چار افراد نکلے اور انہوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ پیچھے موجود گاڑی کے سوار بھی بجلی کی سی تیزی سے باہر آئے۔ ان کی فائرنگ سے ایک گاڑی کو آگ لگ گئی۔ وہ پوکس وین جس میں دسم سوار تھا اس کے چاروں طرف سے پولیس نے گھیرا ڈالا ہوا تھا مگر ان کی تعداد تیزی سے کم ہو رہی تھی۔ حملہ کرنے والوں کے بھی دو بندے گر چکے تھے۔ اچانک ایک دہائی بم پولیس وین پر پھینکا گیا۔ دین ایک دھماکے سے ٹوٹ گئی۔ دسم کا جسم کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ حملہ آور یعنی تیزی سے آئے تھے۔ اتنی ہی تیزی سے غائب ہونے لگے۔

☆☆☆

سعید کو جیسے ہی اطلاع ملی، اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا لیپٹن جبران کے پاس آیا اور اسے دسم کی موت کا بتایا۔

”اوہ۔“ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”مجھے پہلے ہی اندازہ تھا کہ ہم سازش کا شکار ہو رہے ہیں اور شاید جنہوں نے بچوں کو اغوا کر رکھا ہے یہی۔“

”ہاں یہ لوگ اپنے مطالبے پر قائم رہیں گے جو کہ ظاہر ہے اب پورا کرنا ہمارے بس میں نہیں۔ ایکشن کے علاوہ اب کوئی چانس باقی نہیں رہا۔“ وہ باتیں کر رہے تھے کہ اچانک کچھ لوگوں کے چلتانے کی آواز سنائی دی۔ جبران جھانکنا ہوا اس جانب بڑھا۔ تینوں ٹیچرز بچوں کے ساتھ تھے، وہ ہمارگ کر ان کی جانب بڑھ رہے تھے۔ ان کے کپڑے اتار لیے گئے تھے۔ جبران ان کی جانب بڑھتا

اسے روکنا ان کے بس میں نہ تھا۔

☆☆☆

باس غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ منجھڑ کو مارنے کے بعد وہ تیزی سے چلتا ہوا عبداللہ خان کی دفنی والے کمرے میں گھس گیا۔ اسے دیکھتے ہی عبداللہ خان کھڑا ہو گیا۔ زمین رو رہی تھی۔ باس کو دیکھتے ہی وہ چیخ چیخ کر اسے گالیاں دینے لگی۔ عبداللہ نے اسے خاموش کیا اور بولا۔

”میری بیٹی کہاں ہے؟“

”کون؟ یہیں تو تھی؟“ باس نے حیرانی سے ارد گرد

دیکھا۔

”اسے لے گیا ہے تمہارا آدمی۔ وہ بے تصور ہے چھوڑ دو اسے۔“

”کیا بواں کر رہے ہو۔ میرا آدمی میری مرضی کے بغیر کیسے لے جاسکتا ہے؟ ڈرامت کر سیدی طرح بتا کہاں ہے وہ؟“ اس نے پٹل کی نال زمین کے سرے لگا دی۔

”جلدی بتا ورنہ میں اسے مار دوں گا۔“

”خدا کے لیے رحم کرو ہم پر، میں کہاں غائب کر سکتا ہوں اسے۔ ایک نقاب پوش لے گیا ہے اُسے۔“ باس نے کچھ سوچا اور سر ہلا کر باہر کی طرف چل دیا۔ یہاں کچھ عجیب ہو رہا تھا۔ بہت عجیب۔ اس کے آدمی تیزی سے کم ہو رہے تھے۔ اسے بار بار کمانڈوز پر خشک جاتا مگر وہ خود اپنے ہی خیال کو رد کر رہا تھا۔ اس نے باقی بچنے والے سات آدمی ایک جگہ اکٹھے کیے۔

”کوئی یہاں سے کہیں نہیں جائے گا۔“ وہ سب تربیت یافتہ لوگ تھے مگر خوفزدہ نظر آرہے تھے۔ باس خود ادھر ادھر ہل کر گھڑی دیکھ رہا تھا۔ ابھی ڈیڑھ گھنٹا باقی تھا۔ اس نے وائس ایپ پر آنے والے میسج چیک کیے۔ یہاں ایک میسج موجود تھا جسے پڑھ کر وہ چونک گیا۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل چکا تھا اور نقوش میں عجیب طرح کی سختی و صل پکلی تھی۔

”ان میں سے تین بچوں کو باہر لے آؤ۔“ اس نے ایک آدمی کو اشارہ کیا۔ وہ سر ہلاتا ہوا بچوں کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ وہ سب سکڑ کر بیٹھے تھے۔ کچھ مردی کی شدت سے تنگ آ کر ایک دوسرے سے بڑھ گئے تھے۔ کچھ گونگے تھے جن کی آواز نہیں نکل سکتی تھی اور نہ ہی وہ کچھ سمجھ رہے تھے اس لیے اشاروں سے دوسرے بچوں سے پوچھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کے کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک شخص اندر داخل ہوا۔ اس نے تین بچوں کو ساتھ لیا اور باہر آ گیا۔ باس

نے اسے دیکھ کر کہا۔

”سات بچے تنگ ہمارا مطالبہ پورا نہ ہو تو ہر پندرہ منٹ بعد ایک ایک کر کے انہیں مار دیتا۔“ اس کے کچھ کی سفاکی کو بچے نہیں سمجھ رہے تھے۔ وہ حیرانی سے ارد گرد کا ماحول دیکھ رہے تھے۔ اچانک ہوش ایک میسج سے گونج اٹھا۔ وہ سب چونک گئے۔ باس نے نیک کو اشارہ کیا۔

”جبار ذرا ہٹا کرو۔“ وہ تیزی سے اس سمت بڑھ گیا جہاں سے میسج سنا کی دی تھی۔ اسے گئے پانچ منٹ ہو گئے تھے مگر وہ واپس نہ آیا۔ اس بار باس نے اپنے ساتھ ایک اور آدمی ملایا اور خود اس جانب بڑھ گیا۔ وہ مطلوب جگہ پہنچے تو دیکھا کہ جبار کی لاش پڑی تھی اور گردن کی ہونٹ تھی۔ باس کے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ موت چاروں طرف سے گھیر اڑا ل چکی تھی۔

”میں مروں گا لیکن زندہ یہ بھی نہیں رہیں گے۔“ وہ بڑبڑایا۔ ریسٹو پر اس کی گرفت مضبوط ہو چکی تھی اور ریسٹو پر لگا سرخ بین سب کی موت کا فیصلہ سنانے کے لیے تیار تھا۔ بس اسے دبانے کی دیر تھی۔

☆☆☆

جبران اور اس کے ساتھیوں نے تیاری مکمل کر لی۔ وہ اندر داخل ہونے کے لیے تیار تھے۔ اسی دوران سعید چلتا ہوا ان کے پاس آیا۔

”اتنی جلدی فیصلہ مت کریں۔ ہمیں کچھ سوچنا ہوگا۔“

”اب ہم وقت ضائع نہیں کریں گے۔ بچوں کو بچانا ہے تو اندر جانا پڑے گا ورنہ اب وہ کسی بھی وقت انہیں مار سکتا ہے۔“ جبران نے جواب دیا۔

”میرے پاس ایک پلان ہے۔ کیوں نا طریقے سے اندر داخل ہوا جائے۔“ جبران چونک گیا۔

”کیسے؟“

”ہم ان کا مطالبہ پورا کریں گے۔“ سعید نے معنی خیز انداز میں کہا۔ جبران کو اس کی ذہنی حالت پر شبہ ہوا۔

”کیا وہم کو دوزخ سے واپس بلایا جاسکتا ہے؟“

”نہیں مگر وہ ہم کی جگہ کسی اور کو بھیجا جاسکتا ہے۔“ اس نے سوچتی ہوئی نظروں سے سعید کی طرف دیکھا اور کچھ دیر بعد بولا۔

”یہ خطرناک ہوگا انہیں شک ہو گیا تو ایک سینڈش سب کو آڑا دیں گے اور ویسے بھی ان کا کوئی خبر باہر موجود ہے۔ ہمارے آنے کی خبر بھی انہیں پہلے مل گئی تھی۔“

”ہو سکتا ہے یہ خبر نہ پہنچی ہو۔ ویسے بھی میڈیا کو بے خبر

دہراکھیل

رقم ملی ہم یہاں سے بھاگ نکلیں گے۔ پلان بی سب کو پتا ہے۔ اس کا انتظام کیا جا چکا ہے۔ تیار ہو سب۔“ ان سب نے ہاں میں سر ہلادیا۔ وقت تیزی سے بھاگ رہا تھا۔

☆☆☆

گیٹ سے سعید کو واپس بھیج دیا گیا۔ شاہد کے اندر داخل ہوتے ہی ایک نقاب پوش نے ہٹل اس کے سر پر رکھا۔

”خبردار، نیچے لیٹ جاؤ۔“ وہ لیٹ گیا۔ اس کے سر سے جیسے ہی کپڑا اٹھایا گیا، وہ اچھل کر حرکت میں آیا۔ اس کی واپس لات گھوٹی اور نقاب پوش کے منہ پر گلی مگر اس نے اپنے حواس قابو میں رکھے۔ گرتے ساتھ ہی کروٹ بدلی اور گولی چلا دی۔ شاہد کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی ران میں دھلتا انگارہ صدمہ کیا ہو۔ وہ چیخ کر نیچے گر کر نقاب پوش نے اٹھ کر اگلی گولی اس کے سر میں اتار دی۔

”بیوقوف سمجھا ہے تم لوگوں نے۔“ وہ چیخا اور اندر بھاگتا چلا گیا۔ اس کے ہاتھ میں دس کروڑ روپے کا بیگ تھا۔ اس نے اپنے سب ساتھیوں کو اٹھا لیا اور بلند آواز میں کہا۔ ”پانچ منٹ میں یہاں سے بھاگ نکلو۔ کمانڈر اندر مچھنے والے ہیں، میں ہوٹل کو آڑا نے لگا ہوں۔“ اس نے جیب سے ریموٹ نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔ ”جلدی کرو صرف پانچ منٹ ہیں تم لوگوں کے پاس۔“ وہ سب تیزی سے حرکت میں آئے۔ انہیں پہلے فرار کا راستہ بتایا گیا تھا۔ ہوٹل کی بائیں جانب ایک قطار میں بنے واٹس روم کے پیچھے جا کر وہ رک گئے۔ یہاں ان کے پلان کے مطابق میزمری لگائی گئی تھی جو اب کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ سب نے سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اچانک ایک جانب سے پورا برست آیا اور ان کے ایک ساتھی کو آڑا لے گیا۔ وہ سب لیٹ گئے اور فائرنگ شروع کر دی مگر وہ چاروں طرف سے گھیرے میں تھے۔ کمانڈر نے دو منٹ میں ان کا صفایا کر دیا۔ جبران اندر صدمہ چکا تھا جبکہ باقی سب کو عمیر لپٹ کر رہا تھا۔ اس نے انہیں اشارہ کیا۔ وہ بھاگتے ہوئے ہوٹل کے اندر کی جانب بڑھے۔ یہاں کسی قسم کی مزاحمت نہ ہوئی۔ شاہد کی لاش گیٹ پر پڑی تھی۔

”بچوں کا کراہنا شروع کرو۔“ عمیر چلا گیا۔ گراؤنڈ فلور پر ایک طرف بچوں کے چیخنے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ اس جانب بھاگا۔ کراہنا تھا۔ عمیر نے گولی سے لاک آڑا دیا اور اندر صدمہ کیا۔ ان تین معذور بچوں کو چند سیکنڈ میں باہر لے جانا ناممکن تھا۔ ہم کسی وقت بھی پھٹ سکتا تھا۔

ہی رکھا گیا تھا، وسم کی رہائی سے اور دوسری بات اگر انہیں پتا بھی ہے تو ہم اپنا ایک بندہ وسم کی روپ میں بھیج دیتے ہیں اس طرح اندر گھسنے کا وقت بھی مل جائے گا اور وہ بھی انہیں کا شکار ہو جائیں گے جس سے ہم فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔“ اس کی بات کافی حد تک درست تھی۔ کچھ دیر آپس میں بحث کرنے کے بعد جبران مان گیا۔ سعید نے اس بار پاس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ سات بجتے میں پانچ منٹ باقی تھے جب اس کا نتیجہ آیا۔

”وسم اور دس کروڑ روپے ہوٹل کے گیٹ پر لے کر آ جاؤ سعید صاحب۔“ سعید نے جبران کو بھیج دیکھا۔ اس دوران میڈیا کی تمام گاڑیوں کو مزید پیچھے جانے کا حکم دے دیا گیا۔ جبران کے ایک کمانڈر شاہد کا چہرہ چمکا کر اسے سعید کے ساتھ بھیج دیا گیا۔ رقم وہ پہلے ہی منگوا چکا تھا۔ رقم کا بیگ اور شاہد کو لے کر وہ گیٹ پر پہنچ گیا۔

☆☆☆

جبران نے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ ہوٹل کی دائیں سائڈ سے داخل ہونا آسان تھا۔ وہ بھاگتا ہوا اس جانب بڑھا۔ اس کے ساتھ عمیر تھا۔ جیسے ہی وہ دیوار کے قریب پہنچے، جبران نے پھرتی سے ایک غیر عمیر کے ہاتھ اور دوسرا کندھے پر رکھا اور دیوار پر چڑھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ہاتھ بڑھا کر عمیر کو بھی اوپر بھیج لیا۔ دونوں ایک ساتھ اندر بڑھے۔ عمیر اسے کور دے رہا تھا۔ ہوٹل کی چھت پر جانے کے لیے اسے پانچ کا سہارا لیتا پڑا۔ سخت سردی میں چھت پر موجود چیزوں پر برف کی سفید تہ بھی ہوئی تھی۔ چھت پر چڑھتے ہی وہ بائیں طرف گیا اور سر پر موجود بیگ میں سے رسی نکال کر نیچے لٹکانی۔ رسی کا سرا اس نے چھت پر موجود پانی کی ٹینگی سے باندھا تھا جو شاید کئی سالوں سے پانی کو ترس گئی تھی۔ یہاں مچھنے سے پہلے وہ تفصیل سے ہوٹل کا نقشہ دیکھ چکا تھا۔ رسی کے ذریعے نیچے اترتے ہوئے اس نے ایک کمرے کی وینڈو دیکھی۔ یہ کھلی ہوئی تھی۔ اس نے جھلانے کے انداز میں خود کو تھوڑا پیچھے کیا اور اس کھڑکی کے ذریعے کمرے میں صدمہ کیا۔ ایک ساتھ دو چیخیں بلند ہوئیں۔

☆☆☆

پاس نے سب معذور بچوں کو کمرے میں لاک کر دیا اور باقی سب کو ہدایت کی۔ ”ہمیں اب فرار ہونا ہے مگر جاتے ہوئے حکومت کو ان چالاکیوں کی مزاد دینی ہے۔ ہوٹل میں چاروں طرف سے ہم لگائے ہوئے ہیں۔ بس مرنے دبانے کی دیر ہے۔ جیسے ہی

☆☆☆

جبران جس کمرے میں داخل ہوا وہاں عبداللہ خان اور زرین موجود تھے۔ مخصوص درمی دیکھ کر عبداللہ خان چونک گیا اور زرین جو مسلسل چلا رہی تھی، اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر خاموش کیا۔

”میری بیٹی کو وہ عالم لے گئے۔ ہم تو اس کی سالگرہ منانے آئے تھے۔“ زرین مسلسل صدمے میں تھی۔ جبران نے منہ پر انگلی رکھ کر اسے خاموش کیا۔ وہ دونوں امید بھری نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ کمرے کے فرش پر بیٹھے انہیں کسی کھٹے گزر چکے تھے۔ جبران نے انہیں پیچھے کا اشارہ کیا اور خود باہر نکل گیا۔ وہ احتیاط سے آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک اس کی گردن کسی نے رسی میں جکڑ لی۔ اس نے پھرتی سے ایک ہاتھ سے رسی تمام لی اور نہ اسے سانس لینے کا موقع نہ ملا۔ رسی کو پکڑ کر اس نے پیچھے کھڑے شخص کو تھما کر پیچھے پھینکا۔ وہ مضبوط جسم کا مالک، انچھے بال اور بڑھی ہوئی داڑھی والا شخص تھا۔ ایسا غصوں ہوتا تھا جیسے کافی دنوں سے نہایا نہیں۔ اس نے عجیب نظروں سے جبران کو دیکھا۔ جبران اسے گولی مارنا چاہتا تھا کہ اچانک وہ اس سے لپٹ گیا۔ اس نے اپنے دانت اس کی گردن میں پھوست کر دیے۔ جبران کی چیخ نکلی گئی۔ اس نے اپنے جسم کی پوری طاقت لگا کر اس جنگلی کو پیچھے دھکیلا۔ اس کی گردن سے خون بہہ رہا تھا۔ جنگلی دوبارہ پوری قوت سے اس سے آن کر پڑا۔ جبران اچھل کر پیچھے گرا۔ اس کے پیچھے کرتے ہی ایک اور شخص اس پر حملہ آور ہوا۔ اس کے ہاتھ میں تھوڑا سا موجود تھا جو اس نے جبران کے سر پر آڑ مانا چاہا۔ جبران بجلی کی سی تیزی سے ایک سانڈ پر ہٹ گیا۔ تھوڑا فرش سے نکل آیا۔ اب کی بار دونوں ایک ساتھ حملہ آور ہوئے۔ ان کے جسم میں بے پناہ طاقت تھی۔ انہوں نے جبران کو پکڑ کر اس کا سر دیوار میں دے مارا۔ خون کا فوارہ ابل رہا تھا۔ انہوں نے غراتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑا اور کندھوں پر لا دیا۔ جبران کو موت صاف نظر آرہی تھی۔ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔

☆☆☆

باس نے دس کروڑ کا بیگ ہاتھ میں پکڑا اور سب ساتھیوں کو باہر بھیجے کے بعد خود بھی باہر جانا چاہتا تھا مگر کوئی چیز اسے رکنے پر مجبور کر رہی تھی۔ وہ اپنے باقی ساتھیوں کے غیاب اور نامعلوم قاتل کا معاملہ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے پانچ منٹ مزید وہاں رکنے کا فیصلہ کر لیا۔ اگرچہ یہ خطرناک تھا مگر تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ ہول کے اسور روم میں

کھس گیا۔ یہاں ٹونا ہوا فرنیچر اور دیگر سامان پڑا تھا۔ ادھر ادھر دیکھنے کے بعد وہ باہر آنا چاہتا تھا کہ اچانک ایک ہاتھ نے اس کی گردن جکڑ لی۔ باس کی سانس رک گئی۔ اس نے خود کو چھڑانے کی پوری کوشش کی مگر نام کام رہا۔ اس کی نظروں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ موت سے پیچھے کی فطری خواہش نے اسے مزید مزاحمت پر اکسایا۔ اس نے سامنے موجود دیوار پر دونوں جیر لگائے اور قلابازی کھا کر گردن دہانے والے کے پیچھے آگرا۔ ہاتھوں کے ٹھونسنے کی وجہ سے ٹکڑے کزور پڑ گیا۔ باس کی گردن آزاد ہوئی تو وہ کھانسا ہوا پیچھے ہٹا۔ سامنے موجود عجیب شکل و صورت کا شخص غریبا۔ اس نے مقامی زبان میں کچھ کہا جو کہ باس کو کچھ نہیں آیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ اس پر دوبارہ حملہ آور ہوا۔ باس بھاگنے کی دے کر باہر کی طرف بھاگا مگر وہ جسامت کے برعکس پھر تھلا ثابت ہوا۔ اس نے باس کی جیکٹ پکڑ کر پیچھے کھینچا۔ جیکٹ اتر گئی۔ باس باہر نکلنے میں کامیاب ہوتا مگر دروازے سے ایک اور شخص اندر داخل ہوا۔ اس کی شکل بھی پہلے کے جیسی تھی۔ اس نے باس کو گردن سے پکڑا اور نیچے دے مارا۔ باس کی چیخ کمرے میں گونجی۔ ان دونوں نے بغیر کوئی اور لفظ بولے اسے کندھے پر اٹھایا۔ یہ آخری منظر تھا جو باس نے دیکھا تھا۔ ریوٹ کب کا اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ ایک جنگلی نے باہر نکلنے سے پہلے وہ ریوٹ اٹھا لیا۔ وہ الٹا کمرے سے دیکھ رہا تھا جیسے یہ اس کے لیے جی تھی ہو۔ دونوں باہر جانے لگے۔

☆☆☆

عمر ان بچوں کو باہر بھاگنے کا کہہ رہا تھا۔ کچھ چل نہیں سکتے تھے اور کچھ اس کی بات سمجھ نہیں رہے تھے۔ کمانڈوز کی ٹیم نے ان سب کو اپنے ساتھ لیا اور باہر کی طرف بھاگنے لگے۔ چند سیکنڈ بعد ہی وہ ہوٹل سے نکل چکے تھے۔ بچے محفوظ تھے۔ ان سب کو ہوٹل کے سامنے موجود مزک کے پار لے جایا گیا۔ میڈیا ٹیم ان کی طرف کمرے لے کر بھاگ رہی تھی۔ عمیر نے بے چینی سے ہوٹل کی طرف دیکھا۔ جبران ابھی تک باہر نہیں آیا تھا۔ وہ بھاگتا ہوا ہوٹل کی جانب بڑھ گیا۔ بم ڈسپوزل اسکواڈ موجود تھا مگر وہ ریوٹ کنٹرول بم کو ناکارہ بنانے کے لیے اندر نہیں جانا چاہتے تھے کیونکہ ہوٹل کی عمارت کو خطرہ تھا اور بم کی وقت بھی پھٹ سکتا تھا۔ عمیر ہوٹل میں کھس گیا۔ اس کے ساتھ باقی دو کمانڈوز بھی ہوٹل میں جبران کو تلاش کرنے لگے۔ وہ کہیں نہ ملا البتہ عبداللہ خان اور زرین ایک کمرے میں بیٹھے مل گئے۔ زرین وہاں سے جانا نہیں چاہتی تھی۔

دہراکھیل

کچھ ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر تا کام رہا البتہ کمرے کی ایک سائڈ پرسو کے قریب پیشیاں جڑی ہوئی تھیں۔ اس نے قریب جا کر انہیں کھولنے کی کوشش کی مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ قدموں کی آواز سن کر وہ وہاں اپنی جگہ پر لیٹ گیا۔

آنے والا وہی جنگلی تھا۔ اس کے جسم پر اتنی سخت سردی میں بھی عام سے کپڑے تھے جو کہ کئی جگہ سے پھٹ چکے تھے۔ اس نے مقامی زبان میں کچھ کہا جو کہ جبران کو کچھ نہیں آیا۔ جبران نے آنکھیں دوبارہ بند کر لیں۔ وہ بے ہوش ہونے کی ایکجنگ کر رہا تھا۔ جنگلی کے ہاتھ میں ہتھوڑا تھا۔ وہ ہتھوڑا اٹھاتا ہوا بے ہوش بڑے نقاب پوش کی طرف بڑھا۔ جبران کے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ جنگلی ہتھوڑا اٹھاتا ہوا نقاب پوش کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے اچانک ہاتھ کھمایا۔ بے ہوش بڑے نقاب پوش کی کھوپڑی ٹوٹ گئی۔ اگلی باری لڑکی کی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اسے سکون مل رہا ہے اپنے کام سے۔ لڑکی کی طرف جاتے ہوئے جنگلی کے تاثرات اچانک بدل گئے۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ اس نے برسوں بعد عورت ذات کو دیکھا تھا۔ لڑکی جو کہ سادھی، تمام صورت حال سے بے خبر بے ہوش پڑی تھی۔ جنگلی اسے گھسیٹ کر لے جانے لگا۔ ہتھوڑا اس نے وہیں پیچھک دیا تھا۔ جبران کے لیے اب خاموش رہنا ممکن نہیں تھا۔ وہ کروٹ بدل کر ہتھوڑے کے بالکل باس پہنچ گیا۔ ہتھوڑا ہاتھ میں آتے ہی وہ چٹکناڑتا ہوا اٹھا۔ جنگلی اس کی جانب متوجہ ہوا مگر جب تک دیر ہو چکی تھی۔ ہتھوڑے کا دوا پوری قوت سے جنگلی کے سر پر لگا۔ وہ نیچے گرا۔ جبران نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ دو تین وار سے اس کی کھوپڑی پچکا دی تھی۔ صبا کو ہوش آ گیا۔ لاش دیکھ کر وہ چلائے لگی۔ اچانک جبران کو کسی نے دھکا دیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا، یہ باس تھا۔ جبران کے ہاتھ سے ہتھوڑا نکل چکا تھا۔ باس کے ہاتھ میں خنجر دکھائی دے رہا تھا۔ وہ جنگلی کی سی تیزی سے حرکت میں آیا۔ اس کے چہرے سے نقاب اتر چکا تھا اور جبران نے ایک سیکنڈ میں اسے پہچان لیا تھا۔ خنجر کا دوا جبران کے کندھے میں انگارے بھر گیا۔ اس نے کراہ پر قابو پایا اور سنبھل کر دوسرا۔ وار بچا گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے نیچے جھک کر ہتھوڑا اٹھا اور باس کے ہاتھ پر دے مارا۔ باس کی خنجر کمرے میں گونجی۔ خنجر اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ جبران نے ہتھوڑا باس کے سر پر آڑ پایا۔ اب کی بار اس نے ہاتھ ہٹا رکھا تھا۔ باس بے ہوش ہو کر نیچے گر گیا تھا۔ جبران نے صبا کو سنبھالا اور کمرے سے نکلنے کا رستہ سوچتے لگا۔ ابھی ایک جنگلی بانی تھا۔

وڈ صبا۔ کہہ کر چلا رہی تھی۔ عبداللہ زبردستی اسے گھسیٹ کر لے گیا۔ بیٹی کے غیاب نے دونوں کا حال برا کر رکھا تھا۔ اسی دوران ایک کمانڈر نے عمیر کو بلایا۔ عبداللہ خان کے کمرے کے باہر ہی لٹک رہی تھی۔

”جبران صاحب یہاں سے اندر آئے تھے۔“
”مگر وہ کم کہاں ہو گئے؟ اور بچوں کو یہ حال بتانے والوں کا باس بھی دکھائی نہیں دے رہا اس کا مطلب ہے یا تو وہ مرنے چکا ہے یا پھر بے بس ہے۔“ عمیر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”فرار کا راستہ کوئی اور دکھائی نہیں دیتا۔ کچھ تو ہے یہاں۔“ دونوں اس کمرے سے باہر آئے اور جبران کو ڈھونڈنے لگے۔ انہوں نے اتر فون پر بھی رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر کوئی جواب نہ ملا۔ ہوش کافی بڑا تھا۔ ہم پھٹ جانے کا خطرہ ابھی تک برقرار تھا مگر ان کی ٹریننگ نے انہیں جان بھٹیلی پر رکھنا سکھا دیا تھا پھر یہاں تو معاملہ بھی ان کے کپٹین کا تھا جو ان سب کا اچھا دوست بھی تھا۔ عمیر گراؤنڈ فلور پر موجود کمروں میں اسے ڈھونڈ رہا تھا۔ یہاں سامان نہ ہونے کے برابر تھا۔ کچھ ٹوٹا ہوا فرنیچر موجود تھا۔ ایسے ہی ایک کمرے میں ٹوٹا بیڈ پڑا تھا۔ یہاں عمیر کو عجیب سی بو محسوس ہوئی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی مردہ جسم یہاں موجود ہے۔ اس نے اتر فون سے دوسرے کمانڈر کو اطلاع کی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ بھی وہاں موجود تھا۔ ٹوٹا بیڈ اٹھا کر انہوں نے سائڈ پر کیا۔ ٹوٹے سے ان کی سانس رکنے لگی۔ سامنے ایک لاش موجود تھی جس کو مرے شاید کئی دن ہو چکے تھے۔ عمیر نے دوسرے کمانڈر اکبر کی طرف متنی خیز نظروں سے دیکھا۔ لاش بری حالت میں تھی۔ بازو اور ٹانگیں کٹی ہوئی تھیں۔ اس کمرے میں آ کر عمیر کو عجیب احساس ہو رہا تھا۔ بہت عجیب۔

☆☆☆

جبران کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ایک عجیب طرز کے کمرے میں پایا۔ اس کا نقشہ بے ڈھنگا اور بے چاروں طرف سے بند محسوس ہوتا تھا۔ آسجین کی کی محسوس ہو رہی تھی مگر ہوا اتنی خرد تھی کہ وہ سانس لے سکے۔ اس نے اور گرد دیکھا۔ یہاں ایک تار ج روشنی تھی۔ وہ یہ دیکھ کر چونک گیا کہ اس کے علاوہ بھی یہاں تین افراد موجود تھے۔ دو نقاب پوش اور ایک لڑکی۔ ایک نقاب پوش شاید مرنے چکا تھا جبکہ دوسرا درد کی شدت سے کراہ رہا تھا۔ جبران کا ہاتھ سر کے ڈھم پر گیا۔ خون بہہ کر خشک ہو چکا تھا۔ انہوں نے اسے باندھنے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ کھڑا ہو گیا۔ اس نے ادھر ادھر

عسیر اور اکبر کرا کھنکھال رہے تھے۔ یہاں کوئی کام کی چیز نہیں لی۔ وہ باہر نکلنے ہی گئے تھے کہ اچانک دروازے سے کوئی اندر داخل ہوا۔ وہ جنگی تھا۔ ان کی طرف دیکھ کر وہ غصے سے چیخا۔ اس کی جسامت ان دونوں سے ڈبل اور پھرتی دیکھنے کے قابل تھی۔ عسیر نے پہل اس کے سامنے کیا اور گولی چلا دی۔ گولی اس کا بازو چھوٹی ہوئی نکل گئی۔

”عسیر اس کے ہاتھ میں ریوٹ ہے۔“ اکبر چلا یا۔ عسیر نے دیکھا۔ جنگی زخمی ہونے کے باوجود حیرت انگیز برداشت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ عسیر نے اشارے سے اس سے ریوٹ مانگا مگر وہ چیخا ہوا ان پر حملہ آور ہوا۔ عسیر نے دوسری گولی اس کے سر میں اتار دی۔ وہ ٹھنڈا ہو گیا۔ عسیر نے ہتھے انداز میں گہرا سانس لیا۔ اسی دوران کمرے میں کسی کی چیخ مگنی۔ اس نے دیکھا جہاں اکبر کھڑا تھا وہاں کمرے میں اتنا بڑا سوراخ تھا کہ ایک آدمی آسانی سے نیچے اتر سکتا تھا۔ اکبر نیچے گر چکا تھا۔ عسیر بھاگتا ہوا اس جانب بڑھا۔ نیچے اتر کر اس نے دیکھا۔ جبران صبا کے ساتھ موجود تھا۔

جبران اسے انچارج کے سامنے موجود تھا۔ اس کے سر پر ابھی تک ٹی بندوقی ہوئی تھی۔ انچارج اس کی طرف دیکھ کر ہنسا۔

”کافی مشکل ثابت ہوا ہے مشن تمہارے لیے جوان؟“ ”جی سر۔ بس قسمت اچھی تھی جو بچوں کو بچالیا اور ٹیم بھی بڑے نقصان سے بچ گئی۔ بس دو کمائنڈر ذہنی شہید ہوئے ہیں۔ شاید کوہسٹم کے روپ میں بھیجا تھا، وہ اور ایک دوسرے کو ان جنگیوں نے مارا ہے۔“

”حقیقت کیا ہے اس پوری کہانی کی۔ تم سات دن مصروف رہے ہو۔ بڑے لوگ گرفتار ہوئے ہیں۔ شروع سے بتاؤ سب کچھ۔“ انچارج کے پوچھنے پر اس نے گہرا سانس لیا اور بولا۔

”کم ڈسٹرکٹ شیر احمد پر قاتلانہ حملہ ناکام ہوا جس میں ایک پیشرو قاتل وسم پکڑا گیا۔ پولیس اس سے کچھ نہ اٹھوا سکی مگر حقیقت یہ تھی کہ پلاننگ شیر احمد کو زخمی کرنے کی تھی اور یہ پلاننگ خود شیر احمد نے کی تھی۔ وسم کو بس اسے زخمی کرنے کا کہا گیا لیکن فرار کا راستہ دینے کے بجائے گرفتار کر لیا گیا۔ اب شیر نے پلان بی پر عمل کیا اور بس کو استعمال کیا۔ باس کا اصل نام بلال خان ہے اور وہ کافی دنوں سے شیر احمد کے لیے کام کر رہا تھا۔ ان لوگوں نے لاکھوں خرچ کر کے حکومت

کی ناکامی کا ثبوت دینے کے لیے معذور بچوں کو نشانہ بنانے کا فیصلہ کیا۔ بلال خود بے خبر تھا کہ جس وسم کی رہائی کا وہ مطالبہ کر رہا ہے، حقیقت میں شیر اسے بھی قتل کروانے کا منصوبہ بنا چکا ہے۔ بلال کا مطالبہ پورا کرنا ممکن نہیں تھا اس لیے اب بچوں کا مرنا یقینی تھا۔ ہم نے شاید کوہسٹم کی جگہ بھیجا مگر جب تک شیر اسے وسم کے مرنے کی اطلاع دے چکا تھا۔ ان کی پلاننگ مکمل تھی۔ دس کروڑ بلال کو قتل کئے تھے اور وہ فرار ہونا چاہتا تھا مگر وائٹ سٹی ہوٹل کا انتخاب کرنا ان کے لیے مصیبت بن گیا۔ وہ بری طرح ناکام ہوئے۔ کیونکہ وائٹ سٹی میں ان سے زیادہ خطرناک درندے موجود تھے۔ یہاں کہانی بتاتا چلوں وائٹ سٹی کی۔ اس ہوٹل کی تعمیر کے دوران یہاں تہ خانہ بنوایا گیا تھا جس کا مقصد مجھے دو دن پہلے پتا چلا ہے۔ شرم نام کے انڈین اینجنٹ نے اس ہوٹل کے مالک احسان کی بیٹی اور بیوی کو اغوا کر کے اسے بلیک میل کیا تھا۔ اس کے پاس احسان کی بیٹی اور بیوی کے ساتھ ہونے والے ریپ کی ویڈیو تھی۔ ہوٹل کو ملک میں ہونے والی دہشت گردی، ٹارگٹ کلنگ اور آرمی کے خلاف استعمال ہونے والے اسلحے کو محفوظ رکھنے کے لیے استعمال کیا گیا۔ ہوٹل میں ہونے والی اموات کی وجہ بھی اس کے دو آدمی بنے جن کی جسامت عام آدمیوں کے برعکس اور حلیہ جنگیوں جیسا تھا۔ یہ درندے تھے جن کی ٹریننگ بہت خاص طریقے سے کی گئی تھی اور یہ دونوں جڑواں بھائی چالاک اور عیار تھے۔ میں سمجھ رہا تھا شاید انہیں اسلحہ کا استعمال نہیں آتا مگر کوئی گولی اسلحہ کے اسٹور میں آگ نہ لگا دے اس ڈر سے وہ ہتھوڑے جیسا ہتھیار استعمال کرتے تھے۔ یہی وہ دو محافظ تھے جو ہوٹل میں کئی سال سے موجود تھے۔ یہ بھوک مٹانے کے لیے انسانوں کا گوشت بھی کھا جاتے تھے۔ ان میں سے ایک میرے ہاتھوں جبکہ دوسرا عسیر کے ہاتھوں جہنم واصل ہوا۔ انہیں ہم شرم نام کو نہیں پکڑ سکے کیونکہ وہ اپنے ملک میں بیٹھا ہے مگر ہم نے انہیں مالیت کا وہ اسلحہ ضرور اپنے قبضے میں لے لیا ہے۔ بلال اور شیر نے نئی حکومت کو دھچکا دینے کے لیے جو سازش کی تھی وہ ناکام ہو چکی۔ دونوں پر دہشت گردی کا مقدمہ چلایا جائے گا اور میرا نہیں خیال بھائی سے کم سزا ہو گی۔“ جبران نے کہانی ختم کرنے کے بعد گہرا سانس لیا۔

”تم اور تمہاری ٹیم نے بہت اچھا کام ہے۔ ویلڈن؟“ انچارج نے شاباش دی۔ وہ گہرا سانس لے کر باہر آ گیا۔ ایسے محافظ ہی اس ملک کی شان ہیں۔

سراغرسی کا پیشہ دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ مہماتی بھی ہوتا ہے... ذہن کو ایسی مہم جوئی کرنا پڑتی ہے کہ دانتوں تلے پسینا آجاتا ہے... ایک لڑکی کے اغوا کا معاملہ... تاوان کا مطالبہ کرنے والے نظر کے دائرے میں تھے مگر سراغرساں کا زاویہ نگاہ کسی اور جانب تھا...

ساز کے سروں میں بچھی سراغ کی نشاندہی.....

سریلا سراغ

سلیم انور



ریٹائرڈ اسکول ٹیچر فرانسس نے جب لیونا کی مرسیڈیز شریف کے دفتر کے سامنے کھڑی دیکھی تو سمجھ گئی کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔ اس لیے کہ لیونا ماسوائے کنٹری کلب کے کہیں بھی گاڑی میں نہیں جاتی تھی۔

فرانسس، شریف کے دفتر میں داخل ہوئی تو اس نے اپنی بیٹی لوسی کو فون پر معروف پایا۔ لوسی کا ونٹی شریف بھی تھی۔ لیونا شریف کی میز کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔

”فرانسس“ لیونا اس پر نگاہ پڑتے ہی پھٹ

پڑی۔ ”میری بیٹی ٹیری اغوا ہو گئی ہے۔۔۔۔۔ رات کے وقت اپنے اپارٹمنٹ سے۔“

”کیا؟“ ”تمہیں کیسے پتا چلا؟“

شریف لوسی بدستور فون پر باتیں کر رہی تھی اور ساتھ ہی کچھ نوٹس بھی لکھتی جا رہی تھی۔

”اس لیے کہ اس نے مجھے گھر پر فون کیا تھا۔“ لیونا کا چہرہ پیکا پڑ رہا تھا۔ ”تیس منٹ پہلے۔“

”کس نے تمہیں فون کیا تھا؟“

”مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون تھا۔۔۔۔۔ لیکن وہ کسی مرد کی آواز تھی۔ میں نے اس کو ٹیری سے بات کرانے کو کہا۔ اس نے بات کرادی۔“

”وہ شخص کیا کہہ رہا تھا؟“

”اس نے مجھ سے پانچ لاکھ ڈالرز کا مطالبہ کیا ہے ورنہ میں اپنی بیٹی کو بھی نہیں دیکھ سکوں گی۔“ لیونا نے یہ کہہ کر ایک سسکی لی۔ ”میرے پاس اتنی بڑی رقم کہاں ہے۔ ہر کوئی مجھے دولت مند سمجھتا ہے جبکہ میرا شوہر۔۔۔۔۔“

فرانس نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے تسلی دی۔ ”تم نے بتایا کہ اس شخص نے تمہاری ٹیری سے بات کرانی تھی۔ ٹیری نے فون پر تم سے کیا کہا تھا؟“

”اس نے عجیب سی بات کی تھی۔“ لیونا نے کہا۔

”اس کے الفاظ کیا تھے؟“

”میں تم سے محبت کرتی ہوں، ماما۔ جب میں گھر واپس آ جاؤں گی تو ہم وہی فلم دوبارہ دیکھیں گے جو ہم اکثر ساتھ بیٹھ کر دیکھتے ہیں۔“ ڈی ساؤنڈ آف میوزک۔۔۔۔۔ پھر اس شخص نے ٹیری کے ہاتھ سے فون لے لیا اور بولا۔ ”دس بجے صبح، ہیرتج پارک فاؤنٹین۔ پولیس کو خبر نہیں ہوئی چاہیے۔“ لیونا نے یہ کہتے ہوئے اپنی آنکھیں پونچھیں۔

”بس اتنی ہی بات ہوئی تھی۔ البتہ میں نے شریف کو وہ فون نمبر دے دیا ہے جس سے وہ فون کال آتی تھی۔“

اس نے لوسی نے فون بند کر دیا اور بولی۔ ”بھنڈا وہ کوئی ضائع کر دینے والا اسل فون تھا جس سے وہ کال کی تھی تھی۔ مس لیونا۔ البتہ ہمیں ایک سراغ مل گیا ہے۔ ٹیری کے اپارٹمنٹ کے نیچر نے رات گئے عمارت کے پاس فٹ پاتھ کے کنارے ایک ناواقف کارکھڑی دیکھی تھی۔ کار میں دھوپ کی عینک پہنے ایک شخص اسٹیرنگ وھیل پر بیٹھا ہوا تھا جیسے ٹھہرائی کر رہا ہو۔“

”رات کے وقت دھوپ کی عینک؟“ لیونا نے کہا۔

”ہاں، نیچر نے کار کا ماڈل اور ساخت نوٹ کر لی تھی

اور لائسنس پلیٹ کے آخری چند نمبر بھی۔ ڈیڑھ میلون کو میں ڈیپارٹمنٹ آف موٹر وھیکل ریجسٹر رہی ہوں تاکہ وہ مکمل لائسنس نمبروں کو چیک کر سکے۔ اس دوران میں تمہاری بیٹی کے اپارٹمنٹ کا جائزہ لینے جا رہی ہوں۔“

شریف لوسی کے جانے کے بعد فرانس نے لیونا سے پوچھا۔ ”اس بارے میں کوئی آئیڈیا ہے کہ ٹیری نے

’دی ساؤنڈ آف میوزک‘ کا حوالہ کیوں اور کس لیے دیا تھا؟“

”نہیں۔“ لیونا نے سانس اوپر کھینچتے ہوئے کہا۔

”ہمارے پاس چند موڈز ضرور ہیں لیکن یہ والی موڈی نہیں ہے۔ ٹیری اور میں نے کبھی کوئی فلم ایک ساتھ بیٹھ کر نہیں دیکھی!“

ایک گھنٹے بعد شریف لوسی اور ڈیڑھ میلون اپنے اپنے نوٹس کا موازنہ کر رہے تھے۔ ٹیری کے اپارٹمنٹ کے معائنے سے کوئی گلیو حاصل نہیں ہو سکا تھا۔ البتہ لائسنس پلیٹ کے ادھورے نمبروں کے حوالے سے ڈیپارٹمنٹ آف

موٹر وھیکل نے ایک فہرست فراہم کر دی تھی جس میں ایسی کاروں کے اٹھارہ مکملہ مالکان کے نام شامل تھے۔ ان میں سے گیارہ مرد تھے اور پانچ افراد ایسے تھے جنہیں لیونا جانتی تھی۔ اس لحاظ سے اس کی بیٹی کا ان سے واقف ہونا بھی ممکن تھا۔

ان پانچ افراد کی فہرست یوں تھی:

1- جون رابرٹ ہوگن، عمر چالیس سال۔ بیہ ایجنٹ۔ اسٹیٹ سائڈ انشورنس۔

2- آئزن وین میکسویل، عمر ستیس سال، آٹوموبیلک، برائنٹ گیراج۔

3- ڈیوڈ آئزک میک براؤن، عمر تیس سال مارولی، کاؤنٹی جنرل اسپتال۔

4- کرسٹوفر، عمر اکتیس سال، ملازم گریزن پلہنگ۔

5- اوڈنی ایلن ہیز، عمر باون سال، ڈبیک کلرک، ہیکٹران ہوٹل۔

ڈیڑھ میلون نے فہرست پر نظر دوڑانے کے بعد ایک سرور آہ بھری اور بولا۔ ”ہمارے پاس ان کے ایڈریس بھی ہیں۔ میرے خیال میں ہمیں ہر ایک کو چیک کرنا چاہیے۔“

”اس کام کے لیے ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔“ شریف لوسی نے کہا۔ ”سائڈھے تو ہو چکے ہیں۔“

”تمہیں ان تمام ایڈریس کو چیک کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ فرانس نے کہا۔



خدا کے لیے گولی نہ چلائیں کبڑیاں صاف کر رہا ہوں

اور پوچھا۔ ”یہ اندازہ کس نے لگایا تھا کہ اغوا کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟“
”سراغ رساں فرانس نے۔“ لوسی نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

”تمہارا مطلب ہے تم نے؟“ ٹیری نے حیرانی سے کہا۔
”میں شریف لوسی ہوں۔“ لوسی نے بتایا اور پھر اپنی ماں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ”یہ سراغ رساں فرانس ہے۔“

”بلا معاوضہ اور بلا عنوان۔“ فرانس نے تقدیر کیا۔
لیونا دیر تک اپنی بیٹی کو سینے سے چماتے رکھنے کے بعد فرانس کی جانب گھوم گئی اور اس سے بغل گیر ہو گئی۔
اس کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو تھے پھر اس نے پوچھا:
”وہ اغوا کرنے والا کون تھا؟“
فرانس نے دیگر تمام کی طرف دیکھا۔ ”کیا تم یہ سننے کے لیے تیار ہو؟“

لیونا نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں بتاؤ۔“
”کرستوفر دی پلیرا“ فرانس نے جواب دیا۔
سب بے اختیار گہرے سانس لے کر رہ گئے۔ وہ بہت سامنے کی بات تھی۔ ”لکم ساؤنڈ آف میوزک“ میں مرکزی کردار ادا کر کرستوفر پلیرا نے ادا کیا تھا اور مجرم کرستوفر کریٹن پلیر تھا۔

شریف لوسی اور ڈپٹی میلون دونوں ہی فرانس کی جانب استغماہیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔
”کیا؟“

”ٹیری نہایت اسارٹ لڑکی ہے۔“ فرانس نے کہا۔ ”میرے خیال میں اس نے فون پر وقت ضائع نہیں کیا اور اپنی ماں کو ایک اشارہ دے دیا تھا۔ اس اشارے میں اس کو اغوا کرنے والے کے نام کی نشان دہی کر دی تھی۔“
”تمہارا مطلب قلم سے ہے جس کا نام اس نے لیا تھا؟“

”ہاں، میرے خیال میں ان میں سے کسی فرد کا تعلق قلم دی ساؤنڈ آف میوزک سے جتا ہے۔“ فرانس نے کہا۔

”پھر وہ سب ایک بار پوری توجہ سے ناموں کی اس فہرست کا جائزہ لینے لگے۔

”ہینیکو ان میں قدرے ہٹ کر ٹیلے پر پھولوں کا ایک الگ تھلک کر رہا ہوا ہے۔“ لوسی نے کہا۔
ڈپٹی میلون نے ادھ کلی آنکھوں سے فہرست کو دیکھا اور پھر لٹی میں سر ہلا دیا۔

فرانس نے بھی اس خیال سے اتفاق نہیں کیا۔
”میرے خیال سے ڈیوڈ میک براؤن گٹار بجاتا ہے۔“ ڈپٹی میلون نے کہا۔ ”تم جانتے ہو، ماریا کے مانند!“

اس بار سب لوگ اسے شک کی نظروں سے گھورنے لگے۔

”ان میں سے ایک فرد کا نام میکس ہے۔“ شریف لوسی نے کہا۔

سب نے نفی میں سر ہلا دیے۔
ایک طویل لمبے کے بعد فرانس کا چہرہ مکمل اٹھا۔
اس نے نظریں اٹھا کر شریف لوسی اور اس کے ڈپٹی میلون کی جانب دیکھا اور فہرست میں موجود ایک نام کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ”یہی ہے!“

☆☆☆

پندرہ منٹ بعد شریف لوسی اور ڈپٹی میلون نے طرم کے گھر پر چھاپا مار کر اسے حیرت زدہ کر دیا اور حراست میں لے لیا۔
ساتھ ہی خوف زدہ ٹیری کو بھی بازیا بکرا لیا۔ اسے کوئی گزند نہیں پہنچی تھی۔ انہوں نے ٹیری کو اس کی ماں لیونا کے سپرد کر دیا۔

بعد میں ٹیری، شریف لوسی کی جانب متوجہ ہوئی

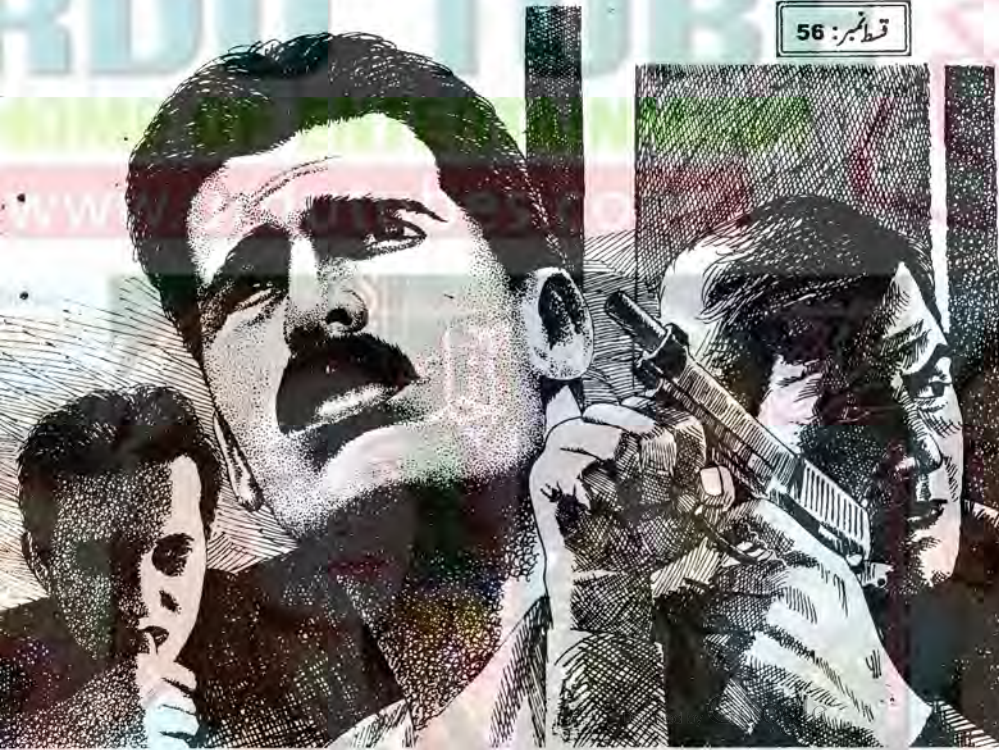
مندن کلیسا، سینی گاک، دھرم شالے اور اتاتہ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب ہانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بٹل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھنٹوں کے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ پورا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جوان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ پی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... ہل ہل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگارنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

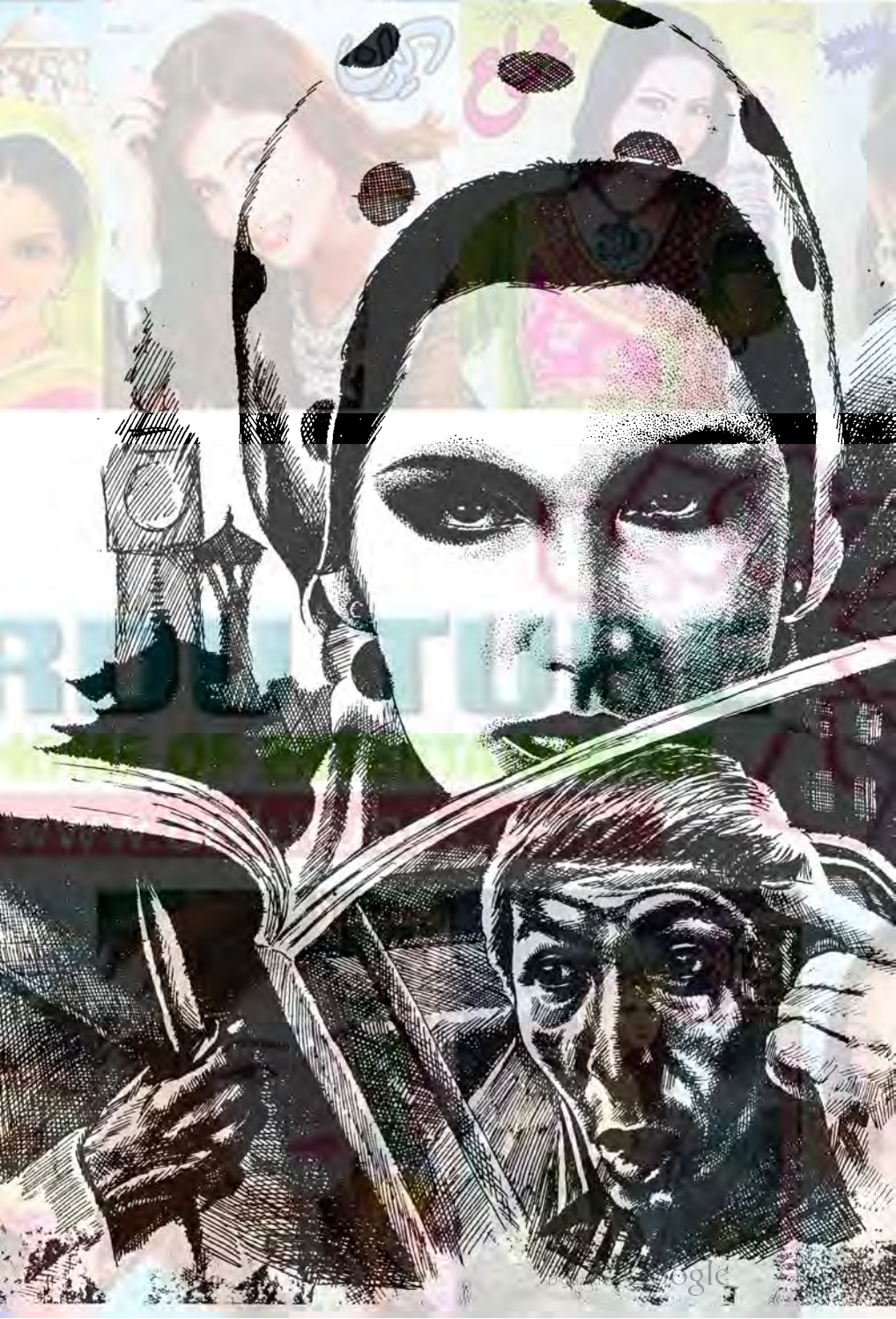
تجربہ... سینی اور ایشین سینیں اس سے تازہ و تازہ ہیں...

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط نمبر: 56





[illegible]

مار نہیں سکا کہ شہزی کے ساتھی اول خبر، ٹھیکہ دار کھیل واداس کے قبضے میں تھے اور کالا پانی "انڈیمان" پہنچا دیے گئے تھے۔ کالا پانی کا نام نہ کر شہزی
 ٹھگ روہ جاتا ہے کیونکہ وہاں چاہا نہ نکلتا تھا۔ یہ تھا۔ اپنے ساتھیوں کی رہائی کے لیے ہی بھیجوا کر تیار کرتا ہے۔ بھیجوا کر دے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔
 اس انٹاش کی کوئی ٹافون پر پتا ہی ہے کہ تینوں کو "کلی خمار" پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ نام نہ کر شہزی مزید پریشان ہو جاتا ہے۔ اچانک بلراج ٹھگ حملہ آور ہوتا
 ہے۔ مقابلے میں ہی بھیجوا مارا جاتا ہے۔ پھر شہزی کی ملاقات ناٹھور سے ہوتی ہے، جو بھیجوا کا ایک بڑا ٹھکڑا تھا۔ ناٹھور شہزی کی مدد کے لیے تیار ہو
 جاتا ہے اور پھر شہزی، سوشلا اور ناٹھور کے ہمراہ کئی خانہ گری طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ ناٹھور کی سربراہی میں رات کی تاریکی میں سفر جاری تھا۔ چوٹی
 کے کنبے والی پہاڑی کی حدود شروع ہو چکی تھی کہ اچانک جنگلی وحشی زہریلے تیروں سے حملہ کر دیتے ہیں۔ شہزی اپنی کن سے جوبانی ٹھگ کر کے کچھ جنگلی
 وحشیوں کو قتل کر دیتا ہے۔ پھر وہاں سے نکل جاتے ہیں کہ تار پائی کی اوج سے ناٹھور دلدل میں پھنس کر ملاک ہو جاتا ہے۔ اس
 سنانے میں اب شہزی اور دھرمی سوشلا کا سفر جاری تھا کہ وہ ایک نیم صحرانی علاقے میں پہنچ جاتا ہے جہاں حدائق، کالی چٹانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سوشلا کوچہ
 میں چھوڑ کر خود ایک فرعی پڑائی کا رخ کرتا ہے۔ وہاں کے لیے پتلا ہے تو فٹک کر رک جاتا ہے کیونکہ ہر طرف سیاہ رنگ کے سونے اور بڑے ڈک
 والے کچھو تھے۔ چھوڑ دے سے بچ نکلنے کے لیے وہ اندھا حد نہ روڑتا ہے۔ ڈھلوان پر دوڑتے ہوئے ٹوٹھو کر گر پڑتا ہے اور چٹائی پتھر سے ٹکرا کر بے ہوش
 ہو جاتا ہے۔ ہوش میں آنے پر خود کو ایک لالچ میں پاتا ہے۔ وہ لالچ بھیجے کہ کھلا اور اس کی بیٹی سوگ کھلائی گئی۔ وہ ناپا کا لے چھوڑ دے سے بھاری تھے اور
 کچھوں کا کاروبار کرتے تھے۔ اچانک سوگ کھلائی گھر سے ہوش شہزی پر پڑتی ہے اور اسے ان کچھوں سے بچا لیتے ہے۔ شہزی خود کو ایک ہمدرد قرار دے کر
 فری کھائی سا کراب بیٹی کو ادھ دے لیتا ہے۔ اس انٹاش بری سلم کوپ کا چاہو لالچ پر غلبہ کر دیتا ہے۔ شہزی کو بچہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ کھلا کر
 ہے گناہ اور عقلم بری مسلمانوں کے لے گا کہ کھلا ہوا ہے کہ وہ کھلا اور اس کے ساتھیوں کو قتل کر دیتا ہے، پھر ناٹھو اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ کاروبار کرتا
 ہے۔ جہاں کل خمار ہیں سے جا کر آہو جاتا ہے۔ شہزی ایک لگا کر ان کے ایک ساتھی دیال دس کو قتل کر لیتا ہے اور اس کا بھیس بھر کر ان میں شامل ہو جاتا
 ہے۔ وہاں پتا چلتا ہے کہ اس سارے چکر میں جہول کے ایلانی کا تھہر ہے اور اس کا نائب بلراج ٹھگ ہی موجود ہے۔ جہول ایڈنی یہاں اپنے خاص
 مٹن کی ٹھیک اور خزانے کو مضبوط بنانے کے لیے ڈاکر ٹھیک نام کی عمارت تعمیر کر رہا تھا جس کے پیچھے بیرونی طاقٹیں تھیں۔ ایڈنی والی نے اپنے کردہ
 مقدمات کے لیے کئی خمار ہیں سے مل کر جاوا قیلے کے سرکار کو مار کر پورے جاوا قیلے کو اپنا غلام بنالیا تھا۔ ایڈنی والی اور بلراج شہزی کو دیال دس کے ہمروپ
 میں بچان کے اندر وہ چالاکی سے اپنا اندھا دھال کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پھر شہزی منصوبے کے تحت بلراج ٹھگ کو قتل واصل کرتا ہے۔ ایڈنی والی
 ڈاکر ٹھیک سے موٹر بوٹ کے ذریعے فرار کی کوشش کرتا ہے۔ شہزی ساتھیوں سمیت ایڈنی والی کا پیچھا کرتا ہے اور اسے سمندر پر ڈر کے قتل کر دیتا ہے اور ہیر حاصل
 کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے پھر ہندوستانی چھوڑوں کے روپ میں پاکستان کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ راستے میں دونوں ٹھگوں کے کوٹ گاؤڑ سے
 خٹنے اپنی سر زمین پاکستان پہنچنے کی ذمہ داری سے اسیلہ کرتا ہے۔ ملتان جانے سے پہلے لاڈلہ کھنچ کر بٹام کی بیوہ ارم سے ملتا ہے۔ وہاں کا زیندہ ار شاہ نواز
 خان جہول کے ایک بھیر پوری کر چکا تھا اب دوبارہ حاصل کرنے کے چکر میں بٹام کی بیوہ پر نظر پڑے ہوئے تھا۔ شہزی دھیرہ کی آمد پر شاہ نواز خان دھو کے سے
 بٹام کے کل اور اس کی بیوہ ارم کے انوکے جرم کی رپورٹ کر دیتا ہے۔ پولیس اول خبر اور کھیل واداس کو پکڑ کر لے جاتی ہے۔ شہزی کو شاہ نواز خان اپنا قیدی
 بنا کر لے جاتا ہے۔ اچانک رات کے سنانے میں خطرناک ڈاکو برہمن چانڑی جو علی پر حملہ آور ہوتا ہے۔ وہاں میں شاہ نواز خان کی بیٹی سوشلی بھی ساتھ ہوتی
 ہے جو اس کی محبت ہے۔ جاتے ہوئے برہمن، شہزی کو بھی اپنے اڑے پر لے جاتا ہے۔ اسی رات برہمن کا نائب لالچ ناگنی لالچ میں آ کر سانس کرتا ہے
 اور برہمن کو غائب کر کر خود صربان بن بیٹھتا ہے اور سوشلی کو کتاوان کے لیے قبضے میں کر لیتا ہے۔ شہزی لالچ ناگنی کے ساتھی عابد خان کو قتل کر لیتا ہے۔
 شہزی، برہمن کو بچا لے لے گا کہ کامیاب ہو جاتا ہے۔ برہمن، شہزی کا احسان مند ہوتا ہے اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شہزی کے ساتھیوں اور سوشلی کو
 چھڑانے کے لیے قتلے پر حملہ کر دے گا کہ شہزی اپنی ذہنی قوت اور تجربہ دہاں پہلے سے موجود ہے۔ مقابلے میں برہمن اور اس کے ساتھی مارے جاتے ہیں۔
 شہزی اور اس کے ساتھی بھڑکی توہل میں چلے جاتے ہیں۔ شہزی، سمجھ و دم کو اپنے بارے میں تمام حقائق سے آگاہ کرتا ہے، سمجھ و دم، شہزی پر احاد
 کرتے ہوئے بھاری فز کی ساتھ شاہ نواز کے خدیوے سے پرہیز کر کے قتل کر دیتا ہے اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ شہزی کے ساتھ شہزی کے ساتھ شہزی کے ساتھ شہزی کے ساتھ
 لا کارہ کرتا ہے جہاں شہزی کے والدین اور زہرہ کی لگا ہی ختم ہیں۔ پاکستان کھنچ کر شہزی کو پتا چلتا ہے کہ عارفہ نواز سے سانچے والا کی قید میں ہے عارفہ کو
 رہائی دلا کر نوے کو قتلوں کے قتلے میں دے دیتا ہے پھر زہرہ کے تھانوں اور ماں باپ کی دعاؤں کے سانسے میں عابد کی رہائی کے لیے کھیل واداس اور کھیل
 کے ساتھ نئے مشن پر امریکا روانہ ہوتا ہے۔ ملہارہ بھی پاکستانی حدود میں تھا کہ شہزی کا کاروبار زہرہ جان سے ہوتا ہے۔ پھر شہزی، زہرہ جان کو بچا دے کر
 ہماگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور ایک خالی ٹوکی سامی سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ وہاں ایک شاہک مال میں کچھ دھت کر دھلا اور ہوتے ہیں اور
 لوگوں کو یہ خیال بنا کر اپنے قیدی چھڑا ناچا ہے ہیں۔ ان کا رخ شہزی کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ جو کاکا کو آری ہے۔ ایک مقام پر دو زہرہ جان سے پھر
 گمراہ ہو جاتا ہے۔ تار پائی کے بعد زہرہ جان کو آہ کر کے اپنے اڑی زمین سے چھڑا رہا لیتا ہے۔ زہرہ جان کے خاتمے کے بعد کاکا کے
 ہر کارے شہزی کو بے ہوش کر کے پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ کاکا، شہزی کی بھادری کا قتل ہو جاتا ہے اور غافل سونے کا گمراہ کچھ کا گمراہ چیلے ہی بیگانہ
 میڈیم سے جی ایل گیا تھا، اب اسے امریکا پہنچا تھا۔ اور اس کے لیے کاکا کو شہزی کا انتہاب کرتا ہے اور امریکا کی ایجنٹ روڈلف کے ساتھ امریکا روانہ
 ہوتا تھا کہ ایجنٹ کے کھیلوں سے گمراہ ہو جاتا ہے۔ روڈلف ہر قدم پر اس کا ساتھ دیتا ہے اور آلا خراک طویل ساتھ دینے کے بعد روڈلف مارا جاتا
 ہے۔ روڈلف کی دوست، جیمین کے ساتھ شہزی امریکا روانہ ہوتا ہے۔ گوہارا یہاں بھی شہزی کا کچھ نہیں چھوڑتا اور ملہارہ پائی جیک کر لیتا ہے اور ملہارے کو
 موہا ہند کے صحرائیں اتارنا چاہتا ہے کہ لیل ٹم ہونے کے باعث ملہارے کو کریش لینڈنگ کرنا پڑتی ہے۔ یہاں شہزی سے دوبارہ ملائی میں کوہارا جیمین واصل
 ہو جاتا ہے۔ اور آلا خراکری کا تیار ہوا پورٹ پر لینڈ کرتا ہے۔

ذہن کی رصدگاہ تک جاری تھی۔ میں اس پر چلنے لگا لیکن ابھی چند ہی قدم چلا تھا کہ اچانک مجھے ٹھنک کر رکنا پڑا۔ کوئی تیز سی الارم جیسی آوازیں گونجنے لگیں۔

میں قدرے ہلکلائے ہوئے انداز میں ادھر ادھر دیکھنے لگا اور اس کے ساتھ ہی ایک سے زائد کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں اسی طرح تیزی کے ساتھ واپس پلٹا۔ ابھی گیٹ تک پہنچا ہی تھا کہ دائیں بائیں کی جھانپوں سے دو جسم کٹے غراتے ہوئے نمودار ہوئے۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ پر پہنچنے میں گیٹ پھلانگ کر باہر جا چکا تھا۔

وہ دونوں گیٹ پر رک گئے اور اپنے بیک بیک جڑوں سے کیلے حکاری دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بڑی طرح غرانے لگے۔ میں وہاں سے ہٹ گیا۔

بارمانے والا میں بھی نہیں تھا۔ میں نے راستہ بدلا اور..... تقریباً دوڑتا ہوا ایک طویل چکر کاٹ کر چند گھروں کے بیک یا رڈز سے گزرتا ہوا دوبارہ اسکاٹی ویلی کی عمارت کے قریب آیا تو بے بسی کے ساتھ ہونٹ بھیج کر رہ گیا۔

اس طرف بھی لوہے کی باڑھ نصب تھی۔ میں چند تھانے وہیں کھڑے ہوتا رہا۔ ایک جارحانہ خیال دل میں آیا بھی کہ ایک بار پھر باڑھ پھلانگ جاؤں اور ان دونوں کتوں سے مقابلہ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے انہیں مار ڈالوں مگر میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔

دقتاً ایک خیال برق کی طرح میرے ذہن میں کودا۔ میں فوراً واپس پلٹا اور تیز قدموں سے چلتا ہوا اس مرکز پر آ گیا جہاں سے مجھے کوئی بس یا کیب ملنے کی امید ہو سکتی تھی۔ اس بار بس ٹل گئی اور خالی نشست بھی، میں اس میں سوار ہو کر دوبارہ اسی علاقے میں آتر ا جہاں پروفیسر ڈین کی بیٹی اور پوتی سے ملتا تھا۔

میں نے کال تیل بجائی۔ اس بار بھی وہی خوبصورت سی ٹین ایجنٹ کی ایلی برآمد ہوئی۔ وہ اپنی ساتھ پوشاک میں ہی تھی یعنی ٹائٹ جینز اور سیلویس چست شرٹ، بالوں کی اس نے پونی ٹیل بننا رکھی تھی۔ مجھے دوبارہ دیکھ کر اس بار خوشی سے مسکرائی نہیں بلکہ اس کی جگہ حیرت نے لے لی، اسی لمحے میں مستغرق ہوئی۔

”ارے انکل آپ؟“ کیا آپ اسکاٹی ویلی نہیں گئے؟“

”نہیں کیا؟“ میں نے مختصر جواب دیا پھر سوال کیا۔

”پروفیسر ڈین کا کہنا ہے کہ وہ آپ کو نہیں جانتے۔ اگر ملتا ہے تو فکا گو یونیورسٹی آکر پہلے ان سے وقت لیں۔“

یہ وہ الفاظ تھے جو اس عورت نے بڑی بے رخی سے ادا کرتے ہی کال منقطع کر دی تھی۔ وہ شاید کوئی ملازمہ بھی یا پھر پروفیسر ڈین کی اسٹنٹ بھی ہو سکتی تھی۔ میں اس کی بات سن کر حیران و پریشان رہ گیا۔ ایک لمحہ تو مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا کہ یہ کہہ کیا رہی ہے؟ تاہم ظاہر تھا کہ اسے پروفیسر ڈین نے ہی ایسا کہنے کو کہا ہو گا۔ کہیں پروفیسر ڈین کو غلط فہمی تو نہیں ہوئی؟ وہ بھلا اتنی جلدی مجھے کیسے بھول بیٹھا؟ جبکہ میری ساسی یا سیمین خانم اس کے ساتھ تھی۔

میں نے پروسچ انداز میں اپنے ہونٹ بھیج لیے۔ اس بار میں نے سوچا کہ یا سیمین کا حوالہ دے کر ہی بات کر کے دیکھتا ہوں، لہذا یہ سوچ کر میں نے دوبارہ اسٹرکام کا ریسیور اٹھا کر کان سے لگا یا تو چونک پڑا۔ اب اس میں سے مجھے ٹون کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔ گویا یہ بالکل ہی ڈیڈ ہو گیا ہو۔

میں چند تھانے کے لیے وہیں کھڑا سوچتا رہا تو کیب ڈرائیور کی آواز نے مجھے چونکایا۔

”سر! پلیز، اگر کہیں اور نہیں جاتا ہے تو مجھے فارغ کر دیں؟“

میں نے اسے کراہے دیا اور شکر ہے کے ساتھ اسے جانے کی اجازت دے دی۔ جواب میں وہ بھی شکر یہ کہہ کر چلتا تھا۔

میں نے ایک گہری سانس لی اور چار اطراف کا جائزہ لیا۔ اب میں حیرت اور تجسس کی کیفیات سے نکل آیا تھا اور اس کی جگہ غصے نے لے لی تھی۔

دراصل میں کچھ سمجھ بھی نہیں پار تھا کہ آخر یہ معاکیا تھا؟ پروفیسر ڈین اتنی جلدی مجھے کیوں بھول گیا تھا؟ ایک روایتی لطیفے کے مطابق کیا واقعی وہ مجھے بھول گیا تھا یا پھر یہ اس کی کوئی دانستہ حرکت تھی؟

میں نے گیٹ کے ارد گرد دیکھا۔ دونوں جانب آہنی تاروں کی باڑھ لگی ہوئی تھی۔ بالآخر میں نے گیٹ پھلانگنے کا ارادہ کیا اور آگے قدم بڑھایا۔ گیٹ پر چڑھنا مشکل نہ تھا۔ تھوڑی سی محنت کے بعد میں دوسری جانب پھلانگ چکا تھا۔ اب میرے سامنے والی پویش نمودی ہو کر پروفیسر

”میں ان کی فیلڈر سیرج ہم میں ساتھ تھا۔“
اس دوران ایلی نے ایک سیل فون اپنی مام کو صنادیا۔
وہ نمبر سچ کرنے لگی۔

”نیں، ہیلو پا! ایشی.....“ کہتے ہوئے اس نے
میرے بارے میں اپنے ”پا“ کو بتا دیا۔ میری نظریں اس
کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔

”نیں، پا! وہ ادھر ہی موجود ہے، مگر پر۔“ عورت
نے سیل فون پر باپ کو بتایا۔ پھر دوسری جانب کی گفتگو سنی
رہی۔ میں نے اس سے استدعا کی کہ مجھے بات کرنے دے
مگر اس نے دوسرے ہاتھ کے اشارے سے مجھے مانع
رکھا۔ میں ٹھہر گیا۔

اب میری بھانجی ہوئی نظریں اس کے چہرے پر جمی
رہ گئی تھیں۔ دوسری جانب کی گفتگو بڑے غور سے سنی جا رہی
تھی۔ میرے دل میں کھلبلی سی ہونے لگی۔ تھوڑی دیر بعد اپنا
نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے فون کان سے
ہٹایا اور مجھ سے مخاطب ہو کے بولی۔

”مسٹر شہزاد! پا، نے یہ سب جان بوجھ کر آپ کے
ساتھ کیا تھا۔“

اس عجیب انکشاف پر میں اُلجھن میں پڑ گیا۔ ”کیا
مطلب؟“ وہ خود بھی اب مطمئن کی نظر آ رہی تھی۔ جواب
میں بولی۔

”ہاں! اس لیے کہ..... وہ خود نہیں چاہتے تھے کہ تم
وہاں آکر ان سے ملو۔“

”اگر ایسی بات تھی تو وہ یہاں سے اپنی لیب میں
جانے سے پہلے تمہیں پہلے ہی میرے سلسلے میں کوئی پیغام تو
دے کر ہی جاتے؟“ میں نے ذہن میں ابھرنے والے
ایک لحاظ خیال کے تحت پوچھا۔

”تم غالباً انٹرپورٹ سے اچانک غائب ہو گئے
تھے؟“ اپنا بولی۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف پھر غور
دیکھتے ہوئے اثبات میں اپنے سر کو جھینس دی۔ وہ آگے
بولی۔

”اسی لیے ہو سکتا ہے کہ..... انہیں اندازہ نہ رہا ہو کہ
تم یہاں کارخ کر سکتے ہو۔“

’اور بجلا میں کہاں جا سکتا تھا؟‘ میں نے کہا۔
”پروفیسر ڈین نے مجھے اپنی راکش گاہ بتا رکھا تھا اور تھوڑا
بہت آئیڈیا اپنی رمد گاہ..... کا بھی دیا تھا، مگر میں نے
صرف ان کی اس جگہ کا پتا ہی ذہن نشین کرنا ضروری سمجھا

”کیا تمہاری مام سے مل سکتا ہوں؟“

”شیر! انکل! اندر آجائیں پلیز۔“ ایلی نے کہتے
ہوئے اندر آنے کا راستہ دیا اور میں اس کے پیچھے ہولیا۔ وہ
پلٹ کر ”متا..... متا.....“ کہتی ہوئی دوسرے کمرے میں
چلی گئی۔ البتہ مجھے اس نے ایک لاؤنج میں ہی ایک صوفے
پر بیٹھنے کا کہا۔

ذرا ہی دیر بعد وہی خوبصورت سی مگر نکیر پوش خاتون
اس کے ساتھ برآمد ہوئی۔ اسے دیکھتے ہی میں احتراماً اُٹھ
کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر بھی حیرت کے آثار تھے۔
جب میں نے اسے ساری بات بتائی تو وہ بھی اُلجھ گئی۔

”میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں، مسٹر
شہزاد.....؟“ اس نے سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ اسے
میرا نام یاد تھا۔

”میں چاہتا ہوں کہ آپ یہاں سے خود انہیں فون کر
کے میری اُن سے بات کرادیں۔ ہو سکتا ہے مجھ سے بات کر
کے انہیں یاد آجائے؟“

میری بات سن کر اس کی نگاہوں میں خشک کے سائے
لہرائے۔ وہ اسی انداز میں بڑبڑاتے ہوئے بولی۔

”حیرت ہے۔ پائے تمہیں نہیں پہچانا، جبکہ بقول
تمہارے وہ آج ہی مصر سے شکا کو پہنچے ہیں۔ تم اور تمہاری
ساتھی بھی ان کے ساتھ تھی؟“

”پا“ سے اس کی مراد پایا ہی تھی۔ امریکی بہت
شات لیکن گینج استعمال کرتے ہیں۔

”بالکل.....“ میں نے فوراً کہا۔ ”میں خود اس بات
پر حیران ہوں۔“

”اوکے“ وہ ذرا سوچنے کے بعد بولی۔ ”آپ
بٹھیں، میں فون کرتی ہوں۔“ پھر اس نے اپنی بیٹی ایلی
سے کہا۔

”بی بی! میرا بیٹری لے کر آؤ ذرا.....“ (یہاں
لوگ سیل فون کو ”بیٹری“ کہتے تھے)

ہم دونوں آنے والے نشستوں پر براجمان ہو
گئے۔ وہ میرا چہرہ دیکھنے لگی۔ میں نے اس سے نگاہیں ملائیں
اور ہولے سے مسکرایا پھر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس نے رسی
اور ابتدائی کلمات کے توالے کے دوران اپنا نام اپنا بتایا
تھا۔

”تم پا کے اسٹوڈنٹ ہو؟“ اس نے سوال کیا۔
”نہیں۔“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔

تھا۔“

”وہ جلدی میں تھے اور بے حد معروف۔“

اینانے جواز گڑھا۔

”ہم۔۔۔۔۔“ میرے حلق سے کوکو سے انداز میں ہکاری نکلی۔

”تم بیٹھو آرام سے، میں تمہارے لیے کچھ لاتی ہوں۔ ڈرنک کرتے ہو؟“ اینا اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔

”تو تھینکس“ میں نے کہا۔ ”مجھے صرف ایک گلاس پانی ملا دو۔“ میں نے کہا۔

وہ چلی گئی لیکن ساتھ ہی میں نے جب اسے پلٹتے ہوئے دوسرے کمرے میں جاتے دیکھا تو مجھے یوں لگا جیسے اس نے اپنی بیٹی ایلی کو کوئی ہلکا سا اشارہ کیا ہو۔ کیونکہ اس نے بھی اسی وقت اپنی ماں کی طرف دیکھا تھا اور ایک دم ہی اس نے میری جانب ایک عجیب سی نگاہ ڈالتے ہوئے اپنی نشست چھوڑ دی۔

میرا ”اند“ بڑی طرح کلکا پھر ان دونوں کے کمرے سے نکلتے ہی میں نے بھی بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنی جگہ چھوڑی اور ان دونوں ماں بیٹی کے عقب میں لپکا۔

میں نے دیکھا کہ۔۔۔۔۔ اینا دوسرے کمرے میں جاتے ہی فوراً اپنی بیٹی ایلی کو کھینچتے ہوئی کونے میں لے گئی اور جھک کر اس سے جلدی جلدی کچھ کہنے لگی۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میری چھٹی حس کی پراسرار گڑبڑ کا ہی نہیں بلکہ خطرے کا بھی احساس دلانا ہی تھی۔

اپنے مرحوم دوست روڈلف کی فیضیت مجھے یاد تھی کہ ”بڑی۔۔۔۔۔! امریکا میں اپنے سائے سے بھی محتاط رہنا۔۔۔۔۔“ اور میں بھی کر رہا تھا۔ اسی سبب یہاں قدم رکھتے ہی سوزی کے شرے بال بال بچا تھا اور اب۔۔۔۔۔ یہ پروفیسر ڈین۔۔۔۔۔ فی الوقت تو میں واقعی اپنے ”سایوں“ سے ہی نبرد آزما تھا۔

میں نے دیکھا ایلی ماں کی بات سنتے ہی خوف زدہ سی نظر آنے لگی اور ہماگ کر زینے طے کرتی ہوئی اوپر پر منزل میں چلی گئی۔ میں دوبارہ اسی پھرتی سے پلٹا اور اپنی نشست پر آن بیٹھا۔ اینا دوبارہ سکراتے ہوئے نمودار ہوئی تو میں نے اس سے پوچھا۔

”پروفیسر ڈین، اندازاً کتنی دیر تک یہاں بیٹھ جائیں گے؟“

”رات تک تو آئی جائیں گے۔“

میں نے وقت دیکھا۔ ابھی رات میں کئی گھنٹے باقی

”بہر حال اب وہ کہہ رہے تھے کہ تم دوسری رہو اور وہ بہت جلد یہاں پہنچنے والے ہیں۔ ممکن ہے رات تک آجائیں۔“

”اور میری ساتھی یاسمین۔۔۔۔۔؟“ میں نے بے اختیار پوچھا۔ مجھے ایسے غیر یقینی حالات میں یاسمین کی فکر ستانے لگی تھی۔

”ان کے بارے میں تو ابھی با، نے کچھ نہیں بتایا مجھے یا پھر کچھ بتانے کی ضرورت ہی نہ تھی ہو۔“ وہ کچھ ایسے انداز میں بولی کہ مجھے لگا، وہ کچھ چھپانا چاہا رہی تھی۔

میں نے ذہن میں اچانک ابھر نے والے ایک سوال کے تحت اس سے پوچھا۔

”ایک بات بتا سکتی ہیں؟“

”نہیں شیور۔۔۔۔۔“ وہ توجہ طلب نگاہوں سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولی۔

”جب پروفیسر ڈین اور ڈاکٹر ہیرالڈ ان پورٹ سے سیدھے یہاں پہنچے تھے تو کیا یاسمین بھی ان کے ساتھ تھیں؟“

”نہیں۔۔۔۔۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا تو میرا ذہن کلکا۔ تھیکے لہجے میں اگلا سوال داغا۔

”تو پھر آپ کو میری ساتھی یاسمین کا کیسے علم ہوا؟ جبکہ بقول آپ کے وہ یہاں آئی بھی نہیں۔“

”اس کا ذکر پانے کیا تھا مجھ سے کہ وہ اچانک کسی کے ساتھ جا چکی ہے۔ اس کا ساتھی، یعنی تمہارے بارے میں بھی اسی طرح کا ذکر ہوا تھا با، اور ڈاکٹر ہیرالڈ کے درمیان۔“ اس نے فوراً جواب میں کہا۔

”پھر وہ دونوں زیادہ دیر یہاں بیٹھے بھی نہیں۔ مجھے کچھ باتوں سے آگاہ کر کے اسکاٹی ویلی چل دیے۔“

میں ہمر اُلجھ گیا اور پہلے سے زیادہ پریشان بھی۔ یہ میرے لیے ایک نیا انکشاف تھا کہ یاسمین بھی میری طرح راستے میں کسی فوری مجبوری کے پیش نظر ان سے الگ ہو گئی تھی۔ یوں مجھے اب ایک نئی فکر و تشویش نے گھیر لیا اور لامحالہ میرے ذہن میں یہی خیال ابھر کر اس کا مطلب ہے کہ یاسمین بھی (نکلی) سوزی کی طرح کسی ایسے ہی دشمن کا شکار ہو گئی تھی؟

”بہتر ہوتا کہ آپ میری پروفیسر صاحب سے بات کروا دیتیں۔“ بالآخر میں نے اینا سے کہا۔

ہے مجھے اس سلسلے میں پا، سے فون پر پہلے بات کر لینی چاہیے۔“

”بے شک لیکن ہو سکے تو میری بھی بات کرو داد اور فون میرے سامنے کرو۔“ میں نے حکم صادر کیا۔ اس نے ہنسی کیا۔

یہ سب کچھ کھڑے کھڑے ہونے لگا۔ اپنا نے فون کان سے لگایا ہوا تھا۔ نبرنج کر چکی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں رابطہ ہوا تو اس نے میری بے چینی کے متعلق پروفیسر ڈین کو آگاہ کر دیا اور یہ بھی بتایا کہ میں ان سے بات کرنا چاہتا ہوں۔

اس کے بعد شاید دوسری جانب سے ڈین نے اسے مجھ سے بات کرانے کا کہا تھا اور یوں اپنا نے فون میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”لو..... بات کرو۔“

میں نے ابھی اس کے ہاتھ سے فون لیا ہی تھا کہ اچانک کال بتل گئی۔ ہم دونوں ہی چونک پڑے۔ فون میرے ہاتھ میں تھا کہ دینا بہر حال دروازے کی جانب بڑھی، میں نے فون ابھی اپنے کان سے نہیں لگایا تھا۔ کال بتل جتنے پر میرے دل کو بے چینی لگ گئی۔

میں اسی طرح فون ہاتھ میں پکڑے اس کے پیچھے لپکا۔ اس نے دروازہ کھول دیا۔ اندر داخل ہونے والی دو جوان خواتین میں سے ایک کو پہچان کر میں بُری طرح چونکا۔

☆☆☆

وہ یاسمین تھی..... جبکہ دوسری عورت میرے لیے غیر شناسا تھی۔ یاسمین کو دیکھتے ہی میں بے اختیار اس کی جانب لپکا۔ وہ بھی مجھے یہاں دیکھ کر حیران اور خوش ہوئی تھی۔

”شہزی ا!“ وہ بھی میری طرف لپکی۔ ڈین سے بات کرنے کا اب کوئی جواز نہیں بچا تھا۔ لہذا فون میں نے دوبارہ اپنا کون تھا دیا۔

ہم دونوں کی شناسائی پر وہ بھی کچھ کچھ سمجھ گئی۔ ایک طرف کونے میں جا کر وہ باپ سے بات کرنے لگی۔

”شکر ہے خدا کا..... تم صبح سلامت ہو۔“ یاسمین کھرا اور طمانیت بھرا سانس لے کر بولی۔ اس کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے اسے کسی خطرے کا پہلے سے علم ہو۔

”مجھے یہ سارا کچھ سمجھ نہیں آ رہا.....“ میں نے قدرے جھٹکا کہا۔ ”تم تو پروفیسر ڈین کے ساتھ تھیں؟ اور یہ خاتون کون ہے؟“

”میرا نام سوزی ہے۔“ اس عورت نے بتایا اور میرا

تھے۔ میں نے ایک بار پھر اپنا پر سنجیدہ سی نظریں گاڑ دیں اور بولا۔ ”ابھی تو رات ہوئے میں کافی وقت پڑا ہے۔ میں تب تک بے چین اور پریشان ہی رہوں گا۔ میری مجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ جب وہ میری ساتھی کو اپنی رصد گاہ لے جائے ہیں تو مجھے وہاں آنے سے کیوں منع کر رہے ہیں؟“

”یہ تو وہی آکر بتا سکتے ہیں.....“ اپنا نے جواب دیا۔ اس بار وہ میرے ساتھ بیٹھی نہیں تھی۔ وہ یکدم اٹھتے ہوئے بولی۔ ”میں ذرا مگن کا کام ختم کروں۔“ کہتے ہوئے وہ چلی تو میں نے فوراً اسے پکارا اور اپنی سیٹ چھوڑ دی۔

وہ میری جانب مڑی۔ مجھے اپنے قریب آنا دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خوف اور گھبراہٹ کے کچھ آثار نمودار ہوئے۔ میں نے اس سے کہا۔

”میرا خیال ہے مجھے اب دوبارہ اسکاٹی ویلی کا رخ کرنا چاہیے اور اس بار تم بھی میرے ساتھ چلو گی۔“

”مم..... میں.....؟“ وہ بوکھلاسی گئی۔ ”نہیں..... لیکن کیوں؟“

”اس لیے کہ مجھے پروفیسر ڈین کی نیت پر شبہ سا ہوا ہے۔ وہ میرے اور میری ساتھی یاسمین کے ساتھ کسی قسم کا دھوکا کر رہے ہیں۔ میں اپنی قتل کرنا چاہتا ہوں۔“

”لیکن تمہیں تو پتا ہے انے اسی گھر میں انتظار کرنے کو کہا ہے۔“ وہ بولی۔ ”اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوتی تو وہ بھلا تمہیں اپنے گھر میں کیوں.....“

میں نے اس کی بات کاٹ دی اور بولا۔ ”انہیں معلوم ہے کہ میں ان کے گھر کے سوا کسی اور جگہ کا رخ نہیں کر سکتا۔ وہ..... یہاں پولیس کے ساتھ بھی آسکتے ہیں۔“

”تو کیا تم کوئی کر مثل ہو؟“ اپنا خود کو اب کافی حد تک سنبھال چکی تھی۔

”میں کوئی کر مثل ہوتا تو تمہارے پا، مجھے یہاں لے کر نہیں آتے۔ وہ خود کر مثل میک کے زمرے میں پھنس چکے تھے اپنے ساتھیوں سمیت۔ میں نے ہی ان کی جان ان سے چھڑائی تھی۔“

”یہ بہت اچھی بات ہے، میں آپ کی مشکور ہوں۔“ وہ بولی۔ ”آپ پلیز یا کا تھوڑا انتظار کر لیں۔“

”ہرگز نہیں، تم اسی وقت میرے ساتھ چل رہی ہو۔ گاڑی تو تمہارے پاس ہوگی۔ ابلی کو بتا جاؤ کہ ہم ابھی تھوڑی دیر میں آجائیں گے۔“ میں حسی لہجے میں بولا۔

وہ کچھ دیر کے لیے سوچنے لگی، پھر بولی۔ ”میرا خیال

دماغ ایک بار پھر ہلک سے اڑ گیا۔

”مجھے لگتا ہے میں پاگل ہو جاؤں گا۔“ میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔ یاسمین نے مجھے سنبھالا دیا۔ اس کے ساتھ جو جان سی لڑکی تھی، وہ خاصی پُرکشش اور سرورقدسی۔

ذرا دیر بعد ایتا بھی باپ سے بات کرنے کے بعد ہمارے قریب آگئی۔

یاسمین نے مجھے پریشان دیکھ کر تسلی دی، پھر ایتا نے ہم سب کو بیٹھنے کا کہا۔

یاسمین نے اصرار کیا کہ پہلے میں اپنے بارے میں بتاؤں کہ انر پورٹ پر اترنے کے بعد کون مجھ سے کرایا تھا اور بعد میں میرے ساتھ کیا ہوا تھا؟

جب میں نے اسے مختصراً الفاظ میں بتا دیا تو..... یاسمین نے متقی خیرنگا ہوں سے اپنے ساتھ بیٹھی سوزی نام کی لڑکی کی طرف دیکھا۔ اس کے دلکش چہرے پر، جو کچھ دیر قبل یاسمین کی زبانی ”شہزی“ کے تعارف پر مسکراہٹ تھی، اب تسلی سوزی کے ذکر اور بعد کے حالات میری زبانی سننے کے بعد وہ پریشان اور شکستگیز نظر آنے لگی۔

”اس کا مطلب ہے دشمنوں کو تمہاری آمد کا علم ہو چکا ہے؟“

”مجھ میں نہیں آتا کہ انہیں کیسے ہمارے بارے میں علم ہوا؟“ یاسمین اُنھے ہوئے لہجے میں بولی۔

یہی سوال میرے اندر بھی پل رہا تھا جو میں نے سوزی سے پوچھا کہ آخر اسے ہماری آمد کا کیسے علم ہوا؟ جبکہ میری معلومات کے مطابق آنسر خالدہ کیلی فورینا اور پھر نیویارک میں تھی۔

”شہزی! تمہارے دشمن تمہاری سوچ سے بھی زیادہ طاقتور اور بااثر ہیں۔ ان کا نیٹ ورک بے حد وسیع ہے۔ اس وقت ان کی تمام تر توجہ تم پر مرکوز ہے۔ یہاں تک آنے میں جن لوگوں نے جتنی طور پر تمہارا دستہ روکنے کی کوشش کی ہوگی۔ وہ یا ان کے سامنے ہر وقت ان سے رابطے میں رہے ہوں گے جو انہیں تم سے متعلق پل پل کی خبریں پہنچاتے رہے ہیں۔“

وہ چہرہ نیوں کے لیے سانس لینے لگی۔ مجھے یاد آیا کہ ایسا سب کچھ جنم واصل کو ہمارا اور اس کے نو بیان کے صحرا میں موجود ساتھیوں کے ذریعے ہی ممکن ہوا ہوگا۔

”لیکن تمہیں کیسے علم ہوا؟“ میں نے اس کے لمحہ

بھر کے توقف پر سوال کر ڈالا۔

”میں خود اپنی ساتھی آنسر خالدہ کی مسلسل تلاش میں تھی اور یوں میں نے بھی ان کے کچھ ساتھیوں کو ٹھیس کر رکھا ہے اور انہی کی مسلسل رہائی کرتے ہوئے میں نے بہت سی باتوں کا پتا چلایا تھا۔“ سوزی جواب میں بولی۔

”لیکن ان میں ایک لڑکی ڈیلا امیٹ بھی تھی (تسلی سوزی) مگر اس نے اُنکا مجھے ٹھیس کر لیا اور مجھ سے بہت کچھ اُگلوا لیا۔ تب ہی اس نے تسلی سوزی بن کر تمہیں پھنسانا چاہا تھا۔ میں تو اس کے چنگل سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گئی تھی، مگر مجھے تم دونوں کی فکر تھی۔ یعنی تمہاری اور یاسمین کی۔“

”اصل سوزی یہی ہے شہزی ڈیزر!“ بالآخر یاسمین نے کہا اور پھر اس نے بتایا کہ..... ہم دونوں کے ساتھ تقریباً ایک ہی طرح کے واقعات پیش آئے تھے لیکن بعد کے حالات کے مطابق ایک واضح فرق تھا کہ میرے ساتھ ٹھکانے والی ”سوزی“ تسلی تھی مگر یاسمین سے ملنے والی سوزی اصل تھی جو آنسر خالدہ کی کوئی اور ساتھی تھی۔

یاسمین نے بتایا کہ میں جیسے ہی انر پورٹ پر اس سے جدا ہوا اور اس کے بعد وہ اور پروفیسر ڈین سمافیل وغیرہ سے جان چھڑا کر نیکی میں بیٹھنے لگے تو..... ایک جوان عورت یاسمین سے ملی اور اس سے میرے بارے میں دریافت کیا۔

مجھے حیرت ہوئی کہ یہ کون عورت تھی جس کی امریکا میں مجھ سے واقفیت تھی؟ تاہم اس کا خیال ٹھیکہ وغیرہ کی طرف بھی گیا تھا۔ جیسا کہ اسے معلوم تھا کہ میرے دو پاکستانی جاں نثار ساتھی بہت پہلے سے ہی امریکا میں موجود تھے۔

لیکن جب اس نے اپنا نام سوزی بتایا اور میرے بارے میں پوچھا تو یاسمین نے اسے یہی بتایا کہ وہ بھی کسی ایسی ہی خاتون کے کہنے پر اس کے پیچھے گیا ہے۔

بہر حال (اصل) سوزی یاسمین کو اپنے ساتھ لے گئی۔ یاسمین کے دل میں خلوک و شبہات ابھرے تھے مگر سوزی نے کچھ ایسی باتیں اس سے کہیں کہ اسے اس پر یقین آ گیا اور یوں وہ بھی پروفیسر ڈین سے جلد ملنے کا کہہ کر اس کے ہمراہ چلی گئی۔

چونکہ میں نے انر پورٹ پر یاسمین سے جدا ہوتے وقت کہا تھا کہ میں اس سے جلد پروفیسر ڈین کی رہائی کا بندوبست

غ

سوزی کی کاشتھی۔ وہی ڈرائیو کر رہی تھی۔ یا اکین اک
کے برابر والی سیٹ پر اور میں حقیقی سیٹ پر براہمان تھا اور
سارے راستے سوزی سے باتوں میں مصروف رہا۔
میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ سوزی سے ایک ہی لمحے
میں سب کچھ کن لوں۔ میرے سامنے وہ سب آگھل دے
جنہیں سننے کے بعد عابدہ کے جلد حصول کی راہ آسان ہوتی
چلی جائے۔

”میں بہت سی باتیں یا سمین کو بتا چکی ہوں.....“ وہ اسٹیرنگ پر اپنے دونوں ہاتھ اور لگا ہیں وڈ اسکرین کے پار سڑک پر بجائے ہوئے یولی۔

”باقی باتیں اپنے ٹھکانے پر پہنچ کر کرتے ہیں، یہ بہت اچھا ہوا کہ تم آگے شہزی! آئنا خالدہ نے مجھے چھلکے سے متعلق بہت کچھ بتا رکھا ہے کہ تم کس قدر ثابت قدم، دلیل اور باہمت ہو..... حقیقت یہی تھی کہ آئنا خالدہ کے بعد میں خود کو ایسا سمجھنے لگی تھی۔ اب تم آگے ہو تو میرے بھی حوصلے بلند ہو گئے ہیں۔ میں بہت کچھ جانتی ہوں، لیکن ایسا تھی زیادہ باتھماؤں مارنے سے گریز کر رہی تھی۔“

”میرے یہاں دو ساتھی اور بھی ہیں۔“ میں نے اس کی گفتگو سے متاثر ہو کر کہا۔ ”لیکن تمہارے حوصلے کی بھی داد دینا چاہیے، مجھ سے زیادہ دلیر اور باہمت تو تم اور آنرہ خالدہ ہیں۔ بلکہ آنرہ خالدہ کی اس سلسلے میں قربانیاں تو میرے لیے بہت زیادہ ہیں۔ میں تو ساری زندگی بھی اس نیک، حوصلہ مند اور بہادر خاتون کا احسان نہیں اُتار سکتا۔ لہذا اس سوزی! میں آپ سے پہلے یہی کہوں گا کہ ہمیں سب سے پہلے آنرہ خالدہ کی بازیابی کے لیے قدم اٹھانا چاہیے۔“

ہم اسی طرح کی گفتگو میں سبک کرتے ہوئے ایک ایسی
 کثیر الحولہ بڑھک کے سامنے پہنچ گئے جہاں کبوتروں کے...
 کباب کی طرح فلیش بنے ہوئے نظر آ رہے تھے۔
 بارکنگ ایریا میں کار روکنے کے بعد ہم تینوں کار
 سے نچھڑ آئے۔

اس کے بعد لفٹ کے ذریعے ہم ساتویں منزل کے ایک فلیٹ میں داخل ہوئے۔

قلیت کشادہ تو کیا زیادہ بڑا بھی نہیں تھا۔ اسے منگل روم اور مختصر سے لاؤنج والا اسٹوڈیو اپارٹمنٹ کہہ سکتے تھے۔ ہم لاؤنج میں بی بیٹھ گئے۔

”اپے چھوٹے فلیٹ عارضی اور کم ترین مدت کے

ملوں گا اسی لیے وہ بعد میں سوزی کے ساتھ ادھر آئی تو میں
 بھی اس کی توقع کے مطابق ادھر ہی تھا۔
 شکا کو قدم رکھتے ہی پیش آمدہ حالات جس قدر تیزی
 سے اچھے تھے، وہ اب اسی تیزی کے ساتھ گویا پرت در
 پرت واضح ہوتے چلے گئے۔

”مس سوزی! تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ کیا یہ جگہ وہ باتیں کرنے کے لیے مناسب ہوگی؟“ میں نے دبے دبے جوش تلے اس سے پوچھا۔

اس نے ایک نگاہ حیران پریشان سی بیشی ایتنا پر...
ڈالی اور اسے متذبذب پا کر میں اٹھ کھڑا ہوا اور..... ایتنا کا
شکر یہ ادا کرتے ہوئے بولا۔

”اینا تمہارا شکر یہ اور تمہاری بے بی کا بھی..... ہم دوبارہ اچھے دوستوں کی طرح ملیں گے۔ معافی چاہوں گا کچھ غلط فہمیوں کی بنا پر مجھے آپ پر اور پروفیسر ڈین پر شبہ ہونے لگا تھا۔“

میں نے اس سے معدرت خواہانہ رویہ اپناتے ہوئے کہا اور بات جاری رکھی۔ ”دراصل میں اور میری ساتھی کچھ ایسے حالات کا شکار رہے ہیں کہ ہمیں محتاط رہنا پڑتا ہے۔ باقی باتیں آپ کو یقیناً پروفیسر ڈین بتا دیں گے۔“

”کوئی بات نہیں اِس اوکے.....“ وہ بھی پورے خلوص سے مسکرا کر بولی۔

”لیکن ایک اُبھرنے والے کہ آخر پروفیسر ڈین نے میرے ساتھ ایسا راز روئے کیوں اختیار کیا؟ جس سے میں ان کی جانب سے ہی نہیں بلکہ آپ کی طرف سے بھی ہلکا ہوا۔“

وہ جواب میں ایک طمانیت بھری سی مسکراہٹ سے بولی۔ ”مستر شہزی! دراصل تم دونوں کے انزپرٹ سے باری باری ہر اسرار طور پر غائب ہو جانے سے پروفیسر ڈین ڈر سے گئے تھے کہ نہ جانے یہاں تم دونوں کے پیچھے کون لوگ لگ چکے ہیں، وہ بھی کچھ بتانے کے لیے رات کو آنے والے تھے۔ ورنہ وہ مطمئن یہاں کا رخ نہیں کرتے اور ان کا زیادہ تر وقت اپنی رصد گاہ میں ہی گزر رہا ہے۔ اسی باعث میں اور میری بیٹی ایلچی بھی پریشان ہو گئے اور کوئی بات نہ تھی۔“

”ہم.....“ میں نے کہا۔
اس کے ذرا دیر بعد ہم تینوں وہاں سے روانہ ہو چکے

آنسہ خالدہ نے دوبارہ کورکوران جیل کا رخ کیا مگر وہاں کی لیڈی چیف وارڈن نے آنسہ خالدہ کو پھر بھی عابدہ سے نہیں ملنے دیا۔ آنسہ خالدہ اور لیڈی چیف وارڈن کے بیچ کھڑائی ہو گئی، لیکن بعد میں آنسہ خالدہ نے اپنے خفیہ ذرائع سے پتا چلانے کی کوشش کی تو اسے فحش ہوا، عابدہ جیل سے ہی غائب کر دی گئی ہے۔

”اس میں تو شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔“ میں نے فوراً جڑے بیچ کر کہا۔ ”میٹر سے پاس جاری ہونے کے باوجود بھی اگر وارڈن نے آنسہ خالدہ کو عابدہ سے ملنے نہیں دیا تھا تو اس کا صاف مطلب یہی نکلتا ہے کہ عابدہ جیل سے ہی غائب کر دی گئی ہوگی۔“

”بالکل صحیح.....“ یاسمین نے میری تائید میں کہا۔ ”لیکن حیرت تو مجھے اس بات پر ہو رہی ہے کہ آپ نے یا آپ کے اخباری ادارے نے کم از کم آنسہ خالدہ کی تلاش کے سلسلے میں تو کوئی قدم اٹھایا ہوتا؟“ میں نے سوزی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ بولی۔

”میں تلاش کرتی رہی ہوں لیکن بد قسمتی سے ابھی تک اس کا سراغ نہیں مل سکا۔“ ڈیلی گھول والے، جن کے لیے ہم دونوں ہی رپورٹنگ کرتے ہیں، وہ بھی اس کی بازیابی کے لیے کچھ نہیں کر پائے ہیں، ماسوائے خبریں دینے کے تاہم عملی طور پر بھی وہ کچھ نہ کوشش کر رہے ہیں۔ جن میں، میں بھی شامل ہوں۔“

”مجھ پر بھی سوزی کے ذریعے حملہ کرنے والے بے بی سی کے ایجنٹ تھے۔“ میں نے ہولے سے کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ ”جس کا مطلب ہے کہ بے بی سی والے یہاں سرگرم ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں انہوں نے ہی آنسہ خالدہ کو اغوا کر لیا ہو؟“

”یہ ممکن ہے۔“ سوزی بولی۔ ”لیکن آنسہ خالدہ سے میری آخری ملاقات ہوئی تو اس کا کہنا تھا کہ یہ حرکت ٹائیگر ٹیک کے چیف باسل ہولارڈ کی ہو سکتی ہے، کیونکہ یہی شخص عابدہ کو بھانسنے کے لیے ابتدا سے ہی سرگرم رہا ہے۔ لہذا خود مجھے اپنا بھی ڈرنگا رہتا تھا لیکن میں یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں سمجھتی کہ مجھ سے زیادہ آنسہ خالدہ، عابدہ والے نازک معاملے میں ”ان ٹی“ رہی تھی۔ جبکہ مجھے میرے ادارے نے آنسہ خالدہ کی تلاش کا فریضہ سونپ رکھا ہے، شاید اسی لیے میں بھی اب تک یہی ہوتی ہوں۔“

”اس کا مطلب ہے کہ میں بھی ایجنٹ خالدہ کا

لیے کرائے پر یہ آسانی دستیاب ہو جاتے ہیں۔“ سوزی ہمیں بیٹھے کا کہہ کر قریب رکھے فریج سے پانی کی بوتل نکالتے ہوئے بولی۔

”آپ میں سے کوئی ڈرنک کرتا ہے؟“ اس نے آخر میں سہمان نوازی کے طور پر پوچھا۔ جواب میں ہم دونوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

وہ کافی بتانے لگی تاہم اس نے اپنے لیے.... اسکاچ وہسکی کا ایک پیگ بتالیا تھا۔

ہم نے اسے کافی کے تکلف سے منع کرنے کی کوشش چاہی تھی مگر وہ نہ مانی۔

ذرا دیر میں کافی تیار ہو گئی۔ میں اور یاسمین کافی پینے لگے، وہ اپنا شغل کرنے لگی۔

میں اس دوران سوزی کا پورا حائرہ لے چکا تھا۔ وہ مجھے امریکن تو کہیں سے بھی نہیں نظر آتی تھی۔ امریکن عورتوں جیسا اس میں کوئی ٹیٹھا پن نہیں تھا، وہ مجھے برطانوی لگی تھی۔ انہی جیسے گاڑے نقوش، ہمرا بھرا بدن، گوری جھلی رگت اور گہری سبز آنکھوں کے علاوہ بوائے کٹ بال تھے، جن کا رنگ ہلکا سنہری بال تھا۔ قد بھی اس کا درمیان تھا۔ وہ قبول صورت تھی۔

”یہ قلیٹ بھی میں نے قلیل مدت کے لیے کرائے پر لیا تھا، ورنہ میری مستقل رہائش کیلی فورنیا میں ہے۔“ سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے وہ آگے بولی۔ ”تمہاری وجہ سے ہی مجھے شکاگو آنا پڑا اور اب ہم آج ہی کیلی فورنیا واپس جا رہے ہیں۔“

”تم آج تک آنسہ خالدہ کی بازیابی کے سلسلے میں کیا کر پائی ہو؟ میرا مطلب ہے کچھ پتا چلا ہے اُس کا؟“ میں نے کافی کا ایک گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ سوزی جواب میں بولی۔

”جب عابدہ کو کورکوران جیل بھیجا گیا تو آنسہ خالدہ نے ایک بین الاقوامی میسر اور سینئر رپورٹر کی حیثیت سے کورکوران جیل کا دورہ کیا۔ مقصد عابدہ سے ملاقات کرنا ہی تھا لیکن اسے عابدہ سے ملنے نہیں دیا گیا، اس کے لیے خصوصی پاس کی ضرورت تھی جو کیلی فورنیا کے میٹر سے حاصل کیا جاتا تھا۔ اس نے فوراً میٹر سے اس خصوصی پاس کے حصول کے لیے ملاقات کی کوشش کی تو اس میں بھی اسے کئی دن لگ گئے، وجہ میٹر کی عدم دستیابی تھی۔ جب وہ ملا تو اس نے بڑی رتو کو کچھ بعد آنسہ خالدہ کو پاس جاری کر دیا۔“

اپنی ایک جوان بیٹی اریتا کے ساتھ رہتی ہے۔ داماد بھی ساتھ رہتا ہے۔ خود اس کی اپنے شوہر سے علیحدگی ہو گئی ہے۔ ہفتے کی رات وہ اپنی فریضہ والی رہائش گاہ پر جاتی ہے۔ اتوار کا دن وہ اپنی بیٹی اور داماد جو کے ساتھ گزارتی ہے، پھر پھر کی صبح سرکاری گاڑی میں کوہ نور ان کا رخ کرتی ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے اگر ہم اسے اس کی فرینس والی رہائش گاہ پر چھاپ لیں تو زیادہ بہتر ہوگا؟“ میں نے سوالیہ نظروں سے سوزی کی طرف دیکھا۔

”ہاں!“ اس نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی۔
 ”لیکن یہ کام تم اور تمہارے ساتھی کر سکتے ہو، میرا کام
 انفارمیشن دینا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ مادام کلر نے نہ صرف
 عابد کا بلکہ آنسہ خالدہ کا بھی پتا لگ جائے گا۔“

”ہم.....“ میں نے خیال انگیزی ہکاری بھری۔
اس کے بعد میں نے اس سے فون کرنے کی سہولت مانگی۔ جو
اس نے فوراً مہیا کر دی۔

میں نے دھڑکتے دل سے زہرہ بانو سے بات کرنے کے لیے بیگم کو لاکھینڈ لائن نمبر ڈائل کیا۔ دوسری جانب سے ٹون جا رہی تھی، لیکن کوئی کال ریسپونڈ نہیں کر رہا تھا۔ میں نے ہونٹ دانتوں تلے چبائے اور پھر زہرہ بانو کے سبیل نمبر پر رابطہ کیا۔ دوسری طرف جانے والی تیسری بتل پر کسی نے کال ریسپونڈ تو میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ میں اپنے ہمدردوں اور محسوساتوں سے باتیں کرنے، ان کی خیریت پوچھنے اور اپنی خیریت سے مطلع کرنے کے لیے بے چین ہو رہا تھا اور مجھ پر ہمیشہ اسی طرح کی جذباتی سی کیفیات طاری ہو جاتی تھیں۔

”ہیلو.....“ دوسری جانب سے زہرہ بانو کے بجائے ایک مردانہ آواز سنائی دی، دوری کی وجہ سے مجھے آواز شناخت کرنے کے لیے پوری توجہ صرف کرنی پڑی تھی اور پھر چند لمحوں بعد ہی میرا اور اوجہ جذبات سے متعیش ہو گیا۔ یہ آواز اول خیر کی تھی۔

”ہیلو..... اول خیر.....! ی.....! یہ میں ہوں شہزی.....!“ میں نے اپنی اندرونی مرضی کی کیفیت پر..... بہ شکل قابو پاتے ہوئے کہا..... دوسری جانب سے اول خیر کو جیسے چند منٹوں کے لیے چپ کی کھا گئی..... پھر اس کی بھی دل گیری کی کہانی ہوئی آواز ابھری.....

پیش..... شہزی..... ای ی..... تو بول رہا
یہ..... اور خیر..... کیا کہ اس کے لیے کچھ دیکھا گیا ہے تو؟

کوئی سراغ نہیں مل سکا ہے؟“ اس بار یاسمین نے سوال کیا۔

”یہ میری بد قسمتی ہے مگر میں نے صدقِ دل کے ساتھ اس کی تلاش میں کسی بھی کوتاہی سے کام نہیں لیا ہے۔“ سوزی نے جواب میں کہا۔ مجھے اب سوزی سے مایوسی ہو نہ لگی، ورنہ تو میں سمجھا تھا کہ وہ مجھے نہ صرف آنسوِ خالدہ بلکہ عابدہ کے سلسلے میں بھی کوئی کلیودہ گی۔

میں نے کافی کا آخری گھونٹ بھر کے خالی کپ میز پر رکھا اور ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ تم سے ملاقات کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔“

”ایسی بات نہیں.....“ وہ ہاتھ میں پکڑے بلوریں
 چمک کو اپنے غرور والی آنکھوں میں گماتے ہوئے بولی۔ ”میں کم
 از کم اتنا تو کر پائی ہوں کہ یہ بات اب پورے یقین سے کہہ
 سکتی ہوں کہ عابدہ اس وقت واقعی کو کوروران کی جیل میں
 موجود نہیں ہے۔“ اس کا انداز انکشاف کرنے والا تھا لیکن
 میرے چہرے سے یہ سن کر جوش کی ایک ذرا راق بھی نہیں
 ابھری تھی۔ وہ آگے بتانے لگی۔

”اس یقین کی ایک ٹھوس وجہ ہے، عابدہ بی کی بیزک سے ایک اوجیز عورت کو آزادی ملی تھی۔ میں نے اس سے ملاقات کی تھی۔ اسی نے بتایا تھا کہ عابدہ کو وارڈن نے ہی بے ہوش کر کے بیزک سے نکال کر کسی کے حوالے کیا تھا۔ یہ آدھی رات کا وقت تھا اور وہ سوئی بتی نہ صرف یہ ساری کارروائی دیکھی رہی تھی بلکہ اسے لیڈی وارڈن کی ایک اپنی ساتھی عورت سے اس قسم کی باتیں بھی سننے کو ملی تھیں جس سے یہی اندازہ ہوا تھا کہ عابدہ کو سی آئی اے کے اسی دنگ کے حوالے کیا جا رہا ہے۔ اب میرے ذہن میں ایک ہی لائحہ عمل آتا ہے کہ اگر ہم اس لیڈی وارڈن کو قابو کر کے اس کے منہ سے حقیقت انکلا سیں تو بہت کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔“

میں نے اس کی بات پر غور کرنے کے انداز میں سوڑی کے چہرے پر نظر ڈالی اور سوال کیا۔ ”اس لیڈی وارڈن کے بارے میں تمہارے پاس کوئی معلومات؟“

”اس کا نام مسز مسخوروڑ ہے، مادام کلر کے نام سے مشہور ہے۔“ سوزی نے بتایا۔ ”عمر اس کی پینتالیس سال ہے، صورت سے ہی خرافات اور مرد مار عورت ہے۔ قد اور بہت ہی ظالم اور ایک وحشی عورت ہے۔ یوں تو اس کی رہائش جیل کی چہار دیواری کے اندر ہی ہے۔ لیکن فرنیچر وہ مکے کے علاقے میں اس کی ذاتی رہائش گاہ بکھر ہے۔ وہاں وہ

کہاں کھو گیا ہے تو، لگ..... کیا ہے ٹوٹھیک ہے،
بتا.....؟“ وہ بے ربط سے انداز میں اور رند سے ہوئے
سے لچے میں بولتا چلا گیا۔

ایک عرصے بعد اس یارے بدل کے منہ سے
”آخر..... کا کے!“ سنا تو میرا دل جیسے کسی نے ہتھی میں بھیج
لیا ہو۔

”میں..... ٹھیک ہوں، بالکل خیریت سے بھی.....“
میں نے گلے میں اترنے والی غناک سی رقت کا گھونٹ
بھرتے ہوئے جواب دیا۔ ”یہ بتا، ماں جی اور ابا جی کیسے
ہیں؟ اور..... اور بیگم صاحبہ..... کیسی ہیں؟ یہ تو ان کا نمبر تھا،
وہ کہاں ہیں؟“

”ہولے ہولے کا کے.....! ذرا سا ہاتھ لین دے
میتوں..... دستانوں..... (ذرا سانس تو لینے دے مجھے، بتاتا
ہوں)۔ وہ بولا۔ اس کا لہجہ ٹوٹا ٹوٹا اور آواز شکستہ محسوس
ہو رہی تھی۔ جانے کیوں میرے دل کو ایک متوحش سی بے
چینی لگ گئی تھی۔

”نہیں اول خبر! مجھے ابھی بتا، کیا بات ہے؟ میرا دل
بے چین سا ہو رہا ہے۔“

”یار.....! سب ٹھیک ہیں“ بالآخر اس کی آواز
اُبھری۔ ”بس! یہ سب سب تو شہاب نے اپنے باپ کی جگہ لے
لی ہے۔ بیگم صاحبہ پر کیس پر کیس کے جارہی ہے۔“

”اوہ..... کیا مطلب؟ کس قسم کے کیس.....؟“ میں
نے بھوئیں کیٹھیں۔

”وہی پرانا سیپا، نئے پنڈ والی زمین اور جاکداد
کا.....“ وہ بولا۔ ”جیسے ہتھیانے کا ذمہ اب چوہدری ممتاز
کے علاوہ اس کی دمی نوشابہ نے لے رکھا ہے۔ یہی نہیں
دہاں کی فیکٹریاں، فلور ملز اور ایک عدد سائونٹ پلانٹ.....،
نوشابہ، بیگم صاحبہ پر اپنے باپ سے زیادہ بھری ہوئی
ہے۔ اس نے بیگم صاحبہ کی نئے پنڈ والی جاکداد وغیرہ پر
کورٹ سے اسے لے لیا ہے، جس میں اس سبکی نے الزام
لگایا ہے کہ.....“ اول خبر اتنا بتا کر چپ ہو گیا۔ پھر
بولا۔ ”یار کا کے! اب تجھے کیا بتاؤں..... ایک نمبر کی
پردہ محاش اور بد ذات کڑی ہے یہ نوشابہ بھی.....“

”مجھے بتاؤ اول خبر.....! اس نے بیگم صاحبہ کے
غلاف کیا الزامات لگائے ہیں؟“ میں نے پُر زور لچے میں
پوچھا۔ وہ ایک گہری سانس لے کر پھر بتانے لگا۔

”اس مبینہ نوشابہ نے کورٹ میں بیان دیا ہے کہ بیگم

صاحبہ کی ماں ستارہ بیگم، اس کے دادا یعنی نوشابہ کے
دادا..... چوہدری الف خان کی دوسری منکوحہ نہیں بلکہ ان کی
رکھیل تھی۔ یوں نئے پنڈ کی جاکداد جو ستارہ بیگم کو حصے میں
دی گئی، وہ ہتھیائی گئی ہے۔ یہی نہیں وہ اپنے بھائی فرخ قتل
کیس میں حیر اور میری ضمانتیں بھی منسوخ کروانے کی
کوشش میں مصروف ہے۔ تجھ پر تو وہ بُری طرح اُدھار
کھائے بیٹھی ہے۔ بہت عذاب میں ہماری جان ڈال رہی
ہے اس بھتیجی نے..... ہاں.....! وہ ہمارے لیے بھتیجی ہی
ثابت ہو رہی ہے۔“ اس نے لمحہ بھر کو توقف کیا تو میں نے
بے اختیار پوچھا۔

”بیگم صاحبہ کہاں ہیں اور کیسی ہیں؟“
”وہ اسپتال میں ہیں۔“ اول خبر نے کہا۔
”کیا.....؟“ میں جیسے چٹخا۔

”ہاں یار، کا کے.....! تو تو جانتا ہی ہے کہ بیگم صاحبہ
کے دل کو پہلے ہی ایک روگ نے اُدھ موا کر رکھا ہے، اتنا
عرصہ گزر چکے کے باوجود وہ ویسا ہی تازہ ہے، اُدھر اس
نوشابہ والے گھٹاؤ نے الزام لے ان کا دل اور مکی کزور کر
ڈالا اور انہیں دل کا دورہ پڑ گیا۔“

”اوہ میرے خدا.....!“ میرے منہ سے بے اختیار
نکلا۔ ”اب کیسی ہیں وہ؟“

”قدرے بھتر ہیں لیکن بیماری کی حالت میں اس
بے چاری کو مقدمے بازیاں بھی بھگتنا پڑ رہی ہیں اور
بیماریاں بھی.....“ وہ بولا۔

”یار کا کے.....! کو بھی جب سے گیا ہے نا..... بیگم
صاحبہ کا تو لگتا ہے جیسے حوصلہ بھی جواب دینے لگا ہے۔ وہ
پہلے ہی تیری جدائی اور تیری فکر میں پکڑاں رنے لگی تھیں،
کا کے.....! اس میں کیا شک ہے کہ وہ آج بھی تجھے لائق شاہ
ہی کے روپ میں دیکھتی ہیں۔ لائق شاہ اسے نہیں بھولتا
کا کے..... نہیں بھولتا وہ.....“ اول خبر کا لہجہ زندہ سا گیا۔
زہرہ بانو کی حالت کان کن میں اپنا دل بُری طرح
سوس کر رہ گیا۔

”آخرین سے اپڑیں بیگم صاحبہ پر، یار کا کے.....!“
وہ کچھ غمگین بھر بولا۔ ”وہ مجھ سے کبھی کہتی ہیں اب بھی کہ اگر
شہزی کا فون آئے تو اسے یہاں کے حالات کے بارے
میں کچھ بتانا اور نہ میری بیماری کا..... ورنہ وہ اپنی عابدہ
والی مہم اُچھوری چھوڑ کر نہ لوٹ آئے۔“

”کبیل دادا اور کھیلے سے رابطہ رہتا ہے؟“ میں نے

”اوہ..... فوراً سان ڈیا کو پہنچو، کہو تو میں اسی وقت تمہاری ٹکٹ کنفرم..... کرو اور او؟“
 ”بہت مہربانی ہوگی آپ کی.....“ میں نے کہا۔
 ”فضول باتیں چھوڑو، یہ بتاؤ..... تم خیریت سے تو ہو ناں.....؟“

”جی ہاں میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھے گھل دادا اور ٹکٹیلے سے بھی بات کرنا تھی اگر ہو سکتی تو.....“
 ”ان کی فکر مت کرو۔“ وہ میری بات کا ٹکڑا کر ایک دم بولی۔ ”وہ میرے ساتھ ہی ہیں اور بالکل محفوظ ہیں، ہم سب کو تمہارا بے چینی سے انتظار تھا۔ بس، آج ہی پہنچو، شکاگو سے سان ڈیا کو صرف چار یا ساڑھے چار گھنٹے کی پرواز ہوگی۔“

”فوراً جواب دو شہزی! میں رابطہ منقطع کرنے لگی ہوں؟“ وہ مجھے خاموش اور سوچتا پا کر دوبارہ بے چینی سے بولی۔

”رائٹ! میں خطر ہوں۔“ بالآخر میں نے کہا۔
 ”گلتا؟“ یہ کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔ عارفہ میری آواز اور یہ سن کر میں امریکا پہنچ چکا تھا، ایک دم جذباتی سی ہو گئی تھی۔

”تو کیا تم کیلی فورنیا نہیں جا رہے؟“ سوزی نے حیرت اور سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

”ابھی نہیں، مجھے پہلے اپنے ساتھیوں سے ملنا ہے جو سان ڈیا کو میں میرا بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”میرے دوستوں میرے ہمپنگ ہینڈ میں ہیں۔ میں ان سمیت ہی اگلے فلائٹ سے کیلیفورنیا پہنچوں گا، باقی کو کوران کی ایڑی چیف وارڈن کے لیے ہمارا اٹھائے رکھ دیا۔“

سوزی کی تسلی ہو گئی۔
 اس کے بعد میں یاسمین خانم کی طرف متوجہ ہوا، اس کا چہرہ اُداس سا نظر آنے لگا تھا۔

”تمہارا اپنے بارے میں وہی پروگرام ہے جو تم پروفیسر ڈین اور ڈاکٹر ہیرالڈ کے طیارے میں بنا چکی ہو؟“

”ہاں!“ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ”میں ان کی اسسٹنٹ کے طور پر ٹرائل کی تھی کہ تحقیقاتی پروگرام میں شامل رہوں گی..... اس طرح مجھے ایک ٹھکانا میسر آ جائے گا، تمہانے اب تم سے کب ملاقات ہو پائے.....“ اس کا گناہ سا چہرہ اُداس ہو گیا۔ میں نے مسکرا کر ملاعت آمیز لہجے

میں کہا۔
 ”یاسمین! تم ہمیشہ میری اچھی ساتھی اور دوست رہو گی..... میں تمہیں خوشی سے الگ نہیں کر رہا ہوں خود سے بلکہ میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ تمہارا مشن اپنی جگہ ایک الگ حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن میرے مشن کی نوعیت کچھ اور ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم ان صوبوں کا حصہ بنو..... خدا کا شکر ہے کہ تمہیں پروفیسر ڈین اور ڈاکٹر ہیرالڈ میس کی قابل ہستیوں کی سرپرستی میسر آ گئی ہے.....“ پھر چند لمحوں وقف کے بعد میں نے بڑی محبت سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔
 میری نظریں اس کے چہرے پر جمی رہیں۔ وہ بھی اپنا اداس سا چہرہ اٹھا کر اپنی گھنیری ہڈیوں کی چھادوں تلے میری طرف دیکھنے لگی۔

”ہم ملتے رہیں گے یاسمین!“ آخر میں فقط اتنا ہی میں نے کہا تھا کہ اس کی کشادہ آنکھوں سے آنسو چمک پڑے۔

”ارے.....! تم تو رو پڑیں یاسمین.....!“ میں نے پیچھے ہٹنے والے کہا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اُسے تھام لیا۔ وہ میرے قریب ہو گئی۔ یوں جیسے جدا ہونے سے پہلے مجھے اپنے ساتھ بھیج لینا چاہتی ہو۔ جیسے میری قربت کی شہید کو اپنے بدن کے روئیں روئیں میں ثبت کر دینا چاہتی ہو۔

”شش..... شہزی! میں تمہیں نہیں بھلا سکتی، لیکن میں تمہارے لیے ہر لمحہ دعا گو رہوں گی۔“ وہ غم سے چور لہجے میں بولی۔ ”تم وعدہ کرو، جب بھی موقع ملے، مجھ سے دوبارہ ملو گے..... دوستی اور انصاف کا یہ رابطہ کبھی نہیں توڑو گے۔“

”ہرگز نہیں..... میں نے کہا نا..... میں تمہیں ہمیشہ اچھے دوستوں کی طرح یاد رکھوں گا۔“ میں نے فوراً جواب دیا۔ ”وعدہ ہے میرا تم سے کہ رابطے میں بھی رہوں گا، اور جب بھی موقع ملے گا تم سے ضرور ملوں گا۔“

یاسمین خانم نے اپنا سر جھکا لیا۔
 باقی کام جلدی سے نٹائے گئے۔ سوزی کیلی فورنیا روانہ ہوئی، یاسمین کو میں نے وہیں چھوڑا اور خود جنگ آفس کا رخ کیا۔

میری ٹکٹ اور سینٹ کنفرنڈ ہو چکی تھی۔ ڈومینک پرواز تھی۔ رات کو بچے میں شکاگو سے سان ڈیا کو کی طرف پرواز کر چکا تھا۔

☆☆☆

آئے تھے۔

یہاں سے مزید دو تین کلومیٹر بعد کار ایک بلڈنگ کے احاطے میں داخل ہو گئی۔ اس بلڈنگ پر بیک وقت کاروباری اور ہائی عمارت کا گمان ہوتا تھا۔

بعد میں عارفہ سے ہی پتا چلا کہ یہاں اکثریت انہی لوگوں کی تھی جو جہاز رانی کے کاروبار سے منسلک تھے۔ اسی عمارت میں ان کے دفاتر اور بارش ہوتی تھی۔

عارفہ میں ایک کشادہ اور نگہباز اپارٹمنٹ میں لے آئی۔ ہم لاؤنج میں ہی رکے صوفوں پر براجمان ہو گئے۔

ہم سب بڑے اشتیاق اور محبت بھری نظروں سے ایک دوسرے کو منکر اسکرار کر دیکھے جا رہے تھے۔

بہت سی باتوں پر تبادلہ خیال ہوتا رہا۔ میں نے بھی اب تک کے بیچ ہوئے واقعات تفصیل سے بیان کر دیے، یا سکین خانم کے بارے میں بھی غائبانہ طور بتایا اور یہ بھی کہ میری فیلا اور پھر مصر سے یہاں تک کی تنگن مہم میں اس کا ساتھ کس قدر مددگار رہا۔ پھر شکاگو میں قدم رکھتے ہی نسلی سوزی سے لے کر امسلی سوزی تک کا ذکر، اس کے بعد آئسہ خالدہ کی بازیابی اور عابدہ کی رہائی تک کی گفتگو میں آئسہ کا لائحہ عمل بھی زیر بحث لایا گیا۔ لیبل دادا اور کلیڈ کو میں نے اپنے اس منصوبے سے متفق پایا۔

اس کے بعد پاکستان میں تنگن صاحبہ اور بے چارے اول خیر کی پریشانیوں اور نوشاہی کے چہرہ دستیوں کے متعلق بھی باتیں ہوتی رہیں، یوں آخر میں یہی فیصلہ ہوا کہ عابدہ کی مہم کو جلد سے جلد نٹایا جائے تاکہ فوراً پاکستان کا رخ کیا جائے اور نوشاہی اور چہدری ممتاز کو اب آخری سبق سکھایا دیا جائے۔

”میں تو تم لوگوں کی کامیابیوں کی جی جان سے دعائیں کرتی رہوں گی۔“ آخر میں عارفہ نے کہا پھر اٹھتے ہوئے بولی۔

”میں کھانا لگاتی ہوں، شہزی، اتم فصل وغیرہ کر لو، وارڈروب میں کپڑے رکھے ہیں۔“

”ہاں جی! آپ بیٹھیں، میں کھانے کا بندوبست کیے دیتی ہوں۔“ کلیڈ نے اٹھتے ہوئے کہا تو عارفہ پر شفیق انداز میں مسکرا کر بولی۔ ”تم تو میری پہلے ہو ہی، آجائے شاباش.....“ وہ دونوں خواتین مسکراتے ہوئے چکن کی طرف بڑھ گئیں۔

معمروانی ہم کے دوران پیش آنے والے واقعات

ایک بج کر چالیس منٹ پر ہمارے طیارے نے سان ڈیاگو انٹرپورٹ لینڈنگ کو عارفہ ایک لمبی سی سیاہ کاریں مجھے لینے پہنچی ہوئی تھی۔ لیکن وہ اکیلے نہیں تھی۔ اس کے ہمراہ کیبل دادا اور کلیڈ بھی تھے۔ اتنے عرصے بعد اپنے پرانے اور جاں نثار ساتھیوں کو اپنی نظروں کے سامنے دیکھ رہا تھا۔ میرا دواں رداں فرط جذبات تلے سرکش ہو رہا تھا۔

پہلے تو میں انہیں پہچان ہی نہ پایا تھا۔ لیبل دادا اور کلیڈ چست لباسوں اور ٹیکسٹس میں خاصے اسٹارٹ اور میڈیم نظر آ رہے تھے۔ عارفہ نے بھی سرد موسم کی مناسبت سے فرکا کوٹ چڑھا رکھا تھا۔ ہم تینوں ایک دوسرے کے گل گل کر تھوڑی دیر تک ایک دوسرے کے کندھوں پر محبت پیار اور شفقت سے چٹکیاں دیتے رہے۔ اس کے بعد اسی کار میں ہم انٹرپورٹ سے روانہ ہو گئے۔

سان ڈیاگو ریاست کیلی فورنیا کا ایک خوبصورت اور ساحلی شہر تھا جو سمندر کے کنارے آباد تھا۔ کار عارفہ ڈرائیو کر رہی تھی۔ ہم سب باتوں میں مشغول رہے۔

سان ڈیاگو کی سڑکیں چمک رہی تھیں، بلڈنگیں، دکان، پب اور رنگ رنگیلے کلبوں کے نوٹن سائن سان ڈیاگو کی اس رات کو حسین اور خوابوں کی شب بنائے ہوئے تھے۔

ایک جگہ میں نے بہت سے لوگوں کا میلہ لگا دیکھا، جو عجیب و غریب روپ دھارے ہوئے تھے، کوئی اسپائیڈر مین بنا ہوا تھا، کوئی آئزن مین اور کوئی سائنس فکشن فلم کا ہیرو۔ یہ ایسے لباس میں خود کو نمبر ہیرو سمجھ رہے تھے۔ عارفہ نے ہی بتایا کہ آج کل سائیاں ڈیاگو میں سالانہ میلے کا کم کون (comic con) کی بھار آئی ہوئی ہے۔ جس میں لوگ اپنے پسندیدہ ٹی وی پروگرامز سائنس فکشن، فلم اور کامک بکس کے کرداروں کا روپ دھارے ہوئے ہوتے ہیں۔

ہر چند کہ وہاں خوب ہڈا تھما جا ہوا تھا۔ نصف گھنٹے سے کچھ زیادہ وقت لگا اور کار اب ساحل سمندر کے کنارے سڑک پر آ گئی۔ چھوٹے بڑے جہازنگر انداز تھے، ہمیں کسی کا بلبل سنا کی دے جاتا تو یوں لگتا تھا جیسے کوئی خوابیدہ ڈولفن جاگ ہو۔

سمندر اور ساحل پر بڑا دلکش منظر تھا۔ روشنیاں، بحری جہاز چھوٹی بڑی لالچیں بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ کئی اسٹال، دکانیں، بیچ دو بیچ کے ریسٹورانٹ اور کلب یہاں بھی نظر

میں روڈلف کی فٹائڈی کی مدد کے بل بوتے پر شمانہ کے مقبرے سے دو انوکھے تھپار سنہری بھوڑا اور اسیک رنگ (سانپ والی انگلی) کے متعلق میں نے عارف کو بتانا ضروری خیال نہیں کیا البتہ کبیل دادا اور کھیلے کو ان کے متعلق ضرور بتا دیا اور ان کا ”نظارہ“ بھی کر دیا تھا۔ حسب توقع وہ دونوں ہی اس عجیب اور انوکھے تھپاروں کو دیکھ کر متحیر ہو گئے۔

تاہم ساتھ ہی میں نے ان کی خطرناکی کے بارے میں بھی بتا دیا کہ ذرا سی غلطی کے سبب یہ اپنے لیے بھی مہلک بن سکتے تھے، لہذا ان کے استعمال میں ہمیشہ غیر معمولی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔

☆☆☆

ساحل سمندر کے کنارے اس گھڑی اپارٹمنٹ میں وہ رات بڑی دلچسپ اور پرسکون گزری تھی۔ میں اور کبیل دادا ایک ہی کمرے میں سوئے تھے جبکہ عارف اور کھیلے نے بھی اسی طرح دوسرے کمرے میں رات گزاری تھی، اگرچہ ہم چاروں رات گئے تک ساتھ ہی ایک کمرے میں بیٹھے بائیں بھی کرتے رہے تھے جبکہ عارف سونے کے لیے جلد ہی اپنے بیڈروم میں چلی گئی تھی۔

بہر کیف ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد جب کافی کا دور چلا تو ہم ایک بنیادی حکمت عملی تیار کر چکے تھے۔ جس کے مطابق ہم نے سان ڈیاگو یا عارف کی جگہ گوانا مستقل ٹھکانا نہیں بنانا تھا۔ اس کے لیے کبلی فورنا میں ہی کسی تیسرے درجے کے علاقے میں اپنی مستقل سکونت اختیار کرنا تھی۔ البتہ ضرور تاجا مارا عارف سے بھی رابطہ رہے گا۔

تیسرے درجے کی سکونت پذیری کا انتظام پہلے ہی سے کبیل دادا اور کھیلے نے کر رکھا تھا۔ وہ کبلی فورنا کا ہی ایک ساحلی علاقہ تھا۔ جو وہاں عرف عام میں لیبر کالونی کہلاتی تھی جہاں غریب مزدور وغیرہ جو پورٹ پر نچلے درجے کا کام کرتے تھے، ان کے ڈیوٹ نما کمروں اور کنٹینرز وغیرہ میں رہتے تھے۔

کبیل دادا اور کھیلے جب پہلی بار یہاں پہنچے تھے تو انہوں نے ادواؤ میں کچھ دھوکے کے لیے رہائش اختیار کی تھی۔ ایسی سستی جگہ پر رہائش ہماری درحقیقت ایک ”بھوری“ بھی تھی۔

سوڑی سے ہمارا رابطہ ہو چکا تھا۔ وہ جس کرائے کے اپارٹمنٹ میں رہتی تھی، وہ بھی وہاں سے زیادہ دور نہ تھا۔

اس کا علاقہ کنگ ایونیو کہلاتا تھا۔

ہم سبہر کی فٹائڈی سے کیلیفورنیا پہنچ گئے۔ میں نے چیک سے امریکن ڈالر ضرورت کے مطابق کچھ کرنسی نکھوای تھی۔

جب لیبر کالونی پہنچے تو یہاں مجھے تیسرے طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ نظر آئے۔ وہ ایک چھوٹا سا کنٹینر تھا جس کے دو داخلی دروازے تھے۔ یہ کرائے پر لیا ہوا تھا۔

سوڑی کو بھی ہم نے ادھر ہی بلا لیا تھا۔ رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ سردی پڑ رہی تھی۔ تاہم کیلیفورنیا واحد اسٹیٹ ہے جہاں موسم گرما ہی جیسا ہی معتدل رہتا ہے۔ یعنی گرمی ہو یا سردی، بس ایک حد تک پڑتی تھی، اس میں کوئی شدت نہیں ہوتی تھی۔

کنٹینر کی فضا گرم تھی۔ اسی کے اندر دو پورشر بنائے گئے تھے۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ بچن تھا۔ یہاں کی ساحلی آبادی بھی کافی جھلک تھی۔ کبیل دادا نے البتہ بتایا تھا کہ کبھی کبھار پولیس یہاں اچانک چھاپے مارا کرتی ہے۔ جب انہیں نشیات یا کسی جرائم پیشہ آدمی کی موجودگی کی کوئی خبر ملتی ہے۔

بہر حال ہمیں اپنے مشن کو جاری رکھنے کے لیے یہ جگہ نسبتاً محفوظ اور قدرے پرسکون محسوس ہوتی تھی۔

عارف نے ایک کام کر دیا تھا کہ ہمیں دو عدد سیل فون نمبرز کے ساتھ دلوادے تھے۔ ایک میں نے رکھ لیا تھا اور دوسرا کبیل دادا کے پاس تھا۔

سوڑی نے ہمیں سبز بخینوؤ کے ہفتے بھر کے معمولات سے آگاہ کر دیا تھا۔

رات نو بجے ہم چاروں اپنے رہائشی کنٹینر سے نکلے اور..... ایک بس کے ذریعے فرینو کے علاقے میں جا پہنچے۔

موسم کی مناسبت سے ہم نے تھوڑی بہت شاپنگ بھی کر لی تھی۔ میں نے ٹائٹ پینٹ شرٹ چڑھا رکھی تھی اور اس پر لیڈر کی گرم جیکٹ تھی۔ کبیل دادا نے وائٹ شرٹ پر بلیس

والی ہلکی براؤن رنگ کی قدرے نیکی اسٹائل کی چٹون پہن رکھی تھی۔ اس بار بال میں نے اپنے قدرے بڑے رکھ چھوڑے تھے۔ انہیں بکھرنے سے بچانے کے لیے

میں نے جمل لگا رکھا تھا۔ باریک مونچھیں رکھنا میں نے چھوڑ دی تھیں۔ چہرہ کلین شیو کر لیا تھا۔ جیسا کہ مذکور ہو چکا، میرا

اور کبیل دادا کا قد و قامت ایک ہی تھا، تاہم اس کا جسم مجھ سے آٹھیں میں کے فرق سے کمرتی تھا۔

”مجبوری میں بیٹی بڑ جاتی ہے۔“
”یہاں تو ایسی کوئی خاص مجبوری نہیں تھی؟ میں نے
بھی تو صرف کولڈ ڈرنک پئی۔“ میں نے کہا۔

”اس بحث کو چھوڑو، ہم مطلوبہ علاقے میں داخل ہو
چکے ہیں شہزی!“ کہیل دادا نے میرے قریب سرگوشی کی۔
اب پتا نہیں وہ کہیل کا دفاع کر رہا تھا یا کچھ اور، لیکن حقیقت
یہی تھی کہ ہم اس فنٹ ہاتھ پر قدم رکھ چکے تھے جس کی سڑک
سبز بنسور ڈھ... کی رہائش گاہ تک جانی تھی۔

یہاں داہیں بائیں روشن پارک تھے۔ دکانیں تھیں
اور دو کلب نظر آئے تھے، چنایک برگر اسٹور اور فنٹ ہاتھ
سائڈ اوپن ائریٹورنٹ تھے۔

آخر الذکر ریٹورنٹ سبز بنسور ڈھ کی رہائش گاہ سے
چند قدموں کے فاصلے پر تھا۔ یہی سڑک آگے جا کر بائیں
جانب کو مڑ جاتی تھی۔ اسی کے کنارے پر ایک منزلہ وہ شاندار
مکان تھا جس کا سیاہ رنگ کا بڑا سا کیت، مذکورہ ریٹورنٹ
کے ایک آخری گوشے پر بیٹھ کر صاف نظر آتا تھا۔

ہم تینوں اسی طرف کی میز کرسیوں پر براہمان ہو
گئے۔ پہلے اونچی آوازوں میں باتیں اور تھیم لگتے رہے،
اس کے بعد ایک نیم عریاں ویڈیو نے آرڈر لیا اور ڈرا
ہی دیر بعد ہماری میز پر ہمیر کر اور دو بیئر اور ایک کولڈ ڈرنک
سرو کر کے منتقلی ہوئی گئی تھی۔

ہم کھانے پینے کے بہانے تھوڑا میز پر جھکے ہی تھے
کہ اچانک کہیل نے سرسراہتی سرگوشی میں مجھ سے کہا۔
”خبردار، شہزی! چونکا مت..... اسی طرح نادل
رہتے ہوئے کسی بہانے اپنے بائیں جانب والی میز پر ڈرا
نظر ڈالنا..... مجھے دو افراد مشکوک دکھائی دے رہے ہیں۔“

یہ کہتے ہی اس نے یونہی ایک گرم جوش سا قہقہہ لگا کر
اپنے قریب بیٹھے کہیل دادا کے گلے میں اپنا ایک بازو حائل
کرتے ہوئے اسے اپنے قریب کر لیا، یوں جیسے اسے
”بکس“ کرنا چاہا رہی ہو، لیکن میں ادراک کر سکتا تھا کہ اصل
میں وہ اس کے کان میں بھی یہی کچھ بڑبڑا رہی ہوگی۔

میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس میں کیا خشک تھا
کہ میرے امرا کا میں قدم رکھتے ہی بے نیسی والے حرکت
میں آچکے تھے اور سوزی کی صورت میں خاک بھی چاٹ
چکے تھے۔

میں نے کہیل و دیکھائی کی صحت پر عمل کرتے ہوئے
ایسا ہی کیا اور..... چہرہ گر کا ایک بانٹ لینے کے دوران کولڈ

کہیل دادا نے اپنے چہرے پر ہلکی داڑھی رکھ
چھوڑی تھی اور مونچھیں بھی نہیں۔ کہیل نے بھی مشن کی
مناسبت سے جینز کی ٹائٹ پنٹ شرٹ زیب تن کر رکھی تھی۔
اوپر سیاہی مائل براؤن جیکٹ تھی۔ ہمارے پیروں میں
بوٹ تھے۔ احتیاط کے پیش نظر چروں کی شناخت کو عقلی
رکنے کے لیے کہیل دادا اور میں نے مفکر لپیٹ لیے تھے،
کہیل نے ایک ادنیٰ گرم ٹوپی پہن لی تھی۔ وہ بھی خاصی خوب رو
اور پرکشش امریکی حسینہ دکھ رہی تھی۔

میں نے یونہی اسے شرارت سے آنکھ مارتے ہوئے
کہا۔ ”کہیل! اگر اس وقت تمہیں اول خیر دیکھ لے تو سوجان
سے عاشق ہو جائے تم پر۔“

”سوجان کیا شہزی؟ وہ تو پہلے ہی اس پر ہزار جان
سے فدا ہے۔“ کہیل کے بھائے کہیل دادا نے مسکرا کر
جواب دیا تھا۔ کہیل تھوڑا جھپٹ سی گئی مگر پھر سر جھٹک کر
جہتے ہوئے اول خیر کی نقل آتاری۔
”اور خیر.....“

”ایک نشانی تو یہ محترم بھی اس کی زبانی کھائی ساتھ
لے ہی آئی ہیں۔“ کہیل دادا نے پھر چٹکلا چھوڑا اور ہم نس
دے اور آگے بڑھتے رہے۔

جب ہم کئی فورٹیا کی شاہراہ سے متصل مارکیٹ،
دکانوں اور بوب وغیرہ کے پاس گزر رہے تھے تو بالکل ہی
کسی کھنڈر سے اور بے فکر دوستوں کی طرح دکھائی دے
رہے تھے جو دیگر امریکیوں کی طرح ”سڈوے ٹائٹ
اکسیٹل“ سنانے کے لیے سڑکوں پر بے مقصد آوارہ گردی کر
رہے ہیں۔

لہذا خود کو ایسا ہی ظاہر کرنے کے لیے ہم آپس میں
پُر شوخ سی انجیلی بھی کیے جارہے تھے۔ ایک بوب میں
بھی ہم گھس گئے، وہاں میں نے تو کچھ نہیں بیا البتہ کہیل دادا
نے ایک بلیک لیبل کے دو پیگ اور کہیل نے ایک پیگ بلیو
لیبل کا چڑھا لیا۔

”اس کہیل دادا نے تمہاری عادتیں بھی یہاں آ کر
خراب کر ڈالی ہیں کہیل؟“ میں نے بوب سے باہر آ کر کہیل کو
گھورا۔

”میں نے کب کی ہیں، اس کی عادتیں تو پہلے سے ہی
خراب ہیں۔“ کہیل دادا اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے
بولے۔

”مستقل نہیں پتی میں شہزی!“ کہیل بولی۔

جب ہم باہر نکلے اور یہاں آکر بیٹھے تو یہ دونوں بھی بیٹھ گئے۔“

”ہم.....“

کھیل دادا کے مقابلے میں کھیلے ایسے عوامل پر اگر غیر معمولی نظر رکھتی تھی تو یہ اس کی تربیت کا حصہ تھا۔ کیونکہ وہ بھی میری طرح پاور کی سابقہ ایجنٹ تھی۔ جبکہ کھیل دادا کا معاملہ اور کسی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ ایسی باتوں کا تجربہ نہیں رکھتا تھا۔ بس، ذرا یہ کھیل زیرک دماغی اور بل بل محاط روی کا تھا، دیکھا جاتا تو میں بھی چونک گیا تھا مگر کھیل نے انہیں تازہ کیا تھا۔

”تم بچپان گئے ہو انہیں شہزی؟ کیا واقعی؟“ کھیل دادا نے ہولے سے تحیرانہ سرگوشی کی۔

”کھیل ہے جے بی سی کے ایجنٹ تو نہیں ہیں جن سے تمہارا شکا گو میں ناگرا ہوا تھا؟“ کھیل بھی مستعجب ہوئی۔

”نہیں، یہ ناگیر فیک کے ایجنٹ ہیں۔“ میں نے جواب میں ہولے سے بتایا اور آگے بولا۔ ”ان میں سے جو قدرے چوڑے شالوں والا ہے، میرا اس سے پاکستان

میں ناگرا ہو چکا ہے، ان دونوں کی بات ہے جب آئے خالد نے مجھے فون کر کے خبردار کیا تھا کہ ناگیر فیک کے چیف باسل ہولارڈ نے اپنے دو ایجنٹ خفیہ طور پر مجھے چھاپنے کے لیے پاکستان روانہ کیے ہیں۔ یہ دونوں مجھ پر ہاتھ ڈالنے میں مجھی کا سہا ہو چکے تھے، اس وقت اول خیر بھی میرے ساتھ تھا مگر انہوں نے اسے ہسپتال کا دستہ رسید کر کے بے ہوش کر دیا تھا اور مجھے بھی بعد میں دھوکے سے بے بس کر دیا تھا مگر چونکہ ان دونوں لولوؤں نے اپنے قریبی ساتھی سے جی کو ہار کو میدان میں اتارا ہوا تھا اور اس نے ان کے منہ سے شکار یعنی مجھے چھین لیا تھا پھر میں اس کی

گھڑی یاٹ میں انڈیا، براہ راست انڈیمان جا پہنچا تھا۔ ان کے ایک ساتھی کو کوہار نے ہلاک کر دیا تھا، یہ سچ کیا تھا۔“

”اوہ.....“ کھیل کے ہونٹ دلکش انداز میں دائرے کی شکل اختیار کر گئے۔

”لیکن کیا اس چوڑے شالوں والے نے تمہیں یا میں بچپان لیا ہے؟“ کھیل دادا بولا۔

”ہاں! کم از کم مجھے تو خوردہ ہی بچپان لیا ہوگا۔ سی آئی اے کا یہ دنگ ناگیر فیک چال ڈھال سے شناخت کرنے کا ماہر سمجھا جاتا ہے، میں نے سرسراتے لہجے میں جواب دیا۔

”مگر ناگرا ہے اب ان کا، مقابلہ یا رو چکر.....؟“

ڈرنک کا کین جان بوجھ کر اس طرح کھولا کہ اس کے اندر کا مشروب گیس کے دباؤ سے اچھلا اور میں بیچنے کی غرض سے ہلک کر کھڑا ہو کر ڈرا پلٹا۔ تب ہی ان اٹھیلوں سے میں نے مذکورہ سمت کی جانب نظر بھی ڈال لی۔

ایک ہی بل میں مجھے اس طرف کی میز اور دو کرسیوں پر دو افراد سیاہ رنگ کے اور کوٹ میں لمبوس بیٹھے ڈرنک کرتے دکھائی دیے۔ ایک تو ان میں مناسب قد و قامت کا تھا، اس کے سر پر فلیٹ ہیٹ تھا، جبکہ دوسرا چوڑے شانوں والا اور قدرے دراز قامت محسوس ہوتا تھا، اس کا ہیٹ سامنے میز پر رکھا ہوا تھا۔

اس شخص کو دیکھ کر یکھٹ میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔

میں اسی طرح ہنستا، لہراتا ہوا دوبارہ اپنی کرسی پر براجمان ہو گیا لیکن میری کنپٹیوں پر جیسے تھوڑے برساتا شروع ہو گئے تھے۔ وجہ بھی یہی کہ اس کا چہرہ مجھے شناسا محسوس ہو رہا تھا اور چند تانے ذہن پر زور دیتے ہوئے مجھے یاد آ گیا کہ یہ کون تھا۔

”کیا ہوا شہزی؟ تم ان دونوں کو دیکھ کر کچھ ندوس سے نظر آنے لگے ہو؟ کیا تم نے فوری طور پر کوئی خطرہ محسوس کیا ہے؟“ کھیل دادا نے ہنسنے کے انداز میں اسی طرح اپنی باچھیں پھیلائے رکھی تھیں۔ ساتھ ہی وہ کھیلے سے بھی خواہ مخواہ ہی اٹھیلیاں کر رہا تھا، مقصد یہی ظاہر کرنا تھا کہ وہ اس کی گرل فرینڈ ہے۔

”خطرہ ہی سمجھو..... ان میں سے ایک کو میں بچپان چکا ہوں۔“ میں نے ہولے سے کہا۔ انداز بظاہر میرا ایسا ہی تھا جیسے میں خوش گپیاں کر رہا ہوں مگر اس کے لبائے میں ہم تنوں کی سنجیدہ تنگن جاری تھی۔

”اوہ..... یہ تو پھر خاصی سستی خیر صورت حال ہے، کون ہیں یہ.....؟“ کھیل دادا نے سوال کیا۔

”کھیل! اچھے یہ بتاؤ کہ تمہیں ان پر کب شبہ ہوا؟“ میں نے کھیل دادا کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کھیلے سے پوچھا۔

”ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی جب ہم جب سے نکلے تھے، میں نے ان دونوں کو بھی وہاں دیکھا تھا۔“ وہ بتانے لگی۔ ”پہلے تو میں یہی سمجھی کہ وہ عام مردوں کی طرح مجھے تاڑنے کی کوشش کر رہے ہیں، لیکن جب وہ ہم تنوں کو ایک خاص انداز سے باری باری گھورنے لگے تو مجھے شبہ ہوا، تاہم

میں اور کھیلے بائیں طرف کسی گیس عمارت کی اندھیری آڑ میں آگئے۔

ہم تینوں اپنی پوری تیاری کر کے نکلے تھے۔ یوں متوقع جھڑپ کی پوسٹنگ تھی ہم نے جلدی سے اپنے ہاتھوں میں سیاہ دستاں چڑھا لیے۔

یہاں کہیں کہیں لوہے کے پول پر گلوب روشن تھے۔ لوگوں کی آؤک جاؤک کم ہی نظر آتی تھی بلکہ نہ ہونے کے برابر تھی۔

دفعتاً میں نے اسی سمت کی طرف جہاں سے ہم الگ ہوئے تھے، دوسرے طویل ہوتے دیکھے، اس کے بعد وہ دونوں نظر آگئے۔ ٹائگر فک کے یہ دونوں ایجنٹ ہیٹ اور اور کوٹ میں لمبوں دور سے ہی آتے دکھائی دے گئے۔

میں نے انھیں سیکڑ کر یہ غور ان کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیا تو تھک گیا۔ ان دونوں کے سیدھے ہاتھ کوٹ کی اندرونی جیبوں کے اندر تھے۔ جس کا صاف مطلب تھا کہ اگر ہم تینوں بروقت گمات نہ لگا چکے ہوتے تو انہوں ہم پر دھاوا بول دیتا تھا لیکن اب باری ہماری تھی۔

وہ دونوں ہمیں تلاش کرتے ہوئے تیز تیز قدموں سے اسی طرف چلے آ رہے تھے۔ ہمیں چھاپنے کی انہیں اس قدر جلدی تھی کہ فوراً ہی انہوں نے اپنے ہاتھ کوٹ کی جیبوں سے باہر نکال لیے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں سیاہ پستول چمک رہے تھے، جن کی لمبی ٹائیں بتاتی تھیں کہ انہیں بے دوا موت پھیلانے کے لیے تیار رکھا گیا ہے۔

میں نے ان کی پوزیشن کا اندازہ کیا، کھیلے کو ہدایت دی۔ پھر جیسے ہی وہ ہماری طرف بڑھتے ہوئے تاریکی کا حصہ بنے، میں اور کھیلے بجلی بن کر ان پر ٹوٹے۔

کھیلے نے حرکت میں آتے ہی بجلی کی سی بھرتی کے ساتھ اپنے شکار پر ہیک ایک وقت ڈبل اسالت پاور داؤ آزما یا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ اپنے قہر مقابل کے پستول والے ہاتھ سے ٹکرایا تھا اور دوسرے ہاتھ کا بیچ اس کی گدی پر سید کر دیا تھا۔ اس اچانک حملے پر وہ ہولکلا یا بلکھڑایا اور جب تک سنبھلا، اس کا پستول کھیلے کے ہاتھ میں ٹپکتا نظر آیا۔

ادھر میں نے..... اپنے قہر مقابل پر دھاوا بولنے ہی اس کے پستول کو قبضہ میں لیتا چاہا تھا کہ وہ اچانک مگر مگر سنبھلا، پستول اس کے ہاتھ سے نکلا، میں نے کچھ کرنے کی سعی چاہی تو اس کی ایک لات نے میرے دائیں

کھیلے بولی۔

”ان دونوں کا خاتمہ.....“ میں نے سرد لہجہ میں کہا۔
”لیکن ہم ان میں سے کسی ایک کو بے بس کر کے عابدہ یا آئسہ خالدہ کے حقیق تو پوچھ ہی سکتے ہیں۔“ گھیل دادا نے مشورہ دینے کے انداز میں کہا۔

”دادا! یہ دونوں گلی کے چلتے پھرے لوٹنے لپاڑے نہیں ہیں۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”سی آئی اے کے انتہائی ایڈوائس ورک ٹائیکر فک کے ٹاپ ایجنٹ ہیں۔ انہیں قابو کرنے سے زیادہ ہلاک کرنا آسان ہوگا، قابو میں آجھی آجائیں تو یہ زبان نہیں کھولیں گے۔“

”اس کا مطلب ہے پہلا والا ہی پروگرام صحیح رہے گا۔“ کھیلے بولی۔

”بالکل۔“ میں نے کہا۔ ”یوں بھی چیف وارڈن مسز بیٹس فورڈ سے ہی ہمیں ساری معلومات مل سکتی ہیں۔“

”اب انہیں واضح دینے یا فکا کے گمات اُتارنے کی سوچ۔“ گھیل دادا نے کہتے ہوئے سیکڑ کی بوتل کا آخری گھونٹ لیا جو معدے میں نفل کرنے کے بجائے اس نے جانے کیا سوچ کر غرارے کرتے ہوئے نگل دیا۔

”موج مستی شروع.....“ میں نے بھی کاشن دیا اور اپنی کرسی چھوڑ دی۔ کھیلے نے بدست قبضہ لگا لیا اور گھیل دادا سے لپٹ گئی۔ میں نے اسے کھینچا، وہ دوڑنے لگی۔

ادھر ہمیں کرسیوں سے اٹھنا دیکھ کر..... وٹرس بل لیے دوڑی آئی اور میں نے چند ارنکال کر اس کی پلٹ پر رکھ دیے اور ہوائی بوسر اس کی جانب اُچھلا تو وہ فوراً گلے کا ہار بننے کے لیے مسکراتی ہوئی بڑھی۔ وہ گویا میرے ہوائی بوسے کی لینڈنگ چاہتی تھی۔

ہم تینوں اسی طرح خرمستیاں کرتے ہوئے ایک جانب کو بڑھ گئے لیکن ٹائگر فک کے ان دونوں مذکورہ ایجنٹوں کی طرف سے بھی حمتا تھے۔

آگے سڑک ویران تھی۔ ایک راستہ پیدل چلنے والے افراد کے لیے یا جو چھوٹی موٹی سواری یعنی سائیکل یا بائیک پر سواروں کے لیے تھا، ایک ٹین ایجنٹ لڑکی کو، جس نے بہت ہی شارٹ ٹیگر پکین رکھی تھی۔ ایک اسکوٹی پر جاتے دیکھا۔

ہم دانستہ مزید سنان جگہ پر آگئے، یہ کسی پارک کا بیرونی حصہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی میری ہدایت پر گھیل دادا دائیں جانب کی بائیسے والی باڑی کی طرف غائب ہو گیا جبکہ

بات غلط نہیں تھی میری لیکن نفسیاتی دوا ضروری تھا۔
ان سے چھٹا ہوا ایک ہتھول میں نے اپنے ہاتھ میں ہونڈ
تھامے رکھا تھا، جبکہ دوسرا ٹھیکلے کے پاس تھا۔

ابھی ہتھول کی نال میں نے اس کے ساتھ پڑے
ہوئے سامی کی پیشانی پر رکھ کر ٹریگر دبا دیا۔ ”پوز“ کی
آواز ابھری، اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔ اس کی
پیشانی سے سرخ روشنی ان کی چھوٹی گاڑی کی بیک لائٹ کی
طرح چمکنے لگا۔ آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں اس کی.....

”ٹائیگر ٹیک..... اور بے بی سی..... کے ہر آدمی کا
میں چشم زدن میں یہی انجام کروں گا، کیونکہ ان دونوں سے
تعلق رکھنے والے میرے سامنے ناقابل معافی دہرے
ہیں، خونی دہرے..... کیونکہ عابدہ کے خلاف سب سے
پہلے اور بعد میں بھی انہی دونوں نے جال پھیلا یا تھا۔ باقی
ایجنٹس کے تو میں کافی نیچے اڈیٹر چکا ہوں..... وہ بھی میرا
ٹارگٹ ہیں۔“

میں نے زہر لے اور سفاک لہجے میں اس آدمی سے
کہا۔ ان تینوں کے نام گوانے کا میرا ایک مقصد تھا۔
اسے مجھ سے شاید اس قدر تجزی کی توقع نہ تھی۔ اسی
سبب چند ثانیوں کے لیے اس کا منہ کھلا رہ گیا مگر حقیقت یہ
بھی تھی کہ خوف یا ڈر کا ایک شائبہ تک اس کے چہرے یا
آنکھوں سے ہو رہا نہ ہوا تھا۔ وہ اسی انداز میں بولا۔

”عابدہ کو تم بھول ہی جاؤ اور اپنی اس ساری جستجو اور
مکھنٹس کے زبیاں پر ماتم کرو۔ باقی رہے تم، تو زندگی کے
بہت تھوڑے دن رہ گئے ہیں تمہارے پاس مسٹر شہزی!“
اس کی بے خوف اور پُر اعتماد انداز نے مجھ پر طش
آئیز جھلاہٹ طاری کر دی، حالانکہ مجھے پہلے ہی سے
اندازہ تھا کہ یہ آسانی سے زبان کھولنے والے نہیں ہیں اور
میرے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ اس کے ساتھ تشدد دانہ حربے
آزماتا۔

لہذا میں نے پُر غیظ انداز میں اپنے ہونٹ سمجھنے لیے
اور ہتھول کی بے نال اس کی پیشانی پر لگا دی۔ ابھی میری
آنکھ ٹریگر پر متحرک ہونے کے لیے بے چین تھی کہ وہ بولا۔
”تھمر دو.....“

میری آنکھ ٹریگر پر رک گئی۔ سامنے اور بالکل نکلنے کو
تیار کھڑی، یعنی موت کی اپنی دہشت ہوتی ہے۔ چاہے کوئی
کتنا ہی پسے خان ہو، اتنی فوری اور جلد موت کو قبول نہیں
کرتا۔

پہلو پر رسائی حاصل کی، میں لوکھڑا کر گرا، سنبھلا تو وہ تب
تک اپنے سڑک پر مگرے ہوئے ہتھول پر دو بارہ قتلہ جھانکا
تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ اس نے اس کی نال کا رخ بھی میری
جانب کر لیا، ٹھیک اسی وقت کسی اندھیرے گوشے سے کھیل
دادا نے اس پر چھلانگ لگا کر اس سے ذرا ہی دیر پہلے
کو یا سیکنڈ کے ہزاروں حصے میں، مدہ مقابل کا ہاتھ زخمی ہوا
اور ہتھول اس کے ہاتھ سے نکل کر دوڑ جا پڑا۔

یہ ٹھیکلے کے ہتھول کا شائبہ تھا جو اس نے اپنے شکار
سے چھٹا ہوا۔ دہرے جب تک کھیل دادا دوسرے حملہ آور کو
چھاپا تو مجھے اپنے خاموش ہتھول کی گولی سے نشانہ بنا چکا
ہوا۔

چشم زدن میں ہم نے ٹائیگر ٹیک کے ان دونوں
گھاگ ایجنٹوں کو بے بس کر دیا تھا۔

ایسے مقاصد کے لیے ہم نے تیاری کر رکھی تھی۔ لہذا
کھیل دادا اور ٹھیکلے ان کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے۔
ان کے منہ پر اس کاچ ٹیپ چپکا دیں۔ ہم انہیں گھمٹتے ہوئے
ایک کونے میں لے گئے۔ یہ عام پبلک پارک کا بالکل بے
ترین گوشہ تھا۔

”میں تمہیں پہچان چکا ہوں۔“ اس کے بعد بغیر کوئی
لحد ضائع کیے..... میں اس چوڑے شانوں والے شخص سے
خونخوار غراہٹ کے ساتھ مخاطب ہوا۔ ٹھیکلے اور کھیل
دادا بائیں کھڑے تھے۔ ان کا دھیان میرے بجائے
اطراف پر تھا، یہ میری ہدایت تھی۔

میں ان دونوں پر جھکا ہوا تھا۔ دوسرے غیر شناسا
آدمی کو میں نے سربست نظر میں رکھا تھا۔ جبکہ مخاطب میں
اسی آدمی سے تھا جس سے ایک بار میرا مختصر کسی لیکن پاکستان
میں ٹاکرا ہوا چکا تھا۔

”لہذا تم بھی مجھے پہچان چکے ہو گے۔ مجھے عابدہ
سمیت آئرس خالہ کا پتا چاہیے۔“ کہتے ہوئے میں نے ایک
ہاتھ بڑھا کر اس کے منہ پر چمکی ہوئی ٹیپ ہٹائی جبکہ دوسرا
سر اچکا رہنے دیا۔

”تت..... تم مارے جاؤ گے..... نہیں بچو گے زندہ
ہمارے ہاتھوں۔“ بولنے کے قابل ہوتے ہی اس نے
پھیرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ہم..... اس کا مطلب ہے مجھے اپنے پہلے والے
ہی طریقہ کار پر عمل کرتے رہنا چاہیے۔ تم دونوں تو خواہ
ہی راستے میں ابھ گئے میرے ساتھ۔“

خود بھی ایک کٹر یہودی اور مسلم دشمن درندہ نما انسان ہے۔“
میں نے اسے جواب دیا اور اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔
اسے شاید میرے ”ہوم درگ“ کا اندازہ نہ تھا۔ اس کے منہ
کو اب کتنی مٹی لگ گئی۔

میں اپنی سوجھ بوجھ اور حالات کے مطابق ان کا
تجویز رکھتے ہوئے جو ہوا میں تیر چھوڑ رہا تھا، وہ ٹھیک نشانے
پر ہی لگ رہے تھے۔ اسے یوں سوچنا پکا کہ میرے عابدہ
سے متعلق قیامت نے درست محسوس ہوئے لہذا بولا۔

”ہاں! ایک کام کر سکتے ہو، مجھے آئندہ خالدہ کے
بارے میں بتاؤ، اسے یہ محال بتا کے کہاں رکھا گیا ہے؟“
”مم..... میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“

وہ گلاماف کرنے کے انداز میں پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔
”اوکے..... یہی میرے لیے ایک کام کی بات تھی،
اب بائی..... بائی۔“ کہتے ہوئے میں نے دوبارہ اس کی
پیشانی پر نال رکھ دی۔

”ٹھٹ..... ٹھٹ..... ٹھٹ..... بتاتا ہوں۔“ اس نے فوراً
کہا۔

”وقت ضائع نہیں کرو، بولتے چلو مگرچ بولنا، ذرا سا
بھی مجھے تمہاری بات کی صداقت پر شبہ ہوا تو میں ٹریگر دبا
دوں گا۔“ میں نے بے درجی سے کہتے ہوئے ایک بار پھر
ٹریگر پر انگلی رکھ دی اور پستول کی نال اس پارس کی پھلی
ہوئی آنکھوں کے درمیان قدرے اوپر پیشانی سے چپکائے
رکھی۔

”سیون ڈے بارک ایونیو، اسٹریٹ تھری تھری،
من ایک کے پاس ایک ٹھکانے کی رہائشی عمارت ہے۔ سامنے
سینٹ لوکا کا گرجا ہے، سیکنڈ فلور پر اس کی رہائش ہے۔“

”اپارٹمنٹ کا کوئی نمبر وغیرہ؟“
”ڈپلیکس اور کا لچر ٹائپ فلیٹ ہیں۔ ہر فلور پر ایک
بی ڈپلیکس ہے۔“

اس نے فر فر بتایا۔ میری بھانپتی ہوئی نظریں اس کے
چہرے پر جمی رہیں۔ موت سامنے ہو اور دلیلیں واضح..... تو
عقل ماؤف ہونے لگتی ہے۔ میری ٹھوس دلیلیں اور واضح
تادیلوں نے اسے اب کسی قسم کی چال بازی سے مانع رکھا
تھا۔

”وہاں کون لوگ ہیں؟ اور ان کا تعلق کس تنظیم سے
ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”اس کا نام اسٹاری ہے، وہ کورکور ان جیل کا ڈپٹی

”کچھ بتانا چاہتے ہو؟ لیکن بات میرے مطلب کی
ہونا چاہیے۔“ میں نے موت کی سی سرسراہٹ آواز میں
پوچھا۔

”ہاں! تمہارے مطلب کی ہے لیکن میری جان بخشی
کا تمہیں سوچنا پڑے گا۔“ وہ بولا۔

”یہ بات کی افادیت اور اس کی صداقت پر انحصار
کرتا ہے، جبکہ میرے لیے ان دونوں باتوں میں زیادہ اہم
صداقت ہے مگر افسوس کہ اسے جانچنے کے لیے میرے پاس
وقت نہیں۔ مجھے ابھی اس سے زیادہ اہم کام نمٹانے ہیں،
اسی لیے بائے..... فار ایور.....“ کہتے ہوئے میں نے پھر
ٹریگر پر انگلی رکھ دی۔

”مم..... میں تمہیں خود..... عابدہ کے پاس لے
چلوں گا۔“ وہ ایک دم بولا۔ میں دیکھ سکتا تھا کہ وہ پیسے میں
نہا گیا تھا۔ اس کے ہونٹ کا نچنے لگے تھے۔

ٹائیگر ٹیک جیسے خراٹ اور کھاگ ایجنٹوں کو میرے
نزدیک زیر کرنا کوئی بڑا کام نہ تھا۔ ان کے منہ سے کچھ
اگھوانا زیادہ مشکل تھا۔

”عابدہ تک رسائی اور اس کی رہائی کے لیے میں پہلے
ہی سے ایک مضبوط فریم ورک تیار کر چکا ہوں..... اس لیے
مجھے کسی کی باتوں میں آنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

”لیکن میں خود تمہیں اس تک پہنچاؤں گا۔“ وہ اپنے
خشک پڑتے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے جلدی سے
بولا۔

”عابدہ کسی ریسٹورنٹ میں میری منتظر نہیں ہوگی۔“

میں نے کہا۔ ”میں جانتا ہوں اس وقت وہ ٹائیگر ٹیک یا جے
بی سی والوں کے کسی ٹارچر سیل یا خفیہ قید خانے میں موجود
میرے ہی لیے دعا میں مانگ رہی ہوگی کہ میں ایسی
خفیاکار جگہ کا رخ نہ کروں جس میں میری جان جانے کا
اندیشہ ہو۔ تم یقیناً سچ بول رہے ہو گے، تم مجھے وہاں تک پہنچا
بھی دو گے مگر وہاں موجود سخت چہرے کو تو ذکر اپنی جان
جو قسم میں ڈال کر اسے دشمنوں کے چنگل سے چھڑانا ہوگا۔
پھر تمہارا اتنا سا احسان کیوں لوں میں؟“

”جہیں یہ تو نہیں معلوم کہ وہ اس وقت کن لوگوں کی
قید میں ہے؟“ وہ گھٹکانے کے سے انداز میں بولا۔

”وہ جے بی سی والوں کی قید میں ہے اور اسے
تمہارے باپ بائسل ہولارڈ نے ہی کسی خاص مقصد کے
لیے سوچنی محلی اسکیم کے تحت ان کے حوالے کیا۔ کیونکہ وہ

آوارہ گرد

رہائش گاہ تک جاتی تھی۔ سوزی کے مطابق لڈی چیف وارڈن اپنی ذاتی رہائش گاہ تک آنے کے لیے سرکاری گاڑی استعمال نہیں کرتی تھی بلکہ اپنے داماد اور بیٹی کے ساتھ ہی ان کی گاڑی میں گھر آتی تھی۔

”تاہم دس سے تھوڑا کر چکا ہے۔ وہ لوگ تو نائٹ منانے گھر سے نکل چکے ہوں گے۔“ کبیل دادا اپنی رسٹ وایج پر ایک نظر ڈال کے بولا۔

”یہ ممکن ہے۔“ میں نے کہتے ہوئے ہونٹ ہینچے۔
”لیکن قیافے کے بجائے ہمیں آنکھوں دیکھی تصدیق کرنا ہوگی۔“

سٹریٹ ٹائٹ کی وجہ سے سڑکوں پر اب لوگوں اور گاڑیوں کی روانی میں رفتہ رفتہ اضافہ ہو چلا تھا۔ لگتا ایسا ہی تھا کہ ہمارا ٹارگیٹ پرسن ویک اینڈ کی رات منانے گھر والوں کے ساتھ نکل چکا ہوگا۔ اس صورت میں میرا ارادہ یہ ہم ہلتی کر کے نایک کی طرف نکلنے کا تھا۔ ان کے ہتھیار ہم نے وہیں چھپک دیے تھے۔ ہم آگے بڑھے۔

دائیں بائیں درختوں اور آرائشی جھاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور میں نے ٹھیکہ کوٹ کی طرف جا کر جائزہ لے کے پلٹنے کی ہدایت کی، جبکہ خود میں اور کبیل دادا گیٹ سے کوئی پچاس فٹ کے فاصلے پر کھات لگاے موجود رہے۔ ساتھ ہی میں نے بھی مکان کا دور سے ہی جائزہ لینے کی کوشش چاہی تھی مگر کچھ اندازہ نہیں ہوتا تھا۔

ٹھیکہ نے ترنت کا منٹا لیا تھا، وہ وہاں آئی اور بولی۔
”گیٹ پر کوئی نہیں تھا لیکن مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ اندر کوئی موجود ہے۔“

”اگر تم نے اندر کسی کمرے سے روشنی چمکتی دیکھی ہے تو یہ ضروری بھی نہیں کوئی اندر موجود بھی ہو۔“ کبیل دادا بولا۔ میں سوچ میں تھا بھر بولا۔

”کیا تم نے اندر پورچ میں جھانکنے کی کوشش کی تھی؟“ میرا مطلب ہے کوئی گاڑی وغیرہ کھڑی تھی؟“

”ایک نور دین ٹائپ کی گاڑی کھڑی تھی۔ جس کے پیچھے چھوٹا سا ٹیلر جڑا تھا اور کوئی گاڑی نہیں کھڑی تھی۔“ ٹھیکہ نے جواب میں کہا۔

”بات بھر بھی واضح نہیں ہوئی۔“ کبیل دادا بولا۔
”ممکن ہے ان تینوں میں سے کوئی ایک نہ جا سکا ہو اور ایک رہ گیا ہو۔ اب وہ ہمارا مطلوبہ شکار ہوگا یا کوئی اور۔“ کیا خبر۔“

وارڈن ہے۔ وہ رہائشی عمارت اسی کی ملکیت ہے۔“
”لڈی چیف وارڈن مسز ہینسٹورڈ کا اس میں کوئی رول؟“ میں نے پوچھا۔ اس کی۔۔۔ آنکھیں ایک بار پھر سکڑ کر چمکیں۔ بولا۔ ”عابدہ کے سلسلے میں ان دونوں کے درمیان نہیں بنتی تھی۔“
”وجہ؟“

”اسٹاری اس بات کے حق میں نہیں تھا جو مسز ہینسٹورڈ چاہتی تھی۔“
”پھر؟“

”اسٹاری کو آخر مجبور ہونا پڑا۔“ اس نے بتایا۔ میں اس کی بات کا مطلب سمجھ رہا تھا۔

”ہم۔۔۔۔۔“ میرے منہ سے سرسراے انداز میں برآمد ہوا۔ پتول کی نال میں نے اس کی پیشانی سے پٹا دی۔ میں اس پر کچھ اور آزما نا چاہتا تھا۔ پتول کی نال ہٹے ہی اس کی آنکھوں میں امید و بیم کی لہر چمکی۔ میں نے پتول بائیں ہاتھ میں تھا اور دائیں ہاتھ سے اس کی گردن سہلانے لگا۔

”ی۔۔۔۔۔ کیا کر رہے ہو۔۔۔۔۔؟“ وہ کھٹی آواز میں بولا اور دوسرے ہی لمحے اس کا منہ کھل گیا۔ اس کے ہونٹ ہی نہیں بلکہ چہرہ بھی ہل بھر میں نیلا پڑ گیا۔ میری انگلی کی زہرے لے سانپ والی انگلی کے نغصے سانپ نے اس کی گردن پر ڈس لیا تھا۔ وہ بچ بولتے بولتے جھوٹ برآمد ہو گیا تھا۔ کبیل دادا اور ٹھیکہ میرے فخر سے خنجر تھے۔ ”کیا ہوا۔۔۔۔۔؟ اس نے کچھ بتایا؟“

ٹھیکہ نے سوالیہ لگا ہوں سے میری طرف دیکھا۔
”ہاں! مگر آدھا چج اور آدھا جھوٹ، باقی کا بچ یہ حرام زادی مسز ہینسٹورڈ اگلے کی، ٹارگٹ کی طرف بڑھو۔“
میری آواز جوش غیل سے ترش تھی۔ میں نے اسٹاری سے متعلق نہیں بتایا تو ان کا بھی یہی خیال تھا کہ اسے ڈرا دھکا کر چپ رہنے پر مجبور کر دیا ہوگا۔

”میرا خیال ہے مسز ہینسٹورڈ کے بجائے ہمیں اسٹاری کے گھر کا رخ کرنا چاہیے۔“ کبیل دادا نے مشورہ دیا۔

”اس کی بھی باری آئے گی۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن اصل حقائق کا تب بھی مسز ہینسٹورڈ کو ہی علم ہوگا۔“
ٹائنگر ٹیک کے ان دونوں۔ ایکٹوں کو جنہم واصل کرنے کے بعد ہم اسی سڑک پر آگئے جو مسز ہینسٹورڈ کی

کھیل دادا کی بات میں وزن تھا۔ میں نے سوچا اگر مطلوبہ فکار اندر ہوا تو یہ بات نہایت سمجھنا ثابت ہوگی۔ لہذا یہی طے پایا کہ اب اندر نقب لگانے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا۔

پھر بے وغیرہ کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے۔ مگر مین یا گیت کچھ کہاں کوئی ایسا رواج نہ تھا لیکن میں جانتا تھا کہ ان کا سیکورٹی الارم سسٹم ہی کسی کن برادر محافظ سے زیادہ اثر انگیز ہوتا تھا۔ کسی بھی مشکوک شخص کے اندر داخل ہوتے ہی ایک دم اور بیک وقت دو جھبوں پر الارم بجتے تھے۔ ایک گھر کے مالک کو جگانے اور ہوشیار کرنے کے لیے جبکہ دوسرا الارم قریبی پولیس سٹیشن میں بجتا تھا، پھر چشم زدن میں پولیس کی گاڑیاں ٹریفک کی مدد سے متاثرہ گھر تک پہنچ جاتی تھیں۔

ایسے سیکورٹی الارم کو ناکارہ کرنا مجھے آتا تو تھا لیکن بہر حال اس ٹیکنک میں مکمل عبور حاصل نہ تھا۔ کیونکہ الارمنگ سسٹم کی اندر تیز ہر بار جدت کے ساتھ بدلتی رہتی تھیں۔

ہم نے رہائشی عمارت کی مشرقی دیوار کا رخ کیا۔ اس طرف پارک کا مینجمنٹ اور قدرے بعید ترین گوشہ پڑتا تھا اور وہاں تاریکی بھی تھی۔ یہاں پہنچ کر ہم نے چھپاٹے رک کر پہلے اطراف کی کن گمن لی اور اس کے بعد میں نے دیوار کا جائزہ لیا۔ وہ زیادہ اونچی نہیں تھی۔

میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک آلہ نکالا اور مضبوطی سے ہاتھ میں پکڑ لیا پھر اسے بلند کر کے ایک مین پیش کیا۔ میرے ہاتھ میں دہی ہوئی گول سی شے سے بھلی سرسراہٹ کی آواز بلند ہوئی اور ایک تار اس آلے سے برآمد ہوئی اور سانپ کی طرح لہرائی ہوئی دیوار پر جا پڑی اور وہیں انگ گئی۔ میں نے پہلے ذرا متحجج کر اس کی مضبوطی کا اندازہ لگایا۔ اب میرے دونوں ہاتھ ایک دوسرے سے مل گئے تھے۔ میں نے ایک اور مین دایا پھر ذرا اٹھلا۔ ”چرر“ کی آواز ابھری، میرے ہاتھوں میں دبے ہوئے آلے کی طاقتور موٹر چل پڑی۔ میرے دونوں پاؤں دیوار پر تک گئے، نہ صرف یہ بلکہ میں گو یا دیوار پر چلنے لگا۔ خود کار دائرہ مجھے اور پھینچنے لگی اور میں دیواری منڈیر پر جا پہنچا۔

میں نے دوسری جانب کا محتاط نظروں سے جائزہ لیا اور پھر اسی وقت کہیں قریب سے کتے کے غرانے کی آواز ابھری۔ مجھے اس کا اندازہ تھا۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا

اور کوئی شے اس کی جانب پھینکی۔ وہ بھونکا اور..... مری ہوئی شے کی جانب پکا۔ اپنی حیوانی جبلت کے مطابق اس نے اس شے کو جیزوں میں لینے سے پہلے سونگھا اور اگلے ہی لمحے وہیں لمبا لیٹ گیا۔

میں نے پلٹ کر نیچے کھیل دادا اور کھیلے کو اشارہ کر دیا۔ اس کے بعد دوسری طرف کود گیا۔

ذرا ہی بعد بعد ہم تینوں اندر تھے۔ ہمارے دائیں جانب لان تھا۔ بائیں جانب پیچھے بیک یارڈ کی طرف جاتا ہوا راستہ، جبکہ سامنے فنی دیوار اور اس پر نصب دیدہ زیب گلاس ڈور..... اس پر وہ الارم نصب تھا۔ میں نے کھیلے کو مین گیت کی اندرونی سمت سے اس پر بڑھنے اور وہاں نگاہ رکھنے کی تاکید کی اور کھیل دادا کو پورچ میں کی جانب بڑھنے کا اشارہ کرتے ہوئے ٹریڈر کو چپک کرنے کا کہا۔ خود میں نہایت محتاط روی کے ساتھ گلاس ڈور کی جانب بڑھ گیا۔

قریب پہنچ کر میں نے اپنی جیکٹ کی اندرونی جیب سے ایک چرمی پاؤج نکالا، اس کے اندر مختصر سا الیکٹرانک ٹول رکھا تھا۔ ایک چھوٹی ڈائمو اور بیٹری تھی۔ اس مختصر مگر بہت ہی حساس نوعیت کے ٹول کی مدد سے میں نے قتل باکس کے ساتھ چھپڑ چھڑ شروع کر دی۔

تلی گونگی تب بھی میرا دل اس خدشے تلے زور زور سے دھڑک رہا تھا کہ کھولے وقت کہیں الارم بجنا نہ شروع کر دے، لہذا دھڑکتے دل سے میں نے اسے اوپن کیا تو ٹھکر رہا کہ ہر سوای طرح خاموشی طاری رہی۔

گلاس ڈور کو آہستگی سے اندر کی جانب دھکا دے کر میں نے کھیل دادا کو ”سب ٹھیک ہے“ کا انگوٹھا دکھایا اور اسے وہیں پہرے پر کھڑے رہنے کا اشارہ دیا۔ اس کے بعد کھیلے کو قریب بلایا۔

ہم دونوں اندر داخل ہو گئے۔ سامنے ہال تھا جو شاید نشست گاہ کے طور پر بھی مستعمل رہتا تھا، وہاں فرنیچر تھا اور پلکے پاور کا لمبے روشن تھا۔ اس طرف سے گزر کر ہم راہداری میں آ گئے۔

قریب کے ایک دو کمر میں تلی کرنے کے بعد ہم زینے کی طرف دبے پاؤں بڑھے۔ وہ اوپری منزل کی طرف جاتا تھا۔ وہاں دو اور کمرے دکھائی دیے۔ ایک کو خالی پا کر ہم دوسرے کی جانب بڑھے تو دروازے کے نیچے سے زیر و پاور بلب کی روشنی آئی دکھائی دی۔

میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ کھیل دادا کا اندازہ

کمرے سے نکلے۔

زیادہ سوچے اور اچانک بدلے ہوئے حالات پر غور کرنے کا وقت نہ تھا۔ ٹائگر ٹیک کے تختے پیچھے گئے ہوئے تھے۔

راہداری سے گھوم کر ہم تینوں محتاط روی سے عقبی سمت کی طرف بڑھنے لگے جہاں میرے اندازے کے مطابق بیک یارڈ میں کھلے والا کوئی نہ کوئی دروازہ موجود ہو سکتا تھا۔ ایک چھوٹے سے خالی کمرے سے گزرتے ہی ہم نے بیک یارڈ میں قدم رکھ دیا۔ اس کی دیوار ہماری نظروں کے سامنے تھی۔ یہاں سے فوری طور پر نکلنے کا یہ اچھا موقع تھا لیکن ابھی ہم نے اس کی طرف قدم بڑھا ہی تھے کہ میں نے ایک سائے کی جھلک دیکھی، وہ ایک دیوار کی آڑ سے اچانک ہی ابھرا تھا اور..... ہل بھر میں اس کے ایک ہاتھ میں چمکے ہوئے پتول نظر آیا۔

کبیل دادا اور کھلیا اس چھپی ہوئی آفت سے غافل تھے۔ میں نے بجلی کی سی پھرتی سے ان دونوں کو دائیں بائیں دھکا دیا۔ اسی وقت میں نے خاموش فضا دوپار ”چزز..... چزز.....“ کی آواز سنی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا لیکن اپنے کسی ساتھی کی کوئی کراہ وغیرہ نہ سن کر مجھے تسلی ہوئی اور پھر میں نے ایک جست بھری۔ اس طرح کہ میں اس کے بالکل قریب جا پڑا، اگرچہ اس نے مجھ پر بھی اپنے خاموش پتول سے گولی دھانے کی کوشش چاہی تھی۔

مجھے چشم زدن میں اپنے قریب پا کر وہ صرف لمحہ بھر کو بوکھلا پا اور دوسرے لمحہ میرا اس کے چہرے پر پڑنے والا ہیر پھیر تھا۔ اس کے حلق سے ادھ کی آواز برآمد ہوئی اور وہ زمین سے چند انچ اوپر اچھل کر اسی دیوار سے ٹکرا کر گرا تھا جسے پھلانگنے کا ہم ارادہ کیے ہوئے تھے۔ میں نے اس کی تصدیق کرنا ضروری نہ سمجھا تھا کہ وہ زندہ تھا یا مر چکا تھا۔ کیونکہ ہیر پھیر استعمال کرنے کے بعد اس کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔

”فورا اٹکل چلو۔“ میں نے سرگوشی کی اور پھر ہم نے اسی طرح ”خودکار“ انداز میں دیوار پھاندی اور دوسری طرف جا پڑے۔

پھر ہم رکے نہیں اور تیزی سے دوڑتے ہوئے تین شاہراہ پر آ گئے۔ پھر ایک جگہ رکے اور اپنی بے ترتیب سائیں درست کرنے لگے۔

”یہ کس کا شاخسانہ ہو سکتا ہے اور کیوں؟“ کھلیہ سے

درست ثابت ہوا تھا۔ ان تینوں میں سے کوئی ایک کسی وجہ سے گھر پر ہی رہ گیا تھا اور زیادہ امکان اپنے شکار کا ہی تھا۔ میں نے دروازے کو آستھی سے اندر دھکا دیا اور وہ کھل چلا گیا۔ مدھم سی روشنی میں مجھے نقطہ بھی نظر آ سکا تھا کہ بیڈ پر کوئی لحاف اوڑھے لٹا ہوا ہے۔ میں نے سوچ بوری دیکھ کر یقین آن کیا۔

چٹ کی ہلکی آواز سے کمرے میں روشنی ہو گئی۔ لیکن سامنے نگاہ پڑتے ہی میں بڑی طرح چونک پڑا نہ صرف میں بلکہ کھلیہ جیسی مضبوط دل گردے کی مالک لڑکی بھی سامنے کا ناقابل یقین منظر دیکھ کر اپنے منہ سے اٹھنے والی ہلکی سی سسکاری کو نہ روک پائی۔

ٹھیک اسی وقت ہمارے عقب میں دروازے پر کسی کے قدموں کی آہٹ ابھری۔ ہم دونوں نہایت پھرتی سے اس طرف گھومے تھے۔

☆☆☆

وہ کبیل دادا تھا، اس کے چہرے پر جوش کی سی کیفیات مترشح تھیں۔
”تم؟“ ”خیریت؟“ میں نے ہلکی سرگوشی میں پوچھا۔

”خیریت نہیں ہے۔“ وہ بولا۔ ”پارہکھوک افراد کو میں نے مختلف سمتوں سے اس مکان کی طرف بڑھتے دیکھا ہے۔ مجھے یہ ٹائگر ٹیک کے ہی کتے محسوس ہوتے ہیں۔“
چند لمحوں کے بعد ہی جب اس کی... نظر سامنے بیڈ پر پڑی تو وہ بھی چونک کر بے اختیار بولا۔

”اوہ..... کیا اتنی جلدی اپنا کام نمٹا لیا تم دونوں نے؟“

”ہم نے نہیں کسی اور نے نمٹا لیا ہے شاید۔“ میں نے دانت پیس کر کہا۔ کبیل دادا کی نظریں ہنوز بیڈ پر جمی ہوئی تھیں جہاں کور کور کی لپٹی چیف وارڈن مسز بیٹس فورڈ ایسی حالت میں دھری پڑی تھی کہ اس کے سینے پر یقین دل کے مقام پر دوتے تک خنجر دھنا ہوا تھا اور خون بہہ بہہ کر بیڈ سمیت نصف اوڑھے ہوئے لحاف تک کو گھٹن کر گیا تھا۔

ہمارا شکار سوزی کے بتائے ہوئے حلیے پر پورا اترتا تھا۔ یوں شہ کی کوئی محتاج نہ تھی۔

”اس کا تو قصہ تمام ہوا، اب ان کتوں سے سننے کی تیاری کرو۔“ کبیل دادا مجھے اور کھلیہ کو کم سم سا پا کر بولا۔
”تصادم کیے بغیر نکلنے کی کرو۔“ میں فرمایا۔ ہم

رہا نہ گیا۔
”تم بہت قائل نے ہماری ساری محنت پر پانی پھیر دیا۔ کتنا رسک لے کر ہم شکار کو چھاپنے کے لیے پہنچے تھے۔“ لکیل دادا بھی سخت بھٹایا ہوا تھا۔

”ایسے واقعات روزنامہ ہوتے رہیں گے یارو! جو ہماری توقعات کے خلاف ہوں گے۔“ میں نے المینان سے کہا اور پھر اس کی توجیہ بھی ساتھ بیان کر ڈالی۔
”اس لیے کہ دشمنوں کو میری یہاں آمد و موجودگی کا علم ہو چکا ہے اور وہ ایک مربوط منصوبے اور عقلی قیاموں سے بھانپتے چارے ہیں کہ میں عابدہ کی تلاش کے سلسلے میں سب سے پہلے کن لوگوں کو محتہ مشق بناؤں گا، وہ انہیں ختم کرتے جا رہے ہیں۔“

”تم از کم یہ کام نا ٹیگریٹک نہیں کر سکتے۔“ لکیل نے فوراً ہی پُر غور انداز میں کہا۔
”بالکل درست۔“ میں نے اس کی تائید کی۔ ”یہ کام بے بی سی (جیوش برنس کمیونٹی) کا ہے۔ یہودی لابی کا یہ نقاب پوش سوداگران گروپ اپنے مفادات کی خاطر اپنے خیر خواہوں اور دوستوں کو بھی مولیٰ پر چڑھانے کی پروا نہیں کرتا۔ انہوں نے مسز ہٹسٹورڈ سے کام لکھوایا اور پھر میری آمد کا سنتے ہی انہوں نے اسے ختم کر ڈالا۔ یوں عابدہ کا تھیل سے پُر اہر اسطور پر غیاب ایک بار پھر معائنہ کیا۔“

”لیکن نا ٹیگریٹک کے ایجنٹوں کی اس قدر جلد اور غیر متوقع آمد کا کیا جواز بنتا ہے؟“ لکیل دادا نے اٹکھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
”جن دو ایجنٹوں کو ہم گھات لگا کر جہنم واصل کر چکے ہیں، یقیناً وہ ان سے رابطے میں ہوں گے۔“ میں نے ایک محتاط انداز سے کہا۔ ”شرڈے ٹائٹ، مسز ہٹسٹورڈ کی ذاتی رہائش گاہ کے علاقے میں ہمارا منڈلانا، انہیں باور کرانے کے لیے لائی تھا کہ ہم یہاں کیل کلھانے آئے تھے۔“

”ایسے تو پھر آئرن خالہ کی جان کو بھی شدید خطرہ لاحق ہے، کیونکہ وہ اب تک عابدہ کے متعلق بہت کچھ جان کاری حاصل کر چکی ہے؟“ لکیل نے خدشہ ظاہر کیا اور میں نے ایک گہری سانس حلق سے خارج کرتے ہوئے ہلکے معنوم سے لہجے میں کہا۔
”آئرن خالہ صرف عابدہ ہی کے متعلق نہیں بلکہ تائن ایلیون والے واقعے کے متعلق بھی بہت سے حقائق کا پتہ لگا چکی ہے۔ وہ نا ٹیگریٹک سے زیادہ بے بی سی دانوں کے لیے

اہم ہوگی، خدا کرے وہ بہادر اور باہمت لیٹانی خاتون زندہ ہو۔ یا پھر تجا نے کس حال میں ہو..... بہر حال لکیل! تمہارا خدشہ غلط نہیں ہے۔“

”ضروری نہیں کہ خالہ اگر ان کی قید میں ہے تو وہ اسے اتنی جلدی ہلاک بھی کر ڈالیں۔“ لکیل دادا بولا۔
”لیکن دل میں اس بہادر خاتون کے لیے یہ اذیت تاک خیال ضرور اُچھرتا ہے کہ وہ اگر خونخوئی یہودی درندوں کے ہتھے چڑھی ہوئی ہے تو بڑے جاں کسل لمحات سے گزر رہی ہوگی۔“

”اشاری کے بارے میں کیا خیال ہے اب.....؟“
لکیل نے معاملہ آگے بڑھانے کی غرض سے سوال کیا۔

”رکنا نہیں ہے لکیل.....!“ میں نے پُر جوش انداز میں کہا۔ ”جس رفتار اور تیزی کے ساتھ دشمن ہماری راہ کھوئی کرنے میں ہم سے ایک قدم آگے چل رہے ہیں، ہمیں ان کی رفتار کو پکڑنا اور ان سے آگے لکھنا ہے۔ چلو۔“
ایک ٹھیکسی کے ذریعے ہم سپون ڈسے بارک ایونیو کے علاقے میں پہنچے، وہاں ہم نے ٹھیکسی والے کو گریہ دے کر قارعر کر دیا۔

اسٹریٹ تھری تھری، بن لیک کی جانب ہم پیدل ہی چل پڑے۔ ابتدا میں اسے تلاش کرنے کی معمولی بہت دشواری ہوئی، لیکن یہ مسئلہ ہفتے کی رات کو انجوائے کرنے والے خوش حال لڑکے لڑکیوں کے ٹوٹے ٹوٹے حل کر دیا۔ ان سے پوچھتے ہوئے بالآخر ہم ایک ایسی بھونکی رہائشی عمارت کے پاس پہنچ گئے جس کے سامنے سینٹ لوکا کا گر جا تھا۔

وہ ایک ”ڈپلیکس“ ٹائپ کی رہائشی عمارت تھی، ہم اس کے گیٹ سے اندر داخل ہو گئے۔ اوپر چاتے ہوئے زینے پر دوسرے فلور پر اشاری کا وہ رہائشی پورن تھا۔

ہم نے ادھر ادھر دیکھا پھر دروازے کی طرف بڑھے۔ دروازے پر ہینک آئی نصب تھی۔ میں نے منہ آگے آکر اس پر بھاپ چھوڑی، اس کے بعد جب سے بائیں طرف کی جالی کھال کر قفل میں گھمائی، ذرا سی کوشش کے بعد دروازہ کھل گیا۔ ہم تینوں غواپ سے اندر داخل ہوئے۔

ہم نے خود کو قدرے کشادہ لاؤنج میں پایا، وہاں ہلکی روشنی ہو رہی تھی۔ پھر دفعتاً ایک ایک کمرے سے جہاں روشنی کی کرنیں نمودار ہوتی دکھائی دیں، ادھر سے کسی مرد اور عورت کی ”مچھیلیں“ کرنی آوازیں آرہی تھیں۔

لکیل اور لکیل دادا نے سختی خیز اور مسکرائی سی نگاہوں

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بسٹھے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا رسالہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

1200

امریکی نیٹلا آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 10,000 روپے

9,000

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد
رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے
ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر
رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

بیرون ملک سے قارئین صرف وائٹرن یونین یا مٹی گرام کے
ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر
بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

0301-2454188

0333-3285269

جاسوسی ڈائجسٹ، پہلی کیشنز

63-3 یا 63-3 پبلیکیشنز و پرنٹنگ ہاؤسنگ اتھارٹی بین گورنگی روڈ کراچی

فون: 35804200-35804300

سے میری طرف دیکھا، مگر میں نے کوئی تاثر نہیں دیا اور
کھیل اور کھیل سے کہا کہ وہ دونوں اچھی طرح سے جائزہ
لے کر کھیل کر لیں کہ ان دونوں کے سوا اور کوئی یہاں موجود تو
نہیں ہے۔

میں اول الذکر کمرے کے دروازے کے سامنے ہی
مقامی انداز میں کھڑا رہا۔

دروازہ پورا بند نہیں تھا۔ یوں صاف ظاہر ہوتا تھا کہ
ان دونوں کے سوا اس پورے عین اور کوئی تھا بھی نہیں، لیکن
میں حفظاً مقدم کو کچھ بھی ملحوظ خاطر رکھنا ضروری سمجھتا تھا۔

چند منٹوں بعد ہی دونوں نے آکر اس کی تصدیق کر
ڈالی۔ اس کے بعد میں نے ہونٹ پیچھے لیے اور بیک وقت
ہم تینوں نے کمرے میں دھوا دھوا۔ میں نے دروازے کو
لاٹ رسید کی تھی پھر ہم تینوں دھناتے ہوئے اندر داخل
ہوئے تھے۔ سامنے بیڈ پر مجھے کسی عجیب مخلوق کے پہلو پہ
پہلو ایک حسین عورت دیکھ کر چنداں حیرت نہ ہوئی۔ پیسے
کے بل بوتے پر عمر رسیدہ مرد کے ساتھ سولہ سالہ جوان حسین
لڑکی بیٹھائی کرسی پر تھی۔ تاہم میری آنکھوں کے سامنے
اس حسین اور لمبے بالوں والی جوان عورت کے ساتھ جو مرد
تھا، وہ اتنی زیادہ عمر کا تو تھا البتہ اس کا وجود ہی ممکنہ خیر نظر
آتا تھا۔

وہ سیاہ رنگت کا مالک تھا۔ جسے کالا امریکی کہنا زیادہ
مناسب ہوتا۔ جسم موٹا تھا اور سر اس مناسبت سے ہوتا تو بھی
چل جاتا مگر سر اتنا چھوٹا تھا کہ لگتا جیسے تربوز کے اوپر خوبانی
رکھی ہو۔ تاہم اس کے موٹاپے کو کسی حد تک کسرتی بھی کہا جا
سکتا تھا۔ ذیل ڈول کا وہ مضبوط نظر آتا تھا۔ بس سروال
معامہ ہی اسے پہلی نظر میں ممکنہ خیر بتاتے ہوئے تھا۔
عورت نے ایک خچ مار کے چادر اوپر کھینچ لی جبکہ
عجیب اقلقت موٹے کو مادر زاد برہنہ دیکھ کر کھیلنے نے منہ
پھیر لیا۔

اس نے اپنے اوپر چادر لینے کی ضرورت ہی نہ سمجھی۔
وہ البتہ بیڈ پر یک دم اٹھ بیٹھا تھا اور خوشحال نظروں سے ہمیں
گھورتے ہوئے بولا۔

”کون ہو تم؟“ اور اس طرح اندر داخل ہونے کی
جرات کیسے کی تم نے؟“

اس کی دلیری کی شاید ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہم تینوں
نیچے تھے۔

”کپڑے پہن لو اسٹاری.....! پھر آرام سے بات

اس کی مکاری کو سمجھتا ہے۔ اس نے ایک ”نازک“ موقع سے، جو شاید اس نے پہلے ہی شکلیہ کو دیکھ کر بھابھ لیا تھا، فائدہ اٹھاتے ہوئے شکلیہ پر چھٹا مارا۔

اُدھر باعثِ شرم سے منہ موڑے کھڑی شکلیہ نے مادرِ زاد برہنہ پھینچے جیسے آدمی کو خود سے لینے دیکھا تو اس کے حلق سے ایسی کھپکھاپنے والی چیخ برآمد ہوئی کہ ایک لمحے کے لیے میں اور کبیل دادا کے دل بھی دھک سے رہ گئے، یوں جیسے شکلیہ کسی توپ کے گولے کا شکار ہو گئی ہو۔

کم بخت اسٹاری کو جتنا ہم تر والہ سمجھے ہوئے تھے، وہ ہماری توقع کے برخلاف اُتار ہی ہمیں دق کیے دے رہے تھا۔

اسٹاری، شکلیہ کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کا یہ موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا چاہتا تھا، لیکن اس نے جب شکلیہ کی گردن دبوچنے اور ہمیں بے بس کرنے کے لیے اپنے ایک بازو کی گرفت اس کے گرد کھینچنے کی کوشش چاہی تو شکلیہ کو ساری شرم بالائے طاق رکھتے ہوئے بالآخر حرکت میں آنا پڑا اور اس نے گھٹنے کی ایک زوردار ضرب اسٹاری کے نازک مقام پر بڑے زور سے رسید کر ڈالی۔ اسٹاری کے حلق سے بتل جیسی ڈکراہٹ اُبھری اور وہ جھک گیا۔ شکلیہ گویا اس پر اپنا غصہ اتارنے پر تلی بیٹھی تھی۔ اسی پر بس نہ کیا اور اسے خود سے پرے دھکیل کر اس کی ”پٹھک“ پر بھی ایک زوردار لات رسید کر دی۔ وہ تھوڑا لڑکھایا اور شکلیہ جھرجھرائے ہوئے انداز میں اس سے دور ہٹ گئی۔

تب ہی میں اور کبیل دادا ایک وقت حرکت میں آئے اور اسے دبوچ لیا۔

شکلیہ نے عورت کو قابو کیا جو اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آہستہ آہستہ دروازے کی طرف کھسک رہی تھی۔ وہ اب شکلیہ کے حکم کی تعمیل میں اپنی فراری کی کوشش ترک کر کے جلدی جلدی اپنا لباس پہننے لگی۔

اسٹاری کو ہم نے صرف اس کا سلیپنگ گاؤن پہنانے پر اکتفا کیا تھا۔

”تت..... تم لوگوں کو جرأت کیسے ہوئی میاں بیوی کے کمرے میں داخل ہونے کی؟“ وہ بے بس ہونے کے باوجود ڈرایا۔

”میاں بیوی؟“ میں نے سوالیہ اور ابھمی ہوئی نظروں سے کبیل دادا کی طرف دیکھا۔

”اوہ..... سوری مسٹر اسٹاری.....! ہم اپنی اس غلطی

کرتے ہیں۔“ میں نے اندازے سے اسے اپنا مطلوبہ آدمی سمجھتے ہوئے ساٹ لہجے میں کہا۔ میرے یعنی ایک اجنبی کے منہ سے اپنا نام سن کر اسے چونکنا چاہیے تھا مگر اس کے چہرے سے ایسا کچھ بھی ظاہر نہ ہوا۔ اسی خطرناک سے بگڑے ہوئے لہجے میں بولا۔

”شٹ آپ! میرے کمرے سے اسی وقت باہر نکل جاؤ۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے مڑ کر کچے کے نیچے اپنا ہاتھ بڑھانا چاہا تھا کہ میں کسی چیز کی طرح اُچھل کر اس پر چھٹا۔ عورت نے ایک اور چیخ اپنے منہ سے برآمد کی اور چادر سمیت بیڈ سے اٹھ کر کونے میں جا کھڑی ہوئی۔ وہ اس اچانک اُفتاد پر بڑی طرح سہمی ہوئی تھی۔

میں نے کالے موٹے کے سر کو دبوچ لیا اور بھی میری غلطی تھی۔ وہ میرے گھٹنے میں آٹو کیا تھا مگر اس نے میرے بازو کی مضبوط گرفت سے نکلنے میں... زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔

وہ کسی شارک مچھلی کی طرح تڑپا اور مجھے خود سے پرے دھکا دیا۔ اس کے انداز سے رسلر کا سا پھر تیل پھن اور طاقت کا اظہار ہوتا تھا۔

دھکا گلتے سے میں بیڈ سے نیچے تو نہیں البتہ اس پر سے ذرا اُچھل کر قدرے پائنتی کی طرف ضرور جا لڑکا تھا۔ اس نے ایک بار پھر کچے کے نیچے سے کوئی اسلحہ نکالنے کی کوشش چاہی تھی لیکن میری ٹانگ حرکت میں آئی اور وہ بڑے ڈول ڈول کے ہونے کے باوصف بیڈ سے نیچے جا لڑکا تھا، یہ شاید میری دوسری غلطی تھی، کیونکہ اس اثنا میں وہ کچے کے نیچے سے پتول نکال کر اپنے ہاتھ میں لے چکا تھا۔

شکلیہ تو شاید اس معاملے کو ”سہل“ سمجھ کر ہنوز دیوار کی جانب منہ کیے کھڑی تھی البتہ کبیل دادا شاید ایسے ہی کسی موقع کا شہر تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کالا پھولوں نما اسٹاری میری جانب اپنے پتول کا رخ کرتا، کبیل دادا اس کے ہاتھ میں پتول کی جھلک دیکھتے ہی اس پر جا پڑا تھا۔ اس کی ٹانگ سب سے پہلے اسٹاری کے پتول والے ہاتھ پر پڑی تھی۔ وہ ہاتھ سے لٹکا اور..... اسٹاری کی موٹے ستون جیسی ٹانگ حرکت میں آئی کبیل دادا کو میں نے کراہتے ہوئے پرے کرتے پا کر اپنی جگہ سے جست بھری۔

اسٹاری نے ٹھیک خاک پولیس ٹریننگ لے رکھی تھی، وہ مجھے حرکت میں دیکھتے ہی اپنی جگہ سے ہٹا۔ جب تک میں

پر شرمسار ہیں۔“ میں نے فوراً مفاہمانہ روش اختیار کرتے ہوئے اس سے کہا۔

”تم میرا نام جانتے ہو تو یقیناً یہ بھی جانتے ہو گے کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں۔“ اس کا ہلکے لہجہ پر رقرار تھا۔

”ہم جانتے ہیں۔ تم کیل فورینا کی سب سے بڑی جیل کو کوران کے ڈپٹی چیف وارڈن ہو۔“ میں نے سابقہ لہجے میں ہی اسے جواب دیا۔ ”ہم آپ سے کسی قسم کی کوئی غلط حرکت کرنے نہیں آئے تھے مگر.....“

”غلط حرکت.....؟“ وہ مجھے زیرِ خند نظروں سے گھورتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بولا۔ ”اور پھر صبح حرکت کے کہتے ہیں؟“

”ہم معذرت خواہ ہیں۔ ہمارا آپ سے کوئی جھگڑا نہیں، بس! چند ضروری سوالوں کے جوابات درکار ہیں آپ سے۔“

”میں تمہارے کسی بھی سوالوں کے جواب دینے کا پابند نہیں ہوں۔“ وہ ہٹ دھرمی سے بولا۔ ”بہتر یہی ہوگا کہ خاموشی کے ساتھ تم تینوں یہاں سے نکل جاؤ۔“ وہ ہم تینوں کو گھور کر دیکھنے لگا۔

”تمہاری تو ایسی کمبختی.....“

”آئی ڈونٹ کیئر.....“ (مجھے پروا نہیں) وہ نخوت سے بولا اور یہی وہ وقت تھا جب میرے برداشت کا پیمانہ

لبریز ہوا۔ میرا ایک گھونسا اس کے جیزے پر پڑا۔ وہ اپنے حلق سے ”اُورغ“ کی کراہتی آواز خارج کرتے ہوئے بیڈ پر الٹ گیا۔

وہ عورت جو سمیٹے طور پر اس کی بیوی تھی۔ مجھ سے رو کر الٹا کر کے لگی کہ میں اس کے شوہر پر تشدد نہ کروں۔ میں نے اس کی انتہائی کوئی پروا نہ کی اور اسٹاری کو گردن سے دبوچ کر اپنے قریب کیا اور غرا کے ایک ایک لفظ چپا کر بولا۔

”اسٹاری.....! غور سے سن لو کہ میں کون ہوں، اگر نام جانتے ہو تو سنو..... میں شہزاد احمد خان شہزی ہوں اور اپنے سر پر کفن باندھ کر پاکستان سے یہاں امریکا میں قدم رکھ چکا ہوں..... مجھے عابدہ کا پتا چاہیے..... اسے کہاں غائب کیا گیا ہے؟“

ایک لمحے میں اسٹاری کی ساری اگڑنوں اور غیظ و غضب فرو ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھیں ناقابلِ یقین تاثرات لیے پھیل چکی تھیں۔ منہ حیرت سے کھلا رہ گیا تھا۔

”اگر مجھے تم نے عابدہ کے متعلق کچھ نہیں بتایا تو یہاں سے جانے سے پہلے تمہیں نشانِ عبرت بنا دوں گا تاکہ کورکوران جیل حکام کو اندازہ ہو سکے کہ قانون کی آڑ میں وہ کن لوگوں کے آگے کاربے ہوئے ہیں، سمجھتے تم؟.....“

اسٹاری کئی ثانیے تک مذکورہ کیفیات کا شکار رہا۔ غصہ اور افسانہ غوت تو جیسے اس کی ہوا ہو چکی تھی لیکن اب حیرت اور ناقابلِ یقین تاثرات کی جگہ ایک گہری سوچ کا جال سا بنتا ہوا اس کی بیچ بیچ آنکھوں سے مترشح ہونے لگا تھا۔ حسبِ توقع وہ عابدہ کے حوالے سے میرے نام اور مجھ سے غائبانہ طور واقف تھا۔

”میں تمہارے سارے سوالوں کے جواب دینے کے لیے تیار ہوں۔“ بالآخر اس نے بڑے عجیب اور گہرے لہجے میں کہا۔ ”لیکن یاد رکھو، اسٹاری کسی سے خوف زدہ نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی یہ سمجھتا کہ میں تمہارے ڈر سے ایسا کہنے پر مجبور ہوا ہوں، کیونکہ میں ذاتی طور پر خود بھی مس عابدہ سے متعلق چند باتوں سے اختلافات رکھتا تھا۔“

اس کی بات، آواز اور لہجے میں کچھ ایسا تاثر محسوس ہوا تھا کہ جس نے میرے اندر کا غبار بھی دھو ڈالا۔

”تھینک یو مسٹر اسٹاری!“ میں نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ ”میں بھی اس حقیقت سے واقف ہوں کہ اسی سلسلے میں تمہارے اور لیڈی چیف وارڈن مسز بیٹسنورڈ کے درمیان بڑے دھواں و دھار اختلافات رہے ہیں۔“ میں نے ٹانگیٹر ٹیک کے جنم و اصل ایجنٹ سے حاصل کردہ معلومات کے مطابق اسے جواب دیا۔ وہ اب مجھ سے مزید مطمئن نظر آنے لگا۔ میں بولتا رہا۔

”اسی لیے کوشش میری یہی تھی کہ تم سے دوستانہ ماحول میں گفتگو ہوتی، لیکن مجھے پوری طرح اس صورتِ حال کا علم نہ تھا، تاہم پھر مجھی میں اپنے تئیں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔“

اس سے یہ کہنے کے بعد میں نے ٹھیکہ کو اشارہ کیا۔ اس نے عورت کو چھوڑ دیا۔ میں نے عورت سے بھی معذرت کی۔ اسے کچھ تسلی ہونے لگی اور اس کی سرایتگی میں کچھ کی آئی۔

چند منٹوں بعد لگتا ہی نہ تھا کہ وہاں کسی قسم کی اودھم مچی ہو۔ ٹھیکہ کی لگائی ہوئی ضرب کے تھوڑی دیر بعد اسٹاری کی حالت بھی کافی تسکین مل گئی تھی۔ ہم لاؤنج میں آکر بیٹھ گئے تھے۔ اس کی بیوی بھی

سراسیمگی اس کی آنکھوں سے صاف ظاہر ہوتی تھی۔
اس نے مجھ دیکھتے ہی قہقہہ اٹا دیا تھا۔ ”میں بے گناہ
ہوں۔ مظلوم ہوں اور مجھے پھنسا گیا ہے۔“

وہ ٹوٹی پھوٹی سی انگریزی بول رہی تھی تاہم اپنا...
مانی الضمیر سمجھا سکتی تھی۔ میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں
دیا۔ اس وقت میں اس سے سرسری ملاقات کرنے کی غرض
سے گیا تھا، میرے پاس زیادہ وقت بھی نہ تھا، لہذا جب میں
اس سے کچھ کہے بغیر واپس چلنے لگا تو اس نے مجھ سے
درخواست کی کہ..... مجھے نماز پڑھنا ہے۔ چونکہ یہاں ایسے
مسلم قیدی بھی تھے جو نماز پڑھتے تھے۔ میں نے اسے
مصلّا، صبح اور قرآن شریف دلوایا اور بتا بھی دیا کہ وہ اپنے
قید خانے میں کس رخ پر نماز پڑھ سکتی ہے، نیز یہاں ایک
مصری مسلم قیدی اذان بھی دیا کرتا تھا۔“

اسٹاری اٹا بتا کر چند تانے کے لیے ٹھہرا۔ عابدہ سے
متعلق اس کی زبانی یہ سب سنتے ہوئے میری ہی نہیں ٹھیکری کی
آنکھوں میں بھی نمی اُتر آئی، اس کی تو عابدہ بچپن کی کنبلی
تھی۔ کنبلی دادا کے چہرے پر بھی سنجیدگی ظاہر تھی۔
میرے گلے میں رقت بھر نے لگی تھی۔ میں اسٹاری کے
آگے بولنے کا نہایت بے قراری سے منتظر تھا، ایسے میں مجھے
محسوس ہوا کہ اسٹاری کا لہجہ بھی عابدہ کے ذکر پر متاثرانہ سا
ہونے لگا تھا۔

”میں نے دو دن بعد عابدہ سے پھر ملاقات کی اور
ذاتی دلچسپی کے طور پر پورا ایک گھنٹا اس کے پاس رک کر
ساری چٹا سنی۔

چنی بات بھی تھی مسٹر شیڈی! کہ میں اس کی قانون
کے دائرے میں ہی رہتے ہوئے مدد کرنا چاہتا تھا۔ اس نے
مجھے اپنے اس وکیل کا پتا دیا جو اس کا کیس لڑ رہا تھا۔ اسی
وکیل کے توسط سے ہی میں آنسہ خالدہ سے بھی ملا۔ وہ
میرے مثبت خیالات سے متاثر ہوئی تھی۔ تاہم میرا رویہ
اب بھی درمیانہ ہی تھا اور میں نے آنسہ خالدہ سمیت عابدہ کو
بھی بتا دیا تھا کہ وہ مجھ سے کسی ایسی بات کی توقع ہرگز نہ
رکھیں کہ میں ان کی مدد میں کسی قسم کی قانون شکنی سے کام
لوں گا۔ البتہ قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے جو مدد ہو
سکی، انسانیت کے ناتے وہ ضرور کرتا رہوں گا۔ انہوں نے
بھی یہی کہا کہ وہ خود بھی یہی چاہتی ہیں۔

درحقیقت نائن الیون کے واقعات کے بعد جنہوں

اب اپنے شوہر کے ساتھ بیٹھ چکی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کوئی
مجھے یوں آرام سے دوستانہ ماحول میں بٹھا کر عابدہ کے
متعلق بتانے والا تھا۔ نقد یہ شاید مجھ پر ایک بار پھر مہربان
ہونے لگی تھی۔

”مسٹر شیڈی!“ اسٹاری نے ہولے سے کھٹکھا کر گھلا
صاف کرتے ہوئے کہا۔ میں دھڑکتے دل اور بے چین
نظروں سے اس کی طرف نگے جا رہا تھا۔

”میں عابدہ کو ایک خطرناک اور اہم قیدی کی حیثیت
سے یہاں لایا گیا تھا۔ اسے نائن الیون کے واقعے کے
ذمے داران کے سامنے کے الزام سے سزا ہوئی تھی۔ دہشت
گردی کی عدالت میں اسے پہلے سزائے موت سنائی گئی تھی
لیکن پھر نجانے کیوں وہ عمر قید میں بدل دی گئی۔ اگرچہ اس
کی وجہ بھی مجھے بعد میں معلوم ہوئی تھی۔

اُسے ایک الگ کھٹک کھڑی میں رکھا گیا تھا۔ وہاں
اس کے سوا اور کوئی دوسری قیدی عورت نہیں تھی۔ مجھے صرف
ایک دو بار ہی عابدہ سے ملنے، اسے دیکھنے اور باتیں کرنے کا
موقع ملا تھا۔ وہ شام کا وقت تھا۔ وہ صلاح دار دروازے
کے ساتھ کھڑی کھڑی کھڑی تھی۔ جب میں وہاں پہنچا اور
اسے دیکھا تو میرے دل کو ہی نہیں بلکہ میرے ضمیر کو بھی ایک
جھٹکا سا لگا۔

مسٹر شیڈی!..... میری عمر اس وقت پچاس کے لگ
بھگ ہے، میں پہلے آری میں جاسوس تھا۔ وہاں سے مجھے
پولیس ڈپارٹمنٹ میں سارجنٹ کے طور پر منتقل کیا گیا تھا۔
پھر میری کارکردگی کی بنا پر مجھے انچیف پولیس ونگ میں ترقی
دے کر بھیج دیا گیا۔ وہاں سے کوکوران جنیل میں نائب
چیف وارڈن کی حیثیت سے تعینات کیا گیا۔ یوں مجھے یہ
نوکری کرتے ہوئے پچیس سال سے زائد کا عرصہ بیت چکا
ہے۔ کہنے کا مطلب یہ کہ اتنے طویل عرصے سے اس نوکری
کی صحرا گردی میں مجھے ہر قسم کے خطرناک، خوفناک اور ایک
سے ایک چنگاوری تجربوں سے سابقہ پڑتا رہا۔

وہ مجھے کہیں سے بھی کسی بھی طرح سے ایک دہشت
گرد تو..... کیا..... ایسی دہشت گرد جس کا قتل نائن الیون
والے واقعے کے ذمے داروں سے جوڑا گیا ہو، کہیں سے
بھی محسوس نہیں ہوئی بلکہ دہشت گردوں کی ساتھی تو دور کی
بات ہے، وہ تو مجھے عام معمولی مجرم بھی نہیں لگی۔ معصوم
صورت، انجمن، گھبراہٹ ہوئی حتیٰ کہ بے گناہوں کی سی

”یہ سانسو کیا نہیں بلکہ کروایا گیا ہے۔“ اس جملے نے گویا ایک تحریک کا کام کیا۔ پھر تو اس نے اس قدر زور پکڑا کہ..... امریکی عوام کے بعض مکاتب فکر اس کا یہ منظر جاننے کے لیے بے چین ہو گئے۔ اس جملے کی سچائی میں جو پہلی دلیل مشہور ہوئی تھی وہ یہ تھی کہ..... اس اندوہناک

خالدہ کی ان باتوں کی تصدیق اس وقت ہونے لگی جب کچھ دیگر "باختر" حلقوں نے یہ بتایا کہ وہ اس "میمو" (Memo) پر غور کر رہے تھے جو آج سے ٹھیک چار ماہ پہلے کی آئی اسے کے اندرونی حلقوں میں تقسیم کیا گیا تھا جس میں بتایا گیا تھا کہ اسرائیلی اٹلی جنس ایجنسی امریکا کے مظالم ایک خطرناک خفیہ آپریشن کا منصوبہ بنا رہی ہے تاکہ نیا بھر کی خصوصاً امریکی اور یورپی میڈیا کی نظریں اسرائیل کے فلسطین پر وحشیانہ مظالم سے ہٹا کر فلسطینیوں کے خلاف رائے عامہ ہموار کی جاسکے اور اس وقتی نفرت کا فائدہ اٹھا کر اسرائیلی فوج کو بے گناہ فلسطینیوں کے ایسے کھلے قتل عام کا

رنگارنگ سلسلوں اور سبق آموز تحریروں کی حدت سے بھر سال 2018 کا آخری شمارہ

گھر گھر فروغ کے لیے

کراچی

نامور مصنفہ

غزالہ فرخ

بہنیں ہماری بزم کی مہمان

پاکیزہ



شیریں حیدر کے مسلسل ناول امرت کا دلکش اختتام

رفت سراج کا تظوار ناول پہ کہاں بچیں کہ دل ہے اپنی منزل مقصود سے چند قدم کے فاصلے پر

اسما قادری کے قلم سے نکلی تلخ حقائق سے بھرپور کہانی بلا عنوان جسے آپ قارئین عنوان دیں گے

حیا بخاری اور دردانہ نوشین کی کہانیاں..... ایک نئے موڑ پر

عورت کہانی میں پڑیے..... فرحین اظفر کی ایک اور چشم کشا کاوش..... عورت دیر

اخلاقی و روحانی بیماری

حسد کے متعلق قرآن و سنت کی روشنی

میں اختر شجاعت کی بہترین تحقیق

نفیسہ سعید کی دل سوز تحریر..... گواہ رہنا

اسکے لیے دعا گو

سکینہ فرخ، ایمل رضا، ربانہ آفتاب، فرح بھٹو، ضادیہ احمد،

سانرہ مشال، دیگر مشاق لکھاریوں کے پرکشش افسانے۔

اس کے ساتھ ساتھ معلومات و تفریح کی غنا صر سے پُر مزید مستقل سلسلے صرف آپ کی خوش ذوقی کی نذر

اندر میں کوکوران جیل کے اندر دیکھوں یہ صورت دیگر میں
حائق عوام و خالص کے سامنے لے آؤں گا۔

میرا یہ کہنا تھا کہ اسی رات کو میرے گھر پر نامعلوم مسلح
افراد نے حملہ کیا جس کے نتیجے میں میری محبوب بیوی اور
بیاری بیوی قتل کر دیے گئے اور مجھے اس دھمکی کے ساتھ زندہ
چھوڑ دیا گیا کہ میں اپنا تمام بند رکھوں ورنہ رسوائی کے ساتھ
اذیت ناک موت سے ہمکنار ہونا پڑے گا۔ یوں تو میرا
سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ کس کے لیے میں زندہ رہتا۔ مگر مجھے
ان سے انتقام لینا تھا، اپنی بیوی اور بیٹی کا۔ مجھے زندہ رہنا
تھا۔ سو میں نے ہائی بھری اور یہ ظاہر اپنی زبان کو تالا لگا لیا
مگر موقع کا خضر تھا جو آپ..... شاید تمہاری صورت میں مجھے
مل رہا ہے مسٹر شہزی.....

وہ تمام باتیں بیان کرنے کے بعد خاموش ہو رہا۔
اس کا چہرہ غم اور انتقام و غیظ کے ملے جلے تاثرات سے سرخ
ہوا جا رہا تھا۔

میں فوراً اپنی جگہ سے اٹھا اور اس باخیر شخص کے
کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”اشاری! ہم ایک ہی کشتی کے
سوار ہیں۔ میں ان کی موت بین کر یہاں آیا ہوں۔“

اشاری نے ایک دم سر اٹھا کر میری جانب دیکھا پھر
وہ کمڑا ہو گیا۔ ہم دونوں دوستانہ انداز میں ایک دوسرے کا
کاندھا چھتھانے لگے۔

اچانک سیل فون کی بیل مکتنائی۔ بیڈ سائڈ ٹیبل سے
جھک کر اشاری نے فون اٹھا کر کان سے لگا لیا اور دوسری
جانب سے کچھ سن رہا۔

مجھ سمیت کیمبل دادا اور ٹھیکہ کی ایک ٹک سی نظریں
اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

میں نے دیکھا دوسری جانب کی کھٹکوتے ہی اُس
کے چہرے کے تاثرات خمیر ہوتے چلے گئے اور بات
پوری سننے کے بعد اس نے میری جانب مگھورتے ہوئے
بالکل بدلے ہوئے لہجہ میں کہا۔

”میں نے کہا تھا شہزی! کہ میری مدد قانون کے
دائرے میں ہوگی، قانون شکنی کر کے نہیں۔ تم نے قانون کو
کیوں ہاتھ میں لیا؟“

اس کی بات سن کر میں ہک دک سارہ گیا۔

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرانے بن
جانے والے اہنوں کی بے غرض محبت میں
پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی شہز
سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

موقع مل سکے جس کا گناہ ناخواب وہ ایک عرصے سے دیکھ
رہے ہیں۔

”مسٹر شہزی! خمیر اور جڈ پڑا انسانیت کی ایک مذہب
کی میراث نہیں ہے۔“ وہ پھر کہنا شروع ہوا۔ ”امریکی عوام
مجھے اس سے مترا نہیں ہیں۔ بہت سے مکالمے فکر آپ کو
یہاں ملیں گے جو خود بھی امریکی مشینری اور اس کے اہم
عہدوں پر کھمبے بیٹھے اسرائیلی اور امریکی بیوروں سے سخت
تالاں ہیں۔ بہر حال امریکا نے اپنی جھینپ مٹانے کے لیے
ایسے لوگوں کو دہشت گردی کے نام پر گرفتار کرنا شروع کر دیا
جن کا اس واقعے سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ اسی سلسلے کی
ایک کڑی عابدہ بھی ہے۔“

وہ رکا۔ عابدہ کا موضوع آتے ہی میرے اعصاب
تن گئے۔ تاہم اس نے اب تک کی جو اجالی تصویر پیش کی
تھی، وہ بلاشبہ حقائق کے لحاظ سے متاثر کن ہی نہیں میرے
جیسے آدمی کی معلومات کے لیے سودمند بھی تھیں۔ اگرچہ یہ
سب خالہ کی ذاتی کاوشوں اور اپنی جان کو مشکل میں ڈال
کر حاصل کر رہی تھیں۔

”عابدہ کو جو زنا کر اس سے بالخصوص عالمی تحصب
میڈیا کے سامنے اپنی مرضی کے بیانات دوانے کے لیے
جیوش لابی نے سی آئی اے میں موجود اپنی سوس ”ٹائیگر
ٹیک“ کے امریکی نژاد بیودی چیف باسل ہولارڈ سے رابطہ
کیا اور عابدہ کو کورکوران جیل سے خاموشی کے ساتھ غائب
کرانے کے لیے کہا۔

ٹائیگر ٹیک کا چیف باسل ہولارڈ خود چل کر لڑی
دارؤن مسز بنٹن فورڈ سے ملا، معاملات یا یوں کہہ لیں کہ
”ڈبل“ پہلے سے طے شدہ تھی۔

مسز بنٹن فورڈ نے عابدہ پر باسل ہولارڈ کے کہنے پر ہی
جیل میں مظالم کے پہاڑ توڑ ڈالے تھے، جبکہ میں اسے منع
کیا کرتا تھا۔ میں چونکہ اس کا تحت تھا، زیادہ نہیں بول سکا
تھا مگر میرا خمیر بھی گوارا نہیں کرتا تھا کہ ایک حقیقت کو جاننے
ہوئے بھی میں غلط روش اختیار کروں، ورنہ دیگر باخیر
امریکی فوجیوں اور افسروں کی طرح میں بھی خودکشی کر چکا
ہوتا۔

ایک دن عابدہ کو جیل سے غائب کر دیا گیا، میں جانتا
تھا یہ کسی کی حرکت تھی۔ میں نے کسی بھی چیز کی پروا کیے بغیر
اپنی افسر مسز بنٹن فورڈ کو صاف دھمکی دے دی کہ میں قانون
کی اس چہار دیواری کے اندر یہ غیر قانونی اور انسانیت سوز
حرکت برداشت نہیں کروں گا۔ لہذا عابدہ کو دونوں کے

نقاب شکست مسکینِ رُف

جرم کی بنیاد... مجرم کی تلاش... اور اسے قانون کی گرفت میں لینے کے لیے سراغرساں کو ہر بار ایک نئے پہلو سے سوچنا پڑتا ہے... اس کیس میں بھی یہی ہو رہا تھا... تحقیق و تفتیش کے بعد لگتا کہ مجرم یہی ہے مگر... ایک ذہین سراغرساں کی ذہانت جو جرم کا سرا اور قاتل و مقتول کی شناخت تک پہنچ چکا تھا۔

ایک وکیل اور ڈاکٹر کے مابین جاری چٹانچاش کا اختتام

ملکین موٹے میٹھوں کی ٹینگ لگائے اسے گھور رہا تھا۔ اس نے ہی ہولڈن کو اپنے گھر کے سامنے سے برف ہٹانے پر مامور کیا تھا۔
”ان دنوں ہمارے پڑوس میں رہنے والا قسائی کیا

ہولڈن چاؤ ٹنگ خود کار انداز میں ملکین کے ڈرائیوے پر پڑی ہوئی برف ہٹانے سے صاف کر رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے اس کے کوٹ کا کار پکڑ کر کھینچا اور وہ اپنے خیالوں سے باہر آ گیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ مینارڈ



کر رہا ہے؟“ ملکیں نے پوچھا۔
”ڈاکٹر بورگ؟“ پاؤنگ نے کام روک کر پوچھا۔

”ایسی کوئی خاص بات مجھے معلوم نہیں۔ میری دو بہنوں سے اس سے بات نہیں ہوئی۔“

”میں اس خون آشام درندے کو عدالت میں دیکھنا چاہتا ہوں اور اس دن کا انتظار کر رہا ہوں جب کوئی شخص بدعنوانی کے مقدمے میں اس کے خلاف میری خدمات حاصل کرے اور میں اسے سخت ترین سزا دلوں۔“

☆☆☆

”پٹرول میں ہینی فورڈ تم سے بات کرنا چاہتا ہے کیپٹن میٹک۔“

میٹک نے اپنا کام روک کر فون اٹھالیا۔ ہینی فورڈ کہہ رہا تھا۔ ”مجھے کیڑ کورٹ کے ایک اپارٹمنٹ میں نقب زنی کی اطلاع ملی تھی لیکن اس کا دروازہ اور کھڑکیاں بند ہیں۔ میں نے کھنی بھائی اور دروازے پر دستک بھی دی لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ کیڑ کیوں کے پردے پڑے ہوئے تھے۔ اس لیے میں اندر نہیں دیکھ سکا۔ البتہ ایک گتے کے بھونکنے کی آواز آ رہی تھی۔“

”تم نے کہا دروازہ؟“ جبکہ وہاں دو دروازے ہونے چاہئیں۔“

”تم شک کہہ رہے ہو لیکن اس کا معنی دروازہ ایک صحن میں کھلا ہے اور اس کا گیت منقل تھا۔“

”تمہیں یقین ہے کہ اسی اپارٹمنٹ میں مجھے تھے جس کے بارے میں بتایا گیا تھا؟“

”ہاں، اپارٹمنٹ کا نمبر سات۔ اس کے میل باکس پر کرائے دار کا نام ہولڈن جاؤنگ لکھا ہوا ہے۔“

اس میں کچھ پرانی ڈاک اور دو عدد پل پڑے ہوئے تھے جب میں نے اس کے نمبر پر فون کیا تو کھنی بھتی رہی لیکن

کسی نے فون نہیں اٹھایا۔ وہاں ایک پرانی بغیر نمبر پلیٹ کی شیڈر لیٹ کھڑی تھی جس کے چاروں دروازے منقل تھے۔“

”تم عمارت کے نیچر یا سپروائزر سے ملو جو تمہیں اپارٹمنٹ میں لے جائے۔ ہمیں وہ اطلاع ایک نامعلوم

کال کے ذریعے ملی تھی جسے ہم ابھی تک نہیں کر سکے۔ ممکن ہے کہ کسی نے فلیٹس ہونی ہو یا جان بوجھ کر غلط اطلاع

دی گئی۔ بہر حال تم چیک کرلو۔“

ہینی فورڈ نے نیچر کے اپارٹمنٹ کی کھنی بھائی تو روڈا ہسٹری دی پر نیم شوڈ دیکھتے ہوئے چمن کی بوٹیاں بنا رہی

تھی۔ جب ہینی فورڈ نے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا تو وہ یوں

”میں نے حالیہ دنوں کوئی غیر معمولی بات نہیں دیکھی۔ اسے میں نے آخری بار گزشتہ ہفتے دیکھا جب وہ

کراہ دینے آیا تھا۔“

”گزشتہ چند روز میں کوئی اس سے ملنے آیا ہو۔ ڈیوری مین یا کوئی ہنرمند؟“

”میں نے کسی کو آتے نہیں دیکھا۔ ویسے بھی میں زیادہ تر اپنے اپارٹمنٹ میں ہی رہتی ہوں۔“

بہر حال اس نے سات نمبر اپارٹمنٹ کا دروازہ کھولنے میں کوئی پچکپاہٹ نہیں کی۔ دروازے کے تالے کو نقصان نہیں پہنچا تھا۔ وہ اپارٹمنٹ ایک میوزک اسٹوڈیو

کے مانند لگ رہا تھا۔ زمین پر گرے اور ٹوٹے ہوئے ایکسٹراکٹ آلات لیڈنگ روم میں کسی شدید پھٹکائی کی نشان دہی

کر رہے تھے اور دروازے کے پلوں والا پچیس سالہ شخص ایک کرسی پر جھکا ہوا بیٹھا تھا۔ اسے مرے ہوئے ایک یا

شاید دو دن ہو چکے تھے۔

اس کے زخم سے بہنے والا سیاہ خون پردوں سے چھن کر آنے والی سورج کی روشنی میں کول تار کی طرح چمک رہا

تھا۔ اس کی پیش پر ہونے والے سوراخ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ زخم پیٹ کے اوپری حصے پر آیا ہے۔ سبز ہنسا کر

تیجی سے پٹی اور اس نے دروازے کی طرف دوڑ لگا دی۔

کتا بھی اس کے پیچھے پیچھے چلا گیا۔ ہینی فورڈ نے سیکڑ ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر کو فون پر اس واقعے کی اطلاع دے

دی۔

سراخ رساں سار جٹ فرسٹ ڈوئلر کے آنے کے چند لمحوں بعد شہادتیں اکٹھی کرنے والا میکینک لیفٹیننٹ کیپٹن

بھی جائے وقوعہ پر پہنچ گیا۔ اسے اندرون شہر میں واقع ہیڈ کوارٹرز سے بھیجا گیا تھا۔ کیپٹن نے ہاتھوں پر دستک کے

دستانے اور بیروں میں گانڈ کے کور چڑھائے اور اپنی کارروائی شروع کر دی۔

ہینی فورڈ کو اپنی ڈیوٹی پر واپس گئے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی لیکن ڈوئلر ابھی کیپٹن کے فارغ ہونے کا انتظار

کر رہا تھا جو لاش اور اس کے ارد گرد کی تصاویر لے رہا تھا۔ اس کے بعد بھی اسے مزید انتظار کرنا پڑا کیونکہ کیپٹن نے

اجتہائی باریک مینی سے جانے دو کہ جا کر لینا شروع کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ دو لیپ ٹاپ پر نوٹس اور کلپ بورڈ

پر خاک بھی بنا جا رہا تھا۔

اگرچہ اسٹیشی کو کورونر کے نمائندے کی حیثیت سے لاش پر قانونی کنٹرول حاصل تھا لیکن یہاں اس کا کردار شہادتیں اکٹھی کرنے والے پولیس مینیجمنٹ سے معقول حد تک مختلف تھا۔ اسے مرنے والے کی شناخت اور اس کی موت کی پانچ ممکنہ وجوہات یعنی طبی موت، حادثہ، قتل، خودکشی اور عدالتی سزا میں سے کسی ایک کا تعین کرنا تھا۔ اس کے علاوہ چند چھوٹے موٹے کام بھی اس کے فرائض میں شامل تھے جن میں اس کے وارث کو اطلاع دینا اور پوسٹ مارٹم کے بعد لاش کو درگا کے حوالے کرنا بھی ترجیح مہتمی۔

قائم کی کونج لگانا پبلک سٹینڈی کا کام تھا اس لیے جب اسٹیشی نے جاؤنگ کی تصویروں کا سیٹ تیار کرنے کے علاوہ ایک الیکٹرانک اسکر کے ذریعے اس کی انکلیوں کے نشانات لے کر انہیں ایک کانڈ کے خیلے میں محفوظ کر لیا تو اس کے بعد وہ وقتی طور پر رک گیا۔

اسی طرح ڈونلڈ بھی وقتی طور پر فارغ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے تجویز پیش کی کہ وہ اس دوران کھڑکیوں اور عقبی دروازے پر نظر ڈال کر تعجب زنی کی علامات دیکھ لیں جس کا تذکرہ فون پر دی گئی اطلاع میں کیا گیا تھا جیسا کہ پٹی فورڈ نے رپورٹ دی تھی کہ دونوں کھڑکیوں میں مضبوطی سے جتنی کٹی ہوئی تھی۔ اسی طرح عقبی دروازہ جو ایک مشین کے گزرگاہ میں کھلتا تھا، اس میں بھی ایک مضبوط تالا لگا ہوا تھا اور اس پر کسی نقصان کے آثار نظر نہیں آئے۔ اس سے یہی بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ قاتل زبردستی گھر میں داخل نہیں ہوا بلکہ شاید مقتول نے اس کے لیے دروازہ کھولا تھا۔

کیسز ل ایجی تک خون میں ڈوبے ہوئے روٹی کے پھائے ٹیپوں میں رکھ کر ان پر لیبل لگا رہا تھا۔ ڈونلڈ اور اسٹیشی آڈیٹل تلاش میں عقبی دروازے سے باہر چلے گئے۔ انہوں نے پارکنگ لائٹ کی طرف جانے والے راستے میں ایک قطار میں رکھے ہوئے پکڑے کے ڈبے دیکھنا شروع کیے اور تیسرے ڈبے میں انہیں ایک بڑے سا سز کا چاقو مل گیا جس پر سیاہ خون بھا ہوا تھا۔

کیسز ل نے اس ہتھیار کو قبضے میں لینے کے لیے اپنا کام روک دیا۔ پہلے اس نے کئی تصویریں قریب سے لیں پھر اپنے دستاں اتار کر لیپ ٹاپ کھولا اور اس نے دس منٹ سے بھی کم وقت میں معلوم کر لیا کہ مذکورہ ہتھیار جرمین فوج کے افسروں کے چاقو کی شکل سے جو بھی جگہ حکیم میں استعمال ہوئے تھے۔ کباڑی بازار میں اس کی قیمت تقریباً

چاؤنگ کا سلی فون اس کی لاش سے چند قدم دور ایک چھوٹے سے اسٹینڈ پر رکھا ہوا تھا۔ ڈونلڈ نے پیمائش چیک کرنے کے لیے اٹھایا تو اس میں ایک ہی پیغام تھا۔

”ہے مین۔ آج رات میں تمہیں بہت یاد کر رہا ہوں۔ پلیز مجھے ابھی فون کر دو کہ میں اور میں، تم پر انحصار کر رہے ہیں اور وقت گزرتا جا رہا ہے۔“

ڈونلڈ نے کال ریٹرنگ فکشن کے ذریعے پیغام بھیجے والے سے رابطہ کیا جس نے اپنی شناخت ڈی کوپر کے نام سے کروائی۔ پہلے تو وہ بھی سمجھا کہ چاؤنگ سے مخاطب ہے۔ وہ زخمی گینڈے کی طرح غرار ہا تھا لیکن ڈونلڈ نے بہت جلد اس کا داغ درست کر دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ چاؤنگ کو ڈی کوپر اور اس کی سگیترے سے گزشتہ شب آٹھ بجے پچاس میل دور مغرب میں واقع نیوڈیش میں مل کر ان کی شادی کے استقبالیہ موسیقی کا پروگرام ترتیب دینا تھا۔ یہ شادی ہفتے کے روز ہو رہی تھی۔ ڈی کوپر اور چاؤنگ کئی ہفتے قبل صرف ایک دفعہ ملے تھے۔ واصل ان کی ملاقات پیری شام ہوتی تھی لیکن ڈی کوپر نے اپنی مصروفیت کی وجہ سے اسے مشکل تک ملتوی کر دیا۔ تاہم اتوار کی رات وہ رابطے میں تھے۔

ڈی کوپر نے چاؤنگ کی موت پر افسوس کا اظہار کیا۔ تاہم اس کا کہنا تھا کہ وہ چاؤنگ کے بارے میں صرف اتنا ہی جانتا ہے کہ وہ پارٹیوں اور فنی تقریبات میں موسیقی کا انتظام کرتا تھا اور اس کے کام میں ایک انوکھا پن تھا۔

جیسے ہی ڈونلڈ نے ٹیلی فون بند کیا تو کورونر آفس سے ایک اسٹیشی بھی آگیا۔ وہ ڈونلڈ کے ساتھ پہلے بھی کام کر چکا تھا۔ وہ ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ کیسز ل کی تحقیقات کے مطابق جائے وقوعہ پر آگ لگ نہیں ملا۔ صرف بکین میں ایک چاقو نظر آیا لیکن اس پر پڑی ہوئی مٹی کی تکی وجہ سے اس امکان کو مسترد کر دیا گیا کہ یہ چاقو اس محل میں استعمال ہوا ہوگا۔

کیسز ل نے خیال ظاہر کیا کہ کمرے میں نظر آنے والی بے ترتیبی اور خون کی چھینٹوں کی بہتات سے ظاہر ہوتا ہے کہ قاتل اور مقتول کے درمیان دیرینہ کشمکش ہوئی ہوگی جس میں مقتول کو ذمہ آیا۔ اس کے پیش نظر اس نے لاش کے اوپر اور اس کے ارد گرد سے خون کے نمونے بہت بڑی تعداد میں لے لیے۔

”تقریباً دو ماہ ہو گئے۔ وہ سردیوں میں میرے ڈرائیوے اور گھر کے آگے سے برف صاف کیا کرتا ہے اور سال میں دو تین مرتبہ مکان کے گرد لگی ہوئی ہاڑکی کاٹ جھانٹ بھی کر دیتا ہے۔ اسے کوئی ذہنی مرض ہے کیونکہ اگر وہ کسی مخصوص ایجنڈے پر عمل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کے خیالات منتشر ہو جاتے ہیں۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم مجھ سے اس کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”ہلک سیٹھی آج صبح ایک کال موصول ہوئی جس میں بتایا گیا ہے کہ اس کے اپارٹمنٹ میں نقب زنی ہوئی ہے۔ جب ہم نے چیک کیا تو وہاں اس کی لاش لیٹن نقب زنی یا کسی کے زبردستی گھر میں مرنے کی علامات نظر نہیں آئیں۔“

”اوہ۔“ وکیل نے متوجہ انداز میں سر ہلادیا۔

”وہ کال اس دفتر سے کی گئی تھی۔“

”سینے سے ہتھی وکیل اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ اس نے کمرے کا دروازہ کھولا اور استقبالیہ فلک کو تھم لہجے میں بلایا۔ ”جینتیر۔“

جینتیر نے سختی سے تردید کی کہ اس دفتر سے کوئی کال ہوئی ہے۔ اس نے بھی ہولڈن چاؤنگ کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ اس نے ڈولنگر سے پوچھا کہ وہ کال کس نمبر سے کی گئی تھی جب ڈولنگر نے بتایا تو وہ بولی۔

”تمہارے گھر پر بھی یہ لائن متوازی طور پر دی گئی ہے مسٹر ملین۔“ اس نے وکیل کو یاد دلایا۔

”یہ فون کس وقت کیا گیا تھا؟“ اس نے ڈولنگر سے پوچھا۔

”صبح آٹھ بج کر چوبیس منٹ پر۔“

”مرد کی آواز تھی یا عورت کی؟“

”میں نے ابھی ٹیپ نہیں سنا لیکن میرے کینٹین کا خیال ہے کہ وہ کوئی مرد تھا جو عورت کی آواز بنا کر بول رہا تھا۔“

”یا اس کے برعکس بھی ہو سکتا ہے۔“ وکیل نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”بہر حال یہ بھی اچھا ہوا کہ اُس وقت میرے گھر میں کوئی مرد نہیں تھا۔“

”یہ فون کس نے کیا ہوگا؟“

ملین نے استقبالیہ فلک کو جانے کا اشارہ کیا اور کہا۔ ”اس وقت گھر میں صرف میری بیوی لیلا، بیٹی ڈوری اور سسز کا نوا ہوئی ہیں جو گھر کی صفائی کے علاوہ شاپنگ اور

میں ڈال رہی۔“

”میں نہیں سمجھتا کہ کوئی شخص اتنا بڑا حواشی آئین میں چھپا کر آیا اور اسے قتل کر دیا۔“ ڈولنگر نے کہا۔

”میں بھی۔“ ملین نے اس کی تائید کی۔ ”یوں لگتا ہے کہ وہ اپنے دل میں کوئی بغض پیلا لایا لیے یہاں آیا اور جب ان کے مذاکرات ناکام ہو گئے تو اس نے یہ چاقو متحمل کے پیٹ میں اتار دیا۔“

ٹیلی فون پر ڈولنگر کو ہیڈ کوارٹر سے اطلاع ملی کہ کتا م کال کی شناخت ہوئی ہے۔ یہ فون مینارڈ ملین کے دفتر سے کیا گیا تھا۔ وہ ایک ممتاز وکیل تھا اور اسے ان لوگوں کے مقدمات لڑنے میں خصوصی مہارت حاصل تھی جن کے پاس ناجائز دولت کی بہتات تھی۔ ڈولنگر نے مناسب سمجھا کہ وکیل سے فون پر رابطہ کرنے کے بجائے اس سے ذاتی طور پر ملنا ٹھیک رہے گا۔ اس نے اسکی... اور کیسز کو وہیں چھوڑا، اور خود اندرون شہر کی جانب روانہ ہو گیا جہاں لیوریٹس ٹاور میں وکیل کا دفتر تھا۔

اسے استقبالیہ پر دس منٹ انتظار کرنا پڑا۔ اس دوران استقبالیہ پر بھی خوب صورت اور طرح دار لڑکی نے اس کے شامی کارڈ کی فونو کاپی کروائی اور اس سے مختلف سوالات کرنے لگی۔ لگتا تھا کہ وہ ڈولنگر کی وجاہت اور دلکشی سے متاثر ہو گئی ہے اور اس کے پس منظر کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہ رہی ہے۔

”بچے جاؤ سارنٹ۔“ وکیل نے پُر اعتماد لیکن کستاخ لہجے میں کہا۔ ”میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”کیا ہولڈن چاؤنگ کا نام تمہارے لیے کوئی اہمیت رکھتا ہے؟“

”ہولڈن؟ ہاں وہ میرے یہاں جڑو تھے برف اور گھاس پھوس کی.... صفائی کرتا ہے کہ یادہ کسی مشکل میں ہے؟“

”وہ آج صبح سویرے اپنے قلیٹ میں مردہ پایا گیا۔“

”ہولڈن؟“ ملین نے دوبارہ کہا۔ اس بار اس کے لہجے میں حیرانی تھی۔ ”اس کی عمر ہی کیا تھی۔ کہیں وہ منشیات کا عادی تو نہیں ہو گیا تھا؟“

”ممکن ہے لیکن اس کی موت کی وجہ یہ نہیں ہے۔ وہ چاقو کا زخم لگنے سے مر رہا۔“

”تمہیں یقین ہے کہ اس نے خودکشی نہیں کی؟“

”نہیں، میرا خیال ہے کہ ہم اس امکان کو مسترد کر سکتے ہیں۔ تم نے آخری بار اسے کب دیکھا تھا؟“

دوسرے سے اُلجھتے تھے چاہے وہ گھر کی باؤنڈری ہو، بارش کے پانی کا بہاؤ یا درختوں سے سڑے ہوئے پھلوں کے گرنے کا معاملہ ہو۔

ان کا تازہ ترین اور انتہائی شدید جھگڑا اونچی آواز پر ہوا تھا۔ یورگ عدالتی حکم حاصل کرنا چاہ رہا تھا جس کے ذریعے ملکین کی بیٹی کو اپنے دوستوں کے ساتھ اونچی آواز میں جاز بجانے سے باز رکھا جائے لیکن عدالت نے ایسا حکم جاری کرنے سے انکار کر دیا۔ اسی طرح ملکین نے بھی چاہا کہ ایک عدالتی حکم کے ذریعے یورگ کے بیٹے اور اس کے دوستوں کو باسکٹ بال کھیلنے سے روکا جائے کیونکہ اسے قریب سے گیند کے گرنے کی آواز اس کی سماعت کو ناگوار گزرتی تھی۔ عدالت نے یہ درخواست بھی مسترد کر دی۔

اس مرحلے پر وکیل نے زیادہ جارحانہ حکمت عملی اپنائی۔ اس نے اپنی اسٹڈی میں ایک طاقتور مائیکروفون نصب کیا اور اس کا رخ یورگ کے ڈرائیوے کی جانب کر دیا جو باسکٹ بال کورٹ کے طور پر استعمال ہوتا تھا پھر اسے ایک طاقتور اسمبلی فائر اور لائن سے لگے ہوئے اسپیکرز کے ساتھ جوڑ دیا۔ اس سے یہ ہوا کہ جب بھی گیند زمین پر گرتی تو ایک گرج دار آواز پیدا ہوتی جیسے کوئی بم پھٹا اور آدھ میل دور تک گھڑکیاں لرزنے لگیں۔

اس بار صرف یورگ کو ہی نہیں بلکہ آدھ درجن سے زیادہ پڑوسیوں کو شکایت ہوئی۔ ملکین نے انتہائی عیاری کے ساتھ عدالت میں اپنا دفاع کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ مائیکروفون بذات خود کوئی آواز پیدا نہیں کرتا تھا۔ اس کے اپنے گھر کے باہر سے آنے والی آوازوں کو پکڑتا ہے۔ اس نے مائیکروفون کے استعمال کے بارے میں پرانے مقدمات کا حوالہ دیتے ہوئے عدالت کو بتایا کہ کسی ایک مقدمے میں بھی اس آلے کا استعمال جرم قرار نہیں دیا گیا تاویفیکہ اس کے ذریعے ذاتی معلومات کسی تیسرے فریق کو دی جائیں۔

عدالت کی جانب سے ان شکایات کو مسترد کیے جانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ یورگ نے فوراً ہی اپنا مائیکروفون، اسمبلی فائر اور اسپیکر کی جوڑی کا انتظام کر لیا اور وکیل کے گھر سے آنے والی موسیقی کی آواز کو دور دور تک پھیلا دیا۔ اس کے بعد علاقے میں جانماد کی قیمتیں گرنا شروع ہو گئیں۔ اس معکمہ خیز داستان کو پڑھ کر ڈونلڈ اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکا۔ بالآخر او برن کو بھی اس جانب متوجہ ہونا پڑا، پھر وہ

کھانا بنانے میں میری بیوی کی مدد کرتی ہے۔ ان میں سے کوئی بھی یہ فون نہیں کر سکتا۔
”کیا وہ اس وقت بھی گھر پر ہوں گی؟“
”غالباً، کیا تم ان سے پوچھ گچھ کا پروگرام بنا رہے ہو؟“

”نہال تمہارے فون سے کی گئی ہے۔ تم متحول سے واقف تھے اور میں اس کی تمام تحقیقات کر رہا ہوں۔“
”خفیک ہے۔ میں بھی وہاں جا رہا ہوں۔ میں اپنے طور پر ان سے کچھ سوالات کروں گا۔“
وہ الگ الگ گاڑیوں میں ملکین کی وسیع و عریض رہائش گاہ پر پہنچے۔ اس کی بیوی ایک مغرور اور فیشن زدہ عورت تھی۔ اس نے نیم دلی سے چاؤنگ کی موت پر افسوس کا اظہار کیا اور سختی سے ہیڈ کوارٹر فون کرنے کی تردید کی۔ اس کی خادمہ مزر کا لودا نے بھی یہی کہا کہ وہ اسکی کسی فون کال کے بارے میں نہیں جانتی۔

ملکین کی سترہ سالہ بیٹی ڈوری اپنی کسی دوست کے گھر گئی ہوئی تھی۔ اسے فون کر کے بلایا گیا۔ اس نے مناسب الفاظ میں چاؤنگ کی موت پر افسوس کا اظہار کیا اور اس نے بھی کسی نامعلوم کال کی تردید کی۔ ملکین بھی چاؤنگ کے ذاتی معاملات یا تعلقات کے بارے میں کچھ نہ بتا سکا۔ وہ پہلے میرے مالی کے ساتھ کام کرتا تھا لیکن وہ گھاس پھوس میں سے پھول الگ نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے مجھے اس سے ہمدردی محسوس ہوئی اور میں اسے دوسرے متفرق کام دینے لگا۔

راستے میں ڈونلڈ نے ایک جگہ رک کر کھانا کھایا۔ وہ جب سینکڑ ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر پہنچا تو اس کا سپردا زور لیفٹیننٹ او برن کی پروجیکٹ پر کام کر رہا تھا۔ اس نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ فی الحال او برن کی توجہ اس کے کام سے نہ ہٹائے۔ ویسے بھی چاؤنگ کے قتل کی تحقیقات بالکل ابتدائی مرحلے میں تھی۔ اس نے چاؤنگ اور ملکین کا ریکارڈ چیک کرنے کا حکم دیا اور خود کمپیوٹر پر ان دونوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے لگا۔

اسے اندرون شہر کے ریکارڈ روم سے ملنے والی ایک فائل سے بہت مفید معلومات حاصل ہوئیں۔ اس میں ملکین اور اس کے پڑوسی کوئنٹن یورگ کے درمیان جھگڑے کے بارے میں اخبار میں شائع ہونے والی خبروں کے تراشے اور ان کے درمیان ہونے والی مقدمے بازی کی معکمہ خیز تاریخ بیان کی گئی تھی۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایک

کیپٹن میٹک سے مشورہ کرنے چلے گئے۔

”ایسا لگتا ہے کہ ان دونوں مشغلوں نے ان حرکتوں کی وجہ سے تمام میڈیا کی توجہ حاصل کر لی ہے۔“ میٹک نے کہا۔ ”نہ جانے کیوں مجھے بورگ کا نام جانا پچھانا لگ رہا ہے؟“

”یہ وہی ڈاکٹر ہے جس نے بیلا اسکول کن کا آپریشن کیا تھا۔“ ڈاکٹر نے اسے یاد دلایا۔ ”وہ ایک معروف ریشل اسٹیٹ ڈیولپر اور سماجی کارکن تھی۔ چند ماہ قبل اس کی اوبین ہارٹ سرجری ہوئی تھی جس کے دوران ہی وہ انتقال کر گئی۔“

”ٹھیک ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم دونوں مل کر اس کیس کو دیکھو۔“

دو بچے ہیڈ کوارٹر سے اطلاع ملی کہ کیپٹن نے جاؤنگ کی کار اور پارمنٹ کا معائنہ مکمل کر لیا ہے لیکن مردہ خانے کے محلے نے ابھی تک وہاں سے لاش نہیں ہٹائی ہے۔ اور بن نے مناسب سمجھا کہ وہاں جائے اور جاؤنگ کے کپس منظر اور تعلقات کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی غرض سے اس جگہ کا معائنہ کرے۔

ڈاکٹر نے جاؤنگ کے لیونگ روم کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا، وہ اسے حقیقت پر مبنی نظر آیا۔ وہاں ایک میز، ایک میبل فائزر، مائیکروفون، ایکسٹراکٹ کی بورڈ، ساؤنڈ سسٹم کی بورڈ اور ایک پرانا چھوٹا یونیورسٹی ہوا تھا۔ اس کے علاوہ وہاں دوسری باقیات اور مصنوعی اشیاء کا ڈھیر، پرانے مچھلنے اور مکمل کا سامان، قلمیں، کنسرت کے پوسٹرز، ڈسک آلود اوزار، ٹوٹے ہوئے چائے کے برتن اور جسموں نے بیڈ روم اور کچن کی خالی جگہ کو گھیر رکھا تھا۔

اس کے علاوہ ایکسی نے جو بڑا کردہ دواؤں کا ذخیرہ بھی دریافت کیا اور نسخہ پر نظر ڈالتے ہوئے بولا۔ ”یہ دوا میں ان لوگوں کو دی جاتی ہیں جن کی ذہنی کیفیت ٹھیک نہ ہو۔ بظاہر یہی لگتا ہے کہ وہ انہیں استعمال نہیں کر رہا تھا۔ ان میں سے کچھ نین سے چار سال پرانی ہیں۔“

”جیسے وہ یہ دوا میں لینا بھول گیا ہو؟“

”ممکن ہے، جبکہ اس کی الماری کے پچھلے حصے میں نفسیاتی علاج سے متعلق کتابوں کی پوری لائبریری موجود ہے۔“

اسٹنہی پورے اپارمنٹ میں پھیلے ہوئے کاغذات کے ڈھیر کی چھان بین کر کے اس کے وارث کو شناخت کرنے کی ناکام کوشش کر چکا تھا۔ اور بن اور ڈاکٹر بھی اس

تلاش میں شامل ہو گئے۔ کچھ کاغذات کا تعلق موسیقی کے پروگراموں سے تھا جن سے واضح طور پر اسے معقول آمدنی ہو رہی تھی۔ انہی کاغذات میں انہیں کچھ تحریریں اور دواؤں کی فہرست بھی ملی جو ڈاکٹر بورگ کے لیٹر پیڈ پر لکھی گئی تھی۔

اس کیس میں ڈاکٹر بورگ کا نام جاؤنگ سے تعلق کی صورت میں سامنے آیا تھا اس لیے اسے آسانی سے نظر انداز کرنا ممکن نہیں تھا۔ ڈاکٹر نے فوراً ہی ڈاکٹر بورگ کے دفتر فون کیا تو اسے بتایا گیا کہ اس وقت وہ اپنے گھر پر ہے۔ چار بچے ان کی گاڑی بورگ کے ڈرائیوے میں داخل ہوئی جس کی وجہ سے ایک پینتالیس سالہ شخص اور ایک نو عمر لڑکے کے درمیان ہونے والا باسکٹ بال کا کچھ رک گیا۔ دونوں سراخ رسالوں کو پہلے سے معلوم تھا کہ ڈاکٹر کی بیوی مرچکی ہے اور اس کا ایک ہی بیٹا ہے جو وہ وہاں اس کی نقل ہے۔

ڈاکٹر نے ان دونوں کے شناختی کارڈ دیکھنے کے بعد کہا۔ ”یقیناً میں ہولڈن جاؤنگ کو جانتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ میں ہی اس کی مدد کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہوں۔“

”اس بات سے تمہارا کیا مطلب ہے؟“ اور بن نے پوچھا۔

”وہ میری ویڈیو میں موسیقی کی ڈبنگ کرتا ہے۔“

”ہمیں یہ بتاتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے کہ آج صبح وہ اپنے اپارمنٹ میں مردہ پایا گیا ہے۔“

”اوہ بے چارہ، کتنا اچھا ٹیلنٹ ضائع ہو گیا۔ کیا ہوا تھا؟“

یہ جاننے کے بعد کہ جاؤنگ کو قتل کیا گیا ہے۔ اس نے کوئی خاص صدمہ ظاہر نہیں کیا۔ شاید دل کے امراض کا سرجن ہونے کی وجہ سے اس کے اعصاب فولاد کی طرح سخت ہو گئے تھے۔ البتہ اس کا بیٹا ڈیلن یہ سن کر رنجیدہ ہو گیا۔

”میں گزشتہ دو سال سے اسے موسیقی کی درس گاہ سے وقفہ دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔“ بورگ نے کہا۔ ”لیکن اسے کچھ یاد ہی نہیں رہتا تھا۔ وہ پیدا کنی موسیقار تھا۔ اسے پٹانو پر بٹھا دو مختلف اقسام کی ڈھولیں بکھیرتا جائے گا۔ دو گھنٹوں میں ایک فنکار تھا لیکن گزشتہ چار برس سے اسے میڈیکل بورڈ نے کسی بھی مستقل ملازمت کے لیے غیر موزوں قرار دے رکھا تھا کیونکہ اسے بھولنے کا مرض

کال نہیں کی۔“
 ”ایسا لگتا نہیں ہے۔ تم چاؤ تنگ کے اپارٹمنٹ کب
 مئی تھیں؟“
 ”بھی نہیں۔ میں تو اسے جانتی بھی نہیں تھی۔“
 ”پھر تمہاری تصویر اس کے بیڈروم میں ڈسکر پر
 کیوں رکھی ہوئی ہے؟“ اور بن نے پوچھا۔
 اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور روئی صورت
 بناتے ہوئے بولی۔ ”میں نے بھی اسے اپنی تصویر نہیں
 دی۔“

لاق ہو چکا تھا۔“
 ڈاکٹر بورگ نے بتایا کہ وہ گزشتہ دو تین مہینوں سے
 چاؤ تنگ سے نہیں ملتا تھا لیکن چار یا پانچ روز قبل اس سے
 فون پر بات ہوئی کی۔
 ”کیا یہ بات اسی کام کے سلسلے میں ہوئی جو وہ
 تمہارے لیے کر رہا تھا؟“
 ”ہاں، شاید تمہارے علم میں ہو کہ آج کل انجیو گرافی
 اور ڈوبلر جیسے ٹیسٹ بلکہ کچھ آپریشن بھی ویڈیو پر ریکارڈ کر
 لیے جاتے ہیں۔ میرے مریضوں کے پاس یہ اختیار ہے کہ
 وہ ان ٹیسٹوں اور آپریشن کی ڈی وی ڈی نقول خرید سکتے
 ہیں اور چاؤ تنگ اس میں ان کے ذوق کے مطابق موسیقی کی
 ڈبک کر دیا کرتا تھا۔“ اس نے افسوس کرنے کے انداز میں
 سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اس کی موت میرے لیے ایک
 ناقابل طاق نقصان ہے۔“

ڈاکٹر بورگ منتول کی ذاتی زندگی کے بارے میں
 کچھ نہیں جانتا تھا اس لیے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ
 چاؤ تنگ کو کس نے قتل کیا ہوگا۔ اس کا بیٹا برابر میں کھڑا اپنا
 ٹچلا ہوٹ چپارہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ اگر اس سے پوچھا
 جائے تو وہ اس سوال پر کچھ روشنی ڈال سکتا ہے۔

انہوں نے ڈاکٹر کا کھڑے ادا کیا اور وہاں سے روانہ
 ہو گئے۔ ملکیں کے ڈرائیو کے قریب پہنچ کر ڈاکٹر
 نے رفتار آہستہ کی۔ وہ جگہ مغرب میں چند گز کے فاصلے پر
 تھی۔

”ڈیکل کی کار چابی ہے۔“ اس نے تمہرے کیا۔“ اور
 دوسری سیڈ ان بھی جو اب یہاں کھڑی ہوئی تھی، میرا خیال
 ہے کہ وہ اس کی بیوی کی ہے۔ کیا تم اس کی بیوی ڈوری سے
 ملنا پسند کرو گے؟“

خادم نے دروازہ کھولا اور ڈاکٹر کو پہچان کر لہجہ بھر
 کے لیے ہچکچائی پھر اس نے انہیں اندر بلا کر ڈوری کو آواز دی
 اور خود جن میں چلی گئی۔ وہ ایک دہلی پتلی لڑکی تھی لیکن اس
 نے بننے سنور نے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اس نے
 افسردگی اور جھٹلاہٹ کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا اور انہیں
 اپنے کمرے میں لے گئی۔

”کیا تم دوبارہ چاؤ تنگ کے بارے میں بات
 کرنے آئے ہو؟“

”ہاں، میڈم۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”اور تمہاری فون
 کال۔“

”میں تمہیں پہلے بتا چکی ہوں کہ میں نے کوئی فون

قاری بن منوجہ سور

مرچا

نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں
 کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچہ نہیں ملتا۔
 ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش
 ہے کہ پرچہ نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون
 کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

بیک وقت انسان کا نام جہاں پر چاہیے لکھ دیا جائے۔
 بیک وقت انسان کا نام۔
 بیک وقت انسان کا نام۔

0301-2454188

حاسو سی داسک سلی کسٹر

پیشہ سنی پائینہ سٹ

مندرجہ ذیل ملکی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

”میں نے یہ نہیں کہا کہ تم نے اسے اپنی تصویر دی تھی بلکہ وہ کسی اخبار کا ترشح ہے۔“

”جس میں ہیٹ پہنا ہوا ہے۔“ وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولی۔ ”وہ میں نے جوڑا اسکول میں ڈالیں کرتے ہوئے پہنا تھا پھر میں ڈیٹ پر چلی گئی۔“

”کس کے ساتھ؟“

”برڈی مار کوول۔ کیا تمہارے لیے یہ جاننا ضروری ہے۔“

”وہ چاؤنگ نہیں تھا؟“

”بالکل نہیں۔ اس نے تو سولہ سال کی عمر میں ہی اسکول چھوڑ دیا تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم نہیں۔ شاید سات آٹھ سال پہلے۔“

”کیا تمہارے باپ کو معلوم تھا کہ تم اس میں دلچسپی لے رہی ہو؟“

”ایسی کوئی بات نہیں تھی۔“ وہ منہ ہلاتے ہوئے بولی۔ ”مجھے تمہارا یہ کہنا اچھا نہیں لگا۔ ہم موسیقی کے بارے میں باتیں کرتے تھے۔ اس میں بے پناہ صلاحیت تھی۔ وہ کبھی ٹراورٹال کو نہیں بھولتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ راگ میں آواز کا اضافہ بڑی مہارت سے کرتا تھا۔“

”میں فون کال کی بات کر رہا تھا۔“

”ہاں، میں نے ہی وہ فون کیا تھا۔“ اس نے ڈرامائی انداز میں اعتراف کیا۔

”چاؤنگ کوکل ایک جوڑے سے ان کی شادی کے استقبالیہ میں موسیقی کے پروگرام کی بات کرنے کیودنیں جانا تھا۔ اس کا ارادہ وہاں رات بھر رکنے کا تھا۔ لہذا اس نے مجھ سے کہا کہ میں آج صبح اس کے گھر جا کر زورینو کو خوراک دے دوں۔“

”کیا تمہارے پاس اس کے اپارٹمنٹ کی چابی تھی؟“

”ہاں اس نے مجھے سوموار کو ایک چابی دی تھی۔“ اس نے ایک گتے کے ڈبے میں ہاتھ ڈالا اور چابی نکال لی۔

”پھر آج صبح کیا ہوا؟“

”میں چاؤنگ کے اپارٹمنٹ گئی تو اسے مردہ حالت میں دیکھا۔“ وہ کانپتے ہوئے بولی۔ ”اس کی لاش کے گرد خون پھیلا ہوا تھا جبکہ آنکھیں اور منہ کھلا ہوا تھا۔ یہ بہت ہی وحشت انگیز منظر تھا۔“

”کیا دروازہ قفل تھا؟“

”میں یقین سے نہیں کہہ سکتی۔ میں نے چابی لگا کر

اس کے چنڈل کو کھنپا یا لیکن ملک کی آواز نہیں آئی۔“

”کیا تمہیں قنب زنی کی کوئی علامت نظر آئی؟“

”نہیں، جیسا کہ میں نے کہا کہ جب میں نے آواز دی۔۔۔۔۔“

”ٹھیک ہے۔ یہ بتاؤ کہ تم نے اپارٹمنٹ میں کسی چیز کو ہاتھ لگا یا تھا؟“

”نہیں، میں نے تو مٹھے کو کھانا بھی نہیں دیا۔ میں شاید وہاں بیس سینکڑہ کی ہوں گی۔“

”کیا تم نے وہاں آتے وقت دروازہ کھول لیا تھا؟“

”ہاں اور میں جیسے ہی گھر آئی تو میں نے پولیس کو فون کر کے اس کی اطلاع دے دی۔“

”تم نے کسی اور کے سامنے تو اس کا تذکرہ نہیں کیا؟“

اس نے تجزی سے سر ہلایا اور دوبارہ کانپنے لگی۔

”تم کسی ایسے شخص کو جانتی ہو جو چاؤنگ سے بہت قریب رہا ہو یا کوئی ایسا فرد جو پرسوں اس سے ملے آیا ہو؟“

اس نے جواب میں صرف کندھے اچکا دیے۔

”ہمارا خیال ہے کہ اسے جرم آرمی کے زیر استعمال چاقو کی ہو بھٹل سے قتل کیا گیا اور برن نے کہا۔“ کیا تم جانتی ہو کہ اس کے اپارٹمنٹ میں ایسی کوئی چیز موجود تھی؟“

اس سوال پر بھی ڈورسی نے کندھے اچکا دیے۔

”ٹھیک ہے۔ میں ایک اور سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ کیا تمہارے باپ کو علم تھا کہ چاؤنگ کے ساتھ تمہاری دوستی ہے؟“

”مجھے یقین ہے کہ اس نے مجھے چاؤنگ سے باتیں کرتے ہوئے دیکھا ہوگا جب وہ لان میں کام کر رہا تھا لیکن وہ کبھی سمجھا ہوگا کہ ہم لڑھکڑھکی باتیں کر رہے ہیں۔“

”پھر آخر حقیقت کیا کر رہی تھیں؟“

”میں بتا چکی ہوں۔ ہم موسیقی کے بارے میں گفتگو کرتے تھے۔“

”کیا ایسا کوئی امکان ہے کہ تمہارے باپ نے یہ گفتگو اپنے طاقتور مانگیر فون کے ذریعے سن لی ہو؟“

”یہ سن کر اسے ایک جھٹکا لگا۔“ کیا اس کے لیے یہ جاننا ضروری ہے؟“

”اس صورت میں یہ بات تمہارے لیے اہمیت رکھتی ہے۔“ ڈونگر بولا۔ ”ہم نے اس کے اپارٹمنٹ میں کسی دوسری لڑکی کی تصویر نہیں دیکھی۔“

ڈاکٹر نامہ

ایک مونے صاحب ڈاکٹر کے مع کرنے کے باوجود ہر چیز کھا جاتے اور ہر روز آکر مونے کا روتا رہتے اور ڈاکٹر کے علاج کو ناقص بتاتے۔

نگ آکر ڈاکٹر نے چٹ پر لکھا۔
”آپ چند روز کے لیے احتیاجی چلے جائیں۔“

جبل حسین حیدری، پنڈدادون خان

ہوئے کہا۔ ”یہ قانون کے محافظ نہیں بلکہ قانون شکن ہیں۔ یہ اپنے موکل کو قائمہ پنشن کی خاطر جھوٹ کو بیچ اور بیچ کو جھوٹ ثابت کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔“

”ان کا بھی کام ہے۔“ اور بن نے اعتراض کیا۔

”ایسا نہیں ہے۔ اس کے برعکس ایک ڈاکٹر ساری زندگی اپنی سناٹھ، دردمندی اور ایمانداری سے غلصہ رہتا ہے۔ تمام ڈاکٹر ایک ہی طرح سے سوچتے ہیں۔ ان کی لڑائی صرف پیاریوں اور موت سے ہوتی ہے۔ ڈاکٹر، ماں کی طرح ہوتے ہیں جبکہ استاد اور پولیس والے معاشرے کے محافظ ہیں لیکن وکیلوں نے جلی کے غنڈوں کی طرح معاشرے میں بد امنی اور انارکی پھیلانے کے لیے خود کو وقف کر رکھا ہے۔“

پوسٹ مارٹم کے آخری مرحلے میں متحول کی کھوپڑی کا معائنہ کیا گیا۔ انہی کو ہمیشہ سے ہی نفسیات سے دلچسپی تھی اگر اس کی معاشی حالت اجازت دیتی تو وہ اسی شے میں اپنا کیریئر بناتا۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا یہ درست ہے کہ جس شخص کو بھولنے کا عارضہ لاحق ہو۔ اس کے دماغ کا حجم پیشانی والے حصے میں کم ہو جاتا ہے؟“

”ہاں لیکن یہ متعلق نہیں ہوتا اور اس کے اثرات کے بارے میں کچھ بتانا بہت مشکل ہے۔“

اگلے روز اور بن اور ڈوڈو انگریسیڈ ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر پہنچے تو انہیں کافی تاخیر سے بیچ کی رپورٹیں ملیں۔ ان کی پہلی قسط میں ملکیں اور بورگ کے جھگڑے کے بارے میں کچھ نئی معلومات فراہم کی گئی تھیں۔ لیکن ہولڈن چاؤنگ سے ان کے تعلق کے بارے میں کوئی خاص بات نہیں بتائی گئی۔

اس کے بعد فرسٹ ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر سے کپٹن سیونج نے فون کر کے انہیں بتایا کہ اس نے ابھی ابھی انجیلا نامی عورت کو ان کے پاس بھیجا ہے جو اپنے آپ کو چاؤنگ

ان کے جانے کے بعد وہ سکیاں لے کر رونے لگی۔

دوسرے روز صبح سات بجے فارنک میٹھالوجسٹ ڈاکٹر ویلٹائن پوسٹ مارٹم کے کمرے میں لاش پر جھکا ہوا تھا۔ اس کی عمر ستر سال سے زیادہ تھی لیکن دیکھنے میں وہ دس پندرہ سال چھوٹا لگتا تھا۔ اور بن، ڈوڈو اور اسکی بیٹی بھی وہاں موجود تھے۔ اس کے خون کے نمونوں میں کسی دوا یا شراب کی آمیزش نہیں پائی گئی۔

”اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ گزشتہ تین چار سال سے ڈاکٹر کی تجویز کردہ دوا نہیں لے رہا تھا۔“ ویلٹائن نے کہا۔

لاش کا تفصیلی معائنہ کرنے پر اس کی گردن پر ایک پیدائشی نشان، ایک پرانا اور اس کی کھال پر تین نئے زخم نظر آئے جن میں دواں کی بائیں گلانی اور کہنی کے درمیان جبکہ تیسرا ہلمک زخم سینے کی ہڈی کے بالکل نیچے لگا تھا۔ یہ زخم اس کے دل کے دائیں اور بائیں جانب اندر تک چلا گیا تھا۔ ویلٹائن کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ اس طرح کا زخم فوری طور پر جان لیوا ہوتا ہے۔

”کیا اس سے پتہ چھا جائے کہ قاتل کو جسم کی اندرونی ساخت کا علم تھا؟“ ڈوڈو نے پوچھا۔

”ضروری نہیں۔ یہ محض ایک اتفاق ہو سکتا ہے۔ دل کے ایک خانے میں سوراخ ہوتا بھی جان لیوا ہوتا ہے۔ تم نے یہ کیوں پوچھا؟ کیا تمہاری نظر میں کوئی اناٹومسٹ ہے؟“

”ابھی تک ہمیں کسی پر شبہ نہیں ہے۔“ اور بن نے کہا۔ ”البتہ ہماری نظر دو آدمیوں پر ہے۔ ان میں ایک ہارٹ سرجن اور دوسرا وکیل ہے۔“ اس نے ملکیں اور ڈاکٹر بورگ کے جھگڑے کے بارے میں بتا دیا۔

”میں ڈاکٹر بورگ سے مل چکا ہوں۔“ ویلٹائن نے کہا۔ ”اور میں نے اخبارات میں ان کے جھگڑے کے بارے میں پڑھا تھا۔ اگر ان میں سے کسی نے قتل کیا ہے تو میں شرطیہ کہتا ہوں کہ وہ وکیل ہی ہوگا۔“

”یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟“

”بہت آسان سی بات ہے۔ وکیلوں کی کوئی اخلاقیات نہیں ہوتی۔ یہ سب جہنم میں جھوٹے جانے کے مستحق ہیں۔“

”کیا واقعی تم عقیدہ ہو؟“

”بالکل۔“ ڈاکٹر نے پوسٹ مارٹم جاری رکھتے

ریاست کی ایسی ذمہ داری بن گیا جسے بھولنے کا مرض ہو گیا تھا۔

”ہاں، وہ اسی بنیاد پر وہ وقار اور ریاست دونوں سے امداد لے رہا تھا۔“

اسے پورا یقین تھا کہ اس کے بھائی نے کئی ماہر نفسیات کو جھانسا دے کر یقین دلایا کہ وہ بے ترتیب خیالات، جذباتی بھجان اور وقتی بہرے بن جیسے عوارض میں مبتلا ہے اور اس بنیاد پر اسے چھوٹی لیکن مستقل آمدنی ہوتی رہی اور اس کے ساتھ ساتھ وہ موقع مل دیکھ کر اپنی موسیقی کی صلاحیت سے بھی فائدہ اٹھا رہا تھا۔

جب وہ اپنے دفتر میں واپس آئے تو انہیں کیسزٹل کی بھیجی ہوئی رپورٹ لی جو جانے وقوعہ کے بارے میں تھی۔ تمام خون کے نمونوں کا گروپ اپنا بیٹو تھا۔ چاقو پر لگے خون کے دھبے بھی محتول کے گروپ سے ملے تھے۔ چاقو پر انگلیوں کے نشانات نہیں ملے لیکن ایسی علامتیں ضرور نظر آئیں جن سے معلوم ہوتا تھا کہ قاتل نے دستاؤں کا استعمال کیا تھا۔ یہ نشانات اپارٹمنٹ میں دوسری جگہوں پر بھی تھے۔

ڈولنگر کو یاد آیا کہ وکیل کی بیٹی نے انہیں بتایا تھا کہ چاؤنگ کیلویڈی، تال اور راگ میں آواز کا اضافہ کرنے میں عبور حاصل تھا۔ اس نے فیس بک پر ڈوری ملٹین کو چیک کیا تو معلوم ہوا کہ اس نے حال ہی میں ماؤنٹ کریسٹ ہائی اسکول سے گریجویشن کرنے کے علاوہ سان فرانسسکو کی آسٹریک ایڈمی آف میوزک سے وٹیفیکیشن بھی کیا ہے۔ اس نے فیس بک میں کئی تصویریں بھی دیکھیں جن میں ڈوری ایک لڑکے بریڈی مارکول کے ساتھ نظر آ رہی تھی۔ البتہ ہولڈن چاؤنگ کا نام یا اس کی تصویر اس سائٹ پر موجود نہیں تھی۔

ڈولنگر نے فیس بک سے بریڈی کے بارے میں معلوم کیا۔ اس نے بھی ماؤنٹ کریسٹ سے ہی گریجویشن کیا تھا کہ اس کا کوئی اچھا گریڈ نہیں تھا لیکن وہ رکی ٹیم کا کپتان رہ چکا تھا اس کی سائٹ لڑکیوں کی تصویروں سے بھری ہوئی تھیں بہر حال ان میں ڈوری کی تصویریں زیادہ تھیں۔ اس سے لازمی طور پر ڈولنگر کے ذہن میں ایک رومانی شلت کا تصور ابھرا۔

اچانک ایک خیال کے تحت اس نے ڈاکٹر کے بیٹے کو بھی چیک کیا۔ لیکن نہ بھی ماؤنٹ کریسٹ سے گریجویشن کیا تھا۔ کوکہ اس کے منہ پر ڈوری کی کوئی تصویر نہیں تھی

کی بہن بتا رہی ہے۔ اس نے قتل کی خبر اخبار میں پڑھی۔ وہ لاش کو شناخت کر چکی ہے اور انہی سے بھی اس کی بات ہو گئی ہے۔

جب وہ دوپہر کے قریب وہاں آئی تو انہوں نے اسے ایک خالی کانفرنس روم میں بٹھا اور رسمی طور پر اس کی شناخت کی تصدیق کرنے کے بعد اپنی کارروائی شروع کی۔ کیونکہ اس کے ہاتھ میں انگوٹھی نہیں تھی اور ڈرائیونگ لائسنس میں اس کے نام کے ساتھ چاؤنگ لکھا ہوا تھا جس سے انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وہ غیر شادی شدہ ہے وہ اپنے بھائی سے چھ سال بڑی تھی اور اسے چاؤنگ سے ملے ہوئے ایک سال سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا تھا۔ ان کے والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان دونوں بہن بھائیوں میں کوئی قدر مشترک نہیں تھی اور اسے بھائی کا طرز زندگی بھی پسند نہیں تھا۔

”تھیں اس میں کیا خرابی نظر آتی تھی؟“ ڈولنگر نے پوچھا۔

”میں اس بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔“ ڈولنگر نے اس کی بات سمجھنے کی کوشش کی پھر بولا۔ ”مزید! تمہارے بھائی کا کٹل ہوا ہے۔ اگر تمہارے پاس کوئی ایسی اطلاع ہے جس سے ہمیں اس کے قاتل کو پکڑنے میں مدد مل سکے تو یہ اس پر تمہارا احسان ہوگا۔“

اس نے پلٹیں جھپکائیں اور مدافعتیہ انداز میں دونوں ہاتھ سینے پر باندھتے ہوئے بولی۔ ”مجھے بیکھرمت دو۔ میں صرف اس لیے یہاں آئی ہوں کہ اس کی لاش وصول کر کے تجھیز و تکھیز کا انتظام کر سکوں۔ میں پہلے ہی فرسٹ ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر میں بیٹھا چکی ہوں کہ اس کے دوستوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس نے کوئی وصیت لکھی تھی اور اس کا کوئی وکیل بھی ہے یا نہیں لیکن مجھے اس بارے میں شبہ ہے۔“

”کیا تمہیں کسی ایسی غیر قانونی سرگرمیوں کا علم ہے جس میں وہ ملوث رہا ہو؟“

”کیا تمہارا مطلب اس گھٹاؤنے فریب سے ہے جو وہ اپنے آپ کو دے رہا تھا؟“

”کوئی بات محسوس کرتی ہو کہ اُسے بھولنے کا مرض نہیں تھا؟“

”ہاں، اس نے آٹھ سال کی عمر میں ہر وہ دھن بجانا شروع کر دی جو وہ ایک دفعہ سن لیتا۔ وہ اسکول کے زمانے میں ہر سال اسے گریڈ حاصل کرتا لیکن اچانک ہی وہ

ناقابل شکست

کرنا پڑی۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں جلانے کے لیے پکرا چھینکا جاتا تھا۔ کیسپل مختصر نوٹس پر اسپتال پہنچ گیا۔ اس نے غلابا زوں جیسا حفاظتی لباس پہن رکھا تھا۔

اگلے روز سہ پہر میں اوہرن اور ڈوئلر، ڈاکٹر بورگ کے کلینک پہنچے اور استقبالیہ پر اپنا تعارف کروانے کے بعد انتظارگاہ میں بیٹھ کر ڈاکٹر کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگے جب آخری مریض بھی چلا گیا تو ڈاکٹر نے اندر بلایا اور بولا۔ ”چاؤنگ کے کیس میں کوئی پیش رفت ہوئی؟“

”ہم نے کل چالٹون اسپتال میں معمول کی تحقیقات کیں۔“ اوہرن نے کہا۔ ”اس دوران ہمیں سرجن لاؤنچ کے عقب میں واقع کچرے کے ڈرم سے ایک گولف شرٹ، چٹون، انڈرویز اور جرابیں ملیں۔ ان پر خون کے دھبے تھے اور چٹون پر لائٹری کے نشان سے شناخت ہوئی کہ یہ پٹریے تمہارے ہیں۔“

ڈاکٹر سکراتے ہوئے بولا۔ ”مجھے اندازہ تھا کہ وہ کبھی صاف نہ ہو سکیں گے کیونکہ ان پر بہت بُری طرح خون کے دھبے پڑ گئے تھے۔ اس لیے میں نے انہیں کچرے میں پھینک دیا۔“

”کیا تم بتانا پسند کرو گے کہ یہ دھبے کیسے لگے؟“

میں بھر کی شام اسپتال کے میڈیکل ریکارڈ ڈپارٹمنٹ میں رپورٹ لکھوا رہا تھا کہ مجھے ایمرجیسی ڈپارٹمنٹ سے مدد کے لیے بلاوا گیا۔ میں اسی لباس میں فوراً وہاں چلا گیا اور ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر کی مدد کرنے کی کوشش کی جو ایک ایسے مریض کی جان بچانے کی کوشش کر رہا تھا جسے صرف گولی ہی نہیں لگی بلکہ اس پر چاقو سے بھی حملہ کیا گیا تھا لیکن وہ بد قسمت جانبر نہ ہو سکا۔“

”اس مریض کا نام کیا تھا؟“

”مجھے یقین نہیں کہ میں نے کبھی اس کا نام سنا۔“

”شاید وہ ہولڈن چاؤنگ تو نہیں ہو گا لیکن ڈی این

اے رزلٹ کے مطابق تمہارے کپڑوں پر اس کے خون کے دھبے پائے گئے ہیں۔“

ڈاکٹر نے اس کے حقوق پڑھنا شروع کر دیے۔

ڈاکٹر نے فوراً ہی ہتھار ڈال دیے اور بولا۔ ”ٹھیک ہے۔“

مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن میں خاموش رہیں نہ سکتا۔

ممکن ہے کہ مجھ سے کچھ غلطیاں ہوئی ہوں لیکن میں قتل کا مجرم نہیں ہوں۔“

”گرم کچھ کہنا چاہو تو ہم سن رہے ہیں۔“ اوہرن نے

لیکن ڈوئلر کے ذہن میں ایک ناکام محبت کا تصور ابھرنے لگا۔ ابھی وہ اس کہانی کا تانا بانا بن رہا تھا کہ اوہرن نے اس کے خیالات کا تسلسل توڑ دیا۔

”فرش۔“ اس نے کہا۔ ”ہم فرض کر رہے ہیں کہ چاؤنگ نے قاتل کو اپنے پارٹمنٹ میں آنے دیا۔“

”ہاں۔“

”اور وہ اپنے ساتھ چاقو لے کر نہیں آیا تھا بلکہ وہ اسے وہیں مل گیا؟“

”ہاں۔“

”پھر اس نے ہاتھوں پر دستانے کیوں چڑھائے ہوئے تھے؟“

اس بار ڈوئلر خاموش رہا۔

”ممکن ہے کہ اس نے نقب زنی کی ہو۔“ اوہرن نے بات آگے بڑھائی۔ ”یہ سوچتے ہوئے کہ چاؤنگ گھر پر نہیں ہے۔“

”لیکن اس کے کوئی آثار نظر نہیں آئے؟“

”شاید اس کے پاس دروازے کی چابی ہو۔ وہی چابی جو ڈوری کے پاس تھی۔“

”ٹھیک ہے لیکن اس نے نقب زنی کیوں کی؟“

”کوئی چیز چرانے کے لیے؟“

”مثلاً؟“

”کوئی بھی چیز۔“ چاؤنگ نے اسے اندر آتے دیکھا۔ اپنی حفاظت کے لیے چاقو اٹھایا اور حملہ آور کا مقابلہ کیا لیکن مخالف اس پر حاوی ہو گیا اور چاقو اس کے سینے میں اتر گیا۔ تم نے اندازہ نہیں لگایا کہ اس کے کپڑوں پر بھی خون کے چھینٹے لگے ہوں گے۔ اس نے وہاں سے روانہ ہوتے وقت انہیں کس طرح چھپایا؟“

”رات میں وہاں کون دیکھنے والا تھا؟“

”شاید، مگر پتہ کس نے کپڑوں کا کیا کیا۔ وہ انہیں لائٹری تو بیچ نہیں سکتا۔“

”انہیں جلادیا ہو گا یا کہیں دفن کر دیے ہوں گے۔“

”اس میں بھی خطرہ ہے۔ اگر وہ مشکوک ہوا تو اس کا سراغ بھی مل جائے گا۔“

”پھر اس سوال کا کیا جواب ہو سکتا ہے؟“

سرج و وارنٹ کے لیے درخواست دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ خوش قسمتی سے وہ جس جگہ کی حلاشی لینا چاہ رہے تھے وہ کسی کی ذاتی ملکیت نہیں تھی لیکن وہاں تک رسائی حاصل کرنے کے لیے انہیں تین اداروں سے بات

ہم دونوں سقیم گھٹا ہو گئے اور چاقو میرے ہاتھ میں آگیا۔
میرا اُسے مارنے کا ارادہ نہیں تھا لیکن غیر ارادی طور پر ایسا
ہو گیا۔“

”تم نے اس چاقو کا کیا کیا؟“

”میں نے اسے ابارغٹ کے پیچھے ایک کچرے
کے ڈرم میں ڈال دیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اب تک کسی نے
اسے اٹھایا ہوگا۔ تمہیں پہلے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ میں نے
خون آلود کپڑے کہاں ٹھکانے لگائے تھے لیکن تم مجھ سے
اس ویڈیو کے بارے میں مت پوچھنا کیونکہ میں ایسی کسی
ویڈیو کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“

”لیکن تم نے اعتراف کیا ہے کہ رات کی تاریکی میں
تم کسی کے مکان میں داخل ہوئے؟“

”ہاں اپنی ذاتی چیز حاصل کرنے کے لیے۔“

”اور پھر تم نے چاقو مار کر اسے ہلاک کر دیا؟“

”جیسا کہ میں تمہیں پہلے بتا چکا ہوں کہ یہ مکمل طور پر
ذاتی حفاظت کا عمل تھا اور میرا اسے کاری زخم لگانے کا کوئی
ارادہ نہیں تھا۔“

اور بن کے گرفتاری کا وارنٹ دکھایا جبکہ ڈونلڈ اُسے
بھٹکری لگانے لگا۔

”اس کیس میں ہمارا کام تقریباً ختم ہو گیا۔ اس کے
بعد سرکاری وکیل کا کام شروع ہو گا اور یہ یقینی ہے کہ وہ تم
پر سیکنڈ ڈگری مرڈر کا الزام عائد کرے گا کیونکہ تم اپنے
دفاع میں جو کہانی سنارہے ہو وہ بہت کمزور ہے۔ اس لیے
ہمارا مشورہ ہے کہ کسی ہوشیار وکیل کی خدمات حاصل
کرو۔“

”تم نے صحیح مشورہ دیا۔ میں بالکل ایسا ہی کروں
گا۔“

جب چند روز بعد سرکاری وکیل نے ڈاکٹر کا مقدمہ
گراؤں جیوری کے سامنے پیش کیا تو ڈاکٹر یورگ کمرائے
عدالت میں اپنی پسند کے وکیل کے ساتھ موجود تھا۔ وہ
کوئی اور نہیں بلکہ اس کا ناقابل شکست حریف مینارڈ ملکیٹن
تھا جو جیوریوں کے لیے دشمن کو بھی گلے لگا سکتا ہے۔ ڈاکٹر
ویلخاٹن نے شیک ہی کہا تھا کہ ایسے وکیلوں کا کوئی کردار
نہیں ہوتا۔ اور بن کے خیال میں اس سے زیادہ اچھا
انتخاب کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے یقین ہو گیا کہ ملکیٹن اپنے
دشمن کو بچانے میں کامیاب ہو جائے گا کیونکہ اس نے ہارنا
نہیں سیکھا۔

کہا۔

”وہ لومزی کی طرح لالچی ہو گیا تھا اور میری مدد
کرنے کے باوجود وہ مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش کر رہا
تھا۔“

”وہ کس طرح؟“

”اسے اتفاقاً طور پر ایک ویڈیو مل گئی تھی جس میں
ایک تکنیکی غلطی کی تصحیل موجود تھی جو مئی ماہ میں مجھ سے دل
کے آپریشن کے دوران سرزد ہوئی تھی۔ اس کا اور پتہ
سائڈ ٹریک ایک ڈراؤنی فلم جیسا تھا جس میں مائٹرز کی
پیش اور شور کے علاوہ نرموس کے چلانے کی آوازیں آ رہی
تھیں اور وہ مریشہ جو ایک معروف شخصیت تھی وہ آپریشن
ٹیمبل پر ہی مر گئی۔“

”کیا وہ بیلا اسکول کن تو نہیں تھی؟“ ڈونلڈ نے
پوچھا۔

یورگ نے اپنے ہاتھ پھیلا دیے اور انہیں میز پر
مارتے ہوئے بولا۔ ”تم اس بارے میں پہلے سے جانتے
ہو۔۔۔۔۔۔“

”محض ایک اندازہ تھا۔ کیا وہ اس ویڈیو کے عوض
پیسے مانگ رہا تھا؟“

”ایک لاکھ ڈالر۔ ہو سکتا ہے کہ یہ اس خلیہ معاوضے کا
ایک حصہ ہو جو مقدمہ ہارنے کی صورت میں مجھے بیلا کی ٹیلی
کوڈ مینا پڑے گا لیکن مجھے اس کا مطالعہ کن کر بہت غصہ آیا اور
میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس سے اپنا میموری کارڈ واپس لے
لوں گا۔ بہر حال وہ میری ملکیت ہے۔“

”اس نے ایک ہفتہ قبل اسی دفتر میں یہ مطالبہ کیا تھا
اور بتایا کہ وہ میرے روز شہر سے باہر جا رہا ہے چنانچہ میں سیر
کی رات وہ کارڈ چرانے اس کے گھر چلا گیا۔“

”تم اندر کیسے داخل ہوئے؟“

”میں اپنے ساتھ نائٹ راڈ لے کر گیا تھا لیکن اس کی
ضرورت پیش نہیں آئی۔ برابر والی کمر کی تقریباً تین انچ مکمل
ہوئی تھی۔ میں نے جالی ہٹائی۔ کھڑکی کو دھکا دیا اور اندر کود
گیا۔“

”تم نے ربر کے دستانے پہن رکھے تھے؟“

”ہاں، کسی ممکنہ حادثے سے بچنے کے لیے مجھے ایسا کرنا
پڑا۔ مجھے ویڈیو کارڈ کا بکس فوراً مل گیا لیکن اس وقت
ہولڈن جاگ چکا تھا اور گھر پر ہی موجود تھا۔ وہ اندر میرے
میں ایک بڑے چاقو کے ساتھ حملہ آور ہوا۔ میں نے فلیش
لائٹ کے ذریعے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں رکا۔“

اس مرگ جانان کا فسانہ جس کی ذات میں سہانا انداز پنہاں تھا

عورت اور محبت گویا ایک آگ کے مانند ہیں... جس میں جلنے اور سلگنے کو مرد پر دم تیار رہتے ہیں... ایک ایسے ہی نوجوان کی دلچسپیاں جو زندگی کے ہر لمحے کو بھرپور انداز میں گزارنا پسند کرتا تھا... عورت اور محبت کی خاطر اس کی مہم جوئی ایک جگہ سے دوسری جگہ مسلسل جاری و ساری تھی... وہ شکر خورہ تھا اور اسے شکر وافر مقدار میں مل رہی تھی...

مرگِ جانان

احمد جعفری



گورا رنگ، بڑی بڑی چمکتی ہوئی سیاہ آنکھیں، تراشیدہ گداز ہونٹ، شرمیلی مسکراہٹ، جب ہاتھوں کی انگلیوں میں چمکی دیا کر اور ہاتھوں کو سر سے بلند کر کے رکھ کر تھی ہیں تو ایک ساں بندھ جاتا ہے۔ یہ آئین کا روا تری رسم ہے۔

یہاں کے بوڑھے کہتے تھے کہ جب... مسلمان آئین میں فاجر کی حیثیت سے آئے تو انہوں نے یہاں شادیایں کیں اور کنیزیں رکھیں... مسلمانوں نے یہاں چھ سو سال سے زیادہ حکومت کی چنانچہ عربوں کی مخصوص عادتیں اور خوب

ستا نیکیں سالہ کوستا آئینی مردانہ وجاہت اور خوب صورتی کا شاہکار تھا۔ چھٹ سے لکھا ہوا قد، صحت مند جسم، کھنکے ہال، تقریباً ٹھوڑی تک آئی ہوئی بالوں کی قلمیں، بھری بھری بھوری مونچھیں، سرخی مائل گورا چہرہ، بات بات پر قہقہہ لگا کر ہنسنے کی عادت۔ آئین کے مرد عموماً ایسی ہی وجاہت کے حامل ہوتے ہیں۔

آئین کی عورتیں بھی صحت مندی اور خوب صورتی میں اپنا جواب آپ ہوتی ہیں، کھنکے لے کالے ہال، ہلکنا ہوا سرخی مائل

جاسٹیفائیڈ ڈائجسٹ، 2018ء دسمبر 2018ء

صورتی کی حامل ایک مخلوق نسل وجود میں آئی۔ وہ پہلے کے کھانے کے بعد قلیلہ عورتوں کی سیاہ آنکھیں، شرابی مسکراہٹ عریوں ہی کی دین تھی۔ غریب اور دوسرے شہروں میں ان کی تعمیر کردہ عمارتیں ان ہی کا ورثہ تھیں۔

کوستا بارسلونا میں ایک بڑی انشورنس کمپنی میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ اچھی تنخواہ کے علاوہ اسے ہر قسم کی انشورنس پالیسی پر طے شدہ کمیشن ملتا تھا۔ وہ بارہ سال پہلے اپنے والدین کے ساتھ یہاں منتقل ہوا تھا۔ پہلے یہ خاندان میڈرڈ کے قریب ایک قصبے میں رہتا تھا۔ بارسلونا میں ہی اس نے نگرہجویشن کیا اور انشورنس کمپنی میں ملازم ہو گیا۔ ایک روڈ حادثے میں والدین کے مرنے کے بعد وہ اکیلا رہ گیا تھا۔

ایک دن کوستا اپنے مرحوم والد کے سامان کی تلاش لے رہا تھا کہ دو اہم دستاویزات اس کے ہاتھ لگیں۔ ایک دو ہزار مربع فٹ پر مشتمل پلاٹ کی میٹریج۔ جو برسوں پہلے اس کے باپ نے آبائی قصبے میں ایک اچھی رہائشی اسکیم میں خرید لیا تھا۔ دوسری اس کے باپ کی ذاتی ڈائری تھی جس میں اس کے باپ نے چیدہ چیدہ واقعات تحریر کیے تھے۔

اس کا باپ نوجوانی میں انتہائی صحت مند اور مردانہ وجاہت کا نمونہ تھا۔ سیاح عورتیں اس کے باپ کی گردیدہ ہو جاتی تھیں۔ ایک اجنبی عمارت کی عورت کو وہ کچھ زیادہ ہی پسند آ گیا۔ اس عورت نے اس کے باپ کو پانچ ہزار ڈالر ماہانہ کے محض ڈرائیور کی نوکری کی آفر کی۔ منتقل رہائش امریکی شہر شکاگو میں ہونا تھی۔ اچھی رہائش، کھانا پینا سب عورت کے ذمے۔ عورت ایک امیر کبیر بیوہ تھی۔ کوستا کے باپ نے صرف ایک شرط رکھی کہ میری چھوٹی بہن بھی میرے ساتھ جائے گی۔ ایجنٹ کے ذریعے یہ طے پایا کہ وہ دونوں بھائی بہن پہلے جزائر سے ہوتے ہوئے میکسیکو کے نواحی علاقے میں آتے۔ یہاں سے کئی فورنیا کی سرحد قریب تھی وہاں دوسرا ایجنٹ سرحد کراس کر کے کئی فورنیا بھجوانے کا ذمہ دار تھا۔

انسانی اسکول نے، امریکی سرحد عبور کرنے کا ایک محفوظ راستہ دریافت کر لیا تھا۔ ایک متروک گٹر لائن میکسیکو کے نواح سے شروع ہو کر کئی فورنیا کے نواح میں جا کر ختم ہوتی تھی۔

پوری گٹر لائن انڈر گراؤڈ تھی جس میں سیڑیوں کی تعداد میں موٹے موٹے چوبیس تھے جو سرنگ سے گزرنے والوں کو کاٹ کاٹ کر زخمی کر دیتے تھے۔ کوستا کے باپ اور اس کی چھوٹی بہن کو اس سرنگ کے ذریعے سرحد پار کرنی تھی۔ پہلے ان کے جسموں پر انتہائی بدبودار تیل مل دیا گیا۔ اس کی بو سے چوبیس قریب تھیں آتے۔ چوبیس کی پسندیدہ خوراک کے دو

پیکٹ اور ایک تاریخ ان کے حوالے کر دی گئی۔ اس کے بعد دونوں کو سرنگ میں اتار دیا گیا۔

سرنگ کی اونچائی تقریباً پانچ فٹ تھی۔ دونوں نے گردن جھکا کر سرنگ میں دوڑنا شروع کر دیا۔ تقریباً بڑھ گھٹنے کی دوڑ کے بعد انہیں چوبیس کی ہزاروں چمکتی ہوئی آنکھیں نظر آنے لگیں۔ انہوں نے چوبیس کی خوراک کے دانے ان کی طرف اچھالنے شروع کر دیے۔ چوبیس اپنی پسندیدہ خوراک کی طرف جھپٹ پڑے۔ دونوں بھائی بہن جلدی جلدی چوبیس کو کراس کرنے لگے۔ پھر بھی چوبیس نے ان کے پیٹ اور پیروں پر کاٹ کاٹ کر زخمی کر دیا۔

ایک گھنٹا مزید دوڑنے کے بعد انہیں تازہ ہوا کے جمونے محسوس ہونے لگے۔ اس کا مطلب تھا کہ سرنگ ختم ہونے والی ہے پھر انہیں روشنی نظر آنے لگی۔ جب وہ سرنگ سے باہر آئے تو پیسے سے شرابور تھے۔ دونوں بڑھ حال ہو کر گر پڑے۔

بالآخر وہ خواہوں کی سر زمین امریکا پہنچ چکے تھے۔

☆☆☆

وہ ارب پتی امریکن بیوہ عورت کئی فورنیا کے انرپورٹ کے فرسٹ کلاس لاؤج میں بیٹھی سگریٹ پر سگریٹ چھونک رہی تھی۔ شکاگو کی فلاحی کال انوائس ہو چکی تھی۔ فلاحی کی روانگی کا وقت ہو چکا تھا۔ امریکن عورت کو ان دونوں بھائی بہن کا انتظار تھا جن کو اس فلاحی پر کالونی کلاس میں اس کے ساتھ شکاگو جانا تھا۔

گراؤنڈ ہوش پریشان تھی اور بار بار اس عورت سے درخواست کر رہی تھی۔ ”میڈم فلاحی لیٹ ہو رہی ہے آپ جہاز میں بیٹھ جائیں۔“

عورت نے نئی سگریٹ جلائی۔ ”بس دو منٹ اور۔“ اسی وقت اس کے سیل فون پر ایجنٹ کی کال آئی۔ ”میڈم مجھے افسوس ہے۔ آپ کو اکیلے ہی شکاگو جانا پڑے گا۔ اس کی بہن اسپتال میں ایڈمٹ ہے۔ اسے چوبیس کے کانٹے کی بنا پر پلنگ ہو گیا ہے۔ اس کا بھائی اس کے ساتھ ہے۔ بہن کے پیٹ اور گردن پر درجنوں کھسکیاں لگی ہیں۔ اس کا پچھلا شکل ہے۔ میڈم آپ کل جا لیجئے۔ میں دو روز کے بعد آپ کو پھر رنگ کروں گا۔“

”بٹ۔“ عورت نے سگریٹ اور بھائی اور جہاز کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ فرسٹ کلاس کا دروازہ بند ہوا اور جہاز شکاگو کے لیے پرواز کر گیا۔

☆☆☆

کوستا کا باپ اسی دن کی فلاح پکڑ کر میڈرڈ بھیج گیا۔
قبضے میں پہنچ کر اس نے دو کام کیے۔ ایک تو ابھی رہائی اسکیم
میں دو ہزار گز کا پلاٹ خرید لیا۔ اسکیم کو یوں پلے ہونے میں ابھی
برسوں کی مدت درکار تھی۔ دوسرا کام اس نے یہ کیا کہ قبضے کے
مگر جا کو پانچ ہزار ڈالر علیہ کیے اور قادر سے درخواست کی کہ
میری مرحومہ بہن کے لیے دعائے سروس کرا دیں۔

قادر کے کہنے پر ہی اس نے قبضے کی ایک لاوارث لڑکی
سے شادی کر لی۔ جب کوستا بارہ سال کا ہوا تو پورا خاندان
بارسلونا شفٹ ہو گیا تھا۔ ڈائری پڑھ کر کوستا نے حسبِ عادت
قہقہہ لگایا۔ ”لے بھئی کوستا تیری ٹولائری کل آئی۔“

☆☆☆

کوستا جب بس کے ذریعے اپنے آبائی قبضے کے اسٹاپ
پر اترا تو قبضے کی ترقی یافتہ شکل دیکھ کر بہت حیران ہوا۔ بارہ
سال میں بہت کچھ تبدیل ہو گیا تھا۔ قبضے میں اب بینک،
اسپتال، اسکول، کالج، بڑے بڑے تفریحی پارک وغیرہ سب
کچھ تھا۔ اٹھارویں صدی کا بنا ہوا چرچ اور خوب صورت ہو گیا
تھا۔

کوستا یہیں پیدا ہوا تھا۔ ابتدائی تعلیم بھی اس نے قبضے
میں ہی حاصل کی تھی پھر والدین کے ساتھ بارسلونا چلا گیا تھا۔
بارہ سال، بعد وہ قبضے میں اپنا پلاٹ فروخت کرنے دو بار وہاں
آیا تھا۔ اسے اپنے بچپن کے دوست بچوں کے گھر کی تلاش تھی۔
وہ اپنا چھوٹا ماسوٹ کیس گھنٹا ہوا میں بچوں کے گھر کے
سامنے پہنچ گیا۔ مکان کی چھت پر ایک دلکش اور جوان عورت
رتی پر کپڑے ڈال رہی تھی۔ وہ بھی بڑے دلچسپ انداز میں
گھر کے سامنے کھڑے کوستا کو دیکھ رہی تھی۔

جونیو عورت کی نظروں، کوستا کی نظروں سے ملیں کوستا
نے سر سے بہت اٹھا کر عورت کو عظیم دی اور ساتھ ہی اسے آنکھ
مار دی۔ عورت کے چہرے پر مسخوئی چٹکی ظاہر ہوئی، اس نے
کہا۔ ”بیٹول۔“ کوستا نے پوچھا۔

”کیا میرے بچپن کے دوست بچوں کا گھر یہی ہے۔
عورت نے گھنے بالوں سے بھر اسراٹات میں ہلایا۔ کوستا نے
جیتے ہوئے کہا۔ ”اچھا تو تم اس کی نوکرائی ہو۔“ عورت کے
چہرے پر چٹکی ظاہر ہوئی۔
”بیٹول۔ میں اس کی بیوی ہوں۔“

کوستا نے قہقہہ لگایا۔ ”واہ بھئی واہ میرے ڈھیلے دوست
نے کیا غضب کی بیوی رکھی ہے ویسے میرا نام بیٹول نہیں بلکہ
کوستا ہے۔ میں بارسلونا سے آیا ہوں۔ خوب صورت خاتون کیا
آپ اپنا دل سوری گھر کا روزہ اس پردہ کی کے لیے

کوستا کا باپ اسپتال کے آئی سی یو میں جراثیم کش
اہمے سے گزر کر چھوٹی بہن کے کمرے میں داخل ہوا۔ بہن
کی حالت بہت خراب تھی۔ ”بھائی تم اس عورت کے ساتھ چلے
جاؤ۔ جہیں نوکری کے ساتھ شیڈن بھی مل جائے گی۔“
بھائی کی آنکھیں بہن کی حالت دیکھ کر بھیگ گئیں۔ اس نے
روتے ہوئے کہا۔

”میری سنی سی بہن، میں جہیں اس حالت میں چھوڑ کر
کہیں نہیں جاؤں گا۔“
بہن کے بچنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ بھائی کے سامنے
دیکھتے ہی دیکھتے اس نے آخری پھگی کی اور موت کی آغوش میں
چلی گئی۔

بہن کے مرنے کے بعد کوستا کا باپ اس ایجنٹ کے
پاس آیا۔ ”میری پیاری بہن تو مر گئی۔ میں معاہدے کے
مطابق نوکری جو ایجنٹ کرنے کے لیے تیار ہوں۔“

ایجنٹ نے اسی کے سامنے اپنے سیل پر اہم مین بیوہ سے
بات کی۔ ”میڈم اس لڑکے کی بہن پلگ کی وجہ سے مر گئی ہے۔
یہ نوجوان نوکری جو ان کے پر آباد ہے لیکن میرا مشورہ ہے
کہ آپ یہ خطرہ مول نہ لیں۔ پلگ کے جراثیم اس لڑکے کے
جسم میں بھی داخل ہو گئے ہوں گے۔ آپ اس کو ایک سال کی
تختہ اور دس ہزار اوپر سے دے کر فارغ کر دیں، میں ایک
ہفتے میں ہی کوئی نوجوان منتخب کر کے آپ کے پاس بھیج دوں گا۔
وہ بھی اسپیشل اور آپ کے مطلب کا ہو گا۔“ اس نے اوکے
میڈم کہہ کر فون بند کر دیا۔

ایجنٹ نے کوستا کے باپ کے سامنے ہی سائڈ میں
رکے ہوئے سیف کو کھولا۔ اس میں سے ستر ہزار ڈالر نکال کر
ایک بڑے لفافے میں بند کیے۔ لفافہ کوستا کے باپ کے
حوالے کرتے ہوئے بولا۔ ”لڑکے اس میں ستر ہزار لیں۔
پانچ ہزار ڈالر میں نے اپنی کیشن کے کاٹ لیے ہیں۔ جہیں
ایک سال کی تختہ پلے پانچ ہزار ڈالر مفت میں مل رہے ہیں،
خوش رہو۔“

یہ سن کر کوستا کا باپ بہتا گیا، اس نے غصے سے کہا۔
”مفت میں۔ اس ایڈوچر میں، میں نے اپنی اکلوتی بہن کھودی
ہے اور تم کہتے ہو مفت میں۔ وہ دنیا میں میری واحد رشتہ دار
تھی۔“

ایجنٹ نے انفس کا اٹھارہ کیا۔ ”ہاں تم صحیح کہتے ہو۔ یہ
تمہارے لیے واقعی بہت بڑا صدمہ ہے۔ ویسے پچھلے دس بارہ
سال میں یہ پہلا واقعہ ہے، ہم چھوٹوں کا تدارک کر رہے
ہیں۔“

کھولیں گی؟“ عورت کھٹکھٹا کر ہنس پڑی اور یوئل کہتی ہوئی بیڑیوں میں غائب ہو گئی۔

دروازہ کھلا تو کوستانے دیکھا کہ اس کے سامنے سفید بلاؤز اور سفید اسکرٹ پہنے ایک نہایت دلکش عورت کھڑی تھی۔ کوستانے حسبِ عادت ہتھکڑیاں لگایا۔ ”واہ بہت خوب۔ شاندار، اب مجھے ہی گھوڑی رہو گی یا اندر بھی آنے دو گی۔“

اندر دوسرے کمرے سے ایک یوڑی عورت کی آواز آئی۔ ”جولی کون آیا ہے؟“

جولی نے شرارت سے ہنستے ہوئے کہا۔ ”آئی۔ بیڑو کے بچپن کا دوست فول کوستا آیا ہے۔“

کوستا سوٹ کیس کھینچتا ہوا دوسرے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے ہتھکڑیاں لگاتے ہوئے کہا۔ ”ارے واہ آئی صوفیہ آپ تو ابھی تک بالکل یک ہیں۔ میں کوستا ہوں۔ مجھے پہچانیے۔ یہ آپ کی نوکرانی مجھے اندر ہی آنے نہیں دے رہی تھی۔“ جولی نے بڑا سامنے بنایا اور انھیں دکھائیں۔

آئی صوفیہ نے کہا۔ ”یہ نوکرانی نہیں، میری بہو ہے۔ میرے بیڑو کی بیوی جولی ہے۔ بڑے جب تو یہاں سے کیا تھا تو بارہ تیرا سال کا بچہ تھا تیرے ماں باپ کہاں ہیں؟“

کوستانے کہا۔ ”آئی! میرے والدین کا ایک ایک بیٹھ میں انتقال ہو گیا۔ اب میں اس خوب صورت دنیا میں اکیلارہ گیا ہوں۔ آئی بڑی دور سے آرہا ہوں۔ پہلے میں نہاؤں گا اسی اثنا میں یہ نوکرانی سواری آپ کی بہو میرا کراٹھیک کر دے گی پھر ڈنٹ کر کھانا کھاؤں گا اور سو جاؤں گا۔ بیڑو تو شاید شام تک آئے گا۔“

کوستانے سوٹ کیس کھول کر اپنے کپڑے نکالے اور ساتھ ہی سب کے لیے جو چھنے لے کر آیا تھا، وہ میز پر سجادیے اور اس کے بعد نہانے چلا گیا۔ نہانے کے بعد اس نے جولی سے کہا۔ ”جولی میرا کراٹھیک دو تاکہ وہاں اپنا سوٹ کیس رکھ دوں پھر کھانے پر لوٹ پڑوں۔“

جولی اس کو لے کر کمرہ نالوں والے حصے میں آئی اور ایک ہوا دار کمرے میں لے گئی۔ کمرے کی کھڑکی باہر کی طرف گھر کی چہار دیواری میں کھلی تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی کوستانے لپک کر جولی کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ جولی دومنٹ بعد خمار آلودہ آواز میں بولی۔

”یوئل۔ کیا تم ہر عورت کے ساتھ اتنی جلدی بے تکلف ہو جاتے ہو۔ آئی مجھ پر کڑی نظر رکھتی ہیں۔ ہمارا بیڑو دم سامنے سے نکلی کھڑکی والا۔“

کھانے کی میز پر بیٹھے ہوئے بیڑو، بکرے کے گوشت کا

اسٹوار اور دیگر چیزیں تھیں۔ کوستا تھوڑی سی دیر میں سب چٹ کر گیا۔ پینٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ”آئی آپ کی بہو بہت اچھا کھانا پکاتی ہے۔ اب میں سوؤں گا خوب خمار آلودہ نیند آئے گی۔“

جولی نے جلدی جلدی میز پر سے پلیٹیں اٹھائیں اور ان کو دھونے کے لیے کچن میں چلی گئی۔

☆☆☆

کوستانے اپنے کمرے میں آکر بیڑو کے بیڑو دم کی کھڑکی کی طرف دیکھا۔ جولی نہایت دھکی آئینے کے سامنے اپنے بال سنوار رہی تھی۔ اس نے گاؤں پہتا ہوا تھا جس کی نگاہ بھی بار بار کوستا کے کمرے کی کھڑکی کی طرف اٹھ رہی تھی۔ جولی نے دیکھا کہ کوستا اپنی کھڑکی سے اتر کر اس کے کمرے کی طرف آرہا تھا۔ جولی جلدی سے اپنے بیڑو پر لیٹ گئی اور چادر اوڑھ لی۔ کوستانے کمرے میں جھانکا۔ کمرے کے دروازے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ کوستانے ابھر اُٹھ دیکھا اور کھڑکی سے کمرے میں اتر گیا۔ جولی نے ہلکی سی چیخ ماری۔ اس کی ساس لیوگ دم میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ”جولی کیا ہوا؟“ جولی نے بات بتائی۔ ”یہ ڈوکی (چھوٹا کتا) تنگ کر رہا ہے۔“

آئی صوفیہ کی تھوڑیاں چڑھ گئیں۔ ڈوکی ان کے سامنے ہی غرخس پر بے خبر سو رہا تھا۔

جب کوستا چادر میں کھسا تو جولی گاؤں کی ڈوری پہلے ہی کھول چکی تھی۔ تھوڑی دیر میں کمرے سے ہلکی ہلکی جذباتی آوازیں آنے لگیں۔ جذبات ٹھنڈے پڑنے پر جولی نے پوچھا۔ ”یوئل، تم ہر عورت کے ساتھ اتنی ہی جلدی بے تکلف ہو جاتے ہو؟“

کوستانے جواب دیا۔ ”بشرطیکہ وہ عورت تمہاری طرح دلکش، یکسی..... اور.....“ جولی نے بات کاٹ دی۔

”بس..... بس مجھے کئی اور شرما کر کوستا کے چوڑے سینے پر اپنا سر رکھ دیا۔“

باہر آئی صوفیہ منکھوک ہو چکی تھیں۔

☆☆☆

شام پانچ بجے، لالان میں ہری ہری گھاس پر چائے کی میز لگی ہوئی تھی۔ چاروں طرف کھادوں میں گلاب کے پودے پھولوں سے لدے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی فرحت بخش ہوا چل رہی تھی۔ بیڑو کا انتظار ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد گیٹ کے باہر ایک چھوٹا ٹرک آکر رکا۔ اس میں سے بیڑو اتر آ۔ ڈرائیور نے ٹرک سے اتار کر تازہ سبز یوں سے بھرا ٹوکرا گیٹ کے باہر رکھ

سورگ جاناں

دوست رک گئے تھے۔ کوستانے قادر سے اپنا تفصیلی تعارف کرایا اور مسئلہ ان کے سامنے رکھا۔ قادر نے توجہ سے اس کی بات سنی اور ان کا پنے کمرے میں لے گیا۔

کمرے میں بیٹھنے کے بعد قادر نے کہا۔ ”کوستانے تمہارے پلاٹ کے بارے میں معلوم ہے۔ میں نے ہی تمہارے باپ کو یہ پلاٹ خریدنے کا مشورہ دیا تھا۔ ویسے تمہارے ذہن میں اس کی کیا قیمت ہونی چاہیے؟“

کوستانے کہا۔ ”کم از کم دو لاکھ امریکن ڈالرز وہ بھی کیش میں۔“

قادر نے کہا۔ ”قادر نہ کرنی یہاں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں جہیں اس کے تین لاکھ ڈالرز دلوں گا وہاں لیکن گاؤں میں معاف کرے، اس کے لیے ہمیں تھوڑا سا ڈراما کرنا پڑے گا

ورنہ یہاں ہالڈرز آپس میں مل کر روپ بتائیں گے اور ہمیں مجبور کر دیں گے کہ تم قیمت خریدے سے کم میں بیچ کر یہاں سے چلے جاؤ۔“

کوستانہ اور پیٹو نے حیرت سے قادر کی طرف دیکھا۔

”قادر کیا ڈراما؟“

قادر نے کہا۔ ”ڈراما میں جہیں بتاتا ہوں لیکن پہلے ہمیں یہ وعدہ کرنا ہوگا کہ تم قیمت فروخت کا دس فیصد کر جا کو علیحدہ کرو گے۔“

کوستانہ جلدی سے بولا۔ ”منعور ہے۔۔۔۔۔ ڈراما کیا ہو گا؟“

دیا اور ڈک ٹمہا کر داپس چلا گیا۔

پیٹو گھر میں داخل ہوا اس کے چہرے سے شدید ٹھنکن عیاں تھی۔ وہ کوستانہ کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ چند سیکنڈ وہ کوستانہ کو بخور دیکھتا رہا جیسے پچپانے کی کوشش کر رہا ہو پھر اس کے گلے لگ گیا۔ ”اب میرے دوست کو ستام، اتنے عرصے بعد کہا سے ٹپک پڑے۔ اتنے لمبے چوڑے شاندار ہو گئے ہو۔“

حسب عادت کوستانہ نے ادھیچا تھہر لگا دیا۔ ”اور تم ویسے ہی ڈھیلے ڈھالے چڑے ہو، کچھ کیا پایا کرو۔ اتنی محنت کرتے ہو۔ زمین پر دو چار نوکر رکھ لو۔ چھاپے لے کر ہوا کر آؤ پھر تفصیل سے بات ہوگی۔ جولی نے خاص تمہارے لیے ٹیکڑے کے پکڑے بنائے ہیں۔“

جولی آج بہت مطمئن اور گھری نظر آ رہی تھی۔

پیٹو جب نہا جو کر آیا تو میز پر ٹیکڑے کے گرم گرم پکڑے اور دیگر چیزیں رکھ دی گئیں۔ اتنی صوفیہ اور جولی بھی بیٹھی ہوئی تھیں۔ پیٹو نے کہا۔ ”میرے پاس دس بیگز زمین ہے۔ آدھی زمین پر زیتون اور چیری کے درخت ہیں۔ آدھی پر میں مکی اور بڑیاں لگا تا ہوں۔ بڑیاں بہت محنت مانتی ہیں۔“

”ہاں تو ہے۔ تمہیں ٹوک کر کہنے چاہئیں۔“

”فکر ہیں۔ ان کے گھر بھی میری زمین پر بنے ہوئے ہیں۔ ان کی عورتیں بھی میری زمین پر کام کرتی ہیں۔ میں سب کو معقول معاوضہ دیتا ہوں پھر بھی مالک کو دیکھ بھال کرنی پڑتی ہے۔“

کوستانہ نے کہا۔ ”ہاں پیٹو، زمین بہت محنت مانگتی ہے۔ چائے کے بعد دلوں دوست باہر بیٹھے کھل گئے۔ کوستانہ نے کہا۔ ”یار پیٹو، میں ایک مقصد سے یہاں آیا ہوں۔ شاید تمہیں معلوم ہو، میرے باپ نے دو ہزار گز کا ایک پلاٹ یہاں خرید لیا تھا۔ اس کے کاغذات میرے پاس ہیں۔ میں اسے فروخت کرنا چاہتا ہوں۔“

”ہاں مجھے معلوم ہے۔“ پیٹو نے کہا۔ ”تمہارا پلاٹ بہت اچھی لوکیشن پر ہے۔ اس پاس کی زمین آباد ہو چکی ہے۔ تمہیں اس کی بہت اچھی قیمت مل جائے گی۔ تم ایسا کرو گے اتوار ہے۔ میری پوری فلی شڈے سروں کے لیے کر جا جائے گی۔ تم چلی پلو، سروں کے بعد یہ مسئلہ قادر کے سامنے رکھتے ہیں۔ قادر وہی پرانے والے ہیں۔ وہ تمہیں اچھی قیمت دلوں دیں گے۔“

”ہاں، ٹھیک ہے کل قادر سے ملنے ہیں۔“

دوسرے دن گر جاش سٹو کے سروں کے بعد اتنی صوفیہ اور جولی گھر چلی گئیں۔ سروں ہال خالی ہو چکا تھا۔ دونوں

کوستانے کہا۔ ”جو حکم..... لیکن اگر اس نے خود میرے قریب ہونے کی کوشش کی تو؟“

”پھر تو مجبوری ہے۔ کوستا پلیز اسے بدنام نہیں ہونے دیتا۔ وہ بے انتہا حسین ہے۔ اس کے کئی بوائے فرینڈز ضرور ہوں گے۔“

کوستانے عادت کے مطابق ہلکے سے ہنستے ہوئے کہا۔

”چلو پھر ایک اور بوائے فرینڈ کے اضافے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اچھا یہ بتاؤ کہ وہاں سے تمہارے لیے کونسا کٹ لے کر آؤں؟“

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔ تم نے پہلے ہی مجھے کرسس کا شاندار تجویز دے دیا ہے۔“ جولی نے شرما کر اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرا اور اپنا سر کوستا کے کشادہ سینے پر رکھ دیا۔

☆☆☆

انتھنز، گریک کا نہایت صاف ستھرا چھوٹا سا شہر تھا۔ کشادہ سڑکیں، جگہ جگہ شاندار پارک، پرانے زمانے کی کئی شاندار عمارتیں، ٹینیس کی پُر شکوہ عمارت اور اس پر تعینات گارڈز کی تہذیبی کا مسٹر سیکلڈوں سیاحوں کو متوجہ کرتا تھا۔ عوام کے لیے خوب صورت آرام دہ بسوں کا نظام۔ درجنوں ٹائٹ کلب، کینسینو، شراب خانے اور تھولاکھیلے کے لیے کئی وسیع ہال۔ رات کو ان پر ملنے بچھتے بیہوش سائیں وغیرہ، جگمگاتے ہوتے تھے۔ رات کو سڑکیں بھانٹ بھانٹ کے سیاحوں سے بھر جاتی تھیں۔

کوستا سہ پہر کو انتھنز کے خوب صورت ہوائی اڈے پر اترا۔ مسافر ہاتھ میں پاسپورٹ پکڑے دور سے ایئر ٹرین والوں کو دکھاتے ہوئے لائن سے گزر رہے تھے۔ نہ پاسپورٹ چیکنگ، نہ اریائیو اسٹیمپ بس پاسپورٹ دکھاؤ اور گزر جاؤ۔ کوستانے ایک ایسے ہوٹل میں چیک ان ہونے کے بعد غسل کیا اور کچھ دیر آرام کرنے کے بعد جولی کی بہن مارگریٹ عرف میک کوٹون کرنے بیٹھ گیا۔

فون پر میکی نے آواز سننے ہی کہا۔ ”واؤ، کوستا دی لیڈی راکر۔ جولی میری بہن نہیں تھی، دوست بھی ہے۔ جولی نے پہلے ہی فون کر کے بتا دیا تھا بلکہ خیر دار کر دیا تھا کہ تم زبردست لیڈی کلر ہو۔ تم پہلی ہی ملاقات میں شکار پر چھپت پڑتے ہو۔ تم سے بچ کر رہنا چاہیے۔“

کوستانے حسبِ عادت قبضہ لگا لیا اور بات بدل دی۔

”جولی نے پوچھنا کہ تمہارے لیے پیسے ہیں انہیں لینے کے لیے تم میرے ہوٹل آ رہی ہو یا میں تمہارے ہاسٹل آ جاؤں۔ کل سے ایک اینڈر شروع ہو رہا ہے، کچھ پروگرام بناتے ہیں۔“

زمین کھدوا کر اشارہ زدہ زمین کھدوا دوں گا اور مقدس کھوپڑی برآمد کر لوں گا۔ یہاں لوگ بہت مذہب پرست اور سیدھے سادے ہیں۔ وہ کھوپڑی ایک چلوں کی شکل میں گر جا لائی جائے گی اور چھوٹے سے شوکیں میں رکھ دی جائے گی پھر تم دیکھنا کہ آکشن میں تمہارے پلاٹ کی قیمت کہاں سے کہاں پہنچتی ہے، کیا سمجھے؟“

کوستانے لمبا سانس خارج کیا۔ ”لیکن قادر یہ کھوپڑی آئے گی کہاں سے؟“

قادر نے کہا۔ ”رات کو کوئی بھی پرانی قبر کھود کر کسی مرد ڈھانچے کی کھوپڑی سے نکال لینا اور اسی رات کو اپنے پلاٹ میں دفن کر دینا اور خفیہ اشارے سے مجھے بتا دینا کہ وہ کھوپڑی کہاں دہائی ہے، کیا سمجھے؟“

دونوں دوستوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پتو کی آنکھوں میں خوف تھا مگر کوستانے کہا۔ ”قادر بے فکر رہیں، یہ کام کر کے آپ کو بتاتا ہوں۔“

☆☆☆

کوستانے دی کھی جو قادر نے کہا تھا۔ اس کا پلاٹ تین لاکھ امریکی ڈالرز میں فروخت ہو گیا۔ خریدنے والے بلڈر نے قیمت کا دس فیصد یعنی تین ہزار ڈالرز کوستا کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ”باقی رقم کرسس کے بعد ضروری ڈاکومنٹس تیار ہونے کے بعد“ کوستانے بھی فوراً ہی تین ہزار ڈالرز گر جا کر علیہ کر دیے۔

دبیر کا مہینا شروع ہو گیا تھا۔ فائنل پے منٹ ملنے میں ابھی کافی دن تھے۔

ایک دوپہر جولی کے کمرے میں سنسنی بھری دوپہر گزارنے کے بعد، کوستانے جولی سے کہا۔ ”جولی کرسس میں ابھی تین ہفتے ہیں۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اس دوران انتھنز کا چکر لگا لوں وہاں ایک کمپنی سے گروپ انشورنس کے سلسلے میں بات چل رہی ہے، اسے فائل کرنا ہے۔“

جولی نے جلدی سے کہا۔ ”انتھنز یعنی گریک۔ وہاں تو میری چھوٹی بہن میڈیکل کالج میں پڑھ رہی ہے۔ میڈیکل کے دوسرے سال میں ہے۔ گریجویٹس کے بعد وہیں ہاؤس جاب کرے گی۔ اس کے بعد یہاں آئے گی۔“

”گریٹ“ کوستانے ہنستے ہوئے کہا۔ ”یہ تو بہت اچھا ہوا۔ تم اس کے لیے کٹ ڈیفنڈ ہو۔“

”وہ تو میں ضرور ہمجواؤں گی مگر خبردار اس کے زیادہ قریب ہونے کی کوشش مت کرنا ابھی وہ صرف آئیس سال کی ہے۔“

ایک اینٹیٹ نے ان سے پہلے گیم کی مقررہ فیس لی اور ان کی میز پر چار فارم رکھ دیے۔ ہر فارم پر گیم نمبر اور ایک چھوڑ خانے میں بہت سے ہندے سے سجے ہوئے تھے۔
میکے نے کہا۔ ”سٹر لیڈی کلر۔“ ابھی گیم شروع ہونے میں دیر ہے۔ میں داش روم سے ہو کر آتی ہوں۔ میرے پرس کا خیال رکھنا۔“

میکے کے جاتے ہی کوستا نے سو سو ڈالر کے دو نوٹ نکالے پھر ہوٹل کے کارڈ پر لکھا۔ ”میکے کے لیے کرسمس کا تحفہ۔“
حفہ۔ قبول کریں، شکر ہے۔“ اس کارڈ کے گرد دو سو ڈالر کے نوٹ لپٹے اور کارڈ کو میکے کے پرس میں ڈال دیا۔

میکے نے داش روم سے واپس آتے ہی خواتین کی عادت کے مطابق، ہلکی لپ اسٹک چیک کرنے کے لیے پرس کھول کر چھوٹا آئینہ نکالنا چاہا۔ پرس کھولتے ہی اس کی نظر ڈالر پر پڑی۔ اس نے نوٹ باہر نکالے اور کارڈ پر لکھی تحریر پڑھی۔ اس کے چہرے پر مصنوعی خشکی ظاہر ہوئی پھر کوستا کی طرف دیکھتے ہوئے جھکے سے مسکرائی۔ ”شرارتی لڑکے، حفہ قبول کیا جاتا ہے۔“

پہلا گیم شروع ہونے کی تیل بجی۔ بڑی بڑی اسکرین پر دو پائے دکھائی دیے۔ ایک پائے پر تین نکتے دوسرے پر دو نکتے تھے۔ ساتھ ہی اسکرین پر آواز آئی۔ ”تھری..... تھری..... تھری..... تھری.....“ سب لوگوں نے اپنے اپنے فارم پر رہنے خانے میں تھری نوٹس کا شروع کر دیا جس کے خانے میں تھری نوٹ تھا، وہ اس نے کراس کر دیا۔ پھر اسکرین پر پائے ظاہر ہوئے۔ دونوں پر پانچ پانچ نکتے تھے ساتھ ہی آواز آئی۔ ”فائیو، فائیو، فائیو..... فائیو فائیو۔“ اس طرح تینوں گیم چلتا رہا۔

میکے کے پاس فارم پر خانے میں پہلی لائن پوری کٹ گئی۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر زور سے آواز دی۔ ”فرسٹ لائن کراس۔“ فوراً ہی گیم رک گیا۔ اینٹیٹ جلدی سے میکے کے پاس آیا۔ اس نے فارم چیک کیا اور میکین کی طرف انگوٹھا اٹھا کر کہا۔ ”اوکے، اوکے۔“ پھر بھاسا بھاسا میکین کی طرف گیا اور وہاں سے نوٹ نکلیش کا دس فیصد امائنٹ لاس میکے کے حوالے کیا۔ میکے نے تنہیکہ کوئی نوٹ نہ کر لیا پھر ان کو بطور پ دیا۔ گیم دوبارہ شروع ہوا۔

پانچویں گیم پر کوستا کے پاس خانے پر تمام ہندے کراس ہو گئے۔ اس نے کھڑے ہو کر کہا۔ ”ہاؤس فل۔“ اینٹیٹ پھر تیزی سے کوستا کا فارم چیک کرنے آیا۔ اس نے چیک کر کے

”میں ہی تمہارے ہوٹل آجاتی ہوں۔ پہلے تم مجھے شاندار ڈنر کرواؤ گے۔ اس کے بعد میرے گفت میرے حوالے کرو گے شرافت کے ساتھ۔“
کوستا نے پھر قہقہہ لگایا۔ ”گریٹ، میں سات بجے ہوٹل کی لابی میں تمہارا انتظار کروں گا۔“
☆☆☆

ٹھیک ساتھ بجے ہوٹل کی لابی میں ایک نہایت خوب صورت، نوجوان لڑکی داخل ہوئی، وہ ہوبہو جولی کی کاپی تھی۔ اس نے ہوٹل کے ریسپشن کاؤنٹر پر کچھ معلوم کیا۔ کاؤنٹر پر کھڑی لڑکی نے کوستا کی طرف اشارہ کر دیا۔ میکے، کوستا کی طرف بڑھی۔ اس کی نظروں میں کوستا کے لیے ستائش تھی۔

کوستا نے صوفے سے اٹھ کر اس کا استقبال کیا۔ اس نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر کہا۔ ”میکے امیر میری باری ہے۔ واؤ کیا طرح دارا اور دلکش لڑکی ہے۔ واؤ، اس نے مجھے دیکھا اور پہلی ہی نظر میں فتح کر لیا۔“

”جولی نے ٹھیک کہا ہے۔ تم واقعی لڑی کلر ہو۔ پہلی ہی ملاقات میں آنکھوں کے ذریعے لڑکی کے دل میں اتر جاتے ہو لیکن میں اتنی آسانی سے شکارت نہیں ہوں گی۔“

”لیکن میکے شکارت میں ہوا ہوں، وہ بھی پہلی نظر میں، میکے یقین مانو میری کئی گرل فرینڈز ہیں اور آج ان میں ایک شاندار اضافہ ہو گیا ہے۔“

میکے نے کہا۔ ”چلو دیکھتے ہیں، کیا ہوتا ہے۔ اب اٹھو بھی۔ ڈنر کرنا ہے۔ یہاں قریب ہی چند قدم دو دو ایک بہت بڑا تبولہاؤس ہے۔ وہ مکمل کے ساتھ ساتھ ڈنر بھی سرو کرتے ہیں۔ ان کا کھانا بہت لذیذ ہوتا ہے، بالکل اسٹیش اسٹائل چٹ پٹا، مسالے دار۔“

کوستا نے میکے کا گداز ہاتھ پکڑا اور ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ باہر جیسے نہ نکلا ہوا تھا۔ چاروں طرف روشنیات جگمگاری تھیں۔ سڑکوں پر سیاحوں کا سیلاب اٹھ اڑا تھا۔

کوستا نے کہا۔ ”کون کہتا ہے کہ اکلین اور گریک یورپ کے پورر کرن (Poor) ہیں۔ ان کو یہ بہاریں دکھاؤ۔“

وہ ٹپکتے ہوئے تبولہاؤس پہنچے۔ وہ ایک بہت وسیع ہال میں داخل ہوئے۔ جگہ جگہ چار چار آدمیوں کے لیے میزیں لگی ہوئی تھیں۔ اس وقت ہال میں تقریباً پانچ سو آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ اینٹیٹ نے کمرہ کرتے ہوئے دونوں کو ایک خالی میز پر بٹھا دیا۔ میزوں کی قطاروں میں تین چار اینٹیٹ چکر لگا رہے تھے۔ چاروں طرف بڑی بڑی اسکرینز لگی ہوئی تھیں جن پر لکھا ہوا آہٹا تھا کہ پہلا گیم شروع ہونے میں ابھی پندرہ

دم گھٹ کر رہ جانے کا۔ وہ اندر جانے کے لیے پھل رہی تھیں۔
جولی نے انہیں بکڑا ہوا تھا۔

کوستا نے ایک موٹا ادنیٰ کھیل پانی میں تر تیز بھگوایا اور
اسے اوڑھ کر اندر کھس گیا۔ اس نے پٹو کو کھیل میں لپیٹا اور اسے
کندھے پر ڈال کر آگ کے شعلوں سے بچاتا ہوا باہر نکل آیا۔
پٹو بچ گیا تھا لیکن کوستا بہت بری طرح جل گیا تھا۔ ایسولینس
اور فائز مینڈرز بچ گئے تھے۔ انہوں نے آدمے کھنکھنے کی
جدوجہد کے بعد آگ پر پوری طرح قابو پالیا۔

اسپتال میں ڈاکٹر نے صوفیہ اور جولی کو بتایا کہ کوستا
تقریباً آتی فیصد جل گیا ہے۔ اس کے پیچھے بھی دم جو بھی
سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔ اس کے بچنے کی بہت کم امید ہے۔
آپ لوگ دعا کریں۔

☆☆☆

دودن نہایت تکلیف میں گزار کر انہیں کچھ اور بات
پر قبضہ لگنے والے کوستا نے اسپتال میں دو توڑ دیا۔
پٹو کو گھر دوبارہ ٹھیک ٹھاک کرانے میں ایک ماہ لگ گیا۔
اتوار کا دن تھا اور صبح کا وقت۔ سب لوگ سوگوار حالت
میں ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ ایک کاران کے گھر کے سامنے
آکر رکی۔ اس میں سے ایک آدمی اترا جو طیلے سے وکیل معلوم
ہوتا تھا۔ اس نے اندر آتے ہی اپنا تعارف کرایا اور پٹو اور صوفیہ
سے اظہار تعزیت کی۔ اس کے بعد اس نے بریف کیس کھول کر
ایک دبیر لٹاف نکال کر کہا۔ ”اس میں مسٹر کوستا کی وصیت ہے جو
انہوں نے کرکس کے ایک بیٹے کو لکھوائی تھی۔ آپ لوگ اس
وصیت کو خود سے پڑھیں اگر آپ کو کہیں الجھن محسوس ہو تو مجھ
سے رابطہ کر سکتے ہیں میرا کارڈ اسی لفافے کے اندر ہے۔ دیے
اس وصیت کا مختصر خلاصہ میں آپ کو سنائے دیتا ہوں۔“

سب لوگ سوگوار انداز میں خاموش بیٹھے تھے۔ وکیل
نے بتانا شروع کیا۔ ”چونکہ مسٹر کوستا کا کوئی عزیز زندہ نہیں ہے
اس لیے مسٹر کوستا نے اپنی کل منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد کا
وارث اپنے بیٹوں کے دوست مسٹر پی ٹی نو (پٹو) اور ان کی
وائف مسز جولی پٹو (جولی) کو قرار دیا ہے۔ کچھ رقم کر جا کے
لیے اور کچھ رقم جو لینا کی بہن مس مارگریٹ (مکی) کے لیے بھی
چھوڑی ہے مسٹر پٹو اور ان کی مسز جولی کو کسی دیر سے آفس
آنا ہوگا تاکہ وصیت کو نافذ کیا جاسکے۔“

وکیل کے جانے کے بعد سب لوگ کھٹے میں بیٹھے
رہے۔ کچھ دیر بعد جولی روتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف
بھاگ گئی۔ وہ بار بار اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔

اوکے کا اشارہ کر دیا۔ کوستا نے بہت بڑی رقم جیتی تھی۔ مکی کا
بیگ نمیا پرس نوٹوں سے بھر گیا۔ انہوں نے کل چھ کیم کیلے۔
چٹ پٹا کھانا کھایا اور پیرے کو پیسے دے کر اٹھ گئے۔

ہوٹل کی لابی میں بیٹھ کر مکی نے کہا۔ ”آف بارہ بج
گئے۔ کوستا میرے کچھ پیسے حوالے کر دو، میں چلتی ہوں۔“
”ان کے لیے تو تمہیں میرے کمرے میں چلنا ہوگا۔“
”ہوں..... تو تمہاری نیت خراب ہو رہی ہے۔ میں پانچ
منٹ سے زیادہ کمرے میں نہیں رکوں گی۔“

دونوں جب کمرے میں پہنچے، کوستا نے مکی کو ٹھیک کر
اپنی انگوٹھ میں لے لیا۔ دو منٹ کے بعد مکی نے خمار آلود
پھولی ہوئی سانس کے ساتھ کہا۔ ”بس، بس شرارتی لڑکے،
باتی پھر بھی۔“

☆☆☆

دوسرے دن حسب وعدہ مکی صبح سات بجے کوستا کے
ہوٹل پہنچ گئی۔ انہوں نے دودن کے لیے سوٹر بوٹ ہار کی اور
آس پاس کے ہرے بھرے جزیروں کی سیر کو کھل گئے۔
آخری جزیرے میں ایک ہوٹل کے کمرے میں انہوں نے
بھرپور انداز میں دوران تیز کر لیں۔ دونوں بہت خوش تھے۔
تیسرے دن کوستا نے اپنی کمپنی کا کام منشا یا اور اسی دن
میڈرڈ روانہ ہو گیا۔ کرکس کی چیمپوں کے بعد کوستا کو پلاٹ کی
بتایا رقم بھی مل گئی جو اس نے اپنے بارسلونا کے فارن کرکس
اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر دی۔ وہ گرجا کو ڈیفینس کی بتایا رقم دینا
نہیں بھولا تھا۔

تقریباً ہر شے کو پٹو، اس کی بیوی جولی اور کوستا ٹینک
کے لیے جاتے تھے۔ بھی کسی پہاڑی پر اور کسی گرم پانی کی
جھیل کے کنارے۔ پٹو حسب عادت جھیل کے کنارے چٹائی
بچھا کر سو جاتا تھا اور کوستا جولی کو لے کر نہانے کے لیے جھیل میں
اتر جاتا تھا۔ وہ کسی کھتے درخت کی اوٹ میں اپنی جھل اگ
جھاتے تھے۔ کوستا اور جولی دونوں بہت خوش تھے۔

کوستا کی چھٹیاں ختم ہونے کو گھیں۔ وہ بارسلونا جانے کی
تیار کر رہا تھا۔ ایک رات، اچانک نہایت ہولناک حادثہ پیش
آیا۔ رات کو سب لوگ جڑے سے سو رہے تھے کہ نہ جانے
کیسے یونگ روم میں رستے نرم کپڑوں اور سامان میں آگ لگ
گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے تقریباً پورے گھر کو دھوئیں نے اپنی
لپیٹ میں لے لیا۔ سب دھوئیں میں کھانستے ہوئے باہر نکل
آئے۔ پٹو گہری نیند میں تھا۔ بار بار جھنجھوڑنے کے باوجود پٹو
کی نیند نہیں ٹوٹی۔ آخری صوفیہ اور جولی میں کھڑے سچ رہے
تھے۔ صوفیہ رورور کر کہہ رہی تھی۔ ”ہائے میرے بیٹے کو بچاؤ وہ

شام دہریں



پہچان

محمد فاروق انجم

بعض لوگ اپنی فطرت سے مجبور ہوتے ہیں... وہ بھی ایسی ہی فطرت کا مالک تھا... جو خواہ مخواہ جرم کا پیچھا کرتے ہیں... وہ اپنی کچ فہمی... کوتاہیوں اور خامیوں کی اصلاح کرنے سے قاصر تھا... کیونکہ وہ اس کی پہچان بن چکی تھیں...

جرم و سزا کا انداز لیے ایک اداکار کی فنکاریاں

تیز بارش کے قطرے اُس کے چہرے پر پڑ رہے تھے اور اس کی نگاہیں کہیں دوسرے کوڑھیں۔ شام کا وقت تھا اور وہ اپنے کمرے کی بالکونی میں کھڑا تھا۔ اس کی ہنسیں خالی تھیں۔ سچ ناشے میں اس نے اپنی جیب میں موجود آخری پوٹی سے ایک چائے کا کپ لے کر پیا تھا۔ اس وقت اسے شدید بھوک لگ رہی تھی۔

پانچ سال قبل وہ اس شہر میں آیا تھا۔ وہ بہت خوبصورت تھا اور اداکار بننے کا جنون شروع دن سے اس کے دل و دماغ

جاسوسی ڈائجسٹ 215 دسمبر 2018ء

”ہو۔“

ساجد چار ماہ کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اس شہر میں پہچان بنانے آیا تھا۔ پہلی بار اسے موقع مل رہا تھا اور اس میں بھی رکاوٹ آگئی تھی۔

”سر آپ اگلی قلم میں مٹس لڑکے کو چانس دے دیں۔“

مجھے اس قلم میں لے لیں۔“ ساجد نے کہا۔

”ایسا ممکن نہیں ہے۔ تم مجھے کی کوشش کرو۔ چار ماہ جنگی

بجائے ہی گزر جائیں گے۔“ دوسرے نے کہتے ہوئے جھکی

بجائی۔

ساجد چپ ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ کیرا مین کے

ساتھ باہر آ گیا۔ مسئلہ چار ماہ کا نہیں تھا۔ ساجد بیچ و ڈکار تھا۔ اس

کو اپنا خرچ چلانے کے لیے مزدوری کرنی پڑتی تھی۔

باہر آ کر ساجد نے کیرا مین سے پوچھا۔ ”وہ لڑکا کون

ہے جسے انہوں نے اپنی قلم میں فائل کیا ہے؟“

”اس کا نام سیر ہے۔ کھاتے پیتے گھر کا ہے۔ یہاں

قریب ہی رہتا ہے۔“ کیرا مین نے بتایا۔

”کیا تم مجھے اس سے ملوا سکتے ہو۔ اس سے ملنے کی

خواہش ہو گئی ہے۔“ ساجد نے کہا۔

”ابھی چلے چلے ہیں۔ بڑا مفلس ہے، اکیلا رہتا ہے اور

چائے بڑے خرچے کی بنا تا ہے۔“ کیرا مین فوراً تیار ہو گیا۔

”اسے یہ مت بتانا کہ میں بھی قلموں میں کام کرنے آیا

ہوں بس اپنے دوست کی حیثیت سے تعارف کرا دینا۔“ ساجد

نے کہا۔

”ٹھیک ہے میں ایسا ہی کہوں گا۔“ کیرا مین بولا۔

ساجد اس کے ساتھ ایک مکان کے سامنے پہنچ گیا۔ سیر

مالی طور پر آسودہ تھا اس لیے اس نے ایک کمرہ کرایہ پر لینے کے

بجائے پورا مکان کرائے پر لے لیا تھا۔ وہ اکیلا رہتا تھا اور اسے

کوئی فکر نہیں تھی۔ کیرا مین کے ساتھ بھی اس کے اچھے مراسم

تھے۔ تیل دینے کے بعد جب دروازہ کھلا تو ایک خوبصورت

چہرہ نمودار ہوا، اس نے جونہی کیرا مین کی طرف دیکھا اس کا

چہرہ جل اٹھا۔ اس نے گرم جوشی سے اسے اپنے گلے سے

لگالیا۔

”یہ ساجد ہے۔ میرا دوست ہے۔ ابھر سے گزر رہے

تھے تو سوچا آپ سے ملنے جائیں۔“

”یہ آپ نے بہت اچھا کیا۔ میں نے اپنے ہاتھ سے

کڑا ہی گوشت تیار کیا ہے۔ مل کر کھانے میں مزہ ہی بڑھ جائے

گا۔“ سیر خوش دلی سے بولا اور دونوں کو اندر لے گیا۔

اس کے ہاتھ کی کڑی لڑائی واقعی لذت تھی۔ دونوں نے

میں تھا۔ یہی جنون اسے اس شہر میں لے آیا تھا۔

ساجد نے دن رات کوشش کی اور بڑے بڑے

پروڈیوسرز سے ملا لیکن اسے کسی نے کام نہیں دیا۔ کمرے کا

کرایہ اور کھانے پینے کے خرچ کے لیے ساجد ساتھ ساتھ

مزدوری بھی کرتا رہا۔

ساجد کی ایک کیرا مین سے اچھی علیک سلیک ہو گئی

تھی۔ وہی اسے ایک دن ایک پروڈیوسر کے پاس لے گیا۔ اس

پروڈیوسر نے ساجد کو سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا اور پھر اپنے

پائنتر کی طرف نگاہیں گھما لیں۔ دونوں ایک عرصے سے قلمیں بنا

رہے تھے اور اب وہ ہیرو کے لیے بالکل نیا چہرہ لے کر قلم

بنانے کی تیاری میں تھے۔ سب کچھ مکمل تھا..... بس نئے ہیرو

کی تلاش تھی۔

”لڑکا تو واقعی بنانا ہیرو ہے۔“ ایک نے تعریف کی۔

”اس میں تو کوئی شک نہیں ہے۔“ دوسرے نے بھی سر

ہلایا۔

”اب کیا کریں؟“ پہلے والے نے اپنے پائنتر کی طرف

سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”ہم نے اس سے پہلے جس لڑکے کو دیکھا ہے وہ بھی اس

سے کم نہیں ہے۔ اس کے اندر اداکاری کی صلاحیتیں بھی

لا جواب ہیں۔“ دوسرے نے کہا۔

”اس کی اداکاری دیکھ لیتے ہیں۔“ اسی وقت ساجد کی

اداکاری کا امتحان شروع ہو گیا۔ کئی سالوں سے ساجد نے آئینے

اور دوستوں کے سامنے اداکاری کی تھی اس لیے ساجد کو اداکاری

کا امتحان دینے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ اس نے ہر طرح

سے ان کو مطمئن کر دیا۔

”لڑکا تو اچھا ہے مگر ہم اس سے پہلے آنے والے لڑکے

کو زبان دے چکے ہیں۔ ہماری نئے ہیرو کی تلاش اس لڑکے پر

ختم ہو گئی تھی۔“ پہلے نے کہا تو ساجد کے اندر جس امید نے جنم

لینا شروع کیا تھا، دم توڑنے لگی۔ اس نے سوالیہ نگاہوں سے

دونوں کی طرف دیکھا اور بولا۔

”سر آپ مجھے موقع دیں۔ یقین کریں میں ایسی

اداکاری کروں گا کہ آپ کو میرے انتخاب پر پریشانی نہیں

ہوگی۔ میں اپنی اداکاری سے سب کو حیران کر دوں گا۔“

”تمہاری بات ٹھیک ہے لیکن جسے ہم نے زبان دی

ہے اب اس کو انکار کر کے اس کا دل نہیں توڑیں گے۔“ دوسرا

بولا۔

پہلے نے کہا۔ ”تم ایسا کرو انتظار کر لو۔ چار ماہ کے بعد

ہماری ایک اور قلم شروع ہونے والی ہے اس کے لیے تم فائل

پہچان

ساجد نے دائیں بائیں دیکھا، سامنے میز پر ایک پلیٹ میں سیب اور چھری رکھی تھی۔ ساجد یہ جان گیا تھا کہ سیر بہت ڈرپوک ہے۔ وہ تیزی سے اٹھا اور اس نے چھری اٹھا کر سیدھے ہوئے سیر کو پھر دیوچ لیا۔ سیر نے اس کے ہاتھ میں چھری دیکھی تو وہ کانپ گیا۔

”خدا کے لیے مجھے کچھ مت کہنا..... میرے پاس اور بھی پیسے ہیں وہ بھی لو..... گاڑی کی چابی وہ سامنے رکھی ہوئی ہے۔“

ساجد نے اس کی منت ساجت اور خوف کو پس پشت ڈالتے ہوئے اسے اچھی طرح سے دیوچا اور تیز رفتاری کی نوک سے اس کے گال پر کلن سے لے کر غصہ کی تھک اور اسی طرح دوسرے گال پر لکیریں کھینچ دیں۔ اس کا خوبصورت چہرہ خون میں نہا گیا۔ تکلیف سے سیر رونے لگا۔ پھر ساجد نے اس کے جسم پر بھی ایسے ہی زخم کے نشان لگا دیے جو گھر کے نہیں تھے لیکن تکلیف دہ تھے۔ ساجد نے اسے چھوڑا اور اس کی الماری سے کپڑے باہر پھینکتے گئے۔ پھر اس نے ایک جگہ سے پیسے اٹھائے کچھ دوسرا سامان ادا کر پھینکا اور دروازے کے پاس جا کر اس نے آہستہ سے ایسے کہا جیسے کوئی باہر کھڑا ہو۔

”سیر..... باہر کوئی ہے تو نہیں..... چلو پھر.....“ ساجد کہہ کر باہر نکلا اور پھر اسے ایک طرف چلا گیا۔ آگے جا کر اس نے چہرے سے رومال اتار دیا اور المیہ خان سے چلتا ہوا اپنے گھر تک پہنچا اور چپ چاپ سو گیا۔

☆☆☆

”ارے بابا تم نے مزاحمت کیوں کی..... جو لے جانا چاہتا تھا وہ لے جاتا۔ تم نے اپنے چہرے کا ستیاناس کر لیا۔ اب ہم اس چہرے کا کیا کریں گے۔ کئی دن لگ جائیں زخم سیرنے میں اور نشان جانے تک جائے۔“ سیٹھ جی نے اپنا سر ہینٹے ہوئے کہا۔

”میں نے مزاحمت نہیں کی تھی۔“ سیر کے لہجے میں ابھی تک خوف تھا۔ مگر سیٹھ اس کی بات سامنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اسے اپنی قلم کی نگر ہو گئی جس کا افتتاحی سیٹ لگ چکا تھا، پرسوں اس کی شوگرنگی، سب انتظامات مکمل تھے۔ جس برس میں نے اس قلم پر پیسہ لگایا تھا اس نے اپنے دوستوں کو کارڈ بھی تقسیم کر دیے تھے۔

”ڈاکٹر صاحب کہہ رہے ہیں پندرہ مہینوں میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ سیر نے کہا۔

”پندرہ مہینوں.....؟“ سیٹھ نے سنتے ہی اسے ایسے کھورا جیسے سیر نے اسے ایسے الفاظ کہہ دیے ہوں جو اس کی

کھانا کھایا اور انگلیاں چاٹتے رہ گئے۔ اس کے بعد چائے آگئی اور چائے کے دوران بہت دیر تک ان میں باتیں ہوتی رہیں۔ ساجد نے بہت کلمات کی تھی لیکن وہ اس سے بہت متاثر ہوا تھا اور اس کی زندگی پر اسے رنگ بھی آ رہا تھا۔ ساتھ ہی اس کے دل میں یہ شکوہ بھی جنم لے رہا تھا کہ اس کے پاس تو سب کچھ ہے اور پھر بھی اسے قلم میں کام ملا ہے جبکہ میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے اور مجھے انتظار کی سولی پر لٹکا دیا گیا ہے۔

رات کافی ہو چکی تھی جب وہ دونوں مشکل سیر سے اجازت لے کر باہر نکلے۔ ورنہ سیر کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ دونوں جائیں۔

وہاں سے نکل کر ساجد اندری سے اندر غصے میں تھلانے لگا اور اپنی قسمت کو مسلسل کوٹنے لگا۔ وہ پہچان جانا چاہتا تھا اور قسمت اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ سیر اٹھن نے اسے اس جگہ اتارا جہاں ساجد رہتا تھا اور وہاں سے چلا گیا۔ اسی وقت ساجد نے فیصلہ کیا اور سیر کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

وہ پھول ہی اس کے گھر تک پہنچا اور اس نے دائیں بائیں دیکھا۔ گلی سنسان تھی۔ ساجد نے اپنی جیب سے رومال نکالا اور منہ پر باندھ لیا۔ وہ دروازے کے پاس پہنچا اور اس نے دستک دی۔ اندر سے سیر کی آواز آئی۔

”کون ہے.....؟“

”سیٹھ جی نے اسکرپٹ دے کر بھیجا ہے۔“ ساجد نے اپنی آواز بدل کر جواب دیا۔

سیر کے چہرے پر حیرت اٹھ آئی مگر اس نے دروازہ کھول دیا۔ ساجد نے نکلی ہی تیزی سے اسے دیوچ لیا اور اندر لے جاتے ہوئے اپنے بڑی شوگر سے دروازہ بند کر دیا۔ سیر کی زندگی لڑائی جھگڑوں سے دو گزری تھی۔ وہ پڑھنے لکھنے والا بچہ تھا، کالج میں بھی اس کی سرگرمیاں ایسی نہیں تھیں، اور جب وہ تعلیم مکمل کر چکا تو بھی اس کے اندر بھی ایسی تحریک پیدا نہیں ہوئی تھی کہ وہ حقیقی زندگی میں بھی سیر رہے۔ وہ صرف پردہ آسکرین پر ہی رہتا چاہتا تھا۔ اس لیے جب ساجد نے اسے دیوچا تو اس کے ہاتھ پیر پھول گئے اور خوف سے اس کا دل دھڑکنے لگا۔

ساجد نے اسے فرش پر گرا دیا اور اس کے سینے پر سوار ہو کر درشت لہجے میں بولا۔ ”کیا کچھ ہے تیرے پاس..... جلدی بول..... کہاں رکھا ہے؟“

”سامنے کی الماری میں پانچ ہزار روپے پڑے ہیں۔ کچھ پیسے میرے بنوے میں ہیں۔“ خوفزدہ سیر نے ایک دم سے سچ اگل دیا۔

کر ساجد کی طرف بڑھا دیے۔ ساجد نے اس فلم کے لیے ہی تو سب کچھ کیا تھا۔ اس نے کچھ تذبذب کے بعد ایکری منٹ ہیچہ پر سائن کر کے پیسے اٹھالے۔

☆☆☆

فلم کی شوٹنگ شروع ہو گئی تھی۔ سیٹ پر جو بھی ساجد کی اداکاری دیکھتا، وہ اس کی تعریف ضرور کرتا۔ ساجد ہر سین کو بڑی خوبصورتی اور محنت سے کر رہا تھا۔ فلماز جوڑی بھی اپنے اس انتخاب پر بہت خوش تھی۔ دن رات فلم کی شوٹنگ ہو رہی تھی۔ دونوں نے اسے ریکارڈنگ میں مکمل کرنا تھا۔

فلم بچاس فیصد مکمل ہو گئی تھی۔ اس فلم پر جس بزنس میں کا پیسہ لگ رہا تھا اچانک اس کے علم میں آیا کہ فلماز جوڑی اسے دھوکا دے رہی ہے اور اسی طرح لگ نہیں رہا تھا وہ اس سے بڑی ہوشیاری سے بخور رہے ہیں۔ اس نے خاموشی سے اور بھی ثبوت جمع کیے اور ایک دن وہ جھٹ پڑا۔

اچھا صاحبان! گناہ ہو گیا۔ بات گالی گلوچ سے ہاتھ بائی اور پھر ایک دوسرے کے سامنے بدحاش کھڑے کرنے تک پہنچ گئی۔ پھر معاملہ تھانے پہنچ رہی تک جا پہنچا۔ فلم کی شوٹنگ اسی جگہ رک گئی۔ سب سے زیادہ پریشانی ساجد ہوئی۔ اس کا کیریئر ڈیوں میں بند ہو گیا تھا۔ فلماز جوڑی کیونکہ بہت ہوشیار تھی اس لیے انہوں نے ایک ثبوت بھی نہیں چھوڑا تھا اور الٹا بزنس میں پر ایک مقدمہ بنادیا۔ بزنس میں ایسی الجھن میں پڑا کہ اسے سب کچھ ختم کر کے، صحافی مانگ کر اور صبح گھر کرنا رہ گیا ہوتا پڑا تھا۔

فلماز جوڑی پہلے ہی پیسہ بنانے کے چکر میں تھی۔

... وہ فلم ڈیوں میں چلنے لگنے لگا۔ کوئی فرق نہیں پڑا۔ ساجد سب کا منہ دیکھتا رہا۔ فلم کی شوٹنگ شروع ہوتے ہی اس نے اپنے گھر والوں کو بھی بتادیا تھا اور گھر والوں نے رشتے دار اور محلے میں بھی بات پھیلا دی تھی۔ جب فلم بند ہوئی اور ساجد کی فلم ریلیز ہونے کی کوئی خبر نہ آئی تو ساجد کو اس کے بھائی کا فون آیا اور اس نے بتایا کہ اب تو رشتے دار دارو محلے دارو نظر کرنے لگے ہیں۔ ساجد تھلانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا، اسے اپنی بچکان بنانے کا موقع ملا تھا اور وہ بھی ختم ہو گیا تھا۔

سیر ٹھیک ہو چکا تھا۔ اس نے فلم میں کام شروع کر دیا تھا۔ اس کی فلم بن کر ریلیز بھی ہوئی اور کامیابی سے ہمکنار بھی ہو گئی۔ ساجد ساجد ہاتھ ہی ہاتھ لگایا۔

ساجد کے پاس کوئی کام نہیں تھا۔ وہ پھر دھوری اور کسی فلم کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ اس نے ڈراموں میں بھی کوشش شروع کر دی۔ اس نے کئی پروڈکشن کمپنیوں کو اپنی تصاویر

پرداشت سے باہر ہوں۔ ”فلم میں ایک ایک دن اہم ہوتا ہے۔ سیٹ کا کامیاب، محلے کے اخراجات..... اسے بابا چندرہ میں دن تو برباد کر دیں گے ہم کو.....“ سیٹ اٹھا اور سر ہلاتا ہوا پریشانی کے عالم میں باہر نکل گیا۔ سمیر ناچاری سے بند دروازے دیکھتا رہ گیا۔

فلماز جوڑی کی پریشانی بڑھ گئی تھی۔ سارا دن گزر گیا تو رات کو ایک کو یاد آیا کہ ساجد نام کا نوجوان بھی ان کے پاس آیا تھا۔ فوراً کیراٹین سے رابطہ کیا گیا۔ اس نے ساجد سے رابطہ کیا تو ساجد نے سن کر کہا۔

”گھر والے میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔ کل لوکی والے مجھے دیکھنے کے لیے آ رہے ہیں۔ اس لیے میں اپنے شہر جا رہا ہوں۔“

”پہلے کچھ بن تو پھر شادی بھی کر لینا۔“ کیراٹین جلدی سے بولا۔

”بابا کچھ تو ساکارو بار ہے۔ یہاں چانس مل نہیں رہا تو میں نے امی کی خدمت کے آگے ہاں کر دی۔“

”اتنا بڑا چانس مل رہا ہے اور تم اسے کھوتا چاہتے ہو؟“

”دیکھو بھائی میں نہیں چاہتا کہ کسی کے حق پر ڈاکا ڈالوں۔ سچ یہ ہے کہ تم نے مجھے بتایا تو میرا دل خوشی سے اچھل پڑا مگر یہ اسی کا حق ہے میں اس کی فلم نہیں کروں گا۔ خواب کیا ہوتے ہیں یہ کوئی مجھ سے پوچھے کہ جب خواب کی تعبیر مل رہی ہو اور میں وقت پر کچھ ایسا ہو جائے کہ تعبیر کوسوں دور چلی جائے تو اس تکلیف کا اعزازہ عام آدمی نہیں کر سکتا۔ میں اسی لیے اٹکا ہوا

کر رہا ہوں اور کوئی وجہ نہیں ہے۔“ ساجد جلد ہی دل میں خوش تھا مگر اس نے اپنے چہرے سے اس خوشی کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ اٹا وہ سمیر کے ساتھ ہر دوری جتا رہا تھا۔

”تم ان باتوں کو چھوڑو اور میرے ساتھ چلو۔ ہمیں یہ چانس مل رہا ہے اور یہ ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔“ کیراٹین نے اس کا ہاتھ پکڑا اور باہر کی طرف کھینچا۔ ساجد باہل ناخواستہ چلنے کی اداکاری کرتا ہوا اس کے ساتھ چل پڑا۔

جب وہ فلماز جوڑی کے دفتر پہنچا تو دونوں اسے دیکھ کر مسکرا دیے۔ کیراٹین نے پہلے دونوں کو بتایا کہ ساجد آنے کو تیار نہیں تھا اور نہ آنے کی وجہ بتائی تو ایک فلماز بولا۔

”تمہاری سوچ واقعی بہت اچھی ہے لیکن ہم نے سمیر کو اس فلم کے لیے ریزرو کر لیا ہے جو ہم دو، تین ماہ کے بعد شروع کرنے والے ہیں۔ تب تک وہ بالکل ٹھیک بھی ہو جائے گا۔ اس لیے یہ فلم تم کرو گے۔“ اس کے ساتھ ہی دوسرے فلماز نے دروازے سے ایکری منٹ ہیچہ اور اس پر چند ہزار کے نوٹ رکھ

سمجھیں لیکن اسے کہیں کوئی چانس نہیں ملا۔

اب وہ جس کمرے میں رہتا تھا اس نے بھی صاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ وہ یہاں سے چلا جائے۔ اس نے ایک بیگ میں اپنا سامان پیک کر لیا تھا اور بارش خٹنے کے انتظار میں بالکونی میں کھڑا تھا۔

ساجد سوچوں میں مستغرق تھا کہ عقب سے اس کو جمان کی آواز آئی جس کا وہ کمرہ تھا۔

”ساجد..... بارش رک گئی ہے، اپنا سامان اٹھاؤ اور جاؤ۔“

ساجد اس کی آواز سن کر چونکا۔ اس نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور بالکونی سے جانے کے لیے ابھی پلٹا ہی تھا کہ عین وقت پر باہر ایک کارر کی اور اندر بیٹھے ایک آدمی نے اپنا سر باہر نکال کر پلٹنا آواز میں پوچھا۔

”بھائی صاحب..... یہاں کوئی ساجد نام کا لڑکا رہتا ہے۔ آپ جانتے ہو وہ کہاں ملے گا؟“

ساجد نے سنا تو چونک کر پلٹا اور پوچھا۔ ”کیا کام ہے اس سے؟“

”بھائی کام اس سے ہے تو اسے ہی بتاؤں گا۔ آپ کو پتا ہے اس کا تو بیٹا دردناک ہے جانتا ہوں۔“ وہ آدمی بڑا سادہ بنا کر بولا۔ اس کے لہجے سے صاف عیاں تھا کہ ساجد کا یہ پوچھنا اسے ناگوار گزرا ہے۔

”میں ہی ساجد ہوں۔“ ساجد نے بتایا۔

”آپ ہی ساجد ہو.....؟ کئی بات ہے؟ نیچے آئیے گا ڈرا۔“ اس نے ساجد کو فور سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”میں ابھی آیا۔“

”چھہ پتچا تو کار والا شخص کار سے باہر نکل کر کھڑا تھا۔ اس نے ساجد کو اوپر سے لے کر نیچے دیکھا اور بولا۔

”گئے تو تم ہی ساجد ہو۔“

”میں ہی ساجد ہوں۔ آپ کہاں سے آئے ہیں اور کیا کام ہے؟“ ساجد بولا۔

”آپ نے جو رابطہ نمبر دیا تھا وہ مسلل بند جا رہا تھا اس لیے مجھے آنا پڑا۔ میڈم دردناک نے آپ کو بلوایا ہے۔“ اس شخص نے بتایا تو ساجد کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔

میڈم دردناک ایک بہت بڑی ڈراما پروڈکشن کی مالک تھیں۔ اس کے ادارے کا ایک نام تھا اور بیک وقت کئی ڈراما سیریل مختلف چینلز پر دکھائی دیتے تھے۔ چند ماہ قبل اس ادارے کو نئے چہروں کی تلاش تھی تو انہوں نے آڈیشن کے

پہچان

لیے کال کی تھی۔ ساجد نے بھی اپنی تصویریں بھیجی تھیں اور وہ بھی سیکڑوں لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ آڈیشن دے کر آیا تھا۔ اسے کہا گیا تھا کہ اسے آگاہ کر دیا جائے گا۔ وقت اسی طرح گزر گیا تھا اور ساجد کو یقین ہو گیا تھا کہ اس کی قسمت اس جگہ بھی ساتھ نہیں دے گی اور وہ بھول بھی گیا تھا۔

”میڈم دردناک نے بلوایا ہے.....؟“ ساجد خوشی سے بول نہیں پارہا تھا۔

”میرے ساتھ چلیں..... آپ کی قسمت چمک اٹھی ہے۔ ایک میکا سیریل کی تیاری ہو رہی ہے۔ آپ نے آڈیشن دیا تھا۔ اس آڈیشن کی بار بار ویڈیو کچھ کران کی ایک ہی رٹ تھی کہ یہ کردار کرے گا تو یہ لڑکا کرے گا۔“ یہی سچ تو یہ ہے کہ آپ نے اس آڈیشن میں اداکاری کے کئی شے دیئے تھے اور ہر شے لا جواب تھا۔ ”وہ آدمی ڈراما ٹیگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے بتا رہا تھا۔ ساجد اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔

”مجھے واقعی کام مل جائے گا؟“

”جناب مل جائے گا نہیں..... آپ کو کام مل گیا ہے۔ بڑا اہم کردار ہے۔ کردار بھی کیا لکھا ہے۔ جاندار کردار..... جاندار مکالمے اور گیت آپ ایسا کہ اسکرین پر تھمکے بچا دے۔ اس کریکٹر کو لینے کے لیے بہت سے پرانے اداکار کوشش میں تھے۔ لیکن میڈم دردناک کو جانے آپ میں کیا دکھائی دیا تھا کہ ان کی نظر اور فیصلہ آپ پر ٹھہر گیا تھا۔“ ڈراما کو شاید بولنے کی زیادہ عادت تھی۔

”میں بھی ایسی اداکاری کروں گا کہ وہ مایوس نہیں ہوں گی۔“ ساجد نے کہا۔

”اب تو آپ کو اس کردار میں جان بھرنے کے لیے اپنی جان کی بازی لگانی پڑے گی۔“ ڈراما میں نے ایک بہت بڑی عمارت کے سامنے گاڑی روک دی اور بولا۔ ”آ جاؤ باہر.....“

ساجد نے اپنا ہاتھ بیگ کی طرف بڑھایا جو وہ اپنے ساتھ ہی لے آیا تھا۔ اس نے پچھلی سیٹ پر رکھا تھا تو ڈراما میں بولا۔ ”اسے پر ڈارہے دو.....“

دونوں گاڑی سے باہر نکلے اور اس عمارت کے اندر چلے گئے۔ وہ ساری عمارت اس پروڈکشن ہاؤس کی ملکیت تھی۔ اس جگہ دفاتر بھی تھے اور شوٹنگ کے لیے فلوور بھی بنے ہوئے تھے۔ اندر جاتے ہی ساجد کو ہاں چھل چھل بھی دکھائی دی اور اسے لگا جیسے وہ کسی اور ہی دنیا میں آ گیا ہو۔

ڈراما میں اسے ایک کشادہ کمرے میں لے گیا۔ ایک بڑی سی میز کے پیچھے پرکشش عورت براجمان تھی۔ اس کا نام

میڈم دردانہ تھا۔ ٹارمیاں نے اندر جاتے ہی ساجد کی طرف اشارہ کر کے بتایا۔

”جس کی آپ کو تلاش تھی، اسے لے آیا ہوں۔“

میڈم دردانہ نے مسکرا کر اسے دیکھا اور بولی۔ ”بہت جاندار اداکاری کرتے ہو..... میں تو بہت متاثر ہوئی آپ سے..... میری سیریل میں دو کردار تھے۔ دونوں آپ پر فٹ تھے۔ ان دونوں کرداروں کو آپ سے بہتر کوئی دوسرا نہیں کر سکتا تھا لیکن ایک کردار میں نے ریحان کو دے دیا ہے، ریحان کا بھی اسی دن ایڈیشن ہوا تھا۔ وہ بھی کمال کی اداکاری کرتا ہے، دوسرا کردار میں آپ کو دے رہی ہوں۔“

”بہت شکریہ میڈم۔“ ساجد مسکرایا۔

”ہمارے پاس وقت کم ہے۔ میں آپ کو اسی گیت آپ میں دیکھنا چاہتی ہوں۔“ میڈم دردانہ نے کہا اور ٹارمیاں کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”انہیں میک آپ روم میں لے جائیں۔ حسن کو میں نے سب سمجھا دیا ہے۔“

”جی بہتر میڈم۔“

میڈم کی نگاہیں ساجد کی طرف گھوم گئیں۔ ”کردار کے بارے میں بعد میں دیکھیں کریں گے۔ ابھی آپ میک آپ روم میں جائیں۔“

ٹارمیاں اسے باہر لے آیا اور باہر آتے ہی وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”آپ کی قسمت چمک اٹھی ہے بھائی..... آپ کی ہی نہیں بلکہ ریحان کا ستارہ بھی چمک اٹھا ہے۔ دونوں کردار بڑے جان دار ہیں۔“

باتوں میں ایک کرا آگیا۔ وہ اسے اندر لے گیا۔ میک آپ روم بہت کشادہ تھا۔ وہاں ایک ہلچل مچی ہوئی تھی۔ ٹارمیاں اسے ایک نوجوان کے پاس لے گیا اور اسے بتایا کہ میڈم نے بھیجا ہے۔ سکندر حیات کا گیت آپ کرنا ہے۔

”اچھا تو یہ ہے ان کا انتخاب ہے۔ میرے ساتھ آجائیں۔“ حسن اس کا بازو دھڑکڑایک طرف لے گیا۔

☆☆☆

طویل وقت گزرنے کے بعد جب میک آپ مین ایک طرف ہٹا اور ساجد نے اپنے آپ کو سامنے آئیے میں دیکھا تو وہ چونک گیا۔ اس کی خیرہ نگاہیں سامنے آئیے پر تنہم ہوئی تھیں۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ جسے وہ آئیے میں دیکھ رہا ہے، وہ وہی ہے۔

اس کے سر پر ٹوٹی جی اور چہرے پر کھنٹی داڑھی موٹھیں تھیں۔ اس کی مٹیوں بے ترتیب بالوں سے عجیب سی نگ رہی تھیں۔ کھنٹی داڑھی موٹھ اور بے ترتیب مٹیوں کی وجہ سے اس کا

اصل چہرہ اس میں دب گیا تھا۔ اسے دیکھ کر کوئی نہیں پہچان سکتا تھا کہ وہ ساجد ہے..... ساجد اگر کسی کو یقین بھی دلاتا تو شاید ہی کوئی مانتا۔ اس کے باوجود اس کا گیت آپ بہت زبردست اور رعب دار تھا۔

دراصل اس ڈراما سیریل میں ساجد کا کردار ایک سخت دل شخص کا تھا اس کی اداکاری کا سارا زور اس کی باڈی لئیکوئٹ اور آواز میں تھا۔

جب اسی حالت میں اسے میڈم دردانہ کے سامنے کھڑا کیا تو وہ بھی اسے دیکھ کر حیرت رہ گئیں اور خوش بھی ہوئیں۔ وہاں ایک اور نوجوان بیٹھا تھا اس کا نام ریحان تھا اور وہ اس کے تہ مقابل کردار کر رہا تھا۔

میڈم دردانہ نے دونوں کی ریسرسل کرائی اور پھر کمرے کے ان سے سین بھی کرائے اور دونوں کی اداکاری سے وہاں پر موجود سبھی خوش ہوئے ہی لیکن میڈم کی خوشی دیدنی تھی۔ اس نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

”زبردست..... زبردست تم دونوں کمال کر دو گے۔ میں بالکل مطمئن ہوں..... اگر ریحان کسی وجہ سے سیریل کرنے سے انکار کر دے گا تو اس کی جگہ ساجد وہ کردار کرے گا اور ساجد کی جگہ ناصر خان آجائے گا۔“

”میں کیوں انکار کر دوں گا۔ میں اس سیریل کے لیے سو فیصد مستجاب ہوں۔“ ریحان جلدی سے بول پڑا۔

”میں نے ایسے ہی ایک بات کی تھی۔“ میڈم دردانہ نے کہہ کر ٹارمیاں کو ہدایت کی کہ وہ ان سے انگری منٹ سائن کرائے اور ساجد کو اسکرپٹ دے کر اس کا کردار اچھی طرح سے سمجھا دے۔

ٹارمیاں نے انگری منٹ سائن کرایا، اسے اچھی طرح سے کردار سمجھایا وہ کردار واقعی بہت طاقتور تھا۔ اس کے تہ مقابل کردار ریحان کا تھا۔ دونوں ڈراما سیریل میں ایک دوسرے کی ضد تھے۔ سب کچھ ٹھیک تھا لیکن ساجد کی پریشانی یہ تھی کہ وہ گیت آپ میں چھپ کر اپنی پہچان نہیں بنائے گا۔ کوئی یقین نہیں کرے گا کہ یہ ساجد ہی ہے۔

☆☆☆

ٹارمیاں نے میڈم کے کہنے پر ساجد کو رہنے کے لیے ایک کمرہ..... اور کچھ پیسے بھی دے دیے۔ چند ہی دنوں میں ساجد اور ریحان کا پہلا لیکن شوٹ ہونا تھا۔

اس کمرے میں گلی گھڑی رات کے تین بج رہی تھی اور ساجد کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ بھی سوچے جا رہا تھا کہ وہ اس کردار کو کرے گا لیکن اسکرین پر دیکھ کر کوئی اسے نہیں پہچانے

وجہ یہ تھی کہ وہ صرف اور صرف اپنے بارے میں سوچ رہا تھا۔
ساجد نے بہت دیر تک جاگنے کے بعد اپنے منصوبے کو
حتمی شکل دی اور بستر پر لیٹ گیا۔

☆☆☆

ساجد دوسرے دن ریحان سے ملنے اس کے گھر چلا
گیا۔ ساجد نے کہا۔ ”میں آپ کے پاس اس لیے آیا ہوں کہ
ہم اس سیریل میں باپ بیٹے کا ہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ میں
چاہتا تھا کہ اپنے کردار پر ڈسکس کریں کہ ہم اسے کیسے
بہتر سے بہتر کر سکتے ہیں۔“

”میں خیال تو میرے دماغ میں بھی تھا۔ میں بھی تم سے ملتا
چاہتا۔ اچھا تو کہ تم میرے پاس آگئے۔“ ریحان خوش ہو کر بولا۔
”میں تو سوچ رہا تھا کہ ایسا میں نے ہی سوچا ہے۔“
ساجد کے چہرے پر بھی خوشی آگئی۔ ”آپ کوئی مناسب وقت
دے دیں تاکہ ہم چند گھنٹے بیٹھ کر ڈسکس کر لیں۔“

”آج دوپہر کی شادی ہے میرے خاندان میں۔ شام
سات بجے میں شادی والے گھر سے نکلوں گا۔ اور واپس گھر
آ جاؤں گا تم یہاں آ جانا۔“ ریحان نے سوچتے ہوئے کہا۔
”اس گھر سے باہر اگر ہم ملیں تو زیادہ بہتر ہے۔ مجھے جو
کمر ملا ہے۔ وہ بہت کشادہ ہے اور ہم سکون سے وہاں اپنا کام
کر سکتے ہیں۔“

”ہاں وہ جگہ میں نے دیکھی ہے۔ وہاں ہمیں کوئی
ڈسٹرب بھی نہیں کرے گا۔“ ریحان نے کہا۔

”آپ جس جگہ شادی پر جا رہے ہیں، وہ جگہ کہاں
ہے؟“

”میں ماڈل ٹاؤن اے بلاک جا رہا ہوں۔“
”اس وقت میں اسی جگہ ہوں گا۔ وہاں ایک جم ہے اور
میں نے وہ جو ان کیا ہوا ہے۔ آپ مجھے بتائیں میں کس جگہ
آ کر آپ کی گاڑی میں بیٹھ جاؤں۔“ ساجد بولا۔
”یہ تو اور بھی اچھا ہے۔ تم ایسا کرنا اس کالونی کے باہر
نکون گراؤنڈ مشہور ہے۔ وہاں گیٹ کے پاس آ جانا۔“
”میں ضحیک ساتھ بیٹھے اس جگہ موجود ہوں گا۔“ ساجد
کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆☆

ساجد کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بیگ تھا اس کے اندر
اس نے ری اور کچھ دوسرا سامان رکھا تھا۔ ساجد سات بجے سے
بھی پہلے اس جگہ موجود تھا۔ سوا سات بجے کے قریب ریحان کی
گاڑی گیٹ سے کچھ آگے کھڑی ہو گئی۔ ساجد اس گاڑی سے
کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ ٹکون گراؤنڈ کے باہر شادو نار ہی کوئی

گا۔ کہیں اس کا انٹرویو ہو گا تو اس کا چہرہ سامنے آئے گا اور لوگوں
کو پتا چلے گا کہ یہ کردار اس نے کیا تھا۔ اسکرین پر اسل چہرے
کے ساتھ دیکھ کر جو تاثر بن رہا ہے، وہ نہیں بن سکا۔ اس کا بھائی
پہلے ہی خون کر کے بتا رہا تھا کہ رشتے دار اور محلے دار اب طنز
کرتے ہیں۔ ان کی باتیں ایسی ہوتی ہیں جیسے وہ چہرہ چھاڑ دیں
گی۔ ساجد کو اپنی پہچان بتانی تھی۔ جو کردار ریحان کر رہا تھا وہ
کردار ایسا تھا کہ اسکرین پر آتے ہی ساری دنیا اس کا چہرہ دیکھ
لیتی اور اس کی پہچان بن جاتی۔

اس بات نے ساجد کو پریشان کر دیا۔ عجیب بات تھی کہ
کامیابی ملنے کے باوجود اسے خوشی نہیں تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ
وہ اپنی پہچان کے لیے اب کچھ بھی کرے گا۔ یہ اس کے پاس
آخری چانس تھا اور اس چانس کو وہ اپنی پہچان بنانا چاہتا تھا۔
اس نے ایک بار پھر یہ فیصلہ کیا جو اس نے سیر کے لیے کیا تھا۔
اس سوچ نے ساجد کے دل کی دھڑکن تیز کر دی۔ وہ
ٹھان چکا تھا کہ کچھ بھی ہے، ریحان کو اس کردار سے ہٹا کر وہ یہ
کردار کرے گا کیونکہ میڈم کے الفاظ تھے کہ اگر کسی وجہ سے
ریحان اس کردار کو کرنے سے انکار کر دے گا تو اس کے پاس
سب کا متبادل ہے۔ اس کی جگہ ساجد آ جائے گا اور ساجد کی جگہ
ناصر خان لے لے گا۔

ساجد کمرے میں بیٹھے ہوئے سوچتے لگا کہ وہ کیا
کرے۔ اس کے دماغ میں ایک ہی بات آ رہی تھی کہ وہ
ریحان کو اغوا کر کے کہیں دور باندھ دے جہاں وہ خود ہی مر
کھپ جائے۔ وہ اس کردار اور پہچان کے لیے سفاک ہو گیا
تھا۔ زندگی اس کے چہرے سے عیاں ہونے لگی تھی۔ وہ اتنا
خود غرض ہو گیا تھا کہ اس نے اس کے سوا کچھ اور سوچنا گوارا بھی
نہیں کیا تھا۔

ساجد نے کچھ دن پہلے ریلوے ٹریک پر بھی کام کیا تھا۔
وہ ٹریک آبادی سے ہٹ کر تھا۔ اس کے دماغ میں ویران
جگہ تھی جو درختوں اور چھاڑیوں نے گھیری ہوئی تھی۔ اس ٹریک
پر اس نے ہر وقت مال گاڑیاں کھڑی دیکھی تھیں۔ ایک مزدور
نے بتایا تھا کہ یہ ٹریک مصروف نہیں ہوتا، یہاں مال گاڑیاں
آ کر کھڑی ہو جاتی ہیں اور جب ان کو راستہ صاف ملتا ہے تو چلی
جاتی ہیں اور بھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ وہاں پر کوئی مال گاڑی
دکھائی نہ دی ہو۔

ساجد نے سوچا، وہ ریحان کو اس جگہ لے کر کسی مال
گاڑی کے ڈبے میں باندھ دے گا۔ گاڑی چل پڑے گی اور
ریحان کی اس ڈبے میں موت ہو جائے گی۔ وہ قہر سے تم ہو جائے
گا۔ ساجد کو یہ سب سوچتے ہوئے کوئی خوف نہیں آیا تھا اس کی

آنکھیں کیوں باندھ رہے ہو؟

”کیوں بند رکھو؟“ ساجد نے اسے ڈانٹا پھر اسے باہر نکلنے کے لیے کہا اور اس کے ساتھ ہی باہر نکل آیا۔ ریحان آگے اور ساجد پیچھے تھا۔ اس نے پستول اس کی پسیلوں سے لگا رکھا تھا اور ایک ہاتھ سے اس نے اس کا دوسرا بازو پکڑا ہوا تھا جس کی مدد سے ریحان چلتا جا رہا تھا۔ چھوٹا بیگ اس نے اپنے کندھے سے لٹکا ہوا تھا۔

دور تک سکوت اور اندھیرا تھا۔ ساجد اسے مال گاڑی کے ایک ایسے ڈبے کے پاس لے گیا جو کھلا تھا اور خالی تھا۔ اس کے فرش پر گھاس پھوس پڑی تھی۔ ساجد نے بیگ سے ری نکال کر پہلے اس کے ہاتھ پیچھے کی طرف باندھے اور پھر اس کی مدد کر کے اسے ڈبے پر چڑھا دیا۔ اندر اندھیرا تھا۔

”یہ آپ مجھے کہاں لے آئے ہو؟“

”چپ رہو.....“ ساجد نے کہا تو ریحان نے آواز کی سمت دیکھنے کی کوشش کی لیکن ایک تو اندھیرا اور اوپر سے اس کی دونوں آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھی ہوئی تھی۔

”مجھ سے میری گاڑی بھی لے لو اور مجھے چھوڑ دو۔“

ریحان نے استدعا کی۔ ساجد نے کوئی جواب نہیں دیا اور اس کے پیرو باندھ کر اسے نیچے لٹا دیا۔ اس نے ریحان کو بڑی مضبوطی سے باندھا تھا اور وہ اس کا ایک سر ڈبے کے اندر ایک راڈ سے باندھ دیا تھا۔ اس کے بعد اس نے ایک کپڑا ریحان کے منہ میں ٹھوس کر اس پر شپ بھی لگا دی تھی۔ ریحان اب اپنے آپ کو آزاد نہیں کر سکتا تھا اور نہ ہی وہ اپنے آپ کو ٹھیسٹ کر نکلے دروازے سے نیچے گر سکتا تھا۔ منہ سے وہ جھنسن.....

ہوں..... ہوں..... ہی نکال سکتا تھا۔

جب ساجد کو اچھی طرح سے قلعی ہوئی تو باہر نکلا اور جونہی وہ کار کے پاس پہنچا وہ چونک کر رہ گیا۔ ریحان کی گاڑی کو اس جگہ سے ہٹا کر ضروری تھا اور وہ کار چلا نا نہیں جانتا تھا۔ ریحان کی کار اس جگہ دیکھ کر مسئلہ کھڑا ہو سکتا تھا۔

ساجد سوچنے لگا وہ کیا کرے۔ اس نے دروازہ کھول کر گاڑی کو کبھر سے نکالا اور اسے دھکیلتے ہوئے آگے تک لے گیا۔ وہ گاڑی کو اس جگہ سے کافی آگے لے گیا تھا۔ اسی اثنا میں اسے انجن جانسنے کی آواز سنائی دی۔ پھر مال گاڑی کے پارکن نے سکوت کو چیز چھاڑ دیا۔ ساجد نے سڑک بال گاڑی کی طرف دیکھا جواب دہیرے دہیرے رینگ رہی تھی۔ مال گاڑی اسی طرح رینگتی رہی اور اس جگہ سے دور ہوتی گئی۔ ساجد سکر دیا۔ اس کا کاشٹاب جلدی صاف ہو گیا تھا۔

ساجد نے گاڑی اسی جگہ چھوڑ دی اور وہاں سے چلتا ہوا

گزر رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک طرف وہ گراؤنڈ تھا اور اس کے سامنے گورنمنٹ اسکول کی دیوار تھی اس لیے گراؤنڈ کا یہ حصہ سنسان رہتا تھا۔ اور آٹھ بجے کے بعد جب فیملی یا لوگ اس طرف کا رخ کرتے تھے تو اسکول کی دیوار کے ساتھ گاڑیاں اور موٹر سائیکلیں کھڑی کر کے وہاں رٹ کر دیتے تھے۔ ریحان گاڑی میں بیٹھا ساجد کا شہر تھا۔ ساجد گاڑی کے عقب سے تیزی سے آیا۔ اس نے آنے سے قبل اپنے چہرے پر دو مال باندھ لیا تھا۔ اس نے گاڑی کے قریب جاتے ہی جھپٹی پستول ریحان کی گردن پر رکھ دیا۔

”چپ رہنا ورنہ گولی مار دوں گا۔“ پچھلا دروازہ کھولو۔“ ساجد نے آواز بدل کر درشت لہجے میں کہا تو اس کا ایک آنت پر ریحان گھبرا گیا۔ اس نے پچھلے دروازے کا لاک کھول دیا۔ ساجد اندر بیٹھ گیا اور پستول اس کی پسیلوں کے ساتھ لگا کر حکم دیا۔

”گاڑی چلاؤ.....“ ریحان نے گاڑی آگے بڑھا دی ساجد پھر بولا۔ ”کیا کچھ ہے تیرے پاس.....“

”میرے پاس میرا پرس اور سو بائیل فون ہے اور کچھ نہیں ہے۔“ ریحان گھبرا کر آواز میں بولا۔

”باہر نکالو.....“ ساجد پہلے سے بھی زیادہ درشت لہجے میں بولا۔ ریحان نے اپنی چٹون کی پچھلی جیب سے ہٹا نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا اور اس کے بعد اپنا سو بائیل فون بھی اسے دے دیا۔

”اور کیا ہے؟“

”اور کچھ نہیں ہے۔“

”گاڑی ایک طرف روک دو۔“ ساجد نے کہا۔ ریحان نے گاڑی ایک طرف روک دی۔ ساجد نے جان بوجھ کر اسے اس جگہ گاڑی روکنے کے لیے کہا تھا کیونکہ کچھ ہی فاصلے پر پولیس کی گاڑی کھڑی تھی۔ ساجد چاہتا تھا کہ ریحان کو کسی طرح کا شک نہ گزرے۔ جونہی اس نے گاڑی روکی ساجد جلدی سے بولا۔ ”گاڑی چلاؤ..... پولیس کھڑی ہے۔“

ریحان نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ اس کے بعد وہ اسے حکم دیتا رہا اور ریحان اس طرف گاڑی چلا تا رہا۔ وہ اسے اسی ٹریک کے پاس لے آیا جو اندھیرے اور سکوت میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس وقت بھی وہاں ایک مال گاڑی کھڑی تھی۔ ساجد کے کہنے پر گاڑی اندھیرے میں روک دی گئی۔ ساجد نے اس کی آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھ دی۔ ریحان نے زیادہ مزاحمت نہیں کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس کے پستول سے ڈر رہا تھا۔ اس نے بس اتنا کہا۔

”میں نے پیسے اور سو بائیل فون دے دیا ہے اب میری

اندھیرے کا حصہ بن گیا۔

☆☆☆

تین دن گزر گئے تھے اور ریحان کی کوئی خبر نہیں تھی۔ اس کے گھر والے تو پریشان ہی تھے لیکن میڈم کی پریشانی سب سے زیادہ تھی۔ اس کا موبائل فون بند تھا اور اس کا کوئی اتنا پتا نہیں تھا۔ تھانے میں رپورٹ بھی درج ہو چکی تھی۔ تلاش بھی شروع تھی لیکن ریحان کا کہیں کوئی پتا نہیں تھا۔

میڈم دردِ دل کو اپنا فیصلہ تبدیل کرنا پڑا۔ ساجد کو ریحان کا کردار دل گیا اور اس کی جگہ ناصر خان آ گیا۔ ساجد بہت خوش تھا۔ وہ اپنے اصل چہرے کے ساتھ کبیرے کے سامنے آ رہا تھا۔ وہ چہرہ جسے دیکھتے ہی پہچان لےنے والی تھی۔ اس نے اپنے بھائی کو فون کر کے بتایا۔

”ایک بہت بڑی ڈراما سیریل کر رہا ہوں۔ ہیرو کا رول ہے۔ پوری دنیا میں اب میری پہچان بن جانے کی.....“ ساجد.... خوشی میں بتاتا رہا اور اس کا بھائی سن کر خوش ہوتا رہا۔

شوٹنگ کے لیے ساری تیاری مکمل تھی۔ سیٹ لگ چکا تھا۔ سین ساجد اور ناصر خان کا تھا۔ اسی سین سے ڈراما سیریل کا افتتاح ہو رہا تھا۔ ناصر خان اسی گیٹ آپ میں تھا جو ساجد نے پہلے کیا تھا۔ اور ساجد اپنے اصل چہرے کے ساتھ تھا جس پر کوئی بناوٹی چیز نہیں تھی۔ وہ بہت خوش تھا۔

سین شروع کرنے سے قبل ناصر خان کو ڈائریکٹر نے کبیرے کے سامنے کھڑا کر دیا۔ اسے سین سمجھا دیا تھا۔ ساجد کو ابھی کبیرے کے سامنے نہیں کھڑا کیا تھا۔ اسے بیٹھنے کے لیے کرسی دی ہوئی تھی اور وہ کسی ہیرو کی طرح اس پر براجمان تھا۔ اس کے دائیں بائیں دو آدمی بیٹھے تھے۔ اور سیٹ پر اور بھی لوگ موجود تھے۔

ہدایت کار کی آواز آئی اور سین شروع ہو گیا۔ ناصر خان اپنے مکالمے بولنے لگا۔ اسکرپٹ کے مطابق چند مکالموں کے بعد ساجد کی انٹری ہوئی تھی۔ جو نبی ناصر خان نے اپنے مکالمے ختم کیے کمرے کا دروازہ کھلا اور ریحان اس کردار کے روپ میں چپے ہی اتر ہوا ساجد چونک گیا اور اس کی خیرہ نگاہیں اس پر جم گئیں۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ ریحان نے اپنا مکالمہ بولا اور سین اوکے ہو گیا۔

ساجد کے دائیں جانب بیٹھے آدمی نے اس کے بائیں طرف بیٹھے شخص سے پوچھا۔ ”یہ کہاں سے آ گیا.....“ یہ تو لانا تھا ہو گیا تھا؟“

وہ شخص بولا۔ ”کہتے ہیں مارنے والے سے بچانے والا زیادہ طاقتور ہے۔ ریحان کو کسی نے گاڑی میں لوٹا اور

پہچان

خوار کر کے اسے ریلوے ٹریک کے پاس لے جا کر اس کی آنکھوں پر سیاہ پٹی باندھ دی، اور مال گاڑی کے خالی ڈبے میں باندھ دیا۔ مال گاڑی وہاں سے چل پڑی اور قریبی اسٹیشن پر رک گئی کیونکہ اس خالی ڈبے میں اس جگہ مال لوڈ ہونا تھا۔ وہاں دیکھا تو ایک نوجوان باندھا ہوا تھا۔ اسے آزاد کیا تو اس نے فوراً پولیس سے رابطہ کیا اور بتا دیا کہ اسے کس نے باندھا تھا۔ پولیس نے اس کی نشاندہی پر مجرم کو پکڑ لیا ہے۔“

”ریحان کو کیسے پتا چلا کہ اسے کس نے باندھا تھا تم نے ابھی تو بتایا کہ اس نے گاڑی میں بھی نہیں دیکھا تھا اور پھر اس کی آنکھوں پر سیاہ پٹی بھی باندھ لی تھی۔“ پہلے آدمی نے پوچھا۔ ”اور وہ مجرم کون ہے؟“

ساجد گم گم دھڑکتے دل کے ساتھ سب سن رہا تھا۔ مجرم کے پکڑے جانے کا ن کر اسے کچھ اطمینان ہوا کہ وہ محفوظ ہے۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ اس نے کام اس ہوشیاری سے کیا تھا کہ ریحان کا ہجک بھی اس کی طرف نہیں جاسکتا تھا۔

وہ آدمی بولا۔ ”مجرم کوئی نہ کوئی غلطی کر رہی لیتا ہے۔ ریحان کو بالکل بھی علم نہیں ہو سکا تھا کہ اس کے ساتھ ایسا کون کر رہا ہے۔ وہ بھی سمجھ رہا تھا کہ وہ کسی لٹیرے کے ساتھ چڑھ گیا ہے۔ لیکن جب وہ ڈبے میں اسے لے جا رہا تھا تو ریحان نے اس سے کہا تھا۔ یہ آپ مجھے کہاں..... لے جا رہے ہو..... تو مجرم سے غلطی ہو گئی اور ریحان کی قسمت ابھی کی کڑی تھی اسٹیشن پر ٹرین رکتی تھی۔ اس ڈبے میں سامان رکھا تھا۔ اسے پولیس کو بتانے کا موقع مل گیا کہ اس کے ساتھ ایسا کون کر رہا ہے؟“

”مجرم سے کیا غلطی ہوئی تھی؟“ وہ آدمی سکرایا اور بولا۔ ”مجرم نے کہا تھا..... چپ رہو..... یہ کہتے ہوئے مجرم بھول گیا کہ جس طرح وہ اس سے آواز بدل کر بات کرتا آ رہا تھا، یہ جملہ بھی اسے اسی آواز میں کہنا چاہیے تھا لیکن وہ اپنی اصل آواز میں کہہ گیا اور ریحان فوراً اس کی آواز پہچان گیا۔“

ساجد نے سنا تو ایک دم اپنی جگہ سے اٹھ کر بھاگنا چاہا لیکن دوسرے شخص نے اس کی کلائی مضبوطی سے پکڑ لی اور اپنا تعارف کراتے ہوئے بولا۔

”انسپکٹر علیل احمد..... اب تم کہیں نہیں جاسکتے۔“

یہ نئے ہی ساجد کا خون خشک ہو گیا جبکہ دوسرا آدمی سب انسپکٹر تھا۔ ساجد کو پولیس نے گرفتار کر لیا تھا۔ دوسرے دن اخبار میں اقبالی بیان کے ساتھ اس کی تصویر بھی چھپی تھی۔ ایک نئی پہچان کے ساتھ.....

کہانی کس تلاش

محمد عرفان آزاد

کردار انسانی شخصیت کا سب سے خاص پہلو ہوتا ہے... کوئی بھی منفی عمل کردار کو داغ دار بنادیتا ہے... وہ ایک بینکر تھا... حسن، اخلاق اور تہذیب یافتہ تھا مگر اچانک ہی ایک مکروہ شخص نے اس پر کیچڑا چھال دی... اور وہ اس بدنامی کو سہہ نہ سکا...

کہانی کی تلاش میں انسانیت کو تار تار کر دیئے والے دل خراش حقائق.....

”مسٹر چارلس اسٹین برگ کو حاضر کیا جائے۔“
پیش کاری کی آواز کرائے عدالت میں گونجی۔
جان چوکنا ہو گیا۔ وہ اسی کس کا انتظار کر رہا تھا۔
اس نے گیلری میں اپنی نشست پر بیٹھے ہوئے کرائے
عدالت کا بجلی دروازہ کھلے اور ہیٹ کو ایک قیدی کے
ساتھ اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ وہ قیدی خاصا خوف
زدہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی عمر تین کے لگ بھگ تھی۔
اس نے عمدہ تراش خراش کا سوٹ، جیکٹ اور سبز رنگ کی
ٹائی پہن رکھی تھی اور جیل میں ایک رات گزارنے کے
باوجود وہ صاف ستھرا اور خوش وضع نظر آ رہا تھا۔ اس کے
کپڑوں اور ظاہری چلے کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ
کوئی شریف اور معزز انسان ہے۔
جج نے میز پر ہتھوڑا مارتے ہوئے کہا۔ ”آرڈر،
آرڈر۔“ اس کے ساتھ ہی کرائے عدالت میں خاموشی چھا
گئی پھر اس نے سرکاری وکیل سے کہا۔ ”مقدمے کی تفصیل
بیان کی جائے۔“
وکیل سرکار نے کہنا شروع کیا۔ ”مائی لارڈ! مسٹر چارلس
اسٹین برگ کو گزشتہ شام ڈیوٹی پر موجود کانسٹیبل البرٹ لوئگے
نے ریجنٹ اسٹریٹ سے گرفتار کیا۔ ایڈورڈ گیون نامی ایک
فحش نے الزام لگایا ہے کہ مسٹر اسٹین برگ اس کا پیچھا کرتے
ہوئے حموی بیت الخلاء میں گئے اور اس سے غیر فطری عمل کی
درخواست کی۔“
گیلری سے ہلکی ہلکی آوازیں آنے شروع ہو گئیں۔ وکیل

اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔
”میں اسی وقت کانسٹیبل لوئگے بیت الخلاء میں داخل
ہوا۔ اس نے دیکھا کہ مسٹر گیون اور مسٹر اسٹین برگ بد فطری کے
مرکب ہو رہے تھے۔ اس نے ان دونوں کو گرفتار کر لیا۔ بعد
میں مسٹر گیون نے بتایا کہ وہ صرف اس وجہ سے مسٹر اسٹین
برگ کی پیش قدمی روکنے میں ناکام رہا کیونکہ وہ ایک غریب
آدی ہے اور اسے مسٹر اسٹین برگ نے دس شلنگ دیئے کا
وعدہ کیا تھا۔“
گیلری سے ایک بار پھر کھسک پھر کی آوازیں سنائی
دیں۔ اس بار ان میں کچھ سیٹیاں بھی شامل تھیں۔ اسٹین برگ
کنبھرے میں کھڑا ہوا زمین کی جانب دیکھ رہا تھا۔ جج نے اس
کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا کوئی وکیل ہے؟“
ایک درمیانی عمر کا فحش اپنی نشست سے کھڑے
ہوتے ہوئے بولا۔ ”مائی لارڈ! میں مسٹر اسٹین برگ کا وکیل
لوئس سور ہوں۔“
”آپ کو اپنے موکل کی صفائی میں کچھ کہنا ہے؟“
”مائی لارڈ! امیر موکل ایک معزز شہری ہے۔ میں اسے
درجنوں افراد کو پیش کر سکتا ہوں جو اس کی اچھی شہرت اور ساکھ
کی گواہی دیں گے۔ اس کے گزشتہ ریکارڈ سے ظاہر ہوتا ہے
کہ وہ کبھی کسی جرم میں گرفتار نہیں ہوا۔ وہ اس کس میں بھی بے
قصور ہے اور اس کا کہنا ہے کہ اسے محض غلط فہمی میں گرفتار کیا
گیا ہے۔ تاہم وہ سمجھتا ہے کہ اس نوعیت کے الزام کا دفاع کرنا
کتنا مشکل ہے۔ اس لیے اس کی خواہش ہے کہ عدالت اور

ہیڈ کرائسٹن برگ کے باہر آنے کا انتظار کرنے لگا۔ اس دوران اسے اپنے آرٹیکل کے لیے کچھ مزید سطور لکھنے کا موقع مل گیا۔ اسٹین برگ کی ظاہری حالت کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا بہت مشکل تھا کہ وہ ایسی ناشائستہ حرکت کا مرتکب ہو سکتا ہے تاہم صرف اچھے کپڑوں کو دیکھ کر یہ فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کہ کوئی شخص شریف اور پارسا ہے۔ خدا جانتا ہے کہ شہر میں کئی ایسے بدکردار لوگ موجود ہیں جو شرقا کی طرح اچھے کپڑے پہنتے اور ان جیسا رتاؤ کرتے ہیں۔ جان کو یقین تھا کہ وہ بہت جلد معاملے کی تہ تک پہنچ جائے گا۔ دیکھنا یہ ہے کہ اسٹین برگ پانچ سو پونڈ زر ضمانت دے سکتا ہے یا نہیں۔

چند منٹ بعد ہی اسٹین برگ اپنے وکیل مسز مور کے ہمراہ عدالت سے باہر آتا ہوا دکھائی دیا۔ جان کی نظر جیسے ہی ان پر گئی، وہ حیرتی ہے اس جانب لپکا۔

”مسز اسٹین برگ!“ اس نے آواز لگائی۔

ان دونوں نے بیک وقت اسے مڑ کر دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں کاغذ اور پینسل تھی۔ وہ بولا۔

”کیا تم آج کی سماعت پر کوئی رائے دینا چاہو گے؟“ اسٹین برگ نے ہونٹ پیچتے ہوئے کہا۔ ”میں..... نہیں، بالکل نہیں۔“

اس کی فیملی کو غیر ضروری اور طویل مقدمے سے دور رکھا جائے۔ اس نے مجھے اجازت دی ہے کہ میں اس پر عائد کیے گئے الزام میں تخفیف کر کے اسے ایک عام قتلہ میں تبدیل کرنے کی درخواست کروں۔“

”درخواست نامہ خور کی جاتی ہے۔“ جج نے کہا۔ ”تمہارے موکل کو اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھنا چاہیے کہ اس پر کسی قابل نفرت جرم کے بجائے محض ناشائستہ حملے کا الزام عائد کیا گیا۔ اس جرم کا معنی شاید موجود ہے۔ اس کے علاوہ کانسٹیبل لوگنے کا کردار بھی بہت عمدہ ہے۔ تمہیں مقدمے کی تیاری کرتے ہوئے یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے۔“

ایک بار پھر کرائسٹن برگ عدالت میں اہلی آوازیں ابھریں۔ جج نے ہتھوڑا میز پر مارا۔ ”مذہم کی طرف سے بے گناہ قرار دینے کی درخواست دائر کی گئی ہے تاہم اسے پانچ سو پونڈ کی ضمانت پر رہا کیا جاتا ہے۔ اگلی سماعت انیس ستمبر کو اولڈ ہیلے میں ہوگی۔“

اس کے بعد عدالت برخاست ہو گئی۔ سیلف نے آگے بڑھ کر اسٹین برگ کو بازو سے پکڑ لیا۔ وہ حیرت زدہ دکھائی دے رہا تھا۔ جان نے بھی جلدی جلدی ایک کاغذ پر کچھ لکھا اور باہر چلا گیا۔ سڑک کے پار اسے ایک جگہ نظر آئی۔ وہ وہاں



اب اسے پچھتاوا ہو رہا تھا کہ اس نے جلد بازی میں ایک اچھا موقع ضائع کر دیا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ وہ یہ اسٹوری دوبارہ لکھ سکتا ہے۔ صرف اسے اسٹین برگ کا نام تبدیل کرنا ہوگا۔ اس خیال کے آتے ہی وہ مجھوم اٹھا۔ اس کی تخلیقی صلاحیتیں دوبارہ بیدار ہونے لگیں۔ کہانی کے پہلے مسودے کے پندرہ پچھلے ایک بار پھر اس کے ذہن میں گردش کرنے لگے۔ اس نے منظر اسے ہونے اپنی جیب سے ایک دوسرا کاغذ نکالا اور اس پر لکھنا شروع کر دیا۔

☆☆☆

جان ناشے کی میز پر اخبار پڑھ رہا تھا کہ اس کی نظر ایک سرفی پر پڑی۔ "منظر نے چرچ ٹاور سے چھلانگ لگا دی۔" اس نے سرسری طور پر خبر پڑھی لیکن منظر کا نام دیکھ کر چونک گیا اور اس نے دوبارہ وہ خبر پڑھنا شروع کی۔ "بنتے کی شب آئینڈ اسٹریٹ، تیل گر یو اسکوئر کے رہائشی چارلس اسٹین برگ نے سینٹ اینڈریو چرچ کے ٹاور سے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی۔ اسے چھلانگ لگاتے ہوئے کئی لوگوں نے دیکھا جن میں ایک عورت بھی شامل تھی۔ پولیس کے پوچھنے پر چرچ کے ناظم مسٹر جوزف ڈرومنڈ نے بتایا کہ مرنے سے پہلے مسٹر اسٹین برگ کو گر جا کے گرد چکر لگاتے دیکھا گیا تھا۔ ڈرومنڈ نے اس سے وجہ پوچھی لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور اس نے باری کے دیگر سوالات اور تعاقبات کی پیشکش کو بھی نظر انداز کر دیا۔ پھر وہ ٹاور کی سیڑھیاں چڑھنے کے لیے آگے بڑھا۔ ڈرومنڈ نے اس کا پیچھا کیا پھر اس کا ارادہ بھانپ کر وہ واپس مڑا اور درود کے لیے بھاگا لیکن اس سے پہلے ہی اسٹین برگ ٹاور کی بلندی سے چھلانگ لگا چکا تھا۔

"پولیس حکام نے تصدیق کی ہے کہ مسٹر اسٹین برگ پر ایسے جرم کا مقدمہ چل رہا تھا جس کی خبر کسی اخبار میں شائع نہیں ہوئی۔ اس مقدمے میں مدعی ایڈورڈ گیون نامی ایک عام شخص ہے جسے پولیس نے مسٹر اسٹین برگ کے ہمراہ ریجٹ اسٹریٹ کے بیت الخلاء سے نکلے ہاتھوں پکڑا تھا۔ مسٹر اسٹین برگ نے یس مانڈگن میں بیوی اور ایک لڑکا چھوڑا ہے۔"

جان نے اخبار ایک طرف رکھا اور منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگا۔ اس نے بھی نہیں سنا تھا کہ کسی امیر شخص نے اس طرح کے فضول الزام پر خودکشی کی ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ دولت مند تھا۔ اس نے نہ صرف اپنی عزت کروائی بلکہ جان کی لکھی ہوئی اسٹوری بھی خرید لی تاکہ وہ کسی اخبار میں شائع نہ ہو سکے۔ اس کے لیے اپنے دفاع میں اچھے سے اچھا وکیل کرنا کچھ مشکل نہیں تھا۔ اگر مدعی مان جاتا تو وہ کچھ پیسے

"مجھے یقین ہے کہ میرے قارئین جہاں ہر موقع جانا چاہیں گے۔"

مسٹر مور نے سرد مہری سے کہا۔ "تم کس اخبار کے لیے کام کرتے ہو؟"

"میں فری لانسر ہوں۔"

لوئس مور کا منہ بین گیا۔ اس نے اسٹین برگ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے میرے پاس ایک اچھی اسٹوری کے لیے کافی مواد موجود ہے۔ بہت سے لوگ یہ جانتا چاہیں گے کہ تم جیسے شریف اور معزز شخص کو اس نوعیت کے گھٹیا الزام کا سامنا کیوں کرنا پڑا۔ شاید میں یہ کہانی ٹائمز اور کرائیکل کوچ سکوں۔"

اسٹین برگ کے چہرے پر تکلیف کے آثار نمایاں تھے۔ مور نے جان سے پوچھا۔ "تم کیا سمجھتے ہو۔ اس کہانی کے تمہیں کتنے پیسے مل جائیں گے؟"

"میرا خیال ہے کہ سب ملا کر کم از کم پانچ پاؤنڈ تو ملنے ہی چاہئیں۔"

"کیا تم ان پیسوں میں یہ کہانی ہمیں فروخت کرنا چاہو گے؟ صرف ہمیں اور ہمارے سوا کسی کو نہیں۔"

جان نے سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی اور بولا۔ "ٹھیک ہے۔"

اسٹین برگ نے کمزور لہجے میں احتجاج کیا تو مور بولا۔ "یہ ایک اچھی سرمایہ کاری ہے۔ میں نے ٹیکری میں کسی دوسرے رپورٹر کو نہیں دیکھا۔ اس اسٹوری کو خریدنے کے بعد ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ جہاں نام اخبارات میں نہ آنے پائے۔"

اسٹین برگ اب بھی ہچکچا رہا تھا تاہم وہ کچھ نہیں بولا۔ "مور نے اپنے بیٹے میں سے پانچ پاؤنڈ نکال کر جان کو دیدیا اور اس سے کہانی کا مسودہ لے لیا پھر بولا۔ "ہمارا کام ختم ہو گیا، اب اجازت دو۔"

یہ کہہ کر وہ مڑا اور اسٹین برگ کو لے کر چلا گیا۔ جان طے چلے جذبات کے ساتھ انہیں دیکھتا رہا۔ اسے پیسے ملنے کی خوشی تھی لیکن ساتھ ہی یہ آنکس ہو رہا تھا کہ یہ اسٹوری کتنی شائع نہیں ہوگی۔ یہ ایسی کہانی تھی جس میں کئی اخبارات دیکھی لیے کو کہ اسے دو تین پونڈ سے زیادہ معاوضہ نہیں ملتا لیکن کسی بڑے اخبار میں شائع ہونے سے اس کی قدر و قیمت میں اضافہ ہو سکتا تھا۔ عین ممکن ہے کہ یہ اسٹوری کسی نیٹ ویئر کو پسند آجائی اور وہ اسے اپنے اخبار میں ملازمت کی پیشکش کر دیتا۔

بتائی۔“

جان نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔ ”یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔“
”کیوں؟ یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ اس طرح کے نصف درجن کیس تو میں دیکھ چکا ہوں۔“

”لیکن برگ امیر آدی تھا۔ اس کے لیے اس الزام سے جان چھڑانا کوئی مشکل بات نہیں تھی۔“
”شاید، لیکن کچھ لوگ اپنی بے عزتی برداشت نہیں کرتے۔ تمہیں یہ بات معلوم ہوئی چاہیے۔ کیا اس نے تمہیں اپنا نام چھپانے کا معاوضہ نہیں دیا تھا؟“

جان حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ ”میں..... تمہیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی کہ وہ اسٹین برگ تھا؟“

”تم نے اپنی خبر میں صرف اس کا نام بدل کر اسٹین برگ سے اسٹین وک کر دیا لیکن اس کی عمر، ظاہری حلیمہ، پیشہ اور علاقہ جہاں وہ رہتا تھا، کچھ بھی نہیں بدلا۔“

جان کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اس نے اسٹین برگ کی شناخت چھپانے کی جو کوشش کی تھی وہ ناکافی رہی۔ اسے لمحہ بھر کے لیے یوں لگا جیسے وہی اسٹین برگ کی موت کا ذمے دار ہے۔ کیونکہ کسی دوسرے اخبار میں اسٹین برگ کے مقدمے کی خبر شائع نہیں ہوئی تھی۔

لوگنٹ نفرت انگیز لہجے میں بولا۔ ”مگر مجھے پوچھو تو اس طرح کی خبریں بالکل شائع نہیں ہوتی چاہئیں۔“

جان نے کمزور آواز میں کہا۔ ”لوگ انہیں پڑھنا چاہتے ہیں۔“

”وہ تجس کی وجہ سے مجبور ہوتے ہیں لیکن تمہیں ان کی حوصلہ افزائی نہیں کرنی چاہیے۔“

جان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لوگنٹ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اس طرح کے مقدمات میں لوگوں کا تجس اپنی اہمیت کو پہنچاتا تھا اور کرائے عدالت میں ہل دھرنے کی جگہ نہیں ہوتی تھی۔

”کیا تم نے لاش کا معائنہ کر لیا؟“ جان نے پوچھا۔
”ہاں۔“

”کیا تم بتا سکتے ہو کہ اس پر لگائے گئے الزامات میں کتنی سچائی ہے؟“

لوگنٹ کی بیوی تن گئیں۔ اس نے برہمی سے کہا۔ ”میں نہیں جانتا اور ویسے بھی اس الزام کی کیا اہمیت رہی ہے؟“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ جان نے کہا لیکن وہ

دے کر اس کا منہ بند کر سکتا تھا اور گواہوں کو بھی رشوت دے کر عدالت میں پیش ہونے سے منع کر دیتا۔ اگر یہ تمام حربے ناکام ہو جاتے تب وہ ملک سے بھاگ جاتا یا فیصلے کے خلاف اپنی عدالت میں اپیل کرتا۔ اس طرح کئی لوگ اپنے مقدمے ختم کروانے میں کامیاب رہے تھے۔

پھر اسٹین برگ نے خود کشی کیوں؟ ناشتے کے دوران بھی جان کے ذہن میں یہی سوال گردش کرتا رہا۔ پہلے اس نے سوچا کہ اس رپورٹر سے رابطہ کرے جس نے یہ اسٹوری دی تھی اور اس سے پوچھے کہ وہ کون سا اہم کتہہ ہے جو اس نے اس خبر میں شامل نہیں کیا۔ جس نامی وہ رپورٹر بھی اس کی طرح فری لانس تھا اور یمن ممکن ہے کہ وہ اپنے مفاد میں اسے پوری بات نہ بتاتا۔ اس لیے جان نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔

وہ اپنے معمول کے مطابق اولڈ بیلی کے لیے روانہ ہوا۔ یہ مرکزی عدالت اس طرح کی خبروں کا بہت بڑا ذریعہ تھی اور لندن کے باقی اس طرح کی خبریں بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ اسے پوری امید تھی کہ اولڈ بیلے سے اسٹین برگ کی موت کے بارے میں مزید معلومات مل جائیں گی۔ عدالت میں ہمیشہ کی طرح لوگوں کا ہجوم تھا۔ بڑی مشکل سے وہ اپنی جان بچان کے ایک ٹکڑک سے ملنے میں کامیاب ہو سکا۔ جس نے بتایا کہ کون سا کوئی دوسرا موت کی تحقیقات کرے گا۔ اس کا نام والٹر لوگنٹ تھا اور وہ برج روڈ پر واقع مردہ خانے میں کام کرتا تھا۔

جان سیدھا اس کے پاس چلا گیا۔ اس نے دیکھتے ہی لوگنٹ کو پہچان لیا۔ وہ اس علاقے میں ہونے والی کئی اموات کی تحقیقات کے سلسلے میں اس سے مل چکا تھا۔ جب جان نے اسے بتایا کہ وہ اسٹین برگ کی موت کی تحقیقات کر رہا ہے تو اس نے پوچھا۔

”تم کیا جانتا چاہتے ہو؟“

”تم یمن سے کہہ سکتے ہو کہ اس نے خود کشی کی ہے؟“
”بالکل، اس کی موت بلندی سے نیچے گرنے پر واقع ہوئی۔ کسی نے اسے دھکا نہیں دیا۔ سڑک پر کھڑے لوگوں نے اسے اکیلے ہی اوپر جاتے اور چھلانگ لگاتے دیکھا۔ اس وقت چرچ میں صرف ناظم موجود تھا جو اسے روکنے کے لیے بھاگتا ہوا آیا ہوا تھا۔“

”کیا وہ گواہ قابل اعتبار ہیں؟“

”ان میں سے ایک راہ گیر ہے لیکن دوسرے دونوں گواہ وہاں باقاعدہ آتے ہیں۔ ان سب نے ایک ہی بات

کہاں کسی تلاش

کچھ اور بس میں سوار ہو کر سینٹ اینڈریو چرچ کے ٹائم سے
لے چلا گیا۔

سفید بالوں والے مسٹر ڈرومنڈ نے بڑی خندہ پیشانی
سے اس کے سوالوں کا جواب دیا۔ وہ پہلے کبھی اسٹین برگ سے
نہیں ملا تھا۔ وہ یہ بھی نہیں بتا سکا کہ موتنی نے خود کشی کیوں کی
اور اس مقدمے کے لیے اس چرچ کا انتخاب کیوں کیا۔ وہاں
سے روانہ ہوتے ہوئے جان نے ایک نگاہ چرچ کے ٹاور پر
ڈالی اور اسے آخری سوال کا جواب مل گیا۔ یہ ٹاور قرب و جوار
کے گرجا گھروں میں سب سے اونچا تھا اور وہاں سے چھلانگ
لگانے والا شخص کسی صورت زندہ نہیں بچ سکتا تھا۔ اس کے
علاوہ رات گئے چرچ میں داخل ہونا قدرے آسان تھا۔ اسے
شبہ تھا کہ رات میں چرچ کے دروازوں کو تالا نہیں لگایا جاتا تھا
ورنہ احاطے میں کوئی چوکیدار یا محافظ ضرور موجود ہوتا جو اندر
آنے والوں کے لیے دروازہ کھول سکے۔

وہ وقت گزری کے لیے کچھ دیر سوکون پر مرقعت کرتا
رہا پھر دوسری بس میں سوار ہو کر مل کر یو اسکوائر پہنچ گیا جہاں
اسٹین برگ کی رہائش گاہ تھی۔ وہ ایک چار منزلہ خوب صورت
ٹاؤن ہاؤس تھا جو اسٹین برگ کی امارت کی گواہی دے رہا تھا۔
دروازہ ایک باوردی ملازم نے کھولا۔ جان نے اپنا تعارف
کرواتے ہوئے کہا۔

”میں تھامس مین ہوں اور میرا تعلق نامزد سے ہے۔
میں مسز اسٹین برگ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

”معافی چاہتا ہوں جناب۔“ ملازم نے کہا۔ ”خاتون
کسی ملاقاتی سے نہیں مل رہی ہیں۔“

”مجھے افسوس ہے کہ ایسے موقع پر مداخلت کر رہا ہوں
لیکن یہ ملاقات بہت ضروری ہے۔ میں اسی حادثے کے سلسلے
میں بات کرنے آیا ہوں۔“

”جناب، مجھے سختی سے ہدایت کی گئی ہے۔۔۔۔۔“

”تم صرف انہیں میرا نام بتا دو۔ میں تھامس مین ہوں
اور ان کے شوہر کی موت کے بارے میں حقائق جانتا ہوں۔“
ملازم نے تھوڑا سا جھجھکتے ہوئے کہا۔ ”بہت بہتر
جناب۔“ اور دروازہ بند کر دیا۔

جان بے صبری سے اس کے واپس آنے کا انتظار کرتا
رہا۔ اس نے جان بوجھ کر اپنا غلط نام بتایا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا
کہ مسز اسٹین برگ اس کے اصل نام سے واقف ہو جائے جو
اس کے شوہر کی اسٹوری کے ساتھ شائع ہوتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ملازم واپس آیا اور اسے اپنے ساتھ
اندھ لے گیا۔ ڈرائنگ روم کے دروازے پر پہنچ کر وہ رکا اور

جموٹ بول رہا تھا۔ اب بھی یہ معاملہ اس کے نزدیک بہت
زیادہ اہم تھا۔

جان کو اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے پہلی بار اپنی
اسٹوری فحاشی کے مرکب ایک شخص کو فروخت کی تھی۔ وہ
کمرائے عدالت سے مقدمے کی کارروائی کے نوٹس لکھ کر
باہر آیا تو اسٹین برگ کی طرح وہ شخص اور اس کا وکیل سامنے
آگئے۔ وکیل نے کہا۔

”تم جو اسٹوری لکھ رہے ہو۔ اگر یہ ہمیں دے دو تو میں
اس کے عوض تمہیں تین پونڈ دوں گا۔“

جان ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اسے کسی نے اس بارے
میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ فری لانسنگ کے شعبے میں بالکل نیا تھا
اور اسے یہ کام شروع کیے صرف ایک مہینہ ہوا تھا۔ اس سے
پہلے وہ ایک فرم میں کلرک کے طور پر کام کر رہا تھا۔ اس وقت
تک اس کی بمشکل کچھ کمائیاں شائع ہوئی تھیں اور ہر ایک کا
معاوضہ تین پونڈ سے کم تھا۔ اس نے کچھ کہے بغیر اپنا لکھا ہوا
کاغذ وکیل کی طرف بڑھایا۔ اس نے فوراً ہی شدہ معاوضہ
ادا کیا اور اپنے نوٹل کو لے کر وہاں سے چلا گیا۔

کچھ عرصے تک وہ یہ سوچ کر پریشان ہوتا رہا کہ بلیک
مینیگ کا مرکب ہوا ہے۔ لیکن بعد میں وہ سمجھ گیا کہ ایسی
معلومات جو پہلے ہی منظر عام پر آ چکی ہوں، انہیں شائع
کرنے کی دھمکی دینا بلیک مینیگ کے ذمے میں نہیں آتا۔
اگر اس کے لکھے ہوئے آرٹیکل عدالتی کارروائی پر مبنی ہیں تو یہ
خلاف قانون نہیں۔ یہ جاننے کے بعد اس نے اپنا ڈھن بنالیا
کہ وہ ہر اسٹوری طرم یا اس کے وکیل کو بیچنے کی کوشش کرے
گا۔

وہ ابھی تک یہ سوچ کر حیران ہو رہا تھا کہ کیا اسٹین برگ
نے بعض بدنامی کے خوف سے خود کشی کی تھی۔ اس نے اس سے
پہلے بھی ایسی بات نہیں سنی۔ وہ گزشتہ ایک سال سے فری لانسر
کے طور پر کام کر رہا تھا اور اس دوران اس نے تقریباً ایسے دس
بارہ آرٹیکل لکھے تھے لیکن ان میں سے کسی ایک طرم نے بھی
خود کشی نہیں کی۔ پھر اسٹین برگ نے یہ انتہائی قدم کیوں اٹھایا
جبکہ اس جرم کے حوالے سے اس کا نام کسی اخبار میں نہیں آیا
تھا۔ وہ اس سے زیادہ اسٹین برگ کے بارے میں کچھ نہیں
جانتا تھا۔ ممکن ہے کہ اس نے کسی اور وجہ سے خود کشی کی ہو اور
اب اسے یہی معلوم کرنا تھا۔

اصولاً اسے سب سے پہلے اسٹین برگ کی بیوہ سے ملنا
چاہیے تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ اس قبیل کی عورتیں عموماً ڈپر سے
پہلے کوئی ٹون نہیں سنیں۔ اس نے وقت ضائع کرنا مناسب نہ

اس نے اسٹین برگ کی بیوہ کو مہمان کے آنے کی اطلاع دی۔
جان نے کمرے میں قدم رکھا۔ ایک درمیانی عمر کی عورت قیمتی
آرام کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی اور تقریباً اسی عمر کا ایک شخص اس
کے برابر میں کھڑا ہوا تھا۔ دونوں نے سیاہ مائی لباس پہن رکھا
تھا۔

جان نے مسز اسٹین برگ کے پاس پہنچ کر معافی کے
لیے ہاتھ بڑھایا اور بولا۔ ”ملاقات کا وقت دینے کا شکریہ۔“
”ہیلو۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں الزبتھ اسٹین برگ
ہوں اور یہ میرے شوہر کے دوست جان براؤن ہیں۔“

جان نے رسمی طور پر اس سے تعزیت کی تو وہ بولی۔
”مجھے بتایا گیا ہے کہ تمہارا انتقال ناخوشگوار ہے۔ میں رپورٹرز
سے بات نہیں کر رہی لیکن تم نے بتایا ہے کہ چارلس کے
بارے میں کچھ حقائق جانتے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ اس پر
لگائے گئے الزامات غلط تھے۔“

”نہیں، میں اسی لیے یہاں آیا ہوں۔ مجھے امید ہے
کہ تم میری مدد کر دو گی۔“

”کسے؟ کیا یہ ثبوت کافی نہیں کہ اس کی بیوی اور ایک
بچہ ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔ اس نے رومال
سے آنکھیں صاف کیں اور بولی۔ ”کوئی قابلِ نفرت شخص ہی
ایک اچھے انسان پر اس طرح کا شرمناک الزام عائد کر سکتا
ہے۔“

”پھر تو تم اپنے شوہر پر الزام لگانے والے ایڈورڈ
کیون کو بھی نہیں جانتی ہو گی؟“

”میں نے اس سے پہلے کبھی اس کا نام نہیں سنا۔“
”ممکن ہے کہ وہ کوئی عام بلیک میلر ہو اور اس نے مسٹر
اسٹین برگ کے عمدہ لباس اور شخصیت کو دیکھ کر اچانک ہی انہیں
اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنے کا ارادہ کر لیا ہو۔ کیا تمہیں
اپنے شوہر کی مالی حالت کا علم ہے؟“
”اس نے کبھی نہیں بتایا۔“

جان نے براؤن کی طرف دیکھا۔ وہ سر ہلاتے ہوئے
الزبتھ سے بولا۔ ”کیون نہ میں اور مسٹر تھامس باہر چلے
جائیں۔ میں اس سوال کا جواب دے سکتا ہوں۔ تمہیں اپنے
دامِ عزت و زور دینے کی ضرورت نہیں۔“

”نہیں، تم لوگ یہیں بیٹھو۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔
”میں تمہارا آرام کرنا چاہتی ہوں۔ اگر میری مدد کی ضرورت
ہو تو بلا لیتا۔“

اس کے جانے کے بعد جان نے کہا۔ ”کیا واقعی مسٹر
اسٹین برگ نے اس الزام کو سنجیدگی سے لیا تھا۔ نہ خود کی

کرنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟“
براؤن اسے گھورتے ہوئے بولا۔ ”یہ انتہائی ناقابلِ
تصور ہے۔ تم جیسا کوئی شخص اسے اچھا نہیں سمجھے گا کہ کسی
شریف آدمی کی سادہ دادرگ ہو جائے۔“

”لیکن لوگوں کو اس پر لگائے گئے الزامات کا کیسے پتا
چلا جبکہ اخبارات میں اس کا اصلی نام نہیں آیا تھا۔“

”یہ ٹھیک ہے کہ کھینے والے نے اس کا فرضی نام
استعمال کیا لیکن باقی سب کچھ اس پر پورا اتر رہا تھا۔ اس کا
خلع، جسامت، چال و حال، مقام، واقعات، میرا خیال ہے
کہ کھینے والا یہ چاہتا تھا کہ فرضی نام کے ہوتے ہوئے بھی اس
کی شخصیت بے نقاب ہو جائے۔“

جان نے اپنا جرم چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
”اس اسٹوری کے شائع ہونے سے حقیقت میں اسے کیا
نقصان ہوا؟“

”وہ اور الزبتھ ان لوگوں سے منہ چھپانے لگے جو
افواہوں پر یقین رکھتے ہیں اور اگر یہ مقدمہ شروع ہو جاتا تو
اس کی بہت زیادہ بدنامی ہوتی۔“

”کیا وہ مدعی یا گواہوں کو کچھ دے دلا کر ان کا منہ بند
نہیں کر سکتا تھا؟“

”شاید لیکن اس کیس میں ایک ہی گواہ تھا۔ وہ پولیس
والا جس نے انہیں گرفتار کیا تھا۔ اس کے بارے میں معلوم ہوا
ہے کہ وہ اچھے کردار کا حامل ہے، جس کا غالباً یہ مطلب ہے کہ
وہ صرف غیر معمولی بڑی رشوت قبول کرتا ہے۔ میں نے سنا
ہے کہ ایسے لوگ ہزاروں پونڈ کا مطالبہ کرتے ہیں جو چارلس
ساری زندگی پورا نہیں کر سکتا تھا۔“

جان نے پوچھا۔ ”تم ایڈورڈ کیون کے بارے میں کیا
جانتے ہو؟“

”کچھ نہیں۔ میں اس سے کبھی نہیں ملا۔“
”مسٹر اسٹین برگ اسے کیسے جانتے تھے؟“

”میں نہیں جانتا۔ وہ عام مزدوروں کو دوست نہیں
بناتے تھے۔“

”مسٹر اسٹین برگ نے اپنے وکیل کو بتایا تھا کہ کانسٹیبل
کو غلط فہمی ہوئی ہے لیکن کانسٹیبل کو لگے گا کہ الزام بڑا واضح تھا
گو یا وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ کیا تمہارے خیال میں اس کی کوئی
وجہ ہو سکتی ہے؟“

”مگر کسی نے اسے رشوت دی ہو۔“
”کون ایسا کر سکتا ہے؟ پھر تو مسٹر کیون کو بھی رشوت دی

مئی ہوگی

کہا نہی کسی تلاش

ان کے مطلب کے لوگ بہ آسانی مل سکتے ہیں۔ اس کے باوجود ان میں سے کچھ عوامی مقامات کا انتخاب کرتے ہیں جیسے بیت الخلا یا کوئی تاریک گلی اور اسی حماقت کی وجہ سے پکڑے جاتے ہیں۔

”جس طرح تم نے اسٹین برگ کو دیکھا؟“
”ہاں، بالکل۔ اس معاملے میں مجھ سے کوئی غلطی نہیں ہوئی۔“

”کیا تم جانتے تھے کہ اس کی بیوی اور بچہ بھی ہے؟“
”نہیں لیکن ان کے ہونے سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

جان نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے ایسی جگہوں کے بارے میں بتاؤ جہاں ان کے مطلب کے لوگ مل سکتے ہیں؟“
لوگنے نے تفصیل سے بتانا شروع کیا۔ ان میں پبلک ہاؤسز، کلب، شراب خانے، پارک اور میوزیم وغیرہ شامل تھے۔ جان بڑی احتیاط سے یہ تمام تفصیل اپنے پاس لکھتا رہا پھر اس نے لوگنے سے اس کے کام کے بارے میں کچھ مزید سوالات کیے تاکہ اندازہ لگا سکے کہ کیا وہ بھی دوسرے پولیس والوں کی طرح ان نام نہاد معززین سے رشوت لیتا ہے۔ اس کے برعکس وہ ایک ایماء اعداد اور فرض شاس پولیس والا لگ رہا تھا جو مجرموں سے کسی قسم کی رعایت کرنے کا قائل نہیں تھا۔

مکمل گفتگو ختم ہونے کے بعد اس نے لوگنے کا شکریہ ادا کیا اور گھر کی جانب چل دیا۔ اس سے بات کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اسے لوگنے کی باتوں پر یقین کرنا ہی ہوگا۔ اسٹین برگ سے ایک جرم سرزد ہوا تھا کہ وہ پہلی بار پکڑا گیا لیکن وہ ایک عادی مجرم تھا جو اپنی بیوی اور بچے کو گھر میں چھوڑ کر مرطوالیوں سے دل بہلاتا تھا۔

اسے اسٹین برگ سے جو تھوڑی بہت ہمدردی تھی، وہ بھی ختم ہو گئی۔ وہ اسی شرمناک موت کا مستحق تھا۔ اب اسے گیون سے ملنے کے لیے شام ہونے کا انتظار کرنا تھا۔ وہ اس سے گھر کے بجائے کہیں باہر ملنا چاہ رہا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں وہ گھر کا دروازہ ہی نہ کھولے۔ اس نے دن کا بقیہ حصہ دوسری خبروں کی تلاش میں گزارا اور رات کا کھانا کھانے کے بعد گیون سے ملنے نکل کھڑا ہوا۔

گیون کا فلیٹ لارنس لین میں واقع ایک عمارت کی دوسری منزل پر تھا۔ جان ایک ایسی جگہ پر کھڑا ہو گیا جہاں سے وہ عمارت میں آنے جانے والوں پر نظر رکھ سکے۔ اس کے اندازے کے مطابق گیون کو اس وقت گھر پر ہی ہونا چاہیے تھا۔ کیونکہ کانسٹیبل لوگنے اسے بتا چکا تھا کہ گیون نو بجے

”میں نہیں جانتا۔ چارلس محض ایک کامیاب ٹیکر تھا لیکن اتنا کامیاب بھی نہیں کہ طاقتور دشمن بنالے۔“

جان نے محسوس کیا کہ براؤن اس کے سوالوں سے اکتاہٹ محسوس کر رہا ہے۔ جان نے کہا۔ ”میری نیت مسٹر اسٹین برگ کو بے گناہ ثابت کرنے کی ہے۔“

”میں تمہاری کامیابی کی دعا کروں گا۔ مجھے جو کچھ معلوم تھا وہ میں نے تمہیں بتا دیا۔ اگر کچھ اور پوچھنا چاہو تو مجھے فون کر سکتے ہو۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب سے ایک کارڈ نکال کر اسے دے دیا۔

☆☆☆

ایک دوست کی وساطت سے اس نے ایڈورڈ گیون کا پتا معلوم کیا۔ وہ چیرنگ کراس کے قریب ایک ایسے علاقے میں رہتا تھا جو اس طرح کی سرگرمیوں کے لیے مشہور تھا۔ ویسے تو لندن کے کئی دوسرے علاقوں کی بھی یہی شہرت ہے جیسے بکلی، ڈی، برکلی اسکوائر اور بریجٹ اسٹریٹ وغیرہ جہاں سے اسٹین برگ گرفتار ہوا تھا لیکن اس سے پہلے اس نے مناسب سمجھا کہ کانسٹیبل لوگنے سے ملاقات کرے۔

عدالت کے کمرے کا رخ اس کی ڈیوٹی پول اسٹریٹ پولیس میں تھی۔ وہ وہاں شام کے وقت گیا۔ اس کا اندازہ تھا کہ لوگنے کی ٹیم شفٹ ہوگی کیونکہ اس نے اسٹین برگ کو بھی رات کے وقت گرفتار کیا تھا۔ وہ پولیس اسٹیشن میں داخل ہوا اور استقبال پر اپنی آمد کا مقصد بیان کیا۔ چند منٹ بعد ہی لوگنے اس سے ملنے باہر آ گیا۔ رکی تعارف کے بعد جان نے اس سے پوچھا کہ کیا اس کا کوئی امکان ہے کہ اس معاملے میں اسے کوئی غلطی ہوئی ہو تو اس نے منبوط لہجے میں جواب دیا۔

”نہیں کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ میں اس کا نام نہیں جانتا تھا لیکن پہلے ہی اسے وہاں کئی مرتبہ کچھ پکڑا تھا۔ اس روز میں نے اسے گیون کے ساتھ دیکھا، وہ بھی اس علاقے میں اکثر دیکھا گیا ہے اور میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کا گزارا ہی اس دھندے پر ہے۔“

”یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟“
”وہ اس سے پہلے بھی گرفتار ہو چکا ہے۔ میں نے خود ایک دفعہ اسی بیت الخلا سے نکلے ہوئے اس کا تعاقب کیا تھا۔“
”معاف کرنا۔ یہ یقین کرنا بہت مشکل ہے کہ اسٹین برگ جیسا معزز شخص یہ حرکت کرے۔“

”شاید مجھیں معلوم نہیں کہ ایسے کی معززین اس علاقے میں آتے دیکھتے ہیں۔ یہاں کم از کم دو کلب ایسے ہیں جہاں

سے پہلے ریجنٹ اسٹریٹ پر نہیں آتا۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد گیون عمارت سے باہر نکلا۔ اس کا حلیہ وہی تھا جو لوگ نے بیان کیا تھا۔ خوش قسمتی سے وہ اسی طرف آ رہا تھا جہاں جان پہلے سے کھڑا ہوا تھا۔ جب وہ قریب آیا تو جان اچانک ہی اس کے سامنے آکر بولا۔
”ایڈورڈ گیون؟“

وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ”تم کون ہو؟“

”تھامس مین۔ میرا تعلق ٹائمز سے ہے۔ میں تم سے چارلس اسٹین برگ کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔“
گیون کی بڑی بڑی آنکھیں حیرت میں تھیں۔ اس نے کہا۔ ”میرے پاس بتانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔“

یہ کہہ کر گیون وہاں سے جانے لگا تو جان نے کہا۔
”میں جانتا چاہتا ہوں کہ تم نے اسٹین برگ کو کیوں مل کیا؟“
گیون واپس پلٹتے ہوئے بولا۔ ”کیا؟“

”تم نے اس پر جھوٹا الزام لگا کر اسے خودکشی پر مجبور کر دیا۔ یہ بھی مل کرنے کے مترادف ہے۔“
”میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں نہیں جانتا کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔“

”پولیس کا کہنا ہے کہ تم مردطوائف ہو جبکہ میرا خیال ہے کہ تم جتنا خود بھی ہو۔ تم نے اس سے کتنے پیسے مانگے تھے؟“

”وہ اس طرح نہیں تھا۔“

”پھر کس طرح تھا؟“

گیون نے ادھر ادھر دیکھا پھر کہنے لگا۔ ”میں اس کا حصہ بننا نہیں چاہتا۔“

”تم پوری طرح اس کا حصہ ہو۔ صرف یہ جانتا باقی ہے کہ کیا اس نے ہمیں پیسے دینے سے انکار کر دیا تھا۔ لگتا ہے کہ ایسا ہی ہوا تھا جس پر ہمیں غصہ آگیا۔ ممکن ہے کہ تم نے ہی اسے چرچ کے مآدر سے دھکا دیا ہو۔“

”نہیں۔“ گیون نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہم یہاں بات نہیں کر سکتے۔“

جان اسے شیلڈ میں لے گیا اور بولا۔ ”اب بات کرو۔“

”تم نہیں جانتے۔ وہ الزامات..... میرے پاس اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ پولیس نے ہم دونوں کو پکڑا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ جیل میں ڈال دیں گے پھر میں کیا کرتا۔ میری اتنی حیثیت نہیں ہے کہ میں چارلس کی طرح اپنے دفاع میں وکیل کرتا۔“

”پھر تم نے کیا کیا؟“

”میں نے اپنے بیان میں کہا کہ چارلس نے مجھے اس کام کے لیے مجبور کیا تھا۔ اس نے مجھے بیسوں کی پیشکش کی اور میں اپنی غربت کی وجہ سے انکار نہیں کر سکا۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ اس سے اسے کوئی نقصان ہوگا۔ میرا خیال تھا کہ وہ انہیں رشوت دے کر چھوٹ جائے گا۔ اس کے پاس کافی پیسہ ہے۔“

”جیہیں کیسے معلوم ہوا؟ تم اس کے بارے میں کیا جانتے ہو؟“

”ہم پہلے بھی شراب خانوں یا سٹیج میں چند مرتبہ مل چکے تھے۔“

”یہ سچ کیا ہے؟“

”سو ہو میں واقع ایک میوزک ہال کا نام ہے۔“
”کیا تم اس ہیٹ الاخلاص میں پہلے بھی اس سے مل چکے تھے؟“

”نہیں، اس رات سے پہلے بھی نہیں۔“

”کیا اس نے تمہیں اس خدمت کا معاوضہ دیا تھا۔“

”میں نہیں بتا چکا ہوں کہ ایسا کچھ نہیں ہوا۔“

”پھر تم نے اس پر الزام کیوں لگایا؟“

”میں نے اس کی وجہ سے بتا دی ہے۔“

جان سوچنے لگا کہ گیون سے ملنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ وہ جو کچھ بتا رہا تھا اس سے کوئی اسٹوری نہیں بن سکتی تھی۔

وہ تو اسٹین برگ کی فطرت کے بارے میں تفصیلات جانتے اور اس کی خفیہ زندگی کو بے نقاب کرنے آیا تھا لیکن اسے یوں لگا جیسے یہ سب باتیں غیر متعلق ہیں۔ اسٹین برگ نے مآدر سے چھلانگ لگا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا تھا۔ اب اس کی ذات سے کسی کو کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ قارئین زندہ لوگوں کی کہانیاں پڑھنا پسند کرتے ہیں۔

گیون نے غبرائے ہوئے انداز میں کہا۔ ”میں سچ بتا رہا ہوں۔ میں نے اسے کوئی تکلیف نہیں پہنچائی۔ میں مجبور ہو گیا تھا۔“

جان نے اسٹریٹ لائٹ کی روشنی میں دیکھا۔ وہ دروہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”اپنے آپ کو سنبھالو۔“

گیون اپنے آئسو پوچھتے ہوئے بولا۔ ”تم نہیں جانتے کہ حقیقت کیا ہے۔ پولیس نے ہمارا دینا حرام کر رکھا ہے۔ وہ ہمیں اس طرح دیکھتے ہیں جیسے انہیں ہمارا وجود گوارا نہ ہو۔ اس کے باوجود اگر ہم کوئی کام کریں تو وہ ہم سے رشوت لیتے ہیں اور محض اوقات ان کا مطالبہ پھمکا رہا ہوتا ہے۔“

”کیا اب جان کی آنکھیں جبر سے کھل گئیں۔“

کہاں کس تلاش

تعارف رپورٹر تھامس مین کی حیثیت سے کروایا۔ انہوں نے اسے ساتھ بیٹھنے کی دعوت دی اور اپنی کہانیاں سنانے لگے جو سب کیون جیسی ہی تھیں۔

جان یہ سب باتیں نوٹ کرتا رہا اور جہاں ضرورت پڑی، اس نے ان سے مزید تفصیل پوچھ لی۔ جان نے زیادہ تر ان سے پولیس والوں اور ممتاز شخصیات کے بارے میں پوچھا لیکن انہوں نے کسی کا نام لینے سے گریز کیا۔ اسی طرح وہ ان کا ہوں کے بارے میں بھی نہ جان کا جو دوسری میزوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔

اگلی شب کیون اسے صبح لے کر گیا۔ دروازے پر ایک باوردی پولیس والا تعینات تھا جو ہر آنے والے کو غور سے دیکھتا تاکہ مستقبل میں ضرورت پڑنے پر انہیں شناخت کر سکے۔ ہال میں جان کو کوئی شہسا چہرہ نظر نہیں آیا۔ کچھ دیر بعد پروگرام شروع ہو گیا اور وہ سوچنے لگا کہ یہاں آنے کا کیا فائدہ ہوا جب وہ ہال میں بیٹھے ہوئے کسی ایک شخص کا نام بھی معلوم نہیں کر سکا۔ تاہم اسے یقین تھا کہ وہ بالآخر اس مقصد میں کامیاب ہو جائے گا۔ ایسی صورت میں وہ کوئی مضمون یا مکتا م خط لکھ کر ان نام نہاد معززین سے اچھی خاصی رقم بنور سکتا تھا۔

دوسرے روز وہ اور کیون ایک اور شراب خانے گئے۔ وہاں ان کی ملاقات انہی تین آدمیوں سے ہوئی جن سے وہ پہلے مل چکے تھے۔ انہوں نے کچھ اور کہانیاں سنائیں لیکن اس بار بھی کسی کا نام نہیں لیا۔

”پولیس اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔“ سرخ بالوں والے نے کہا۔ ”ممکن وہ لوگ زیادہ خطرناک ہیں جو ہماری تلاش میں یہاں آتے ہیں۔“

”تم کن لوگوں کی بات کر رہے ہو؟“ جان نے پوچھا۔
”اوپر جا کر دیکھ لو۔ تمہیں خود ہی معلوم ہو جائے گا۔“
”میں کچھ سمجھا نہیں۔“

”اوپر کمرے کرائے پر ملتے ہیں۔ ایک شخص نے ہمارے آدمیوں کو رکھے ہاتھوں پکڑنے کی اسکیم بتائی چنانچہ اس نے دو کمروں کی درمیانی دیوار میں ڈرل سے سوراخ کر دیا اور اس کے ذریعہ وہ سب کچھ دیکھ لیا جو وہ دیکھنا چاہ رہا تھا پھر اس نے پولیس کو اطلاع کر دی اور اب وہ دونوں جیل میں ہیں۔“

میز پر بیٹھا ہوا دوسرا شخص بولا۔ ”وہ سوراخ اب بھی وہاں موجود ہے۔ تمہیں وہ ضرور دیکھنا چاہیے۔“ پھر وہ کیون سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”ایڈی اسے وہ چب ہول

”تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔“
جان کو یقین نہیں آیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا کیون بول پڑا۔ ”لوگوں کو نہیں معلوم کہ وہ ہمیں کس طرح ہراساں کرتے ہیں۔“

”ممکن ہے کہ ایسا ہوتا ہو۔ پولیس والے رشوت لے کر لوگوں کو چھوڑ دیتے ہوں۔ لوگ اس بارے میں بڑھتا چاہیں گے۔“

”نہیں۔“ کیون نے کہا۔ ”میں نہیں چاہتا کہ ایک بار پھر میرا نام اخبارات میں آئے۔“

”میں تمہارا نام تبدیل کر دوں گا۔“
کیون اب بھی الجھا رہا تھا۔ ”تمہارے پاس اس کہانی کو بیان کرنے کا اچھا موقع ہے۔“ جان نے کہا۔ ”لوگوں کو بتاؤ کہ تم خوف کے عالم میں رہ رہے ہو اور چارلس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔“

کیون سوچ میں پڑ گیا۔ جان جانتا تھا کہ وہ کیا فیصلہ کرنے والا ہے۔ وہ اسے ایک ایسی اسٹوری دینے والا تھا جو اس کا کیریئر بتا دیتی۔

کیون نے پھر پوچھا۔ ”اس میں میرا نام تو نہیں آئے گا؟“

”بالکل نہیں، میں وعدہ کرتا ہوں۔“
کیون نے پہلے روز ہی جان کو انٹروین برگ کے ساتھ اپنے تعلق کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ جان نے بدولی سے اس کی بات سنی تاہم وہ پولیس کی بدعنوانیوں کے بارے میں زیادہ دلچسپی رکھتا تھا۔ کیون نے پولیس والوں کی بھی بہت سی کہانیاں سنائیں۔ ان میں سے کچھ رشوت لے کر چھوڑ دیتے اور کچھ کسی دوسری شکل میں رشوت لینے۔ جان کے پورے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔ اسے ایک زبردست کہانی مل رہی تھی۔

کیون نے اسے اپنے گروپ کے دوسرے لوگوں سے بھی ملوایا۔ جب وہ اگلے روز جان سے ملا تو اس نے بتایا کہ وہ اس کے کہنے پر اپنے دوستوں سے پوچھنے گیا تھا کہ کیا وہ جان سے ملنے اور اسے اپنی کہانیاں سنانے کے لیے تیار ہیں۔ وہ اس شرط پر راضی ہوئے کہ ان کا اصل نام ظاہر نہیں کیا جائے گا۔ جان نے یہ شرط مان لی۔

سب سے پہلے وہ اسے ایک شراب خانے لے کر گیا۔ جان اس سے پہلے ہی مرتبہ وہاں سے گزرا تھا لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ کیون اسے لے کر ایک میز پر گیا جہاں تین آدمی بیٹھے براؤنی لی پیسے جمع کر رہے تھے۔ جان کا

البتہ پولیس والوں نے مدعی کا نام ضرور بتا دیا۔ وہ ایڈورڈ
کیون تھا۔

جیل کی کٹھری سے ہی اس نے ایک وکیل کا انتظام کیا
اور اسی روز سہ پہر میں اسے جمنسٹ کے روبرو پیش کیا گیا۔
سرکاری وکیل نے اس پر ایڈورڈ کیون کے ساتھ بدعقلی کا الزام
لگایا اور کہا کہ یہ واقعہ ٹوئل اسٹریٹ پر واقع گولڈن میں نای
ہب کی بالائی منزل پر پیش آیا۔ اس جرم کو ملحوظ کرے میں
موجود تین افراد نے دروازے کے سوراخ سے دیکھا۔ اس
کے علاوہ آٹھ افراد کو ای دیں گے کہ وقوع سے پہلے جان اور
کیون اسی عمارت کی علی منزل میں شراب نوشی کر رہے تھے۔
اس کے علاوہ انہیں دو دن قبل اولڈ ہاؤس بار میں بھی ایک ساتھ
دیکھا گیا۔ مزید برآں کاشیمل ولیم جارجس بھی کوای دیے گا
کہ اس نے انہیں خبر کو جان اور کیون کو سہو میں واقع سٹیج
میوزک ہال میں داخل ہوتے دیکھا۔

جان کے وکیل نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”میرا
مذکورہ ایک مختصر رپورٹ ہے جو ایک اور شخص کی موت کی تحقیقات
کر رہا تھا۔ اس پر بھی یہی الزام لگایا گیا تھا اور اسی مقدمہ کی
خاطر اس نے کیون کے ساتھ ان تینوں جگہوں کا دورہ کیا۔
مجھے یقین ہے کہ یہ الزام انہی لوگوں نے لگایا ہے جو میرے
مذکورہ کو اس تحقیقات سے بھٹانا چاہتے تھے۔ میرے مذکورہ کا
نامی بے داغ ہے اور وہ بھی اس قسم کی ناشائستہ حرکت
کا مرتکب نہیں ہوا۔“ وکیل کے دلائل سے متاثر ہو کر جج نے
جان کو چھو سو پونڈ کی ضمانت پر رہا کر دیا۔ جان کے لیے اس رقم
کا انتظام کرنا مشکل تھا۔ اس کے لیے اسے اپنے سرے سے ادھار
لینا پڑا۔

جان کے وکیل نے اسے مشورہ دیا کہ کیون کو کچھ
دے دلا کر معاملہ ختم کرنے کی کوشش کی جائے کیونکہ اس
نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر بہت ہی مضبوط کیس بنایا
تھا۔ جان ان تینوں کو نام سے شناخت نہ کر سکا لیکن اس کا
خیال تھا کہ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے شراب خانے میں
اسے اپنی کہانیاں سنائی تھیں۔ اگر یہ سچ ہے تو کیون بہت
پہلے سے اس کی منصوبہ بندی کر رہا ہو گا لیکن اسے اس کا
اصل نام کیسے معلوم ہوا۔

وہ کیون سے ملنے اس کے گھر گیا لیکن وہ نہیں ملا۔ اس
نے اگلے روز دوبارہ کوشش کی۔ اس کے بعد چند دنوں تک
مسلل جاتا رہا۔ جیسے جیسے اس کی آئندہ چیٹی کی تاریخ قریب
آ رہی تھی، اس کی پریشانی بھی بڑھ رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا
کہ کیا کیون جان بوجھ کر اس سے ملنا نہیں چاہ رہا تھا یا شہر

دکھاؤ۔ یہ بہت اہم ہے۔“
کیون نے جان سے کہا۔ ”یہ شک کہہ رہا ہے۔ تمہیں
اس طرح کی چیزوں کے بارے میں لگتا چاہیے۔ میرے
ساتھ آؤ۔ میں تمہیں دکھاتا ہوں۔“

کیون نے بار والے سے چابی لی اور جان کو لے کر
اوپر چلا گیا۔ تیسری منزل پر پہنچ کر اس نے ایک کمرے کا
دروازہ کھولا اور جان کو اندر چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ ایک عام سا
کمرہ تھا جس میں معمولی فرنیچر رکھا ہوا تھا۔ جان نے کیون
سے پوچھا۔ ”یہ کمرہ کس نے کرائے پر لیا تھا۔“

کیون نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جان نے اس کے
چہرے کی طرف دیکھا۔ اس پر سختی چھائی ہوئی تھی اور وہ ایک
بدلا ہوا شخص لگ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”ہب ہول وہاں
ہے۔“ اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی جسے جان سمجھ نہ سکا
پھر بھی وہ چلا ہوا دباؤ تک گیا جس جانب کیون نے اشارہ کیا
تھا۔ اسے وہاں ایک چھوٹا سوراخ نظر آیا۔ اس نے اس میں
سے جھانکنے کی کوشش لیکن وہاں گہری تاریکی تھی۔

”لگتا ہے کہ اسے بند کر دیا گیا ہے۔“ جان نے کہا۔
”نہیں بلکہ اس کی دیوار کے ساتھ ایک الماری رکھی
ہوئی ہے۔“ پھر خود ہی بولا۔ ”جارجس ایک اچھا شخص تھا۔ وہ کئی
لوگوں سے بچر تھا تم سے بھی بچر۔“
”یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟“ جان نے حیرت سے
پوچھا۔

”ہم نے تمہارے سوالوں کے جواب دیے۔ اب تم
یہاں سے چلے جاؤ اور کبھی واپس مت آنا۔“
”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“

”اب تم جاؤ۔“ کیون نے دوبارہ کہا۔
جان ایک لمحے کے لیے ہچکچایا لیکن وہ دیکھ رہا تھا کہ
کیون سنجیدہ ہے۔ وہ دروازے کی طرف چل دیا۔ پھر
سیڑھیوں کے ذریعے نیچے آیا۔ سرخ بالوں والا اسے دیکھ کر
بولا۔

”امید ہے جان کہ تمہاری شام اچھی گزری ہوگی۔“
جان سوچنے لگا کہ اسے اس کا اصلی نام کیسے معلوم ہو
گیا۔ تاہم وہ رکائیں اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھتا
رہا۔

☆☆☆

اگلی صبح جان کو غیر فطری جرم کے الزام میں اس کے گھر
سے گرفتار کر لیا گیا۔ اس نے احتجاج کرنا چاہا لیکن کسی نے
اس کی ایک منہ پی اور نہ ہی اس کے کسی سوال کا جواب دیا۔

کہاں کس تلاش

اسے یہ سارے تجربات ہو چکے تھے۔ سب سے زیادہ ناخوشگوار وہ تاثرات تھے جو اس کے سر کے چہرے پر نمودار ہوئے جب اس نے اسے بتایا کہ کس مقصد کے لیے پیسوں کی ضرورت ہے۔ اگر وہ سو سال بھی زندہ رہا۔ تو اس شرمندگی سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکے گا۔

براؤن نے کہا۔ ”اس وقت تمہاری سادہ کس بری طرح متاثر ہوئی ہے۔ اسے سامنے کر تم تصور کر سکتے ہو کہ چارلس جیسے محرز شخص پر کیا کڑی ہوگی۔“

”کیا تم واقعی گیون کے نمائندے بن کر آئے ہو؟“

”ہاں، مجھے اعتراف ہے کہ اس سے ملنا آسان لیکن ناپسندیدہ تھا۔ کیونکہ اس نے صرف اپنی کمال بچانے کے لیے چارلس پر جھوٹا الزام لگایا۔ بہر حال بعض اوقات ہمیں اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے ناخوشگوار فیصلے کرنا پڑتے ہیں۔“

”اس کا کیا مطلب ہے؟“

”اگر اسے پانچ پاؤنڈ دے دیے جائیں تو وہ اپنا الزام واپس لے لے گا۔“

جان کو ایک جھٹکا لگا۔ اسے یاد آگیا کہ اس نے بھی ایشین برگ سے اتنی ہی رقم لی تھی۔ اس نے گن کر وہ پیسے براؤن کے حوالے کیے اور بولا۔ ”کیا واقعی اب یہ معاملہ ختم ہو گیا ہے؟“

”تم پر جو الزامات ہیں وہ واپس ہو جائیں گے لیکن تمہاری ذات پر جو دہا بگ گیا ہے، وہ اتنی آسانی سے صاف نہیں ہوگا۔ اس میں کئی سال لگ سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ساری عمر یہ داغ تمہارے دامن پر لگا رہے۔ تمہیں لالچ نے کہیں کا نہ دکھا۔ پہلے تم نے ایشین برگ سے پیسے لیے پھر وعدہ خلافی کر کے اس کے بارے میں مضمون لکھا پھر تم مزید کہانیوں کی تلاش میں گیون اور اس کے ساتھیوں کے جال میں پھنس گئے جن کا کام ہی لوگوں پر جھوٹا الزام لگا کر ان سے پیسے بنورنا ہے۔ جیسا کہ تمہارے ساتھ ہوا۔ امید ہے کہ اس واقعے سے تمہیں سبق مل گیا ہوگا اور آئندہ تم کہانی کی تلاش میں محتاط رہو گے۔“

براؤن کے جانے کے بعد جان بہت دیر تک گم گم بیٹھا رہا۔ اس بدنامی کے ساتھ وہ اس شہر میں نہیں رہ سکتا تھا۔ اسے کسی دوسری جگہ جا کر قسمت آزمائی کرنا ہوگی۔ وہ اٹھا اور بو جھل قدموں سے گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔ اب اس کے سامنے سب سے پہلا مسئلہ بیوی کو دوسرے شہر جانے کے لیے راضی کرنا تھا۔

چھوڑ کر چلا گیا ہے کو کہ اس کی امید کم تھی۔ تاہم اگر وہ اگلی پیش پر نہ آیا تو اس کے سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔

عدالت میں پیش ہونے سے دو دن پہلے اسے ایک خط ملا جس پر کسی کے دستخط نہیں تھے۔ اس میں لکھا تھا۔ ”مسٹر گیون مجھوتے کے لیے تیار ہیں۔ ان کا نمائندہ تم سے کل دوپہر بارہ بجے کونز میڈیا میں ملے گا۔ اکیلے آنا۔“

اگلے روز وہ مقررہ وقت پر اس جگہ پہنچ گیا۔ چھوٹے سے ہال میں آدمی کرسیاں خالی تھیں۔ وہ بیٹھنے کے لیے مناسب جگہ دیکھ رہا تھا کہ اس کی نظریں ایک شخص پر جم کر رہ گئیں جو دروازے کے ساتھ ہی ایک نشست پر بیٹھا ہوا تھا۔

”بیٹھ جاؤ مسٹر جان۔“ براؤن نے کہا۔

وہ اسے ایشین برگ کے گھر میں دیکھ چکا تھا۔ اس نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ ”تم نے کہا تھا کہ گیون کو نہیں جانتے۔“

”تم نے بھی تو اپنا نام تمہاری قلمی میں بتایا تھا۔“

”تمہیں میرا اصلی نام کیسے معلوم ہوا؟“

”میں نے تمہیں چارلس کے مقدمے کی ساعت والے روز عدالت کے باہر دیکھا تھا۔ تم نے اس سے کچھ رقم بھی لی تھی۔“

”میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔“

”ممکن ہے کہ قانون کی نظر میں یہ کوئی جرم نہ ہو۔ تم نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ یہ اسٹوری کہیں شائع نہیں ہوگی لیکن اس کے باوجود تم نے اس کا نام بدل کر ایک مضمون لکھ دیا۔ سچ سچ بتاؤ کیا اس طرح تم اس کی شناخت چھپانا چاہ رہے تھے؟“

”اں۔“

”لیکن تم نے ایسا نہیں کیا۔ اس مضمون کو پڑھ کر کوئی بھی سمجھ سکتا تھا کہ یہ کس کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ چارلس کو اس کے جرم کی بہت بڑی سزا ملی جو اس نے نہیں کیا تھا۔ شاید وہ عدالت سے بری ہو جاتا لیکن تم نے وہ مضمون لکھ کر اسے بارڈالا۔ وہ یہ بدنامی برداشت نہ کر سکا۔ اس نے مجھے یہی بتایا تھا۔“

”میں صرف اپنا کام کر رہا تھا۔“

”ہاں، اور حالیہ دنوں میں تم کیا کرتے رہے، کیا تمہیں اپنی کہانیاں بیچنے میں مشکل نہیں آ رہی۔ جب سے تم پر یہ الزام لگا ہے۔ کیا تمہارے دوست اور خاندان والے تمہیں نظر انداز نہیں کر رہے۔ کیا تمہاری بیوی گم نہیں رہنے لگی؟“

جان کچھ نہیں بولا۔ سچ تو یہ ہے کہ پچھلے چند دنوں میں

آزاد قیدی

منظرِ امام

کہاوت ہے کہ بچے کا نام تو بہت اچھا ہے، دیکھنا یہ ہے کہ میزا ہو کر انسان کیسا نکلتا ہے۔ ہر ماں باپ کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا سپوت سب سے جدا اور دنیاوی منزلوں میں سب سے آگے رہے... گھر ہی وہ پہلا نشیمن ہوتا ہے جہاں انسان کے خیالات... احساسات اور امنگیں جنم لیتی ہیں... تربیت و ترویج کا آغاز ہوتا ہے... بال و پور ملتے ہیں... اور پھر پرواز شروع ہو جاتی ہے... مگر ہر کسی کی قسمت میں یہ گھر... یہ نشیمن اور گہوارہ نہیں رہتا... بچپن میں ہی یہ درودیوار چھوٹ جاتے ہیں... اور وہ ننھے بال و پور کے منتظر بکھر جاتے ہیں... سنگ ریزوں کے مانند بکھر جانے والے ایسے ہی کرداروں کی روداد... فٹ پاتھ... سڑکیں ہی ان کا گھر تھیں... کوئی ان کا نہیں تھا مگر وہ ایک دوسرے کے ساتھی تھے۔ وہ تھے... اور جرم کی تاریک چادر چاروں طرف سے ان کو اپنے حصار میں لے رہی تھی...

ان آزاد پرندوں کی کہانی جو زندگی اور جرم کے قیدی تھے.....

چنگیز بہت بد معاش تھا۔ وہی ہوش کو اکسایا کرتا۔
 اسی وقت بھی اس نے اکسایا تھا۔ ”ابے تجو میں اتنی ہمت ہی
 نہیں ہے کہ چھوٹی میاں کے ساتھ جا سکے۔“
 ”جو اس مت کر۔ پچھلی بار کون کیا تھا؟“
 ”ابے وہ تو چھوٹی میاں اپنے ٹیلے پر سویا ہوا تھا۔ تو
 نے اس پر دو چار ٹھانڈا برسادیے تو کیا پتا چلا۔“
 ”یار چنگیز! تو اس بے چارے کے پیچھے کیوں پڑ
 گیا ہے؟“

جاسوسی ڈائجسٹ (235) اگست 2018ء

”اے سالارات بھرائے سیدھے گائے گا تا رہتا ہے۔ ہم کو چین سے سوئے بھی نہیں دیتا۔“ چکیرے نے کہا۔
 ”تو کیا کرے بے چارہ، اکیلا آدمی ہے۔“
 ”اکیلے تو ہم بھی ہیں یار۔“ چکیرا اچانک اُداس ہو گیا۔

وہ چار تھے۔ دلاور، بلم، چکیرا اور ہوشو۔ ہوشو ان سبھوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ ان چاروں کی پوری کائنات شہر کی ایک بڑی مارکیٹ کی یاد تک تھی۔
 ان کے پاس ٹین کے کسٹر ہوا کرتے اور گاڑیاں پونچھنے کے لیے نیلے کپڑے۔ عام طور پر دن بھر میں چار پانچ گاڑیاں ہر ایک کے حصے میں آتی جاتیں۔

دن بھر کی محنت کے بعد ساٹھ ستر روپے مل جاتے۔ رات کا کھانا وہ چاروں ترپ کے ایک خرب نواز قسم کے ہوٹل میں جا کر کھالیا کرتے۔ ان کے اخراجات بہت محدود تھے۔ کیونکہ ان کی زندگی بھی محدود تھی۔ ان کی خواہشات بھی مختصر تھیں۔

چکیرے کو پھر چھوٹوں میں کا خیال آ گیا۔ اس نے ہوشو سے کہا۔ ”جایا تو بھی ایک نمبر کا بزدل ہے۔ ذرا مونہ سستی رہے گی یار۔“
 ”یار! دلاور بھائی نے دیکھ لیا تو بہت مارے گا۔“
 ہوشو نے کہا۔

”اے تجھے معلوم ہی نہیں ہے۔ دلاور اور بلم دونوں کو لال گاڑی والی اپنے ساتھ لے گئی ہے۔“
 ”وہ کیوں؟“

”مزدوری کروانے، کہہ رہی تھی میرے گھر چل کر ذرا سامان سیٹ کر دو۔ پیسے دوں گی۔ وہ تو مجھ سے بھی کہہ رہی تھی۔“

”تو پھر تو کیوں نہیں گیا؟“
 ”یار! اپن آزاد آدمی ہے۔ ان چکروں میں نہیں بڑتے۔“ چکیرے نے کہا۔ ”اب جا، یہ بے سڑے ہوئے ٹماٹر۔“ اس نے اپنے ٹھیلے سے کچھ ٹماٹر نکال کر ہوشو کی طرف بڑھا دیے۔ ”برسارے سالے پر۔“
 چھوٹوں اس وقت بھی اپنے ٹھیلے کے پاس ہی کھڑا ہوا تھا۔ وہ گندے سندے پھل بچھا کرتا۔ ایسے پھل جنہیں کوئی معقول گاؤں کا خریدنا پسند نہیں کرتا تھا۔

وہ شام کے وقت منڈی چلا جایا کرتا۔ جہاں اس قسم کے پھل بہت سستے داموں مل جایا کرتے۔ وہ رکشے میں لدوا کر انہیں لا کر اپنے ٹھیلے پر بٹاتا۔

زیادہ خراب چلوں کو ایک طرف پھینک دیتا۔۔۔ اور نہایت بہتر چلوں کی اچھی قیمت وصول کر لیا کرتا۔ ان چاروں نے اسے چھوٹوں میں کا نام دے رکھا تھا۔ اس کا قد بہت چھوٹا تھا اور چہرے پر بے شمار داغ تھے۔

چکیرا اس کے بارے میں کہا کرتا۔ ”سالے کا چہرہ بھی مڑے ہوئے امرود کی طرح ہو گیا ہے۔“
 ہوشو اپنے ہاتھوں میں نمائے لیے چھوٹوں بھائی کی پشت پر پہنچ گیا۔ اس نے ایک گاڑی کی آڑ لے کر چھوٹوں پر نمائے پھینکنے شروع کر دیے۔

چھوٹوں نے مڑ کر دیکھا۔ ہوشو جلدی سے ایک گاڑی کی سائڈ میں بیٹھ گیا۔ چھوٹوں نے بھنا کر گالیاں دینی شروع کر دیں۔

دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”چھوٹوں میں کا ڈبا گول۔“ چھوٹوں میں کا ڈبا گول۔ ”یہ چکیرا تھا۔“
 ”ہاں کیسے تیری ماں کا ڈبا گول۔ تیرے باپ کا ڈبا گول۔“ چھوٹوں کی طرح دباؤ رہا تھا۔ ہوشو گاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا کھٹکنا ہوا وہاں سے نائلے پر پہنچ چکا تھا۔

چکیرا دونوں ہاتھوں سے پیٹ دباؤے زور زور سے ہنسنے جا رہا تھا۔ ”وہ میرے شیر، کیا کام دکھایا ہے۔ مزہ آ گیا سالے کو۔ یاد ہی کرے گا۔“
 ”وہ مجھے دیکھ لیتا تو میرے پیچھے پڑ جاتا۔“ ہوشو نے کہا۔

”کیسے دیکھ لیتا۔ میں جانتا ہوں کہ تو بہت ہوشیار ہے۔ اس کو پتا بھی نہیں چلا ہو گا۔ چل، اسی خوشی میں تجھے چائے پلواتا ہوں۔“

کوئٹہ چائے کا ہوٹل اسٹاپ کے پاس ہی تھا۔ اس ہوٹل کا مالک شہباز خان بہت ہی خرد سام قسم کا شخص تھا۔ چکیرا اس کے سامنے بالکل سیدھا ہاتھ تھا۔

دونوں کلڑی کی بیٹی پر جا کر بیٹھ گئے جس کے سامنے ایک گندھی سی ییزر مچی تھی۔ چکیرے نے دودھ پتی کی ایک چٹک کا کہہ دیا تھا۔ ”یار! ان لوگوں کو چائے بنانے کا طریقہ آتا ہے۔“ چکیرے نے ہوشو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”پتا نہیں بھائی، مجھے تو معلوم ہی نہیں کہ دوسری قسم کی چائے کیا ہوتی ہے۔“ ہوشو اُداسی سے بولا۔ ”مجھے تو جب سے ہوش آیا ہے اسی طرح کی چائے پی رہا ہوں۔“

چکیرا خاموش ہو گیا۔ شاید اسے بھی یاد نہیں ہو گا کہ اس نے دوسری قسم کی چائے کب پی ہوئی۔ ابھی پشمان لڑکے نے ان کے سامنے چٹک لاکر رکھی تھی کہ دلاور اور بلم

آزاد قیدی

کہاں ہوں گے۔ ابھی تو سب کی دوستی ہے پھر بعد میں جانے کہاں ہوں۔“

”یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ چلو ہم ایک وعدہ کر لیتے ہیں۔“ ہوش نے کہا۔ ”اگر ہم میں سے کسی کے پاس پیسے آجائیں تو وہ دوسروں کو بھی اپنے ساتھ رکھے گا۔ اس کا ساتھ دے گا۔“

”ہاں، بالکل ٹھیک۔“ چکبر اچک اٹھا۔ ”یہ تو اک دم فٹ کلاس معاملہ ہو جائے گا۔“

”ویسے بھی تو ہم دکھ دکھ میں ایک دوسرے کے ساتھ ہی ہیں یار۔“

اچانک چھوٹو میاں کی گرج سنائی دی۔ ”کیڑا! یہاں بیٹھے ہو، جہاز ہی تو۔“

انہوں نے مڑ کر دیکھا۔ چھوٹو میاں اپنے ہاتھ میں ایک بڑا سا پتھر لیے ان کی طرف دوڑا چلا آ رہا تھا۔ اس کے تیز بہت خطرناک ہو رہے تھے۔

”ابے بھگ لے۔“ چکبر اچھل پڑا۔ ”آج یہ نہیں چھوڑے گا۔“

ان چاروں نے دوڑ لگا دی اور چھوٹو میاں کے پتھر کی زد سے باہر آ کر تالیاں بجا بجا کر گانا گانے لگے۔ ”چھوٹو بھائی کا ڈبا گول۔ بول رے مرنے بول۔ چھوٹو میاں کا ڈبا گول۔“

☆☆☆

اس رات ہلکی ہلکی بارش بھی ہو گئی تھی۔

وہ لوگ جہاں رات بسر کرتے، وہ مارکیٹ کی دکانوں کے چمچے تھے۔ جو ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلے گئے تھے۔ یہاں وہ اپنے بستر بچھا کر سو جاتے تھے۔

بستر کیا تھے۔ چمچی پرانی دریاں اور چادریں تھیں۔ مارکیٹ کا واحد چوکیدار ان چاروں پر بہت مہربان تھا۔ وہ کچھ دیر چکر لگانے کے بعد ان ہی کے پاس آ کر بیٹھ جاتا۔

گل محمد ایک سیدھا سادہ انسان تھا۔ وہ پہاڑی علاقے سے اپنی تقدیر آزمانے شہر آیا تھا اور یہاں چوکیدار ہو کر رہ گیا تھا۔ گل محمد ان لوگوں کو جب اپنے دیسی کی کہانیاں سنایا کرتا تو یہ حیرت سے دیکھتے رہ جاتے۔

گل محمد کی کہانیوں میں برف پوش پہاڑیاں ہوتیں۔ سرسبز وادیاں ہوتیں اور میٹھے پانی کے جھرنے ہوتے۔ خوب صورت آنکھوں اور تازہ گالوں والی لڑکیاں ہوتیں۔

اس رات بھی بارش ہوتے ہی وہ ان کے پاس آ کر بیٹھ گیا تھا۔ مارکیٹ کی دکانیں رات دن گیارہ بجے تک بند ہو جاتیں۔

اس رات بھی بارش ہوتے ہی وہ ان کے پاس آ کر بیٹھ گیا تھا۔ مارکیٹ کی دکانیں رات دن گیارہ بجے تک بند ہو جاتیں۔

اس رات بھی بارش ہوتے ہی وہ ان کے پاس آ کر بیٹھ گیا تھا۔ مارکیٹ کی دکانیں رات دن گیارہ بجے تک بند ہو جاتیں۔

بھی ٹپک پڑے۔

”ابے ہم جانتے تھے کہ تم دونوں یہیں ہو گے۔“ ہالم نے کہا۔

”چائے منگواؤں؟“ چکبر نے پوچھا۔

”نہیں رہنے دے۔“ دلاور بے نیازی سے بولا۔

”ابھی ہم فٹ کلاس چائے کی کر آرہے ہیں ملائی والی۔“

”ہاں یار!“ ہالم نے انگلیوں سے مجھے اشارہ کیا۔ ”یہ موٹی ملائی، مزہ آگیا۔ وہ اپنے ہونٹوں پر زبان چھیرنے لگا۔

”یہ دیکھ، ہم دونوں پچاس پچاس کی مزدوری کر کے آ رہے ہیں۔“ دلاور نے اپنی جیب سے پچاس کا ایک نوٹ نکال کر دکھایا۔ ”کھانے کو الگ سے ملا۔ تو رومہ برائی۔“

”تم لوگ مجھے کیوں نہیں لے گئے؟“ ہوش نے شکایت کی۔

”ابے تو اس وقت یہ کرنے گیا ہوا تھا۔“ ہالم نے چھوٹی انگلی کا اشارہ کیا۔ ”اگر لال گاڑی والی کو بہت جلدی ہو رہی تھی۔“

”اس کا گھر کیسا ہے یار؟“ چکبر نے پوچھا۔

”مت پوچھ۔ ایک دم فٹ کلاس۔“ دلاور نے بتایا۔ ”ایسے ایسے کر کے کہ دل خوش ہو جائے اور مومنے تو ایسے نرم کہ اس پر بیٹھو تو اندر دھنس جاؤ۔“

”یار! ان لوگوں کے پاس اتنے پیسے کہاں سے آتے ہیں؟“ ہوش نے حسرت سے پوچھا۔

”میں بتاؤں۔“ ہالم نے کہا۔

”چلو تم ہی بتاؤ۔“

”ابے میں پچھلے جیسے کو نماز پڑھنے چلا گیا تھا تو مولوی بتا رہا تھا کہ خدا جس کو چاہے بے حساب دولت دے دیتا ہے۔ اب یہ اور بدلے کی مرضی۔“

وہ تینوں ہالم کی اس علیت سے مرعوب سے ہو گئے۔ چائے ختم ہوئی تو پیسے دے کر پارکنگ میں آ گئے۔ ہوش بہت خاموش خاموش دکھائی دے رہا تھا جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔

”ابے تجھے کیا ہو گیا۔“ چکبر نے پوچھا۔

”یار! میں یہ سوچ رہا ہوں کہ ہماری زندگی میں بس یہی سب کچھ ہے۔ کیا بھی ہمارے پاس پیسے نہیں آئیں گے؟“

”اچھا ہے کہ ہم اسی طرح ہیں۔“ دلاور نے کہا۔

”ابے اگر ہمارے پاس پیسے آ گئے تو ہم ایک ساتھ

جائیں پھر پوری مارکیٹ کی فٹ پاتھ پر ان چاروں کا قبضہ ہوتا۔

وہ جہاں سویا کرتے، اس سے کچھ واسطے پر صبح سویرے اخبار والے اخبارات کے بڈل لے کر آجایا کرتے اور اخبارات کی سارنگ کی جاتی۔

اس دوران میں کوئٹہ چائے والا ان کے درمیان چائے تقسیم کرتا۔ تموزی دیر کے لیے پہل ہوتی تھی۔ اس کے بعد اخبار والے سات بجے تک وہاں سے روانہ ہو جاتے۔ فٹ پاتھ۔ گیارہ بجے تک خالی ہو جاتے۔ دکانیں گیارہ کے بعد کھل کر جاتی تھیں۔

پارکنگ میں گاڑیاں لگنا شروع ہو جاتیں اور یہ چاروں اپنے اپنے ڈبے اور کپڑے لیے پارکنگ کی طرف نکل جاتے۔ کیا زندگی تھی۔

اس رات جب بارش ہوئی تو گل محمد ایک تھیلی میں ان کے لیے چائے لے کر آگیا۔ ”یہ لویا! اگر مارم چائے۔“
”واہ گل محمد بھائی! یہ کہاں سے لے آئے۔“ دلاور نے تھیلی پکڑتے ہوئے پوچھا۔

”یارا! کوئٹہ والا ہو گل بند کر کے بھاگنے لگا تھا۔ ہم نے پکڑ لیا۔ ہم بولا پہلے مارم چائے بناؤ پھر دفع ہو جاؤ۔“
زوری ہوا کے ساتھ بارش کی پھواریں ان تک آنے لگی تھیں۔ ہلکی ہلکی ٹھنڈک کا احساس ہونے لگا تھا۔

”واہ، خدا کی شان۔“ گل محمد نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ ”دن میں گرمی پڑتا ہے۔ رات کو سردی ہو جاتا ہے۔“

گل محمد کے پاس کاغذ کے ڈسپوزیبل گلاس ہوا کرتے تھے۔ وہ ان چاروں کے لیے وہ گلاس بھی ساتھ لایا تھا۔

”یارا گل محمد بھائی! تم بہت اچھے آدمی ہو۔“ پالم نے کہا۔ ”تم ہم لوگوں کا بہت خیال رکھتے ہو۔“

”اور کیا۔“ چکبرے نے تائید کی۔ ”ورنہ دکانوں کے فٹ پاتھ پر سونے کی اجازت کیوں دیتے۔“

”واہ رے وا۔“ گل محمد ہنس پڑا۔ ”کیسا موٹا موٹا باتیں کرتا ہے۔ اجازت۔۔۔۔۔ کس نے سکھایا ہے؟“

”یارا! میں نے چھ جماعتیں پڑھ رکھی ہیں۔“ چکبرے نے فخر سے بتایا۔

”پھر کیا ہوا؟“

”اب رہے دو۔ یہ لہی کہانی ہے۔“
”نہیں یارا! آج تو ہم لوگ اپنا اپنا کہانی سناؤ۔ دیکھو

ہم نے اپنا سارا کہانی بتا دیا ہے۔ تم لوگ نہیں بتاتا۔“
”ہاں یارا! آج یہ بھی ہو جائے۔“ دلاور نے کہا۔ ”ہم

لوگ یہاں آسمان سے تو نہیں ٹپکے ہوں گے نا۔ کہیں نہ کہیں سے تو آئے ہیں۔“

”اب تو ہم بھی کے ہو گئے ہیں دلاور بھائی۔“ ہوشو دھیرے سے بولا۔ ”اب سبھی ہماری دنیا ہے۔ سبھی ہماری

کہانی ہے۔“
”چل ہوشو، پہلے تو بتا۔“ دلاور نے کہا۔ ”تیرے

ساتھ کیا ہوا تھا؟ تو کہاں سے آیا ہے؟“
”میری کہانی یہ ہے دلاور بھائی کہ مجھے یہ نہیں معلوم

کہ میرا باپ کون ہے۔“ ہوشو نے بتایا۔
”اور ماں، وہ تو ہوگی؟“

”ہاں، وہ بے چاری تو ہے۔“ ہوشو دھیرے سے بولا۔ اس کی آنکھوں میں یادوں کے چراغ جل اٹھے تھے۔

☆☆☆

وہ ایک بڑا سا احاطہ تھا۔
جس کا ایک بڑا گیت تھا۔ اس گیت پر ایک خوشخوار سا

در بان بیٹھا رہتا تھا۔ جو ہر آنے جانے والے پر کڑی نگاہ رکھتا۔

احاطے میں کچرے کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ ان ڈھیروں کے درمیان ہی سے لکڑی کا ایک کھوکھڑا ہوا زینہ

اوپر چلا گیا تھا۔ پھر ایک طویل سا کوریڈر۔ جس میں دونوں طرف چھوٹی چھوٹی کھڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ یہ بہت پرانی

عمارت تھی۔ نہ جانے کس زمانے کی بنائی ہوئی تھی۔
ہو سکتا تھا کہ انگریزوں کے زمانے میں یہ کھڑیاں

سپاہیوں کے رہنے کے کام آتی ہوں لیکن اب یہاں عورتیں رہا کرتیں۔

اترے ہوئے چہروں اور ڈھلکے ہوئے جسموں کی عورتیں۔ جن کو دنیا بھر کی بیاریاں لاحق تھیں۔ ان میں کچھ

لڑکیاں بھی ہوں گی لیکن ان لڑکیاں نہیں کہا جاسکتا تھا۔
وہ سب آج بچی تھیں۔ ان میں سے کچھ ایسی بھی تھیں

جن کی اولادیں بھی ہوا کرتیں۔ وہ اولادیں کچرے بھرے احاطے میں کندے کیڑوں کی طرح دن بھر ریتی ریتی تھیں۔

یہ عورتیں دن بھر ایک دوسرے کو کندی کندی گالیاں دیتی ریتی اور شام ہوتے ہی میک آپ ٹھونپ کر آنے والوں کے انتظار میں بیٹھ جاتیں۔

یہ بہت مختلف دنیا تھی لیکن اس احاطے میں پرورش پانے والے بچوں کو یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ اس کے علاوہ کوئی

طرف غلط قسم کی چھوٹی چھوٹی دکانیں تھیں۔

کاکی جب اسے کچھ پیسے دیتی تو وہ انہی دکانوں سے کچھ لے لیا کرتا۔ وہ بڑی آسانی سے اس احاطے کے گیٹ سے باہر آسکتا تھا۔ اس احاطے کے دربان لڑکوں کو کچھ نہیں کہتے تھے۔ لیکن بے چاری لڑکیاں گیٹ سے باہر قدم بھی نہیں نکال سکتی تھیں۔ انہیں ڈانٹ کر وہاں بھیج دیا جاتا۔ اس کی ایک دوست تھی۔ اسی احاطے میں رہنے والی ایک عورت کی بیٹی۔ سسلی نام قمار کا۔ نو دس برس کی۔ بہت خوب صورت تھی۔

دودھ جیسا رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، سر تک آتے ہوئے بال۔ اس کا بہت خیال رکھا جاتا۔ اس کی ماں کے علاوہ احاطے کا مالک بھی اس کا بہت خیال رکھتی تھی۔ ہوشو دیکھتا کہ سسلی کے لیے خود مالک جیسے کپڑے لے کر آیا کرتی۔ وہ اکثر کھا کرتی۔ ”ارے، تو تو بہت بھاگوان ہے۔ یہ جو تیرا رنگ روپ ہے نا، یہ آگے چل کر قیامت ڈھا دے گا۔“

سسلی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے رنگ روپ میں ایسی کون سی بات ہے جو آگے چل کر قیامت ڈھا دے گی۔ وہ ہوشو سے کہا کرتی۔ ”ہوشو! یہ سب میرے لیے کیسی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔“ ہوشو کے پاس اس کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہوتا تھا۔ ویسے تو سسلی کا ہر طرح خیال رکھا جاتا۔ لیکن اس کے ہاتھ میں بھی پیسے نہیں دیے جاتے جبکہ ہوشو کی اس کو پیسے دیا کرتی۔ ہوشو جب بھی بازار جاتا، سسلی کے لیے اس کی پسند کے چاکلٹ ضرور لے کر آتا تھا۔ سسلی اس سے کہا کرتی۔ ”ہوشو تو میرے لیے یہ سب کیوں کرتا ہے؟“

ہوشو کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ سسلی کے لیے یہ سب کیوں کرتا ہے۔ اس احاطے میں تو اور بھی لڑکیاں تھیں لیکن ہوشو کو سسلی ہی کا خیال رہتا تھا۔

سسلی کو پڑھانے کے لیے ایک ٹیوٹر بھی آیا کرتا۔ وہ ایک جوان اور مہذب قسم کا لڑکا تھا۔ بے چارہ نہ جانے کس طرح اس احاطے میں ٹیوٹر پڑھانے آ گیا تھا۔

سسلی کی ماں نے جس وقت اس کا انٹرویو لیا، اس وقت اتفاق سے ہوشو بھی وہی موجود تھا۔ سسلی کی ماں نے اس ٹیوٹر سے کہا۔ ”وہ کچھ بھائی! ذرا کان کھول کر سن لے۔ میری بیٹی کو صرف پڑھانے کی کوشش کرنا، اس سے عشق مت شروع کر دینا۔“

اور دنیا بھی ہے۔

ہوشو انہی عورتوں میں سے ایک کا بیٹا تھا۔ وہ جس عورت کے ساتھ رہتا وہی اس کی ماں تھی۔ نئے وہ کاکی کہا کرتا۔

ایک کاکی تھی جو ہر طرح اس کا خیال رکھتی۔ درندہ دہری تو اس کا مذاق اڑایا کرتی تھی۔ وہ اسے لونڈیا کہا کرتی تھی۔ کیونکہ وہ بات بات پر شرما جاتا کرتا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہاں ہوتا کیا ہے۔

وہ دیکھتا کہ جب کوئی آدمی اس کی ماں کے پاس آتا تو اس کی ماں اسے کمرے سے باہر چلے جانے کا کہتی۔ کبھی کبھی وہ اس کے ہاتھ پر دس کا ایک نوٹ بھی رکھ دیتی۔ ”یہ لے بیٹا! جا کر آٹس کریم کھا لے اور ہاں ذرا دیر سے آنا۔“

پھر دروازہ بند ہو جاتا اور وہ نوٹ ہاتھ میں لیے سوچتا رہتا کہ یہ سب کیوں ہو رہا ہے۔ کیا ہو رہا ہے۔ اس احاطے کی نگرانی یا مالک پچاس پچپن برس کی ایک بد صورت عورت تھی۔

جس کی آواز اتنی کرخت اور بلند تھی کہ جب وہ دھاڑتی تو پورا احاطہ کو گونجنے لگتا تھا۔ اس نے چار آدمی بھی پال رکھے تھے۔ وہ چاروں بہت غمیٹ صورت کے مکروہ لوگ تھے۔ وہ بہت بے رحم ظالم تھے، کبھی کبھی وہ احاطے کی کسی عورت کو اتنی بے دردی سے مارا کرتے کہ دہری عورتیں ہم کر رہ جاتیں۔

ایسے موقعوں پر ہوشو کاکی کی آغوش میں چسپ جایا کرتا۔ وہ کاکی سے پوچھتا کہ وہ آدمی اس بے چاری کو کیوں مار رہے ہیں تو وہ خاموش رہتی یا پھر اسے سینے سے لگا کر رونے لگتی۔

ایک رات اس نے ہوشو سے کہا تھا۔ ”ہوشو بیٹا! تو یہاں سے چلے جانا۔ یہاں نہیں رہنا۔“

”کہاں جاؤں گا کاکی؟“

”میں نہیں جانتی بیٹا، میرے پاس تیرے اس سوال کا جواب نہیں ہے لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں کہ یہ جگہ تیرے لیے نہیں ہے۔ یہ بہت بُری جگہ ہے بیٹا۔“

”تو پھر کاکی تم کیوں رہتی ہو۔ تم بھی چلو نا میرے ساتھ۔“

”نہیں بیٹا، میں نہیں جاسکتی۔“ کاکی کہا کرتی۔ ”میں مجبور ہوں۔“

اس احاطے سے باہر کی دنیا ہوشو کے لیے صرف ایک جگہ تھی۔ بہت تنگ اور دور تک چلی گئی تھی اور ان کے دونوں

”یہ آپ کسی بات کر رہی ہیں۔“ وہ ہلبلا کر بولا۔
”میرا کام پڑھانا ہے۔“

”وہی میں بھی سمجھا رہی ہوں۔ میری لکھنیا ہے بہت خوبصورت، ایسا نہ ہو کہ تو اس سے کوئی جھگڑا شروع کر دے۔“

”آپ یہ سب کیوں کہہ رہی ہیں۔ مجھے نہیں پڑھانا، میں جا رہا ہوں۔“

”اچھا اچھا، ناراض نہ ہو۔ ہزار روپے دوں گی مہینے کے۔ اس کو بس چلا کر دے۔ انگریزی آجائے اس کو۔“ شاید ہزار روپے کا لالچ ہی تھا کہ وہ بے چارہ ٹیٹر ناراض ہو کر جاتے جاتے بھڑک گیا۔

سکھنی اپنے اس ماسٹر کے بارے میں ہوشو بتایا کرتی۔
”ہوشو! وہ تو جب مجھے دیکھتا ہے تا تو بس دیکھتا ہی رہتا ہے۔“

”ارے تو چیز ہی ایسی ہے۔“
”کیوں مت کر، مجھے یہ سب اچھا نہیں لگتا۔“

ایک دن اس نے ہوشو سے کہا۔ ”ہوشو! کیوں نہ ہم یہاں سے نکلیں اور چلے جائیں۔“

”تم کہاں جا سکتے ہیں۔“ ہوشو دیر سے بولا۔
”اور تو کیوں جانا چاہتی ہے؟“

”چاہتا نہیں کیوں، مجھے یہاں رہنا اچھا نہیں لگتا۔“ اس نے کہا پھر کچھ دیر رک کر بولی۔ ”وہ ماسٹر صاحب بھی یہی کہہ رہے تھے۔“

”وہ کیا کہہ رہا تھا؟“ ہوشو کے کان کھڑے ہو گئے۔
”وہ یہ بتا رہے تھے کہ یہ کوئی اچھی جگہ نہیں ہے۔“

یہاں گناہ کا کاروبار ہوتا ہے۔ یہاں کی ساری عورتیں بدکردار ہیں اور ایک دن تمہیں بھی ایسا بنا دیا جائے گا۔“

ہوشو کسی سوچ میں پڑ گیا۔ اسے خود بھی یہ احساس ہوا کرتا کہ اس احاطے میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ ٹھیک نہیں ہے۔ آخر ہر رات کو عجیب عجیب لوگ احاطے کی عورتوں کے پاس کیوں آتے ہیں اور بچوں کو باہر نکال کر کمروں کے دروازے کیوں بند کر دیے جاتے ہیں پھر وہ لوگ کچھ دیر بعد کیوں چلے جاتے ہیں۔

بے شمار سوالات تھے۔ اسے یہ سب اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ کم از کم اس کی کا کاروبار وہ بھی نہ بند ہو۔ ایک بار ایک موٹا بڑے کا سا آدمی کمرے میں آیا تو اس نے کمرے سے باہر جانے سے انکار کر دیا۔ ایک بار ایک لڑکی کو

بھاری بھی ہو رہا تھا۔ سر وہی بھی لگ رہی تھی۔
کا کی نے جب اسے باہر جانے کے لیے کہا تو اس نے نیم خود کی کے عالم میں کا کی کا ہاتھ تھام لیا۔ ”نہیں کا کی! آج تم میرے پاس رہو۔ میں پیار ہوں کا کی۔“

”ارے کیوں موڑ خراب کر رہا ہے حرام کی اولاد۔“
”موٹے کی آواز گھٹی۔“ نکل باہر۔“

”دیکھو، آج میرا بیٹا پیار ہے۔“ کا کی نے کہا۔ ”آج رہنے دو۔ کل آجانا۔ میں زیادہ تاہم دے دوں گی۔“

”نہیں، آج وہاں نہیں جاؤں گا۔ اس کو باہر بھیج۔“
”دیکھو، میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔“

کا کی کی آواز آئی۔
اس موٹے نے احاطے کی مالکہ کو آواز دینی شروع کر دی۔ ”میڈم۔۔۔ میڈم!“

ہوشو اس وقت اگلی چار پائی پر نیم بے ہوشی کے عالم میں پڑا ہوا تھا لیکن وہ آوازیں سن رہا تھا۔ کا کی۔۔۔ سے کہہ رہی تھی۔ ”نکال اس کو باہر۔ کیوں وحشتا خراب کر رہی ہے۔“

”دیکھو، اتنا تو رحم کرو کہ آج رہنے دو۔“ ہوشو نے کا کی کی آواز سنی۔

ہوشو نے سنا کہ احاطے کی مالکہ اس کی کا کی کو موٹی موٹی گالیاں دے رہی تھی۔ اس وقت ہوشو کے بدن میں نہ جانے کہاں سے اتنی جان آگئی۔ وہ بستر سے اتر کر مالکہ سے لپٹ پڑا۔ وہ اسے لاتیں مار رہا تھا۔

کمرے میں پہنچ و پکار سن کر احاطے کا ایک غنڈا کمرے میں داخل ہو گیا۔ اس نے آتے ہی ہوشو کو تھپے سے پکڑ کر اٹھا کر ایک طرف پھینک دیا۔

کا کی رو رہی تھی۔ پہنچ رہی تھی۔ ”خدا کے لیے اسے کچھ نہ کہو۔ یہ بیمار ہے۔ میرا ہے۔ چھوڑ دو اس کو۔ میں اب کبھی انکار نہیں کروں گی۔“

لیکن اس غنڈے نے ہوشو کا گلہ دبانے شروع کر دیا۔ ہوشو آٹھ گھنٹوں میں ہوشو کا گلہ دبانے لگا تھا۔ کا کی دوڑ کر اس غنڈے سے لپٹ گئی۔ احاطے کی مالکہ نے اس غنڈے سے کہا۔ ”بس چھوڑ دے اس کو۔ اتنی سزا بہت ہے۔ اس۔۔۔۔۔ کے بچے کو بیڑھیوں کے نیچے ڈال آ۔“

اس غنڈے نے ہوشو کو بے رحمی سے اٹھالیا۔ کا کی رو رہی تھی۔ سک رہی تھی۔ مالکہ گندی گالیاں دے رہی تھی۔ ہوشو کو بیڑھیوں کے نیچے پھینک دیا تھا۔ جہاں وہ نہ جانے کب تک پھنسی پڑا رہا۔ ہوشو آیا تو کا کی دودھ کا گلاس

وہ رو رہا تھا۔ چکبرے نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”روتا کیوں ہے یار جی مرد بن، ہم سبھوں کی کہانی ایک ہی جیسی ہے۔ یہ دنیا جو ہے نا، یہ بہت خراب ہے۔ بہت ظالم ہے۔“

”ایک بات بتا، کیا تو کبھی اپنی کاکی سے ملنے گیا؟“ ہالم نے پوچھا۔

”نہیں، وہاں جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔“ ہوشو نے بتایا۔ ”وہ بہت ظالم لوگ ہیں۔ نہ جانے مجھے دیکھ کر کیا کریں اور پتا نہیں میری کاکی بھی زندہ ہے یا نہیں۔“

سب خاموش ہو گئے۔ کچھ قاصدے سے ٹاپتا فقیر کی آوازیں آرہی تھیں۔ ”دیتا خاندان کے نام پر دیتا جانا۔“

”یار! اس اندھے کا بھی دماغ خراب ہے۔“ دلاور نے کہا۔ ”اس وقت اتنی رات ہو رہی ہے۔ کون اس کو پیچک دینے آئے گا۔“

”ارے یار! اس بے چارے کو کیا معلوم کہ یہ رات ہے یا دن ہے۔“ چکبرے اٹھ بٹا کر بولا۔

اس کی بات سن کر سب ہنس پڑے۔ ماحول کا یو جمل پن کچھ دیر کے لیے دور ہو گیا تھا۔

☆☆☆

پتا نہیں کیا نام تھا اس کا لیکن تھا بہت بد معاش۔ پتہ قامت، گول موٹل، بڑی بڑی موچھیں۔ اس کے بدن پر پولیس کی وردی اس کے پیٹ کے گندے پھسل پھسل کر بچنے آئے تھی۔ وہ اپنی پیٹ کو پھسل اور پرکھ کا تارہتا۔

اس کی ڈیوٹی اسی پارکنگ میں ہوا کرتی۔ وہ ان چاروں پر بہت مہربان تھا۔ خاص طور پر ہوشو پر۔ وہ اکثر ہوشو کو آکس کریم لاکر دیا کرتا۔

ایک دن چکبرے ہوشو پر برس پڑا۔ ”اب تو اس کی لائی ہوئی آکس کریم کیوں کھاتا ہے؟“

”بھائی! وہ اتنی محبت سے آکس کریم جو لا کر دیتا ہے۔“

”لغت ہے ایسی محبت پر۔ وہ ایک نمبر کا بد معاش معلوم ہوتا ہے۔ یہ لوگ یونی کسی کو کچھ نہیں دیتے۔ کسی دن۔۔۔“

”تو چہرہ بتاؤ کیا کروں؟“

”اب کے کچھ دے تو منع کر دیتا سالے کو۔“ چکبرے نے کہا۔

”اور اگر بڑا مان گیا تو؟“

”تو کیا کر لے گا۔ تو نے کون سی اس کی جاگیر ماری

لے اس کے پاس بیٹھی روئے جاری تھی۔ ”لے بیٹا! یہ پل لے اور چلا جا یہاں سے، چلا جا۔“

ہوشو کا پورا جسم بخار سے چپ رہا تھا۔ اس کی گردن اکڑی ہوئی تھی۔ دودھ پینے وقت تکلیف ہونے لگی تھی، اس غنڈے نے بہت لمبی دیر سے اس کا گھاد بایا تھا۔

گھونٹ گھونٹ گھاس خالی کرنے کے بعد اس کی جان میں کچھ جان سی آگئی۔ کاکی رو رہی تھی۔ اس کے آنسو اس کے گالوں کو بھگور رہے تھے۔

ہوشو نے اپنی لرزتی انگلیوں سے اس کے آنسو پونچھے اور خود بھی روئے ہوئے کہا۔ ”کاکی! تم بھی چلو یہاں سے۔ یہ بہت بُرے لوگ ہیں۔ تم یہاں نہیں رہو۔“

”نہیں بیٹا تو چلا جا۔“ کاکی روتے ہوئے بولی۔ ”میں یہاں سے نہیں نکل سکتی۔ تو چلا جا۔ تجھے کوئی نہیں روکے گا۔ یہ لے۔“ کاکی نے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر کچھ نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے۔ ”یہ لے بیٹا! یہ تین ہزار روپے ہیں۔ تو چلا جا۔ ورنہ یہ ظالم لوگ ماریں گے تجھے۔ بھاگ جا۔“

”میں کہاں جاؤں گا کاکی؟“

”کہیں بھی چلا جا بیٹا، میں نہیں جانتی تو کہاں جائے گا۔ اتنے بڑے شہر میں کون تجھے قبول کرے گا۔ میں کچھ نہیں جانتی لیکن میری دعا میں تیرے ساتھ ہوں کی بیٹا! تو جا۔۔۔“

چلا جا۔“

کاکی نے جھک کر اس کی جلیق ہوئی پیشانی پر ہونٹ رکھ دیے۔ اس کے آنسوؤں نے ہوشو کے چہرے کو بھگو دیا تھا۔

”جا بیٹا! اب جا تیرا خدا حافظ۔ یہ نوٹ اپنے ازار بند میں باندھ لے۔ لا میں باندھ دیتی ہوں۔“ اس نے تین ہزار روپے ہوشو کے ازار بند میں کس کر باندھ دیے۔ ”بس بیٹا! اب جا، خدا تیرا نگہبان۔“

”کاکی! میں اتنم سے کیسے ملوں گا؟“

”کوئی ضرورت نہیں مجھ سے ملنے کی۔“ کاکی بڑی طرح رو رہی تھی۔ ”بس اپنی زندگی گزار، خدا تجھے اچھے لوگوں سے ملوادے گا بیٹا۔“

ہوشو نے کاکی کو پیار کیا اور آہستہ آہستہ لڑکھڑا کر مڑ مڑ کر کاکی کو دیکھتا ہوا اچاٹے کے گیٹ سے باہر آ گیا۔ دربان نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

”اور میں اس طرح اس پارکنگ میں تم لوگوں کے پاس پہنچ گیا۔“ ہوشو نے اپنی کہانی ختم کر دی تھی۔

ہے۔ بس کسی بھانے اس سے کہہ دیتا کہ تو اس کی چیزیں نہیں لے سکتا۔“

اس شام جب اس پولیس والے طفیل نے ہوش کو چاکلیٹ دینا چاہی تو اس نے انکار کر دیا۔ ”نہیں جی، میں اب یہ سب نہیں لے سکتا۔“

”نہیں۔“ طفیل حیران رہ گیا۔ ”کیوں نہیں لے گا؟“

”اچھا نہیں لگتا۔“

”دکسی نے تجھے بھکا دیا ہے کیا؟“

”نہیں انکل! کون بھکا نے گا۔“ ہوش نے کہا۔ ”میں تو یونہی کہہ رہا ہوں۔“

”تو پھر رکھ لے، تو تو میری اولاد کی طرح ہے۔ تجھے دیکھ کر اپنا چھوٹا یاد آنے لگتا ہے اس لیے تجھ سے پیار کرتا ہوں۔“ اس نے ہوش کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

ہوش پھل گیا۔ بے چارہ ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہوگا۔ چکبرے کی تو عادت ہے بات بنانے کی۔ اس نے طفیل سے چاکلیٹ لے لی۔ ”اب تو خوش۔“

”ہاں۔“ طفیل کی آنکھیں جھپکے لگیں۔ ”تو ان گفتگوں کی پروا مت کیا کر۔ خواہ ان کے چکر میں اپنی زندگی برباد کر رہا ہے۔“

”نہیں انکل! یہ سب بہت اچھے ہیں۔“ ہوش نے کہا۔ ”میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔“

”میں بھی تو تیرا خیال رکھتا ہوں۔ اچھا یہ بتا تیرے پاس کپڑوں کے کتنے جوڑے ہیں؟“ طفیل نے پوچھا۔

”بس یہ دو۔ ایک ہے یہ جو میں نے پہنا ہوا ہے اور دوسرا دھو کر سوکنے کے لیے ڈال دیا ہے۔“

”ادھو، اچھا ایسا کر، میرے ساتھ چلنا۔ میں تجھے دکان سے دو جوڑے دلا دوں گا۔ چم چم کرتے ہوئے، ٹھیک ہے؟“

”ہاں ٹھیک ہے۔“

”کل شام کو کونڈے ہوکل کے پیچھے آ جانا۔“ طفیل نے کہا۔ ”اور ہاں، ان لوگوں کو مت بتانا۔ یہ بہت بدعاش ہیں۔“

”ٹھیک ہے، کسی کو نہیں بتاؤں گا۔“

لیکن اس رات جب سب سونے کے لیے مارکیٹ کی فٹ پاتھ پر اکٹھے ہوئے تو ہوش نے انہیں پوری بات بتادی۔

چکبرا اور بالم تو گالیاں دینے لگے لیکن دلاور بول پڑا۔ ”خاموش، ہوش تو کل اس کے ساتھ جاے گا۔“

”کیا کہہ رہے ہو دلاور بھائی؟“ چکبرے نے کہا۔

”وہ سالہ۔۔۔۔۔“

”آپے میں سب سمجھتا ہوں، ہم ہوش کو اس کی مرضی پر نہیں چھوڑ سکتے۔ اس کا چچا کر کے دیکھیں گے کہ وہ ہوش کو کہاں لے جاتا ہے۔“

”دلاور بھائی! وہ پولیس کا بندہ ہے۔ کہیں کوئی مسئلہ نہ کر دے؟“ بالم نے کہا۔

”آپے وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ رشید صاحب کو تو جانتے ہوتا تم لوگ۔ وہ اسی قحانے کے انچارج ہیں۔ ان کی گاڑی میں ہی دھوتا ہوں۔ یہ تو معلوم ہے تاہم لوگوں کو۔ رشید صاحب میرا کتنا خیال کرتے ہیں۔ ان سے شکایت کر دوں تو اس موٹے کی حالت خراب ہو جائے گی۔“

”نہیں دلاور بھائی! میں تو نہیں جاؤں گا۔“ ہوش نے کہا۔

”آپے چلا جا۔ روز روز کا ڈراما تو ختم ہو گا نا۔“

اس رات اپنے بستر پر لیٹ کر ہوش کو نہ جانے کیوں اپنی کاکی بہت یاد آئی رہی تھی۔ بے چاری کاکی یہ سمجھ رہی ہو گی کہ وہ بہت بڑا آدمی بن گیا ہوگا۔

کسی کے گھر میں آرام سے رہ رہا ہوگا۔ کسی دردمند نے اسے پناہ دے دی ہوگی۔ اس بے چاری کو کیا معلوم ہوگا کہ اس کا ہوش کہاں کہاں بھٹکتا پھر رہا ہے۔

کاکی کو یاد کرتے کرتے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

دوسرا دن ان بھگوں کے لیے بہت سنسنی خیز تھا۔ شام کے وقت ہوش کو طفیل کے ساتھ جانا تھا اور ان تینوں کو چچا کرنا تھا۔ اس دن چکبرے نے چھوٹو میاں سے بھی چھینر چھاڑ نہیں کی اس لیے پارکنگ میں چھوٹو میاں کی گالیاں نہیں گونج سکی تھیں۔

ہوش بہت گھبرایا ہوا تھا لیکن وہ تینوں اس کا حوصلہ بڑھاتے رہے تھے۔ ”آپے گھبرا تا کیوں ہے، وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ ان بھگوں نے مغرب سے پہلے ہی کام بند کر دیا تھا۔ حالانکہ مغرب کے وقت ایک سی چوڑی گاڑی دلاور کے صفے میں آئی تھی لیکن اس نے کام کرنے سے انکار کر دیا تھا۔“

مغرب کے بعد ہوش ان لوگوں کی طرف امید بھری اور سہی نگاہوں سے دیکھا تو کونڈے ہوکل کی طرف چل پڑا۔ مارکیٹ اس وقت جگمگا رہی تھی لیکن کونڈے ہوکل والا علاقہ اندھیرے میں ہوا کرتا تھا۔ صرف ہوکل کی روشنی ہوا کرتی۔ اس ہوکل کے پیچھے جھاڑیوں کا ایک سلسلہ تھا جو بہت دور تک چلا گیا تھا۔

”دلاور بھائی! کیا ہو گیا ہے اس کو؟“ ہوش نے خوف زدہ ہو کر پوچھا۔

”اے بے جو ہوا خشک ہی ہوا۔“ چکبرے نے کہا۔
”نہیں بھائی، وہ تو بالکل بے جان ہو گیا ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں بھی نہیں مل رہے۔ بالکل بے جان ہو رہا ہے۔“

”اے سالاکھیں مرنے تو نہیں گیا؟“ بالم نے اندیشہ ظاہر کیا۔

”دلاور بھائی! میں نے تو بس یونہی اس کا نشانہ لیا تھا۔“ چکبرے اڑی طرح خوف زدہ ہو رہا تھا۔ ”کیا معلوم تھا کہ ہتھکڑی کے سر پر لگے گا۔“

”اچھا، اب زبان بند رکھنا۔“ دلاور نے کہا۔ ”میں دیکھ کر آتا ہوں۔“

دلاور بہت گھبرایا ہوا واپس آیا تھا۔ ”یار، وہ تو مر گیا۔“ اس نے بتایا۔

”مر گیا؟“ سب چیخ اٹھے۔
”ہاں، بس خاموش۔ بھول جاؤ کہ ہم اس طرف آئے تھے، سمجھے۔“

☆☆☆

دورات ہوش کے لیے بہت بھیاں تھیں۔

بہت دیر تک روتا رہا تھا پھر اسے سردی لگنے لگی۔ مارکیٹ کے چوکیدار گل نے اس کی چیشتیائی پر ہاتھ رکھ کر بتایا۔ ”یار! اس کو تو بہت تیز بخار ہو رہا ہے۔ اس کو ڈاکٹر مائیکر کے پاس لے جاؤ، ورنہ یہ مر جائے گا۔“

”گل بھائی! ہم لوگ کہاں سے ڈاکٹر کے پاس لے جائیں۔“ دلاور نے کہا۔ ”اور رات بھی تو ہو رہی ہے۔ اس وقت تو کوئی لے گا بھی نہیں۔“

”تو پھر اس کو اسپتال لے جاؤ۔“

اسپتال لے جانے بھی ان کے لیے ایک مسئلہ تھا۔ کس طرح لے جاتے۔ پہلے کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ ہوش کا پورا بدن کانپ رہا تھا۔ اسی دوران چھوٹی میاں بھی کسی طرف سے ان کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

”کیا موت آگئی ہے تم لوگوں کو؟“ اس نے پوچھا۔ اس کی نظر ایک طرف پڑے ہوئے ہوش پر نہیں گئی تھی۔

”اٹکل! ہوش بہت بیمار ہو گیا ہے؟“ بالم نے بتایا۔ ”اے، اس وقت میں اٹکل کیسے ہو گیا؟“ وہ ہاتھ چما کر بولا۔

”اٹکل! ہم مذاق نہیں کر رہے۔ دیکھ لو اس کو، بے

وہ تینوں کچھ فاصلے سے ہوش کا تعاقب کر رہے تھے۔ انہیں مزہ بھی آرہا تھا۔ بقول چکبرے کے وہ سب جاسوسی کر رہے تھے۔ ایسی جاسوسی کا موقع انہیں پہلی بار مل رہا تھا۔ وہ ہوش تک تو ہوش کو دیکھتے آئے تھے پھر اچانک ہوشوان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

وہ روشنی تک تو نظر آیا تھا۔ اس کے بعد نہ جانے کس طرف چلا گیا تھا۔ ”اے بے ہوشو کہاں غائب ہو گیا؟“ بالم پریشان ہو کر چیخ اٹھا۔

”پتا نہیں، ہوش تک تو سامنے ہی تھا۔“ چکبرے نے کہا۔

”چلو جلدی سے پچھل طرف چلو۔“ دلاور نے ہوش کی عقبی جھانپوں کی طرف دوڑ لگا دی تھی۔

تینوں جھانپوں میں کس پڑے۔ جن کے درمیان ایک راستہ بھی بنا پڑا تھا لیکن ہوش کا کوئی پتا نہیں تھا۔

”اے کہاں چلا گیا؟“ بالم ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔

”آواز دوں؟“ چکبرے نے پوچھا۔
”نہیں۔“ دلاور نے منع کر دیا۔ ”آواز دینے سے

سلاٹیل ہوشیار ہو جائے گا۔ بس خاموشی سے اس کو تلاش کرتے رہو۔“

پھر ایک طرف سے ایک گھٹی ہوئی آواز آ کر اس طرح خاموش ہو گئی جیسے کسی کا منہ دبا دیا گیا ہو۔ ”وہ.... وہ اس

طرف۔“ دلاور نے اشارہ کیا۔ ”لیکن بہت چپ چاپ۔ کوئی آواز نہیں نکلے اور نہ ہی ان کے سامنے جاتا ہے۔“

”تینوں جھانپوں کے درمیان راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ ایک جگہ انہیں دونوں دکھائی دے گئے۔

فٹیل نے بہت سختی سے ہوش کا منہ دبا رکھا تھا۔ ہوش اس کی گرفت سے نکلنے کی جدوجہد کر رہا تھا۔

”بس، اب تم لوگ بالکل چپ رہو۔“ دلاور نے اندیرے میں ٹٹول کر ایک ہتھکڑی پھرا اٹھا لیا۔

پہلا ہی ہتھکڑی نشانے پر لگا تھا۔ دلاور نے فٹیل کی کمر کا نشانہ لیا تھا۔ ایک چیخ کے ساتھ اس نے یوٹاکر ہوش کو

چھوڑ دیا تھا۔ دلاور کا دوسرا ہتھکڑی کی پیٹھ پر لگا۔ اس کے ساتھ ہی فٹیل نے گندی گندی گالیاں دینی شروع کر دیں پھر

اچانک ایک زوردار چیخ کے ساتھ ایک طرف الٹ گیا۔ چکبرے نے اس کے سر کا نشانہ لے کر ہتھکڑی چلا لیا تھا۔

اس کے گرتے ہی ایک سناٹا سا ہو گیا۔ ہوش خوف زدہ ہو کر اس طرف دوڑ آیا جہاں یہ تینوں چھپے ہوئے تھے۔

”وہ دیکھو، وہ برآمدے میں مریضوں کے ساتھ آنے والے بیٹھے ہیں۔ تم بھی وہیں بیٹھ جانا۔“
 ”یہ تو مجبوری ہے۔ کون رہے گا اس کے ساتھ؟“
 چھوٹی میاں نے پوچھا۔
 ”میں رہوں گا چاچا، بالم واہس جائے گا۔“ دلاور نے کہا۔

”چل ٹھیک ہے۔ ہم لوگ صبح آجائیں گے اور ہاں کوئی پریشانی ہو تو میرے جاننے والے کو بلا لیتا۔“ فتح محمد نام ہے اس کا۔ ٹائٹ ڈیوٹی ہوتی ہے اس کی۔ پورے اسپتال میں اس کی ٹور ہے۔
 ”ٹھیک ہے چاچا تم لوگ جاؤ۔ میں سب سنبھال لوں گا۔“

بالم اور چھوٹی واہس چلے گئے۔ دلاور کچھ دیر تک ہوش کی طرف تشریف بھری نگاہوں سے دیکھتا رہا پھر برآمدے میں آ گیا۔

اسے ایسا لگا جیسے کسی ریلوے پلیٹ فارم پر آ گیا ہو۔ عورتیں، مرد، بچے دیوار کے ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ باقاعدہ دریاں بچھا کر کھانے پینے کے سامان کے ساتھ۔ جیسے پبلک منانے آئے ہوں۔

ایک جگہ چار پانچ بندے تاش کی بازی لگائے ہوئے تھے۔ دلاور کو بھی تاش سے بہت دلچسپی تھی لیکن اس وقت اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ ہوش کی بیماری نے اسے پریشان کر دیا تھا۔

اس کے اندازے کے مطابق ہوشوان واقعات سے گھبرا کر بیمار پڑ گیا تھا۔ پولیس والے کا اسے اپنے ساتھ لے جانا، پھر پولیس والے پر مقرر ہوتے ہوئے دیکھنا، پھر اس کی موت، اس کی لاش ...

بے چارے ہوشو کے لیے یہ سب بھیانک اور خوفناک منظر تھا۔

دلاور کو ہوشو کی بیماری کی وجہ سے اب تک کچھ سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا لیکن اب برآمدے میں بیٹھ کر اسے پولیس والے کی خون آلود لاش یاد آ رہی تھی۔

اس کا چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے رقص کر رہا تھا۔ اگر کسی کو پتا چل گیا کہ پولیس والے کی موت میں ان لوگوں کا ہاتھ ہے تو پھر کیا ہوگا؟

یہ ایک دہلا دینے والا سوال تھا۔ پولیس، گرفتاری، جیل، بھائی، اب ایک راستہ تو یہ تھا کہ وہ سب والد سے بھاگ جائیں لیکن شاید یہ اور خطرناک بات ہوتی۔ سارا ٹھک انہی

سدھ پڑا ہوا ہے۔“ دلاور نے بے ہوش ہوشو کی طرف اشارہ کیا۔

چھوٹی میاں ہوشو کے پاس پہنچ کر اسے دیکھنے لگا۔
 ”اے، یہ تو واقعی بخار میں چپک رہا ہے۔ لے جاؤ اس کو اسپتال۔“

”کیسے لے جائیں، ہمارے پاس تو کوئی سواری بھی نہیں ہے۔“ چنگبر نے کہا۔

”تم سالانہ صدمہ معاشی کرنے کے لیے ہو۔“ چھوٹی میاں بھڑک اٹھا۔ ”ٹھیک ہے، سنبھالو اس کو۔ میرا دوست رکشا چلاتا ہے اس کو لے کر آتا ہوں۔“

چھوٹی میاں بھدکتا ہوا تیز قدموں سے ایک طرف چلا گیا۔

”میرا خیال ہے یہ نکل لیا۔“ بالم نے اندیشہ ظاہر کیا۔
 ”نہیں یار، وہ آئے گا۔“ دلاور نے کہا۔ ”اس کا اسٹائل بتا رہا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا۔“

چھوٹی اپنے وعدے کے مطابق دس بی منٹ میں رکشا لے کر آ گیا تھا۔ ”چلو بے، ملتاؤ اس کو۔“

تینوں نے مل کر ہوشو کو رکنے کی سیٹ پر لٹا دیا تھا۔ چھوٹی کے ساتھ بالم اور دلاور بھی کسی نہ کسی طرح گھس کر بیٹھ ہی گئے تھے۔

”اس کو کہاں لے جائے گا چاچا؟“ بالم نے پوچھا۔

”اے واہ، آج تو بڑی شرافت سے چاچا بول رہا ہے۔“ چھوٹی میاں ہنس پڑا۔ ”اب ٹرہ لگا چھوٹی میاں کا ڈبا گول۔“

”ارے چاچا معاف کر دو۔“ دلاور نے کہا۔ ”یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں ہے۔“

چھوٹی بھی ہوشو کی حالت دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ رکشا عباسی اسپتال کے گیٹ تک پہنچ چکا تھا۔ تینوں نے بڑی مشکلوں سے ہوشو کو اتارا اور ڈنڈا ڈولی کر کے اندر لے آئے۔

اسپتال میں چھوٹی کی جان پہچان کا ایک بندہ تھا جس کی ٹائٹ ڈیوٹی تھی۔ اس کی وجہ سے ایک خالی بستر مل گیا اور اس کا علاج شروع ہو گیا۔

وارڈ یوائے نے ان کے پاس آ کر بتایا۔ ”دیکھو بھائی، یہاں رات میں مریض کے پاس کسی کو رکھنے کی ضرورت ہوگی لیکن صرف ایک آدمی۔“

”اور وہ ایک آدمی کیا مریض کے ساتھ ہی بستر پر لیٹے گا؟“ بالم نے جمل کر پوچھا۔

لوگوں پر چلا جاتا۔ ایک اطمینان بھی تھا کہ کسی نے ان لوگوں کو دیکھا نہیں ہوگا۔

”بھائی! اس بوتل میں پانی بھر کے لا دو گے؟“ اچانک کسی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

اس کے سامنے ایک لڑکی کھڑی تھی۔ بہت خوب صورت لڑکی تھی۔ اسے دیکھتے ہی دلاور کا دل دھڑک اٹھا۔ انیس بیس برس سے زیادہ کی نہیں ہوگی۔ اس کی آنکھوں میں کاجل لگا ہوا تھا۔ وہ دلاور کی طرف پلانک کی ایک بڑی سی بوتل بڑھاتے ہوئے اس سے پانی بھر لانے کی درخواست کر رہی تھی۔

”کیوں نہیں، ابھی لے آتا ہوں۔“ دلاور نے اس کے ہاتھ سے بوتل لے لی۔

سیرمیوں کے نیچے ایک رنگ آلود سا کالر لگا ہوا تھا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ اس میں پانی آ رہا تھا۔ دلاور جب بوتل بھر کر واپس آیا تو وہ لڑکی ایک بڑے میاں سے ہاتھیں کر رہی تھی۔

سفید داڑھی والا وہ بوڑھا لڑکی سے کچھ کہہ کر مریمینوں کے کمرے کی طرف چلا گیا تھا۔

دلاور نے بوتل لڑکی کے حوالے کر دی۔
”بہت شکریہ۔“ لڑکی نے کہا۔ ”بہت زور کی پیاس لگ رہی تھی۔“

دلاور نے بس یونہی پوچھ لیا۔ ”یہ بڑے میاں تمہارے ابا تھے کیا؟“

”نہیں تو۔“ لڑکی کے ہونٹوں پر ایک تلخی مسکراہٹ آگئی۔ ”ابا نہیں تھے۔ میرے میاں تھے۔ میرے شوہر۔“ دلاور ہچک سا ہو گیا۔ ”تمہارا شوہر؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔ ”لیکن وہ تو بہت بوڑھا آدمی ہے۔“

”بس اب تم بہت جاؤ۔ اگر اس نے دیکھ لیا تو آفت کر دے گا۔ ابھی اپنے پیار بھائی کو دیکھنے گیا ہے۔ ویسے ہم ابھی چار پانچ دنوں تک اور یہیں رہیں گے۔“

لڑکی اتنا بتا کر تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ ویسے اس نے دلاور کو اشارہ دے دیا تھا کہ وہ چار پانچ دنوں تک یہیں رہے گی۔

دلاور اس کے بارے میں سوچتا ہی رہ گیا۔ کیسا عظم تھا۔ اتنی نازک سی اچھی لڑکی، اور اس کا شوہر اتنا بوڑھا آدمی۔ چنانچہ یہ شادی کیسے ہو گئی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ لڑکی اپنے بوڑھے شوہر کے ساتھ آتی ہوئی دکھائی دے گئی۔ وہ بوڑھا اس پر کسی بات پر ناراض

ہو رہا تھا۔ اس کے زور زور سے بولنے کی آوازیں پورے برآمدے میں گونج رہی تھیں۔

دلاور کا دل چاہا کہ وہ اس غنیمت بوڑھے کی گردن جکڑ کر اس کو اتنے جھکے دے کہ اس کے ہوش شکنے نہ آجائیں، اس غنیمت کو اتنی اچھی لڑکی کی قدر ہی نہیں تھی۔

دلاور ساری رات دیوار کے ساتھ لگا بیٹھا رہا تھا۔ اسے نیند ہی نہیں آئی تھی جبکہ دوسرے اسی برآمدے کے فرش پر غرائٹ لے رہے تھے۔ وہ بس اسی لڑکی کے بارے میں سوچے جا رہا تھا۔

دلاور تین بار ہو شو کو بھی دیکھ آیا تھا۔ جس کا بخارا اب کم ہونے لگا تھا۔ اس کی حالت پہلے سے بہت بہتر تھی۔ خود کی کیفیت بھی ختم ہو گئی تھی۔

دلاور ایک بار جب اس کے پاس آیا تو وہ ہوش میں تھا۔ اس نے دلاور کا ہاتھ تھام لیا۔ ”دلاور بھائی! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے، وہ.....“

”بس خاموش۔“ دلاور نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اشارہ کیا۔ ”کوئی ایسی سیدھی بات مت کرنا۔“
”مجھے یہاں سے لے چلو دلاور بھائی۔“

”تو ٹھیک ہو رہا ہے۔ صبح تک بالکل ٹھیک ہو جائے گا، پھر ڈاکٹر صاحب سے بول کر تجھے لے چلوں گا۔ اب تو سو جا۔“

”تم تو نہیں جا رہے ہوتا؟“
”نہیں رہے، میں باہر برآمدے میں ہوں۔“ دلاور نے اس کا گل خیمہ پایا۔

برآمدے میں وہ لڑکی شاید اس کا انتظار کر رہی تھی۔ دلاور کو دیکھتے ہی اس کے قریب آگئی۔ ”تم کہاں چلے گئے تھے، میں تو تم ہی کو ڈھونڈ رہی تھی۔“

”کیوں خیریت؟“ دلاور نے حیرت سے پوچھا۔
”وہ اس وقت اپنے لیے پان لینے گیا ہے۔“ لڑکی نے بتایا۔ اس کا اشارہ اپنے بوڑھے شوہر کی طرف تھا۔

”تو بچہ۔“
”تم مجھے یہاں سے نکال لو۔“ لڑکی نے کہا۔
”نکال لوں؟ کہاں نکال لوں؟“

”کہیں بھی تم نے دیکھ لیا وہ کیسا ہے۔ میں اس کے ساتھ نہیں رہتا چاہتی۔ اس نے میری زندگی برباد کر دی ہے۔ تو بڑی سی ہمت سے کام لو تو میں تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔ میں ایک جوان اور خوب صورت لڑکی ہوں۔ صرف انیس برس کی ہوں۔ بھگتا لے جاؤ مجھے۔ وہ بڑھا ڈھونڈتا ہی

پوچھا۔

”اے اتنا بڑا شہر ہے۔ ہزاروں پارکنگ ہیں۔ فٹ پاتھ ہیں۔ ہم نے کون سا یہاں اپنا گھر بنا رکھا ہے کہ ہمیں جاتے ہوئے پریشانی ہوگی۔ بس اپنا اپنا بستر اٹھاؤ اور نکل لو یہاں سے۔“

”اس طرح نہیں۔ یہ ہمارا پرانا فیما ہے۔“ چکبرے نے کہا۔ ”پہلے ہم شہر گھوم پھر کر دیکھ لیتے ہیں۔ جہاں اچھا لگے گا، وہیں ڈیرا ڈال لیں گے۔“

”لیکن یہاں تو ہمارا کام بندھا ہوا ہے۔“ ہوش دھیرے سے بولا۔

”اے وہاں بھی بندھ جائے گا۔ گاڑیاں دھلوانے والے ہر جگہ آتے ہیں۔“ دلاور نے کہا۔ ”خیر، یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ ابھی تو سوجاؤ۔ بہت رات ہو چکی ہے۔ کل صبح سوچ لیں گے۔“

مارکیٹ کا چوکیدار گل زمان بھی دو چار دنوں سے دکھائی نہیں دیا تھا۔ اس کی جگہ ایک دوسرا چوکیدار تھا۔ کرخت چہرے اور بڑی بڑی مونچھوں والا۔

گل زمان پندرہ بیس دنوں کے لیے اپنے گاؤں گیا تھا۔ اس نے اپنی جگہ اپنے کسی رشتے دار کو دے دی تھی۔ وہ ان لوگوں کو پہلی بار میں پسند نہیں آیا تھا۔ وہ ایک فضول سا آدمی معلوم ہوتا تھا۔

اس کی صرف یہ بات اچھی تھی کہ اس نے بھی ان چاروں کو مارکیٹ کے فٹ پاتھ پر سونے کی اجازت دے دی تھی۔ اس رات چکبرے کو بہت عجیب سے خواب آتے رہے۔

اس نے دیکھا کہ وہ اندھیرے میں دوڑتا جا رہا ہے۔ کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ ساتھ ہی آوازیں دے رہا ہے۔ رگ جا۔۔۔ رگ جا۔۔۔

چکبرے کو وہ آواز بہت بے صبا لگتی تھی۔ وہ اور تیز دوڑنا شروع کر دیتا ہے اور اچانک سورج نکل آتا ہے۔ اس کے چہرے کے سامنے۔

اس کی تیز کرشمیں اس کی آنکھوں میں اتاری چلی جا رہی ہیں۔ وہ یوکلار آکر انھیں کھول دیتا ہے۔ کئی طاقتور تار بج کی روشنیاں اس کے چہرے پر پڑتی ہیں۔ وہ یوکلار اٹھ گیا۔ ”چل اٹھ۔“ کسی نے اس کی کمر پر ایک زوردار ٹھوکر رسید کر دی۔

وہ جلدی سے کھڑا ہو گیا۔ کئی پولیس والوں نے اسے اور اس کے ساتھیوں کو گھیر رکھا تھا۔ مارکیٹ کی فٹ پاتھ کے

ڈراما کی دیر کے لیے دلاور ڈول کر رہ گیا تھا۔ ایسا اس کے ساتھ پہلے بھی نہیں ہوا تھا۔ کسی لڑکی نے اس سے اس طرح کی باتیں نہیں کی تھیں۔

پارکنگ میں لڑکیاں اپنی گاڑیوں میں آیا کرتیں۔ اور اس سے اپنی گاڑیاں دھلوا کر تھیں۔ اس دوران ان لڑکیوں سے بس دو جی سی باتیں ہوا کرتیں۔ ”اتنے پیسے لوں گا، ٹھیک سے دھونا، یا اسی قسم کی کوئی اور بات۔ آج تک کسی نے اس سے یہ نہیں کہا ہو گا کہ وہ اس کے ساتھ بھاگ جانا چاہتی ہے۔

لیکن ان سب باتوں کے باوجود وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا تو خود کوئی شکار نہیں تھا۔ زندگی فٹ پاتھ پر بسر ہو رہی تھی تو کیا وہ اسے فٹ پاتھ پر رکھتا؟

خدا جانے اس لڑکی نے کیا سوچ کر اس سے اتنی بڑی بات کہہ دی تھی۔ اس نے دلاور کو کیا کچھ لیا تھا؟

دلاور اس کی بات کا جواب سوچ ہی رہا تھا کہ اس کا بوڑھا شوہر کارڈور میں آتا ہوا دکھائی دے گیا۔ لڑکی فوراً اس کے پاس سے ہٹ کر کسی اور طرف چلی گئی۔ دلاور بھی وہاں سے ہٹ گیا تھا۔

اسی شام ہوشو کو اسپتال سے رخصت کر دیا گیا تھا۔ اگر وہ لڑکی اپنے شوہر کے ساتھ اسپتال میں موجود بھی تھی تو دلاور نے اسے تلاش کرنے اور اس سے ملنے کی کوشش نہیں کی۔

ہوشو کا بخار اتر گیا تھا لیکن بہت کمزور ہو رہا تھا۔ بالم اور چکبرے اس کی داپسی پر بہت خوش تھے۔ اسی خوشی میں بالم اپنے پیسوں سے گلاب جامن لے کر آ گیا تھا۔

اس وقت ہوشو نے ان تینوں سے کہا۔ ”یار! اب ہمیں چھوڑو یہاں کے ساتھ مذاق نہیں کرنا چاہیے۔ اگر وہ ہمارا ساتھ نہیں دیتا تو پھر مجھے کچھ ہوجاتا۔“

”ہاں بھائی۔“ چکبرے نے اس کی تائید کی۔ ”یہ چھوڑو یہاں تو بہت اچھا آدمی نکلا۔ ورنہ اس کو کیا پڑی تھی کہ ہماری مدد کو آتا۔“

وہ چاروں جان بوجھ کر اس پولیس والے کی بات نہیں کر رہے تھے۔ ان کے دلوں کے چور نے ان کی زبانوں پر تالے لگا دیے تھے۔

اس رات وہ بہت دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ دلاور کا خیال تھا کہ ان لوگوں کو اب اس پارکنگ کو چھوڑ کر کہیں اور چلے جانا چاہیے۔

”دلاور بھائی! ہم کہاں جا سکتے ہیں؟“ بالم نے

ساتھ روڈ پر پولیس کی ایک گاڑی بھی کھڑی ہوئی تھی۔

”اوتے بٹھاؤ سب کو۔“ ایک پولیس والے نے آواز لگائی۔

ان چاروں کو موبائل میں اٹھا اٹھا کر جیسے پیسک دیا گیا تھا۔ ہوشو، ہانگے لپٹ کر روئے جا رہا تھا۔ دلاور نے حتیٰ سے اپنے ہونٹ بھیج رکھے تھے۔

”چلو۔“ اسی پولیس والے نے آواز لگائی اور موبائل ان چاروں کو سمیٹ کر آگے بڑھ گئی۔

☆☆☆

ان چاروں کو ایک کمرے میں بٹھا دیا گیا تھا۔ پولیس والے انہیں کمرے میں بٹھا کر باہر چلے گئے تھے۔

دلاور، ہوشو کے شانے پر تھکی دے رہا تھا۔ ”بس حوصلہ رکھ، اور کسی طرح بھی اپنی زبان نہیں کھولنا ہے۔ ورنہ یہ ہماری کھال اوجھڑیں گے۔“

”یہ معاملہ کیا ہے دلاور بھائی؟“ چکبرے نے پوچھا۔

”اے وہی معاملہ ہوگا اور کیا ہوگا۔“ دلاور نے کہا۔ ”لیکن پھر سمجھا رہا ہوں کہ یہ چاہے ہم پر لاکھ سختی کریں۔ ہمیں کچھ نہیں بولنا ہے۔“

کچھ دیر بعد ایک موٹا سا پولیس والا اپنے ہاتھ میں ایک رول گھماتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی خون خوار نگاہیں ان چاروں پر لگی ہوئی تھیں۔ ”ہاں اب بتاؤ، لیکن سچ سچ بتانا۔ جھوٹ بولے تو یہ ڈنڈا۔۔۔۔۔“

”بات کیا ہے صاحب؟“ دلاور نے ہمت کر کے پوچھا۔ ”ہم تو غریب لوگ ہیں۔ گاڑیاں دھو کر اپنا کام چلاتے ہیں۔ ہمارا کسی معاملے سے کیا لیتا دیتا۔“

”نچو، صاف صاف بتاؤ۔ سامان کہاں بیچتے ہو۔ کس کے ہاتھ بیچتے ہو؟“ پولیس والے نے پوچھا۔

”سامان؟“ ان چاروں نے حیران ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ”کون سا سامان؟ کس کا سامان؟“

”وہی سامان جو گاڑیوں سے نکالتے ہو۔“ پولیس والے نے پوچھا۔

”نہیں صاحب جی! ہم تو کوئی سامان نہیں نکالتے۔“ چکبرے نے کہا۔

”تیری تو۔۔۔“ پولیس والے نے چکبرے کی کمر پر ڈنڈا رسید کر دیا تھا۔ ”بتانا ہے یا نہیں؟“

چکبرا بلبلانے لگا تھا۔ وہ دہائیاں دینے لگا۔ ”میں سچ کہہ رہا ہوں صاحب! ہم ایسا کام نہیں کرتے۔ ہم محنت کی کمائی کھاتے ہیں۔“

”تیری محنت کی تو۔۔۔۔۔“ پولیس والے نے ایک موٹی سی گالی دیتے ہوئے دوسرا ڈنڈا بھی اس کی کمر پر رسید کر دیا تھا۔

چکبرا اتر پ کر رہ گیا۔ ہانگے کے ساتھ اس نے اپنی کمر پکڑ کر دو تا شروع کر دیا۔ پولیس والا اسے چھوڑ کر ہوشو کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”ہاں اب تو بتائے گا۔ تجھ میں جان ہی کتنی ہے۔ دو ڈنڈے پڑیں گے تو تانی یاد آجائے گی۔“

”صاحب جی! اسے کچھ مت کہنا۔“ دلاور نے اپنے ہاتھ جوڑ دیے۔ ”یہ بہت پیار ہے۔ یہ آج ہی اسپتال سے واپس آیا ہے۔ تیرے ہمت بخار ہو گیا تھا اس کو۔“

”تو پھر تو ہی بتا۔ سامان کس کو دیتا ہے؟“

”کسی کو نہیں صاحب! ہم ایسا کام ہی نہیں کرتے۔“

دلاور نے کہا۔ پولیس والے نے دلاور کو بھی ایک ڈنڈا رسید کر دیا تھا۔ دلاور تڑپ کر رہ گیا۔ ”بتانا کیوں نہیں؟“ پولیس والا غصے سے دھاڑا۔

”صاحب جی! جب ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ ہمارا ایسے کاموں سے کوئی تعلق نہیں ہے تو آپ یقیناً کیوں نہیں کرتے۔“ چکبرے نے ذرا تیز آواز میں کہا۔

”اوہو۔“ پولیس والا اب پوری طرح چکبرے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”بڑی جان ہے بھائی تجھ میں۔ بڑی اونچی آواز نکالتا ہے۔ دیکھ، تیرے ساتھ ابھی کیا ہوتا ہے۔“

پولیس والے نے کمرے سے باہر کھڑے پولیس والوں کو آواز دی۔ ”اوتے ذرا اندر تو آؤ۔“

دو پولیس والے اندر آ گئے۔ پہلے والے نے چکبرے کے بالوں کو پکڑ کر جھٹکا دیتے ہوئے ان دونوں سے کہا۔ ”ذرا اس ہیر و کوٹو اندر لے چلو۔ بہت اونچا بولتا ہے۔“

”معاف کر دو صاحب۔“ چکبرے نے پہلے والے کے پاؤں پکڑ لیے۔ ”اب کچھ نہیں بولوں گا۔“

”چلو اٹھاؤ اس کو۔“ چکبرے کو زبردستی اس کمرے سے اٹھا کر باہر لے گئے۔ ان تینوں پر سناٹا طاری ہو گیا۔ ہوشو بری طرح کانپ رہا تھا۔

”حوصلہ رکھو تم سب۔“ دلاور نے کہا۔ ”خود سوچ جب ایک جھوٹی بات پر یہ لوگ ایسا کر سکتے ہیں تو پھر وہ بات

آزاد قیدی

”ہاں، وہ زندہ ہے۔“ چکبرے نے بتایا۔ ”وہ سالہا زخمی ہو کر بے ہوش ہو گیا تھا۔ ہمارے خلاف اس کے پاس کوئی ثبوت تو نہیں تھا تاہی لیے اس نے دوسرے طریقے سے اپنی خرابی نکالی ہے۔“

دلاور کی آنکھیں شعلے برسانے لگی تھیں۔ بالم کے بھی کچھ ایسے ہی تاثرات تھے جبکہ ہوش گھٹنوں میں اپنا چہرہ چھپائے روئے چلا جا رہا تھا۔

☆☆☆

چکبرے کو ٹھیک ہونے میں ایک ہفتہ لگ گیا تھا۔ ان لوگوں کو پولیس والوں نے چھوڑ دیا تھا۔ کیونکہ ان کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔ اس وقت بھی چھوٹو میاں ہی ان کے کام آتا رہا تھا۔

اسی نے چکبرے کے علاج کروایا تھا۔ مرہم اور دوائے کرا آتا۔ چکبرے کو دوبارہ انجکشن بھی لگے تھے۔ وہ مارکیٹ کی ایک بندوکان کے سامنے پڑا کر اہتا رہتا۔

سب نے اس کا بہت خیال رکھا تھا۔ دواؤں کے ساتھ اس کے لیے پھل اور دودھ لے کر آیا کرتے۔ اس واقعے کے بعد چکبرے بالکل خاموش ہو کر رہ گیا تھا۔

وہ ہر وقت فضاؤں میں کچھ مگھوڑتا رہتا۔ جیسے کسی سوال کا جواب تلاش کر رہا ہو کہ آخر ان سبھوں کی قسمیں ایسی کیوں ہیں۔

اس نے ایک بار چھوٹو میاں کا ہاتھ تھام کر اس سے یہی سوال کیا۔ ”آخر کیوں چھوٹو بھائی! کیوں ہم ایسے کیوں ہو گئے؟“

”اس لیے کہ ہم غریبوں کے نصیب میں یہی ہوتا ہے رے۔“ چھوٹو میاں نے کہا۔

”نہیں چاچا۔“ دلاور غصے سے بولا۔ ”مجھے ایسے نصیب کے ساتھ نہیں رہنا۔ کتوں کی زندگی ہی اچھی ہوتی ہو گی۔ مجھے اپنا یہ نصیب بدلنا ہے۔ طاقتور بننا ہے۔“

”ارے کیسے بدلے گا نصیب؟ فٹ پاتھ پر رہنے والے ہمیشہ فٹ پاتھ پر ہی رہتے ہیں۔“

چھوٹو میاں کے جانے کے بعد دلاور نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا۔ ”تم لوگ یہ بتاؤ، ہمیں کس جرم میں پکڑا گیا تھا؟“

”گڈزیوں سے سامان نکالنے کے جرم میں۔“ بالم نے بتایا۔ ”جبکہ ہم نے ایسا کام بھی نہیں کیا۔“

”لیکن اب کرنا ہے ہمیں۔“

”کیا کہہ رہے ہو دلاور بھائی؟“ ہوش پریشان ہو کر

معلوم ہونے پر ہمارا کیا حشر ہوگا۔“

”یار! یہ سالے کس سامان کی بات کر رہے ہیں؟“ بالم نے پوچھا۔

”چنانچہ۔“ چرایا کسی اور نے ہوگا اور جلی ہم پر آگئی ہے۔“

”یہ چکبرے کو کہاں لے گئے ہیں؟“ ہوش نے لرزتی آواز میں پوچھا۔

”بھئی کرنے۔“ دلاور تنگی سے بولا۔ ”دھو دیں گے اس کو۔“

”یونہی خواہ تو ا۔“

”اے ہاں، یہاں سب کچھ یونہی خواہ تو ا ہی ہوا کرتا ہے۔“ دلاور نے کہا۔ ”غریبوں کی زندگی بھی سالی کیا زندگی ہوتی ہے۔ کچھ کر دو تو بھی پکڑے جاؤ۔ کچھ نہ کر دو تو بھی پکڑے جاؤ۔“

”چنانچہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہوگا۔“ بالم نے خیال ظاہر کیا۔

”کھیں ایسا نہ ہو۔ مارکھا کر پولیس والے کے بارے میں بھی بتادے۔“ ہوش نے کہا۔

”اگر بتا دیا تو سب سے زیادہ تو اسی کی شامت آئے گی۔“ دلاور کچھ سوچ کر بولا۔

وہ کچھ دیر بعد چکبرے کو دواؤں لے آئے تھے لیکن اس حال میں کہ وہ پورے بدن سے کانپ رہا تھا۔ اس کی سفید پیٹ خون سے رنگین ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ نہ جانے زندہ تھا یا مر گیا تھا۔

انہوں نے چکبرے کو ان کے ساتھ لاکر ڈھیر کر دیا اور ہتھے ہوئے باہر چلے گئے۔ بالم اور دلاور چکبرے پر جھک پڑے تھے۔ وہ زندہ تھا لیکن اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

”یار!“ دلاور نے اس کا گال جھٹھکیا۔ ”ہوش میں آ میرے بھائی، ہوش میں آ۔۔۔۔۔“

”بہت، بہت، بہت مارا ہے کہیوں نے۔“ چکبرے آہستہ آہستہ بولنے لگے۔ اس کے گالوں پر آنسو ڈھلک رہے تھے۔

”بہت بے رحمی سے مارا ہے بھائی، بہت بڑا کیا ہے میرے ساتھ۔“

”کس پولیس والے نے تیرا یہ حال کیا ہے میرے بھائی؟“ دلاور میاں میچھے لگا۔ ”بتا، کس نے کیا ہے؟“

”اسی نے جس کو ہم مرا ہوا سمجھ رہے تھے۔“ چکبرے نے بتایا۔

”کیا؟“ سب حیران رہ گئے۔

بولو۔ ”ایسا ہم نہیں کر سکتے۔“

”کیوں نہیں کر سکتے۔ جب بغیر جرم کے چکبرے کے ساتھ ایسا سلوک ہو سکتا ہے تو جرم کے بعد کیوں نہ ہو۔ بے گناہ کیوں مارے جاؤ۔ واہ..... یہ اچھی رہی۔ اب تو ہمیں کر کے دکھانا ہے۔ کم از کم انہیں تو ہمیں ہو گا تا کہ ہم نے کچھ نہیں کیا تھا اور پکڑے گئے۔“

”سوچ لو دلاور بھائی! بہت خطرے کا کام ہے۔“ بالم نے کہا۔

”یہ سب مجھ پر چھوڑ دے۔ میں سنبھال لوں گا۔ میرے پاس ایسے طریقے ہیں۔ کسی کا باپ بھی نہیں پکڑ سکتا۔“

”لیکن سامان کہاں دیں گے۔ کس کو دیں گے؟“ بالم نے پوچھا۔

”وہ بھی سوچ ہی لیں گے۔ تو اس کی فکر مت کر۔ راجا سے بات کریں گے۔ وہ ایک نمبر کا چلتا پرزہ ہے۔ کوئی نہ کوئی راستہ بتا دے گا۔“

راجا گاڑیوں کا کارنگر تھا۔ یہ لوگ اسے اچھی طرح جانتے تھے۔ اس کی ورکشاپ مارکیٹ کے پیچھے ہی تھی۔ کبھی وہ ان لوگوں کے پاس آکر بیٹھ جایا کرتا۔

اس کی ورکشاپ میں کام کرنے والے کارنگر اس کے بارے میں بتایا کرتے کہ وہ دو نمبر کا دھنڈا کرتا ہے۔ دلاور کو کسی دو نمبر کے دھنڈے کے بارے میں اس سے معلوم کرنا تھا۔

وہ رات بھر اسی موضوع پر سوچتا رہا۔ گاڑیوں سے سامان نکالنا اس کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ اسے ہر گاڑی کے میک اور چابیوں کی ساخت کے بارے میں علم تھا۔ وہ جانتا تھا کہ عورتوں کی گاڑیوں سے سامان نکالنا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ جب وہ شاپنگ کے لیے گاڑی کھڑی کر کے مارکیٹ میں جاتی ہیں تو پھر وہاں ہی کا راستہ ہی بھول جاتی ہیں۔

ان کی واپسی گھنٹوں میں ہوا کرتی ہے۔ اس دوران ان کی گاڑی پر ہاتھ صاف ہو سکتا تھا۔ بالم، چکبرے اور ہوش کو پیرے داری کے لیے الگ الگ کھڑا کر دیا جاتا۔ وہ تینوں کسی خطرے سے آگاہ کرنے کے لیے سٹی سہاویہ اور دلاور وہاں سے ہٹ جاتا۔

پھر ایک اہم سوال یہ تھا کہ چوری کا براہ راست شک انہی چاروں پر جا سکتا تھا۔ اس قحانے کے پولیس والے تو ویسے ہی ان کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ جب چوریاں

ہوئے لگتیں تو انہی کی گردنیں پکڑ لیتے۔ تو پھر کیا ہوتا۔

اس سوال کا دلاور کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ نہیں، ان کو کچھ اور کرنا چاہیے۔ کیوں نا راجا سے مشورہ کیا جائے۔ وہ کانیاں آوی تھا۔ کوئی نا کوئی مشورہ تو دے ہی سکتا تھا۔

دلاور دوسری صبح اپنے ساتھیوں کو بتاتے بغیر راجا کے گھر پہنچ گیا۔ وہ اس وقت ایک طرف بیٹھا جائے ہی رہا تھا اور اپنے پاس کھڑے ایک بچے کو گالیاں بھی دیتا جا رہا تھا۔ ”ابے سالے! تجھے اب تک بارہ نمبر اور تیرہ نمبر کی پہچان نہیں ہوئی ہے، آئندہ غلطی ہوئی نا تو ناگنیں تو زردوں گا۔“

دلاور کو دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ”اوہ، آؤ آؤ۔ آج ادھر کیسے آ گئے۔ چل بے چھوٹے، دودھ پتی ایک چائے لے کر آ جاتا۔“ اس نے ایک کام کرنے والے بچے سے کہا۔

دلاور، راجا کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ ”راجا بھائی! میں تم سے ایک ضروری بات کرنے آیا ہوں۔“

”ہاں ہاں بول، کیا بات ہے؟“

”یار! اس کام میں گزارا نہیں ہوتا۔“ دلاور نے کہا۔ ”آج کل کے لوگ سالے خود ہی گاڑیاں دھولیتے ہیں۔“

”ابے اتنی مہنگائی جو ہو گئی ہے۔“

”یہ کیا بات ہوئی۔ اتنی مہنگی مہنگی گاڑیاں رکھتے ہیں اور گاڑیاں دھولوانے میں سالی مہنگائی سامنے آ جاتی ہے۔“

”اچھا، اچھا یہ بتا کا کام کیا ہے؟“

”کچھ اور کرنے کی سوچ رہا ہوں راجا بھائی۔“ دلاور نے بتایا۔ ”اُنسی کتے والی زندگی سے تو موت اچھی ہے۔ اب یہی دیکھو، خواہ مخواہ ہمیں پکڑ لے گئے تھے۔ کیا کیا تھا ہم نے؟“

”ہاں یار! بے چارے چکبرے کی تو حالت خراب کر دی ظالموں نے۔“

بچہ اس دوران میں چائے لے کر آ گیا تھا۔ دلاور نے بچے کے ہٹ جانے کے بعد کہا۔ ”راجا بھائی! اب کوئی کام بتاؤ۔“

”ابے کچھ نہیں کر سکتے ہو تم لوگ، بس گاڑیاں ہی دھو رہے ہو۔“

”نہیں راجا بھائی! کچھ نہ کچھ ضرور کرتا ہے۔ تم کوئی راستہ بتاؤ۔“

”چل چھوڑ، یہ بتا تو کیا سوچ کر میرے پاس آیا ہے؟“ راجا نے پوچھا۔

”جی ہاں راجا بھائی! تم سے کچھ نہیں چھپا رہا۔“

میں سے آدھے اپنے کیشن کرکھ لوں گا۔
 ”یہ کیا بات ہوئی راجا بھائی؟“ دلاور بھڑک اٹھا۔
 ”اس طرح تو سب تمہارے ہی پاس چلا جائے گا۔ خود
 سوچو۔ سودا بھی تم خریدو گے اور جو بیسے دو گے، اس میں سے
 آدھا بھی خود ہی رکھ لو گے۔ پھر تو یہ گھائے والی بات ہوئی
 نا۔“

”ابے اپنے کیشن پر تو حق بنتا ہے نا۔“ راجا نے کہا۔
 ”ورنہ ایسا سودا آج کل خریدتا کون ہے۔ اس میں خطرے
 ہی خطرے ہیں۔ چلو پورے شہر میں گھوم کر دیکھ لے اور ایک
 بات یہ بھی ہے کہ میں سودا اٹھاندا ہی سے خریدتا ہوں۔ ایسا
 نہیں ہوگا کہ تیری مجبوری دیکھ کر دام کم لگا دیے۔ اس کے بعد
 کیشن میرا حق بنتا ہے۔ اب خود ہی سوچ کر جواب دے
 دیتا۔“

”سوچنا کیا ہے راجا بھائی۔“ دلاور نے گہری سانس
 لی۔ ”میں تو تمہارے پاس آیا ہی اس لیے تھا۔“
 ”تو بس کام شروع کر دے۔ میں تجھے سکھانا شروع
 کرتا ہوں۔“

☆☆☆

ہوشو ایک گاڑی دھور ہاتھاکہ کسی نے اس کے شانے
 پر ہاتھ رکھ دیا۔
 اس نے مڑ کر دیکھا ایک مختصّ اس کے سامنے کھڑا تھا۔
 وہ اس پارکنگ میں پہلے ہی نہیں دکھائی دیا تھا۔ چالیں سے
 زیادہ عمر کا۔ چہرے پر پتلی کے ساتھ ساتھ ہلکی نرئی بھی
 تھی۔

اس نے خوب سارا پاؤڈر وغیرہ تھوپ رکھا تھا۔ ہوشو
 ایسی حقوق سے گھبرایا کرتا تھا۔ اس وقت بھی وہ اس کا ہاتھ
 جھٹک کر بدک کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ ”کیا بات ہے۔ کیا
 چاہتے ہو؟“ ہوشو نے پوچھا۔
 ”جان من میں تو نہیں جانتی ہوں۔“ اس نے اپنے
 سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔
 ”ارے چاہیہاں سے۔“

”چندا امیری بات سن۔ میں تیری دشمن نہیں ہوں۔
 تیری بھلائی کے لیے آئی ہوں تیرے پاس۔“
 ”کیا بھلائی کرے گا؟“

”دیکھ، تو کتنا سوتا رہتا ہے۔ کیا جھگ کر رہا ہے اور کام
 کیا کرتا ہے۔ دن بھر گاڑیاں دھونا، کیا ملتا ہے اس سے؟ اور
 اوپر سے گالیاں الگ سنا ہے۔ اتنی سیدھی نظریں بھی کتنی
 ہیں۔ بول میں سچ کہہ رہی ہوں یا نہیں؟“

دلاور نے اپنی پلاننگ بتادی۔
 ”ابے ایسا کرنا بھی نہیں۔“ راجا نے کہا۔ ”سارا کٹک
 تم ہی لوگوں پر جائے گا۔ کیونکہ پارکنگ میں تم چاروں ہوتے
 ہو۔ پولیس والے تمہاری تو ہڈیاں توڑ کر رکھ دیں گے۔“
 ”اسی لیے تو مشورہ لینے تمہارے پاس آیا ہوں۔“
 ”ابے جب گاڑیاں کھولنے کا ہنر ہے تمہارے پاس تو
 پارکنگ کی گاڑیوں کو کیوں چمیرتے ہو۔ دور کی گاڑیاں
 پکڑو۔ گاڑیاں تو دور دور تک کھڑی ہوتی ہیں۔ کسی اور محلے
 کی مشادی ہالوں کے باہر جاؤ، دن کے وقت ادھر ادھر گھومتے
 رہو اور موقع پا کر اپنا کام دکھا جاؤ۔“
 ”تمہارا مشورہ تو ٹھیک ہے راجا بھائی لیکن ایک
 مصیبت اور بھی ہے۔“

”اب کون سی مصیبت ہے؟“
 ”یار! یہ جو گاڑیاں ہیں نا، ان کے آلازم بہت شور
 کرتے ہیں۔ ذرا سی دیر میں ہنگامہ ہو جاتا ہے۔“
 ”سمجھ گیا۔“ راجا اپنی ایک آنکھ دبا کر ہنس پڑا۔
 ”بہت بد محاش ہے تو۔۔۔۔۔ یہی معلوم کرنے آیا ہوگا کہ
 الآزم کو جام کس طرح کرتے ہیں؟“

”ہاں راجا بھائی، سچ تو یہ ہے کہ اس محلے میں
 پورے شہر میں تمہارا جواب نہیں ہے۔“ دلاور نے ٹھکن لگایا۔
 ”بد محاشی والی بات مت کر۔ ابے یہ وہ ہنر ہے جس
 کے لیے برسوں ہاتھ پاؤں داہنے پڑتے ہیں اور تو چاہتا ہے
 کہ چھوٹک میں تجھے بتا دوں؟“
 ”راجا بھائی! میں تمہاری ہر خدمت کے لیے تیار
 ہوں۔“ دلاور نے کہا۔

”تو پھر۔۔۔۔۔“ راجا کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتا
 رہا پھر بولا۔ ”تو پھر سن لے۔ میری تین شرائط ہیں۔“
 ”بتاؤ راجا بھائی۔“
 ”پہلی شرط تو یہی ہوگی کہ تو اگر پکڑا بھی گیا تو میرا نام
 نہیں بتائے گا، منظور۔“
 ”ہاں راجا بھائی منظور ہے۔ جان چلی جائے۔ تمہارا
 نام زبان پر نہیں آئے گا۔“

”اور دوسری شرط یہ ہے کہ جو کچھ ملے گا وہ میرے
 ہاتھ پہنچے گا۔“ راجا نے کہا۔ ”کسی اور کے پاس کیا تو مجھ سے
 بُرا کوئی نہیں ہوگا۔“
 ”یہ بھی منظور ہے راجا بھائی! اس کی طرف سے
 اطمینان رکھو۔“
 ”اور تیسری شرط یہ ہے کہ میں جتنے پیسے دوں، ان

”پیسے رہنے دے بھائی! میں دوا لے کر آ جاتا ہوں۔“
 پیسے ہیں میرے پاس۔“ ہوشو نے کہا۔
 تیرے پاس کہاں سے آگئے؟“
 ”سویرے سے اب تک تین گائیاں دھو چکا ہوں۔“
 ہوشو نے بتایا۔ ”پیسے آگئے ہیں۔“
 چکبراسکر ادا کیا۔ ہوشو پر پیسے لے کر دوا لینے چلا گیا۔
 دلاور اور بالکم بھی گئے ہوئے تھے۔ آج کل ان کی ہشک
 درکشاپ والے راجا کے ساتھ ہونے لگی تھی۔ نہ جانے کیسی
 کہانی چل رہی تھی۔ ان دونوں نے ابھی تک کچھ نہیں بتایا
 تھا۔

چکبرا آج کل کام نہیں کر رہا تھا۔ وہ دن بھر مارکیٹ
 کی ایک دکان کے قعرے پر بیٹھا رہتا۔ وہ دکان بہت دنوں
 سے بند پڑی تھی۔ اس کا مالک مر گیا تھا۔ اس کی موت کے
 بعد ہی اس کی دکان بند چلی آ رہی تھی۔
 چکبرا کو آج کل اپنے گھر والے بہت یاد آنے لگے
 تھے۔

وہ لوگ جن کو وہ بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ اس کی ماں،
 اس کی اپنی ماں اور اس کا چھوٹا بھائی سونو۔ وہ نہ جانے کہاں
 ہوں گے۔ کیا کر رہے ہوں گے۔
 وہ اسی شہر میں تھے لیکن چکبرا ان کے پاس نہیں جاسکتا
 تھا۔ وہ ایک بار اپنے پرانے مکان کی طرف گیا تھا لیکن
 پتا چلا کہ اس کی ماں اور بھائی بہت پہلے غریب آباد کا مکان
 بیچ کر کہیں جا چکے ہیں۔ ان کا موجودہ پتہ کھلے والوں کو نہیں
 معلوم تھا۔

چکبرا ماپس ہو کر واپس آ گیا تھا۔ اس نے ابھی تک
 اپنے ساتھیوں کو اپنے حالات کے بارے میں کچھ نہیں بتایا
 تھا۔ اگر وہ پوچھتے بھی تو مسکرا کر ٹال جاتا۔
 بہت ہی شرمناک سی کہانی تھی اس کی۔ کئی بار اس کا
 دل چاہا کہ وہ اپنی ماں کا گھاکھونٹ کر مار دے اس کو پھر اس
 کی ہوردیاں یاد کر کے خاموش ہو جاتا۔

اس کا باپ تالے اور چابی کا کاربگر تھا۔ وہ صبح
 سویرے اپنی پرانی سائیکل پر اپنے اوزار لے کر نکل پڑتا
 اور دن بھر گلیوں گلیوں گھوم پھر کر ”تالے تالے چابی بخالو۔ تالے
 چابی بخالو“ کی آوازیں لگایا کرتا۔

چکبرے کا اصل نام تو حمید تھا لیکن اس کے چہرے پر
 بہت سے داغ دھبے تھے اسی لیے اس کے گھر والے تک
 مذاق میں اسے چکبرا کہہ کرتے۔
 اس کا چھوٹا بھائی سونو اس سے تین چار سال چھوٹا تھا۔

”اجھا، سچ ہے تو پھر؟“
 ”میرے ساتھ چل۔ میں تجھے شہزادہ بنا کر رکھوں
 گی۔“ خنٹ نے کہا۔
 ”گندی باتیں مت کر۔“
 ”کوئی گندی بات نہیں ہے چندا۔ کوئی تیری طرف
 آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھے گا۔ تیرے پاس اتنے اتنے پڑے
 ہوں گے۔ رہنے کو کھر ہوگا۔ یہاں کیا ہے فٹ پاتھ پر بڑا
 رہتا ہے۔ بستر بھی نہیں ہوتا تیرے پاس۔“
 ”تجھے کیسے معلوم؟“

”سب معلوم ہے چندا۔“ خنٹ نے کہا۔ ”میں کیا
 نہیں جانتی۔ خوب سوچ لے۔ مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ
 پولیس تم لوگوں کو اٹھا کر لے گی بھی۔ تو خود سوچ۔ کیا فائدہ ایسی
 زندگی سے۔ تو ہمارے ساتھ رہے گا تو حال ہے جو کوئی آنکھ
 اٹھا کر دیکھ لے۔ آنکھیں پھوڑ دوں گی اس کی۔ جان لے
 لوں گی۔“

”لیکن کیوں، تو مجھے کیوں لے جانا چاہتا ہے؟ کیا
 کام کروائے گا مجھ سے؟“
 ”کوئی کام نہیں چندا۔ کوئی کام نہیں کرواؤں گی۔“ وہ
 لپک کر بولا۔ ”تجھے تو عیش سے رکھوں گی۔ تو رواج کرے گا۔
 حکم چلانے کا مجھ پر۔“ خنٹ نے کہا۔ ”اور ہاں، اس کے
 علاوہ دوسروں پر روز۔ چاہے ہم بھوکے مریں۔ تجھے روزِ صبح
 دوسل جایا کریں گے۔“

ہوشو کچھ جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ چکبرے کی آواز
 سنائی دی۔ ”ہوشو! ادھر!۔۔۔ کہاں کھڑا ہے؟“
 ”یہ لو پکار لیا کسی ننھوں نے۔“ خنٹ بیزار ہو کر بولا۔
 ”ٹھیک ہے چندا میں پھر آؤں گی تیرے پاس۔ تو اچھی طرح
 سوچ کر رکھنا۔“

چکبرے کی حالت اب کچھ بہتر ہو گئی تھی۔ اس نے
 ابھی کام شروع نہیں کیا تھا۔ اس کو بال کم اور دلاور نے گاڑیوں
 کی دھلائی کرنے سے روک رکھا تھا۔
 اس وقت اسے ہوشو سے کوئی کام پڑ گیا تھا اسی لیے وہ
 ہوشو کو آوازیں دیتا پھر رہا تھا۔

”کیا بات ہے چکبرے بھائی؟“ ہوشو نے اس کے
 پاس آ کر پوچھا۔ ”کوئی کام ہے کیا؟“
 ”ہاں یار! سارے بدن میں درد ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر کی
 دوا ختم ہو گئی ہے۔ جا کر جلدی سے دوا لے آ یا۔“ اس نے
 اپنی جیب سے پرچی نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔ ”یہ
 لے اور یہ پیسے رکھ لے۔“

ویسے ایک بات تھی۔ جس دن وہ آئے، اس دن ان کے گھر میں بہت اچھا کھانا بن جاتا تھا۔ گوشت، مرغی اور کوئی مٹھائی۔ جن کو ان کا باپ بھی حرمے لے لے کر کھایا کرتا۔ ایک دن اس کی ماں نے کہا۔ ”وہ کچھ پکچیرے اتوا اپنی زبان بند رکھے گا۔ ان دونوں کے بارے میں اپنے باپ کو مت بتادینا۔ ورنہ وہ آج چھوڑ دیں گے اور یہ جو حرمے حرمے کے کھانے بنتے ہیں۔ یہ پھر نہیں بنیں گے۔“

چنگر اچونکہ ایسے کھانوں سے محروم نہیں رہتا چاہتا تھا۔ اس لیے وہ اپنے باپ کو کچھ نہیں بتایا کرتا۔ پھر ایک دن گوشت کی دکان والے نے اس سے ایک ایسی بات کہہ دی تھی کہ وہ سلگ کر رہ گیا۔

ایک چاچا گھر پر آیا ہوا تھا۔ اسی نے پیسے دیے تھے کہ جا کر گوشت لے آیا۔ جب وہ گوشت لے رہا تھا تو دکان والے نے اس سے کہا۔ ”واہ بھائی واہ۔ تیرے تو حرے آرہے ہیں۔ پہلے تو صرف دال اور برسی پر گزارا کرتا تھا۔ اب تو گوشت اور مرغی سے کم میں بات نہیں ہوتی۔“

”ہے چاچا کی وجہ سے ہے۔ وہ سودے کے پیسے دیتے ہیں۔“ چکبرے نے کہا۔

”اے کون چاہا! کس کا چاہا؟“

”وہی جو گمراہا کرتے ہیں۔“

”ابے بھولے شاہ وہ تیرے چاچا دادا چاہتے ہیں۔“
دکاندار نے بتایا۔
”تو پھر کون ہیں؟“

”صاف صاف سنا ہے تو سن لے۔ وہ تیری ماں کے چاہنے والے ہیں۔ تیری ماں نے دونوں کو پھاس رکھا ہے۔ اسی لیے ایک دن ایک کو بلاتی ہے اور دوسرے دن دوسرے کو۔“

”بکواس مت کر۔“ چنگبرے کے بدن میں آگ سی لگ گئی۔

”یہ بکواس نہیں ہے میرے بھولے شاہ۔ پورا حلقہ جانتا ہے کہ وہ دونوں کیوں آتے ہیں۔ یقین نہ آئے تو اسی وقت گھر جا کر دیکھ لے لیکن دروازے سے مت جائیو۔ دیوار بھاندر کو گودھا۔ پھر دیکھ تماشا۔“

اس نے منہ ہوئے گوشت کو وہیں چھوڑا اور گھر کی طرف دوڑ لگا دی۔ گھر کی دیواریں اس کے قدم سے ڈرامی اوجھیں تھیں۔ ان پر چڑھ کر دوسری طرف کود جانا اس کے لیے کوئی مشکل نہیں تھا۔

اس نے ایسا ہی کیا پھر اس نے جو کچھ دیکھا، اس نے

کول مثل سا۔ بہت خوب صورت۔ گورا رنگ۔ وہ اسکول جایا کرتا۔ اس کے گھرو والوں کی تو یہ خواہش تھی کہ خود چمکیر ابھی اسکول جایا کرے لیکن ایک بار جب اسکول کے ایک ماسٹر نے اسے بید کی چھڑی سے مارا تو وہ اس کے سر پر پتھر مار کر اسکول سے بھاگ آیا تھا۔ اس کے بعد وہ اسکول کی طرف لوٹ کر نہیں گیا۔

وہ اپنے باپ سے کہا کرتا۔ ”ابا! مجھے تمہاری طرح
تالے جانی کا کام نہیں کرنا۔ میں کچھ اور کروں گا۔“

”کیا کرے گا تو؟“ اس کا باپ غصے سے منمنانے لگا۔ ”کیا گورنر نے گا؟“

”پتا نہیں ابا، ہو سکتا ہے کہ بن بھی جاؤں۔“

اس کا باپ چلبلا کر اسے گالیاں دینے لگا۔ اس وقت اس کی ماں آکر اپنے شوہر کے غصے کو خنڈا کر دیتی تھی۔ وہ ایک خوب عورت تھی۔ بہت طرح دار۔ سونو اسی پر گناہ تھا۔

جب اس کا باپ سائیکل لے کر اپنے کام پر چلا جاتا تو اس وقت سے اس کی ماں کا کام شروع ہو جایا کرتا۔ دو چاچا اس کے گھر آ کر تے۔

باری باری۔ ایک دن ایک چاچا آتا تو دوسرے دن دوسرا چکمبرے کو یہ دونوں ہی پسند نہیں تھے۔ بہت عجیب سے لوگ تھے۔ ان کے آنے کے بعد اس کی ماں چکمبرے کے ہاتھ میں کچھ پیسے دے کر اسے گھر سے باہر بھیج دیا کرتی۔ اس تاکید کے ساتھ کہ وہ فوراً ویر کر کر واپس آئے۔

اس کے باپ کو ان دونوں چاچاؤں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ ماں نے سختی سے منع کر رکھا تھا۔ ”دیکھ! اپنے باپ کو ان کے بارے میں مت بتانا۔ ورنہ بہت بُرا ہو گا۔“

”کیوں اماں! کیوں نہ بتاؤں؟“

”ارے تو نہیں جانتا۔ ان سبھوں میں برسوں کی دشمنی چل رہی ہے۔ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں۔

”مار دیں گے ایک دوسرے کو۔“

”ارے میں سب میں دوستی کرانے کی کوشش کرتی ہوں تا سب کو سمجھایا کرتی ہوں۔“

چکبرے کے ذہن میں کئی سوالات اٹھا کرتے۔
 دونوں آدمی اس دن بھی نہیں آیا کرتے جب سونو گھر پر ہوتا یا
 اس کا بیابا گھر پر ہوتا۔ نہ جانے کس طرح ان دونوں کو خبر ہو
 جاتی تھی۔ اسی لیے وہ اس دن نہیں آتے تھے۔

کر اس کی طرف دیکھا تھا پھر آگے بڑھ گئی۔
اس نے چکبرے کو پہچانا نہیں تھا۔ کیسے پہچانتی۔ چکبرے
اب تو بہت بدل گیا تھا۔ بھکاری دکھائی دیتا تھا۔ اس کے
چہرے پر جھٹ کے نشانات تھے۔ دونوں آنکھیں سوجی
ہوئی تھیں۔ کیسے پہچانتی وہ اس کو۔ لیکن کسی ماں جی جو اس کو
نہیں پہچان سکی جس کو اس نے جنم دیا تھا۔
چکبرے کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ روتا رہا۔
روتا رہا اور روتا ہی رہا۔

☆☆☆

راجا نے پالم اور دلاور کو کام پر لگا دیا تھا۔
اب تک انہوں نے دو گاڑیوں کے سامان پار کیے
تھے۔ دلاور کے پاس گاڑیوں کو کھولنے کا ہنر پہلے سے موجود
تھا۔ راجا نے اسے الارام جام کرنے کی ہنر بتادی تھی۔
”ابے یہ گورے چاہے جیسا بھی الارام بنا دیں، استاد
کی دعاؤں سے اپنے ہاتھوں میں ایسا ہنر ہے کہ الارام کی چھٹی
ہو جاتی ہے۔ سارے پلانا بھول جاتے ہیں۔ گورے بھی کیا
یاد کریں گے کہ کس ملک میں الارام سسٹم پہنچ دیا۔“
دلاور ان ہی دونوں ہنر کی مدد سے اب تک دو
گاڑیوں پر ہاتھ صاف کر چکا تھا۔ راجا نے اسے یہ بھی بتادیا
تھا کہ گاڑیوں کی کون کون سی چیزیں آسانی سے نکل آتی ہیں
اور کتنے میں بک جاتی ہیں۔ کس ایک کے سامان کی ڈیمانڈ
زیادہ ہے۔

”ابے یہ بہت بڑا علم ہے۔ بہت بڑا سمندر ہے یہ۔
تجربے تو میں یونہی بھائی بھتی میں بتاے جا رہا ہوں۔ ورنہ میں
نے تو اپنے استاد کی برسوں جو تپاں سیدھی کی تھیں۔ خدا اس کو
جنت نصیب کرے۔ کیسا کارنگر آدی تھا۔“

راجا نے دونوں گاڑیوں کے سامان دس ہزار میں خرید
کر آدھے پیسے پانچ ہزار اپنے کمیشن کے طور پر اپنے پاس
رکھ لیے تھے۔ اور بقیہ پانچ ہزار کے بارے میں کہا تھا۔
”اب یہ بھی میرے پاس ہی رہنے دے۔ تیری امانت کے
طور پر رکھے رہیں گے۔“

”کیوں راجا! استاد! تم کیوں رکھو گے؟“

”ابے تو پھر تو کہاں رکھے گا۔ فٹ پاتھ پر۔ تاکہ کسی
کی نظروں میں آجائیں۔ تو کیا سمجھ رہا ہے کہ میں تیرے پیسے
کھا جاؤں گا۔ یاد رکھ۔ ہمارے دھندے میں زبان کی بڑی
اہمیت ہوتی ہے۔ جو بول دیا، وہ بول دیا۔ یہ لے۔ ہزار رکھ
لے۔ تیرے اور پالم کے۔ عیش کر۔ اور ہاں ایک بات اور
لاچ میں آکر جلدی جلدی کارنگری مت دکھانے لگنا۔ آرام

اس کے ہوش اڑا دیے۔ اس کا دل چاہا کہ وہ اپنی ماں کو جان
سے مار دے۔ گھگھونٹ دے اس کا۔
اگرچہ وہ دونوں اس کو اس طرح گھر میں دیکھ کر سنبھلنے
کی کوشش کر رہے تھے لیکن وہ اپنی آنکھوں سے سب کچھ
دیکھ چکا تھا۔
وہ غصے سے ان دونوں کو گھور کر دیکھتا رہا۔ اس کی ماں
نے اسے آواز دی۔ ”بیٹا! ادھر آؤ۔ بات سنو۔“ لیکن وہ اس
کی آواز پر دھیان دیے بغیر آنگن کا دروازہ کھول کر باہر نکل
گیا۔

اسے غصہ آ رہا تھا، شدید غصہ۔ اپنی ماں پر۔ اپنے
باپ پر اور اپنے حالات پر۔ گوشت والے کی دکان کے
سامنے سے وہ گردن جھکائے گزرتا چلا گیا۔
اس نے آواز بھی دی۔ ”شہزادے! بات تو سن جاؤ۔“
کہاں جا رہے ہو؟“

لیکن شہزادہ اس پر دھیان دیے بغیر گزرتا چلا گیا۔ وہ
نہیں جانتا تھا کہ اسے کہاں جانا ہے۔ اپنے گھر کے سوا اس کا
اور کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔
کہاں جاتا۔ بس بغیر سوچے سمجھے چلا رہا اور بہت دور
کے محلے کی پارکنگ لٹ میں آ گیا۔ یہاں اس کی ملاقات
دلاور سے ہوئی اور زندگی کا ایک نیا راستہ اس کے سامنے کھل
گیا۔

وہ بند دکان کے سامنے والے قطرے پر بیٹھ کر سوچتا
چلا گیا۔ یادوں نے اس پر حملہ کر دیا تھا۔ اچھی بڑی یادیں۔
ماں کی یادیں۔ باپ کی یادیں۔ بھائی سونو کی یادیں۔ وہ کس
کس طرح اس کو تلاش کرتا ہوگا پھر ٹھک ہار کر سب خاموش ہو
گئے تھے۔

ایک نئی سیاہ رنگ کی گاڑی دکان کے سامنے پارکنگ
میں آکر روک گئی۔ اس میں سے ایک موٹا آدمی اتر آیا۔ اس کے
بعد ایک عورت اتری اور چکبرے نے اس عورت کو پہچان
لیا۔ وہ اس کی ماں تھی۔

وہ اپنی ماں کو پہچاننے میں غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ ابھی
ابھی تو اس کو یاد کر رہا تھا اور اس کی ماں چھوستر کی طرح اس
کے سامنے حاضر ہو گئی تھی۔

اس کا دل چاہا کہ وہ دوڑ کر ماں سے جا کر لپٹ جائے
لیکن اس کے ساتھ وہ موٹا آدمی کون تھا۔ اس کا باپ کہاں
گیا۔ اس کا بھائی سونو کہاں تھا؟

یہ شار سوالات تھے۔ وہ دونوں اس کے برابر سے
گزرتے چلے گئے۔ ایک لمحے کے لیے اس کی ماں نے رک

نے پوچھا۔

”ہاں یار! لیکن وہ مگر بک چکا ہے اور خدا جانے وہ لوگ کہاں چلے گئے ہیں۔“
”حوصلہ مت ہار یار۔“ دلاور نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وقت کا انتظار کر۔ کہیں نہ کہیں وہ لوگ بھی مل ہی جائیں گے۔“
”یارو! میرا بھائی بہت اچھا ہے۔ بتائیں اس کا کیا حال ہوگا۔“ چکبرے کی آنکھیں جھلکانے لگی تھیں۔

☆☆☆

ایک رات چھوٹی میاں سخت بیمار پڑ گیا۔
وہ چاروں رات کا کھانا کھا کر کوئی ہوش میں بیٹھ جائے ہی رہے تھے کہ انہیں چھوٹی میاں دکھائی دے گیا۔ وہ لرختا ہوا ہوش کی طرف آ رہا تھا۔
ان کے دیکھتے دیکھتے وہ سڑک پر ہی ڈھیر ہو گیا۔ وہ چاروں دوڑتے ہوئے اس کے پاس پہنچ گئے تھے۔ دلاور نے اسے اٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔
”یارو! اس کو تو بہت تیز بخار ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”اس کا پورا بدن جل رہا ہے۔“

”چلو اس کو اسپتال لے چلتے ہیں۔“ بالم نے کہا۔
”ہاں بھائی، چھوٹی چاچانے میرا علاج کروایا تھا۔ ہم اس کو ایسے نہیں چھوڑ سکتے۔“
”بالم جلدی سے رکشا یا جیسی رکوالے۔“ دلاور نے کہا۔ ”پیسوں کی گمرمت کر۔ پیسے ہیں میرے پاس۔“
وہ چاروں چھوٹی میاں کو سرکاری اسپتال لے آئے تھے۔ ان کی قسمت اچھی تھی کہ وہاں ایک ایسا ڈاکٹر ایک طرف جاتے ہوئے دکھائی دے گیا جو اپنی گاڑی انہی لوگوں سے دھلویا کرتا تھا۔

وہ چاروں جلدی سے اس کے پاس پہنچ گئے۔ اس نے ان چاروں کو پہچان لیا تھا۔ ”ارے! تم چاروں یہاں کیا کر رہے ہو؟“
”ڈاکٹر صاحب! ہم ایک مریض کو لے کر آئے ہیں۔“ دلاور نے بتایا۔ ”چھوٹی چاچا، وہ بے چارہ وہیں پارکنگ میں ٹھہلا لگا تا ہے۔ اس وقت سخت بیمار ہے۔“
”اچھا اچھا، ابھی بندوبست کر دیتا ہوں۔ تم لوگ پریشان نہ ہو۔“

اس ڈاکٹر کی مہربانی سے چھوٹی میاں کا علاج فوری طور پر شروع کر دیا گیا تھا۔ وہ سب اس کے قریب کھڑے اس کے لیے دعا بھی مانگ رہے تھے۔

آرام سے۔۔۔ سینے میں بس ایک دو گاڑیاں اس سے زیادہ نہیں، سمجھے؟“

دلاور نے بالم سے صرف نگرانی کا کام لیا تھا۔ اس کا ارادہ چکبرے کو بھی ساتھ ملانے کا تھا لیکن چکبرا ابھی کمزور ہو رہا تھا۔ اور ہوش ابھی اس کام کے لیے بہت چھوٹا تھا۔
ہزار ملنے کے بعد دلاور نے اس میں سے چار سو روپے بالم کو دے دیے تھے۔ اس رات ان چاروں نے دھلی ہوس جا کر نہاری کھائی تھی۔

سب بہت ہی خوش دکھائی دے رہے تھے۔ سوائے چکبرے کے۔ وہ بہت اُداس ہو رہا تھا۔

جب دلاور نے اس سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے یار! کیوں منہ لٹکائے بیٹھا ہے؟“

تو چکبرے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ ”اے میرے شیر! کیا بات ہو گئی۔ کیوں رو رہا ہے؟“

”یارو! آج میں نے اپنی ماں کو دیکھا ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”لیکن وہ میرے سامنے سے گزر گئی۔ اس نے مجھے پہچانا بھی نہیں۔“

چکبرا ان سبھوں کو اپنی اور اپنے گھر کی کہانی سنا چکا تھا۔

”خدا ہو گئی یار! تو چوک کیوں کیا۔ جا کر اس سے پلٹ جاتا۔“ بالم نے کہا۔

”اس کے ساتھ ایک موٹا سا آدمی بھی تھا۔“ اس نے بتایا۔ ”دونوں چچھائی ہوئی گاڑی سے اترے تھے۔ خدا جانے میرا باپ کہاں ہوگا۔ میرا بھائی کہاں ہوگا۔ پھر یارو! یہ بھی تو دیکھو کہ وہ برابر سے گزرتی چلی گئی اور اس نے اپنے بچے کو پہچانا بھی نہیں۔“

”اس میں اس کا کیا قصور، تو اتنا بدل چکے۔ وہ کیسے پہچان لیتی؟“ بالم نے کہا۔

”نہیں یارو! مجھے تو کوئی اور ہی بات گنتی ہے۔“ دلاور کچھ سوچ کر بولا۔ ”ہو سکتا ہے کہ اس کی ماں نے اسے پہچان لیا ہو لیکن اس موٹے کے دباؤ میں ہو۔ اس کی وجہ سے اس نے نہ پہچانا ہو۔“

”ہاں یار! یہی ہو سکتا ہے۔“ چکبرے نے گردن ہلائی۔ ”میری ماں کو تو مجھ سے بہت پیار تھا۔ میرے لیے پریشان رہتی تھی۔ اب سوال یہ ہے کہ کہانی کیا ہے۔ وہ موٹا کون ہے۔ میرا کیا کہاں چلا گیا۔ میرا بھائی کہاں ہے؟“

”بھائی! تم ایک دو بار اپنے گھر جا تو چکے ہو۔“ ہوش

ڈاکٹر کا یہ کہنا تھا کہ مریض کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ اس کے پیچھے چھڑوں میں پانی بھر گیا ہے۔ جس کو نکالنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

رات دو بجے چھوٹی میاں کو آپریشن تھیٹر میں لے جایا گیا تھا۔ اور تین بجے کے قریب ڈاکٹر نے بتایا کہ مریض جانبر نہیں ہو سکا ہے۔ چھوٹی میاں کا انتقال ہو گیا تھا۔

وہ چاروں اس خبر کو سن کر دنگ رہ گئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب انہیں کیا کرنا چاہیے۔

”اب یہ بتاؤ تم لوگ مرنے والے کے کسی رشتے دار وغیرہ کو جانتے ہو؟“ ڈاکٹر نے پوچھا۔

”نہیں ڈاکٹر! ہم کسی کو نہیں جانتے۔“ چکبرے نے بتایا۔ ”یہ بے چارہ بھی ہماری طرح پارکنگ میں رہا کرتا تھا۔“

”تو پھر لاوارث لاش ہو گئی نا۔“

”جی ہاں ڈاکٹر صاحب! ایسا ہی سمجھ لیں۔“

”ٹھیک ہے۔ اب تم لوگ جاؤ۔ تم نے اپنا فرض پورا کر دیا۔ امیدی والے اس بے چارے کا انتظام کر دیں گے۔“

وہ سب بہت اُداس سے واپس آ گئے۔

صرف چند ہی گھنٹوں میں یہ سب ہو گیا تھا۔ چھوٹی میاں کا سڑک پر گرنا۔ ان کا اسپتال اٹھا کر لے آنا۔ پھر اس کی موت۔ یہ ساری کہانی دیکھتے دیکھتے ختم ہو گئی تھی۔

چاروں پارکنگ میں اپنی جگہ آکر بیٹھ گئے۔ ان میں سے کسی کا بھی دل بات کرنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ خوف کے ساتھ اداسی بھی تھی۔

”دلاور بھائی! ہم بھی تو لاوارث ہی ہیں۔“ بہت دیر بعد ہوشو نے کہا۔ وہ بہت دیر سے روئے جا رہا تھا۔

”ہاں یار! ہم بھی لاوارث ہیں اور ہمارا بھی کسی دن یہی حال ہوگا۔“ بالمرخ ہو کر بولا۔ ”ابے چھوٹی میاں کو تو اسپتال لے جانے والے ہم چار تھے لیکن ہماری لاشیں تو اسی پارکنگ میں سڑ جائیں گی۔ ہمیں تو کوئی اٹھانے والا بھی نہیں ملے گا۔“

بھیا تک مستقبل کے بھیا تک خوف نے انہیں لرزا کر رکھ دیا۔

پارکنگ کا سناٹا اچانک اور گہرا ہو گیا تھا۔ کھیموں کی جلتی ہوئی روشنیوں کے باوجود انہیں ہر طرف اندھیرے دکھائی دے رہے تھے۔

اچانک کوئی انہیں اپنی طرف آتا ہوا دکھائی دے گیا۔

اس کے قدموں کی چاب کو بج رہی تھی۔ آنے والے نے شاید ایسے جوتے پہن رکھے تھے جو شور کر رہے تھے۔ کھٹ کھٹ کھٹ۔

”ابے اس وقت کون آ رہا ہے؟“ چکبرے نے پوچھا۔

”کوئی چور نہ ہو۔“ ہوشو نے کہا۔

”چور ہم سے کیا لے کر جائے گا۔ ہمارے پاس کیا ہے؟“ دلاور نے کہا۔

آنے والا اندھیرے سے نکل کر ان کے سامنے آ گیا تھا۔ وہ کوئی اجنبی تھا۔ ڈیلا پتلا، اس نے کالے رنگ کا ایک کوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ کھٹ کھٹ کرتا ہوا ان کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

”کون ہو تم؟“ دلاور نے بلند آواز میں پوچھا۔

”یہاں کیوں آئے ہو؟ کیا چاہتے ہو ہم سے؟“

”ابے ایک سانس میں اتنے سوال۔“ وہ ادبی بے تکلفی سے ان کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ ”میرا نام سلطان ہے۔ گھبراؤ نہیں۔ صرف نام کا سلطان ہوں۔ میں نے آج ہی اس پارکنگ میں اپنا کاروبار شروع کیا ہے۔“

”کیسا کاروبار، ہم نے تو نہیں دیکھا۔“ بالمر نے کہا۔

”ہم تو اسی پارکنگ میں رہتے ہیں۔“

”تم لوگ دیکھ بھی نہیں سکتے۔“ وہ عجیب انداز سے ہنس پڑا۔ ”یہ کاروبار رات میں ہوتا ہے۔ ابھی کچھ دیر میں مال بچھ جائے گا۔ مگر ہاں ابھی آجائیں گے۔“

”اوکے، ہم سے صاف صاف بات کر۔“ چکبرے ہاتھ سے اکٹڑ گیا۔ ”کس کاروباری بات کر رہا ہے۔ کون سا مال؟“

”یار! تو تو بڑے گرم دماغ کا ہے۔“ وہ ہنس پڑا۔ ”دیکھو بھائی! اب میں تمہیں سمجھا ہوں۔ بات یہ ہے بھائی کہ اپنے پاس چار پانچ لڑکیاں ہیں۔ بہت صاف ستھری، ہم ایرے غیرے کے پاس نہیں جاتے۔ ہمارے گا ہک بھی شریف لوگ ہیں۔ جو دن کے اجالوں میں اپنے چہرے صاف رکھتے ہیں۔ اور رات کے اندھیروں میں ان کے چہرے بھی کالے ہو جاتے ہیں۔ اب تو تم لوگ سمجھ گئے نا۔“

”لیکن تم اپنا گنہہ دھندل کرنے کے لیے یہاں کیوں آ گئے؟“ دلاور نے پوچھا۔

”یار! اب کیا بتاؤں۔۔۔ جہاں پہلے کام کرتا تھا۔ وہاں پولیس بہت سختی کرنے لگی ہے۔ یہ جگہ ذرا محفوظ ہے۔ اسی لیے میں نے سوچا۔ چلو میں سے کام شروع کر دوں۔ میں یہ

آزاد قیدی

”وہی درکشاپ والا راجا۔ اب یہ مت کہنا کہ تم اسے نہیں جانتے۔“ اس نے کہا۔ ”اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ اس لیے میری زبان مت کھلاؤ۔ میں ساری حقیقت جانتا ہوں۔“

دلاور نے گردن جھکا لی تھی۔ بالم بھی دوسری طرف دیکھنے لگا تھا۔ راجا کے حوالے پر دلاور بالم کا اچانک خاموش ہو جانا چکبرے کی کچھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ”ابے تجھے چاہے کسی نے بھی سمجھا ہو۔“ چکبرے نے اس آدی سے کہا۔ ”ہم تجھے یہاں یہ کندہ کاروں بار نہیں کرنے دیں گے۔“

”نہیں چکبرے۔“ دلاور نے اس کا ہاتھ دبا دیا۔ ”ہمیں اس کے کاروبار سے کیا لینا دینا۔ اس کو اپنا کام کرنے دے۔ ہم کو اپنے کام سے مطلب ہے۔“

”بھائی دلاور! کوئی معاملہ ہے کیا؟“ چکبرے نے سرگوشی کی۔

”خاموش رہ۔ بعد میں بتاؤں گا۔“ پھر اس نے اس آدی کی طرف دیکھا۔ ”ٹھیک ہے، تو اپنا دھندا چالو رکھ۔ لیکن ہم سے الگ ہٹ کر۔ اور ہالز۔ کمیشن کے پیسے ہمیں مل جانے چاہئیں۔ ہمارے پاس پوری نئی ہوگی۔“

”ہاں ہاں کر لینا جیتی۔“ وہ آدی کھڑا ہو گیا۔ ”اب میں چلتا ہوں۔ دھندے کا نام ہو گیا ہے۔“

”اپنا نام تو بتا دے؟“ بالم نے پوچھا۔

”شریف نام ہے میرا۔“ اس نے بتایا۔

”واہ نام تو شریف ہے اور کام کیسا چڑا ہے۔“ بالم

ہنس پڑا۔

”ابے یہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔“ وہ بھی ہنس پڑا۔

”اچھا میں چلوں۔ یہاں سے جاتے ہوئے تمہارے پیسے دے جاؤں گا۔“

اس کے جانے کے بعد ہوشو جو بہت دیر سے خاموش بیٹھا تھا، اچانک بھٹ پڑا۔ ”نہیں دلاور بھائی منہ کر دو اس کو۔ ہمیں ایسے پیسے نہیں چاہئیں۔“

”کیوں ہوشو! اب تجھے کیا ہو گیا؟“

”دلاور بھائی! میں جہاں رہتا تھا وہاں اس قسم کے

سیکڑوں تماشے دیکھ چکا ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”میں نے دیکھا

ہے کہ یہ لوگ لڑکیوں کو کہاں کہاں سے اٹھا کر لاتے ہیں اور

بُڑے کام کرواتے ہیں۔ وہ بے چاریاں قیدی ہوتی ہیں۔

مجبور ہوتی ہیں۔“

”تو ٹھیک کہتا ہوشو لیکن اس کے پاس جو لڑکیاں

سب تم لوگوں کو اس لیے بتا رہا ہوں کہ تم لوگ نہیں رہتے ہو۔ میرا دھندا تم لوگوں کو مظلوم ہو سکتا تھا۔ اسی لیے میں نے مناسب سمجھا کہ تم لوگوں کو دوست بنا لوں۔ تاکہ تم لوگ کوئی گڑبڑ پیدا نہ کرو۔“

”بس تم نے اپنی بات پوری کر لی۔“ دلاور نے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں پوری کر لی۔“

”اب ہماری سنو۔ اگر ہم دلاور نہیں کرتے ہیں تو اس

سے ہمارا کیا فائدہ ہوگا؟“ دلاور نے پوچھا۔

”اصول کی بات ہے۔“ بالم بھی بول پڑا۔ ”ہمیں کیا

ملنے والا ہے؟“

”اچھا چلو، ہر سووے پر دو سو روپے۔“ اس نے کہا۔

”واہ، صرف دو سو۔“

”تو اور کتنا دو؟“ وہ بھی ہنرک اٹھا۔ ”ارے بھائی

آج کل ملتا ہی کیا ہے۔ بس ہزار پندرہ سو۔ اس میں سے لڑکی

کو بھی دینا پڑتا ہے۔ کچھ علاقے والے لے جاتے ہیں۔ کچھ

میں رکھ لیتا ہوں۔ میں اپنے حصے میں سے دو سو دے رہا ہوں

اور کیا چاہیے تم لوگوں کو؟“

”ایک بات تو بتا یا راجا! یہ لڑکیاں تیرے پاس آتی کہاں

سے ہیں؟“ چکبرے نے پوچھا۔

”مجبور ہوتی ہیں نیچاری۔“ اس نے بتایا۔ ”ایک

عورت ہے۔ بہت کائیاں۔ اس نے نہ جانے کہاں سے ایسی

لڑکیاں پھانسل لی ہیں۔ بس وہی میری طرف بڑھا دیتی

ہے۔“

”اور تو ان کو آگے بڑھا دیتا ہے؟“ بالم نے کہا۔

”ہاں یار! وہ ہنس پڑا۔ ”پیٹ کے لیے تو سب کچھ

کرنا ہی پڑتا ہے نا۔“

”بے غیرت انسان ہے تو۔“ دلاور ہنرک اٹھا۔ ”شرم

نہیں آتی مجھے۔ تیرے ہاتھ پاؤں سلامت ہیں۔ تو چاہے تو

کچھ اور بھی کر سکتا ہے۔ اس بے شرمی کے کام سے کیا

فائدہ؟“

”اوئے بات سن۔“ اس آدی کا لہجہ اچانک بدل گیا۔

اس کے لہجے میں اعتدال آ گیا تھا۔ ”زیادہ دودھ کا دھلا ہوا بننے

کی کوشش مت کر۔ میں نے ابھی تک بتایا نہیں لیکن اتنا

جان لے کہ مجھے یہاں راجا نے سمجھا ہے۔ اسی نے تم لوگوں

کے ساتھ مل کر کام کرنے کے لیے کہا تھا۔“

”راجا۔“ دلاور اور بالم ایک دوسرے کی طرف دیکھنے

لگے۔ ”کون راجا؟“

”ابے اس طرح کام نہیں چلتا۔“ راجا نے کہا۔ ”جو پیسے ملتے رہیں ان کو جمع کرتا رہ۔ آگے کام آئیں گے، جب سب ہی لٹا دے گا تو پھر اس کام کا فائدہ کیا ہوگا؟“

”ٹھیک ہے راجا بھائی! آئندہ سے دھیان رکھوں گا۔“ دلاور نے جان چھڑانے کے لیے کہہ دیا۔

”یہ لے۔“ راجا نے پانچ سو کا ایک نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ ”اب یہ بتا۔ تیرے پاس کوئی بندہ آیا تھا؟ رات کے دھندے والا؟“

”ہاں، ایک آیا تو تھا۔ شریف نام بتا رہا تھا۔ کہہ رہا تھا تم نے بھیجا ہے اس کو۔“

”ہاں یار! میں نے ہی بھیجا تھا اس کو۔ بہت دنوں سے کسی ایسے اڈے کی تلاش میں تھا اسی لیے میں نے اسے تیری طرف بھیج دیا۔ بات بنی یا نہیں؟“

”ہاں اس سے معاملہ تو ہو گیا تھا۔“

”لیکن یاد رکھنا، اپنے پیسے اس پر مت چھوڑنا۔ ایک نمبر کا بد معاش ہے۔ ہاتھ کے ہاتھ لیتے رہتا۔“

”یار! یہ بتا، تیری اس سے کیسے دوستی ہو گئی؟“ دلاور نے پوچھا۔

راجا بد معاشی اور معنی خیز انداز میں اپنی آنکھ مار کر بولا۔ ”یاد کیا کروں، یاروں کے کام تو آنا ہی پڑتا ہے نا۔“

دلاور پانچ سو کا نوٹ لے کر پارکنگ کی طرف آ گیا۔ جلے کی تیاریاں جاری تھیں۔ جگہ جگہ بینرز لگائے جا رہے تھے۔ اسٹیج کو جاپا جا رہا تھا۔ جس پر مولانا صاحب کو تقریر کرنی تھی۔ سیکڑوں کی تعداد میں کرسیاں بچھائی جا رہی تھیں۔ میلے کا سامان تھا۔

بکلی کے لیے کنڈوں کا بندوبست کیا جا رہا تھا۔ تاکہ.... تقریر کے دوران میں اندھیرا نہ ہو جائے۔

وہ تیزی سے ایک طرف کھڑے تیاریاں دیکھ رہے تھے۔ دلاور ان کے پاس پہنچ کر بولا۔ ”چلو، کھانا کھا کر آتے ہیں۔ پیسے لے آیا ہوں۔“

چاروں رحیم کے ڈھابے کی طرف بڑھ گئے۔ یہ بہت پرانا ڈھابا تھا۔ چاچا رحیم اور گنی ٹاؤن سے اپنے ساتھ کھانے کی دیکسین سوزوکی پر لایا کرتا اور ڈھابے پر رکھ دیتا۔

اس کے ڈھابے پر صرف دال چاول ہوتے تھے لیکن وہ بھی اتنے مزے کے کہ کھانے والوں کے پیسے وصول ہو جاتے۔ آج اس کے ڈھابے پر برش بہت تھا۔

”وہ مجبور نہیں ہوں گی۔“ بالم نے کہا۔ ”یہ اپنی مرضی سے آتی ہوں گی اور اپنی مرضی سے جا سکیں گی۔ میں نے کسی سے سنا تھا کہ آج کل ایسی لڑکیوں کو سوسائٹی گرل کہا جاتا ہے۔ یہ اچھے گھرانوں کی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ ان کے ساتھ کوئی ایسی مجبوری نہیں ہوتی۔ یہ صرف اپنے میک اپ فیک اپ اور نئے نئے ڈیزائن کے کپڑے خریدنے کے لیے ایسے کام کرتی ہیں۔“

”لغت ہے ایسی لڑکیوں پر۔“ چکمرے نے کہا۔

سب بالم کی ایسی معلومات پر اس سے مرعوب ہو گئے تھے۔ کچھ فاصلے پر اندھیرے میں اس آدھی کا خاکہ دکھائی دے رہا تھا۔ جو اپنے گاہک یا اپنے سودے کے انتظار میں تھا۔

☆☆☆

ایک رات پارکنگ میں بہت رونق میلہ لگ گیا تھا۔ دن بھر پارکنگ کی صفائی ہوتی رہی تھی پھر بڑا سا پنڈال لگایا گیا تھا۔ کرسیاں بچھائی گئی تھیں۔ رات کو کوئی مذہبی جلسہ ہونے والا تھا۔ بہت بڑے عالم تقریر کرنے والے تھے۔

جو گاڑیاں پارکنگ میں کھڑی ہوا کرتی تھیں، انہیں دور ہٹا دیا گیا تھا۔ یہ چاروں بھی آج کے جلے کے حوالے سے بہت نرجوش ہو رہے تھے۔

”دلاور بھائی! آج تو بہت مزہ آئے گا۔“ ہوشو نے کہا۔

”کیا خاک مزہ آئے گا۔“ دلاور نے بڑا سامنہ بنایا۔ ”آج تو ہمارا کوئی دھندا ہی نہیں ہوگا۔ جب گاڑیاں ہی نہیں آئیں گی تو ہم کیا دھومیں مچا سکیں گے؟“

”یہ بات تو ہے لیکن چلو کسی بھی ایسا بھی سی۔“

اس دن دلاور کے پاس بھی پیسے نہیں تھے۔ جو ملے وہ خرچ ہو گئے تھے۔ کچھ پیسے راجا کی طرف سے آئے تھے اور چار سو روپے شریف نے دیے تھے۔

یہ ساری رقم آپس میں تقسیم ہو گئی تھی۔ دو تین دنوں تک خوب سونگ سٹی رہی تھی پھر پیسے ختم ہو گئے تھے اور وہ دن بھی جلے کی نذر ہوئے والا تھا۔

دلاور کچھ پیسے مانگنے کے لیے راجا کے پاس پہنچ گیا۔

”یار راجا بھائی! پانچ سو روپے تو دے دو۔“

”ابے اتنی جلدی پیسے ختم بھی ہو گئے؟“

”ہاں بھائی، سب کو بانٹ دیے۔ کچھ کھاپی کر عیاشی کر لی اور ہمیں کیا کرنا ہے۔“

راجا نے ادھر ادھر دیکھ کر سرگوشی کی۔ ”یار! آج جو جلسہ ہو رہا ہے۔ اس کو خراب کرنا ہے۔“

”کیا؟“ دلاور حیران رہ گیا۔ ”کیا کہہ رہے ہو راجا بھائی؟“

”ہاں، ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ تین ہزار قہجے مل جائیں گے۔“

”راجا بھائی! یہ تو بہت گناہ کا کام ہوگا..... ایسے جلسے کو کیسے خراب کروں؟“

”ارے چھوڑو! اپنا دھندا دیکھ۔“ راجا نے کہا۔ ”یہ سب پیسے کمانے کے طریقے ہیں۔ ان میں سے ایک طریقہ یہ بھی ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے راجا بھائی، لیکن میں جلسہ خراب کیسے کر سکتا ہوں؟“ دلاور نے پوچھا۔

”اے تیرے ساتھی کس کام آئیں گے، دیکھ مارکیٹ کے چاروں طرف فلش بنے ہوئے ہیں، تو اور تیرے ساتھی پتھر لے کر چتوں پر چڑھ جائیں گے۔ اور جلسہ شروع ہونے کے کچھ دیر بعد ہر طرف سے پتھراؤ شروع کر دیتا۔ بس بھگدڑ مچ جائے گی اور جلسہ خراب ہو جائے گا۔ لیکن یاد رکھنا، کوئی پتھر مولانا صاحب کو نہ لگے۔“

”وہ کیوں، راجا بھائی! پہلا پتھر تو انہی کو لگنا چاہیے۔“ دلاور نے کہا۔

”نہیں یار! ایسا مت کرنا۔ یہ کام بھی تو خود ہی کروا رہے ہیں۔“ راجا نے بتایا۔

”کیا؟“ دلاور حیران رہ گیا۔ ”کیا کہہ رہے ہو راجا بھائی! وہ اپنا جلسہ خود ہی خراب کروا دیں گے؟“

”ہاں، تو یہ سب نہیں سمجھے گا بیٹے۔ اسی کو تو سیاست کہتے ہیں۔“ راجا نے کہا۔ ”اے جلسہ خراب ہونے کا سارا الزام دوسرے پر لگ جائے گا اور اپنے مولانا کے بھاؤ بڑھ جائیں گے۔ اب تو سمجھ گیا؟“

”ہاں راجا بھائی، مجھ میں آ گیا۔“

”یہ لے دو ہزار۔ اور جب کام ہو جائے تو پھر ایک ہزار اور لے لیتا۔“ راجا نے دو کرارے نوٹ اس کی طرف بڑھا دیے۔

دلاور نے نوٹ لے لیے۔ اسے اپنا کام کرنا تھا۔ چاہے جیسی بھی سیاست ہو۔ جیسی بھی منافقت ہو۔ اس کا اور اس کے ساتھیوں کا کیا لینا دینا تھا۔

اس کے ساتھی ان کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے جو

آس پاس کی دکانوں میں کام کرنے والوں کے علاوہ جلسے میں کام کرنے والے مزدور بھی اسی کے ڈھابے پر آئے ہوتے تھے۔

چاچا رحیم اور اس کے دونوں بیٹے مشین جیسی پھرتی کے ساتھ سب کو دال چاول کی پلیٹیں نکال نکال کر دیے جا رہے تھے۔ اور چاچا رحیم جلسے میں آنے والے بزرگ کی شان میں قہقہے پڑھے جا رہا تھا۔

”ارے بھائیو! کیا شان ہے ان کی۔ ہم نے ان کو اورنگی میں دیکھا ہے۔ نور برستا ہے نور۔ اللہ والے ایسے ہیں ہوتے ہیں جدھر مہمان ہو کر دیکھ لیے، اس طرف روشنی پھیل جاتی ہے۔“

”چھوڑ چاچا! تو اپنا کام کر۔“ کسی دل جلے کی آواز آئی۔ ”بہت دیکھے ہیں ایسے اللہ والے۔“

رحیم چاچا کو جلال آ گیا۔ ”تم لوگ تو کفر بکتے ہو، کفر۔“

”واہ رحیم چاچا! ہم اتنی سی بات پر کافر ہو گئے۔“

رحیم چاچا پیڑا ہو کر دوسرے گاؤں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ان چاروں نے بھی اپنے لیے دال چاول کی پلیٹیں حاصل کر لیں۔

کھانے کے دوران وہ ڈھابے میں آنے والوں کی باتیں سنتے رہے۔ اچانک کسی نے دلاور کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ یہ راجا کے ورکشاپ میں کام کرنے والا اصغر تھا۔ ”دلاور بھائی! استاد رہا ہے تم کو۔“

”کیوں؟“

”میں نہیں جانتا، کہہ رہا تھا بہت ضروری کام ہے۔“

”اچھا اچھا تو نکل لے۔ میں ابھی کھانا کھا کر آتا ہوں۔“

دلاور نے سب سے پہلے کھانا ختم کر کے رحیم چاچا کے کھانے کے پیسے ادا کیے اور اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا۔ ”تم لوگ آرام سے کھا رہو۔ میں ابھی آتا ہوں۔“

راجا چائے کی چپک سانے رکھے اس کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ ”یہ دیکھ، میں نے تیرے لیے چائے کا پہلے ہی بندوبست کر دیا ہے۔“

”غیریت تو ہے راجا بھائی؟“ دلاور اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

”اے ایک بڑا زبردست کام آ گیا ہے، عیش ہو جائیں گے، پورے تین ہزار کا دھندا ہے۔“

”کام کیا ہے؟“

جلسہ گاہ میں بچھائی گئی تھیں۔ وہ بہت دلچسپی سے مزدوروں کو کام کرتا ہوا دیکھ رہے تھے۔

دلاور ان تینوں کو بلا کر ایک طرف لے آیا تھا۔ اس نے کچھ جھگڑے ہوئے انہیں ساری انکیم بتادی۔ وہ تینوں ہی پریشان ہو گئے۔

”دلاور بھائی! کوئی بڑا لہوا نہ ہو جائے؟“ بالم نے کہا۔ ”اگر ہم پکڑے گئے تو ہمارا کیا ہوگا؟“

”اسی لیے تو ہم چھتوں پر رہیں گے۔ وہاں اندھیرا ہوتا ہے۔ جگہ ڈیس کی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔ لوگ ایک بلڈنگ کی طرف دیکھیں گے۔ دوسرا پتھر دوسری بلڈنگ سے آئے گا۔ تیسرا تیسری بلڈنگ سے۔ اس طرح سارا کام چوکس ہو جائے گا۔“

”دلاور بھائی! یہ تو گناہ والی بات ہو گی نا؟“ ہوشو نے کہا۔

”اے کوئی گناہ نہیں۔۔۔ یہ خود بھی سرکاری بجلی چوری کر کے جلسہ کر رہے ہیں۔“

”یہ بات تو ہے۔“ چکمرے نے گردن ہلائی۔

”پھر پیسے بھی تو ملیں گے۔“ دلاور نے کہا۔ ”میش ہو جائیں گے ہمارے۔“

تھوڑی سی بحث کے بعد سب مان گئے بلکہ یہ سوچ سوچ کر خوش ہو رہے تھے کہ جب جلسہ خراب ہوگا تو پھر کتنا مزہ آئے گا۔ دلاور نے سب کو بتا دیا تھا کہ مولانا صاحب کو پتھر نہیں لگنا چاہیے۔

جلے کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ چاروں طرف بڑے بڑے لاؤڈ اسپیکر لگا دیے گئے تھے۔ دلاور نے حکمت عملی بتائی تھی۔ مارکنگ کے دائیں اور بائیں دونوں طرف فلیش کی عمارتیں تھیں۔

چکمر اور ہوشو ایک بلڈنگ کی چھت پر ہوتے۔ اور وہ خود بالم کے ساتھ دوسری بلڈنگ کی چھت پر ہوتا۔ ان چاروں نے بڑے بڑے شاہزادہ میں پتھر بھر لیے تھے۔

اب جلسہ شروع ہونے کا انتظار تھا۔

اندھیرا ہوتے ہی ہر طرف روشنی ہی روشنی ہو گئی تھی۔ بڑے بڑے بلب جل رہے تھے۔ مائیک پر ویو سسٹم کی نیٹنگ کی آوازیں گونج رہی تھیں۔

عشا کی نماز کے ساتھ ہی لوگوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ ہر طرف سے قافلے چلے جا رہے تھے۔ گاڑیوں پر، پیدل، مولانا صاحب کے لیے مخصوص نعرے لگاتے ہوئے، جھنڈے اٹھاتے ہوئے۔

خود بھی اسی بھیڑ کا حصہ بن کر دونوں بلڈنگز کی چھت پر پہنچ گئے۔ ہوشو اور چکمر ایک بلڈنگ کی چھت پر۔ دلاور بالم دوسری بلڈنگ کی چھت پر۔

جلسہ شروع ہو چکا تھا۔ فلیش پڑھی جا رہی تھیں۔ پھر جلسہ گاہ میں ہلچل مچ گئی۔ مولانا صاحب شریف لے آئے تھے۔ یہ چھت سے صاف صاف دیکھ رہے تھے۔

گاڑیوں کا پورا قافلہ آیا تھا۔ مولانا صاحب ایک شاندار گاڑی سے اترے تھے۔ صحت مند انسان۔ کھڑکھڑاتا ہوا قیمتی لباس۔ اس کے ساتھ ساتھ مسخ افراد بھی تھے۔ جو اس کی حفاظت کر رہے تھے۔

”دلاور بھائی! یہ کیسا والا ہے؟“ بالم نے کہا۔

”اللہ والے تو بہت سادگی میں رہتے ہیں۔ میں نے تو یہی سنا ہے۔“

”ارے یہ سب جھوٹے لوگ ہیں بالم۔“

”وہ دیکھو، لوگ اس کے ہاتھ چوم رہے ہیں۔“

مولانا اسٹیج پر آچکا تھا۔ لوگ اس کے ہاتھوں کو بوسہ دے رہے تھے۔ وہ بڑے کر دفر کے ساتھ ایک صوفے پر بیٹھ چکا تھا۔

اس کے بیٹھے ہی جلے کا باقاعدہ آغاز ہو گیا۔ پہلے تلاوت کی گئی۔ پھر ایک نعت سنائی۔ اس کے بعد ایک شخص نے مولانا کی شان میں قصیدے پڑھنے شروع کر دیے۔

”سب جھوٹ ہے۔“ دلاور بڑبڑایا۔

”شروع ہو جاؤں دلاور بھائی؟“ بالم نے پوچھا۔

”ابھی نہیں۔ اشارہ یہ ہے کہ جیسے ہی مولانا تقریر کے لیے کھڑا ہو، ہمیں شروع ہو جانا ہے۔ دوسری طرف سے وہ دونوں بھی شروع ہو جائیں گے۔“

بالآخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ مولانا اپنی جگہ سے اٹھ کر مائیک کی طرف آیا۔ بالم نے پتھر اٹھا لیا تھا۔ لیکن دلاور نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”میں بالم! تو پتھر نہیں پھینکے گا۔“

”کیوں دلاور بھائی۔ اب کیا ہو گیا؟“

”دیکھ میرا نشانہ کتنا سچا ہے۔“ دلاور نے کہا۔ ”جو بے چارے تقریریں سننے آئے ہیں۔ ان بے چاروں کا کیا قصور ہے۔ اصل قصور تو اس قسم کے مولانا کا ہے۔“

”تو پھر؟“

”پھر یہ کہ میں مولانا ہی کا نشانہ لے رہا ہوں۔ اب تو دیکھتے رہتا۔“

دلاور نے ایک گول مٹول سا پتھر اپنی مٹھی میں تولا۔

تینوں میں بانٹ دیے۔

”واہ دلاور بھائی۔“ چکرا انوت چم کر بولا۔ ”اگر میں نے اس قسم کے دو چار کام مل جائیں تو اپنے پیش ہو جائیں۔“

بس اسٹاپ پر لوگوں کا رش دکھائی دے رہا تھا۔ بہت سے لوگ ایک دائرے کی صورت میں کھڑے کسی کو دیکھ رہے تھے۔ جیسے دائرے کے بیچ میں کچھ ہو رہا ہو۔

”یہ کیا ہو رہا ہے دلاور بھائی؟“ ہوشو نے پوچھا۔
”پتا نہیں رہے۔“

”میں دیکھ کر آتا ہوں۔“ بالم دیکھنے چلا گیا۔
بالم کچھ دیر بعد دونوں کانوں کو ہاتھ لگا تا اور توبہ تو پر کرتا ہوا واپس آ گیا۔

”کیا ہو گیا رہے۔ کیوں توبہ تو پر کر رہا ہے؟“

”ارے، نہ جانے کون وہاں ایک عورت کو پھینک کر چلا گیا ہے۔“ بالم نے بتایا۔ ”زغده تو ہے لیکن مردے سے بدتر۔ اس کا پورا جسم سزا ہوا ہے۔ اس کے دونوں ہاتھ تڑپڑ کی طرح گل گئے ہیں۔ توبہ میں تو دیکھ بھی نہیں سکا۔“

”وہ انسان تو ہے ناپا یا راجل دیکھ کر آتے ہیں۔“

”تم لوگ جاؤ، میں نہیں جا رہا۔“ بالم سر ہٹام کر ایک طرف بیٹھ گیا تھا۔ ”میرا سر چکر رہا ہے۔“

وہ تینوں اسٹاپ پر پہنچ گئے۔ جہاں لوگ ایک دائرے کی صورت میں اس عورت کو گھیرے کھڑے تھے۔ وہ ایک طرف فٹ پاتھ پر بڑی سب کو کیے جا رہی تھی۔

بالم نے ٹھیک ہی بتایا تھا۔ اس کا پورا جسم سڑ چکا تھا۔ دونوں ہاتھ پاؤں گل گئے تھے۔

اس عورت کی حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ اچانک ہوشو، دلاور سے لپٹ کر بڑی طرح ہچکیاں لے لے کر رونے لگا۔

”ابے تجھے کیا ہو گیا؟“ دلاور نے حیرت سے پوچھا۔
”دلاور بھائی ایہ..... یہ..... یہ میری ماں ہے۔ میری

کاکی۔“

”کیا؟“

”ہاں دلاور بھائی، یہ ماں ہے میری۔“

وہ بڑی طرح رو رہا تھا۔ اور اس کو سنبھالتے ہوئے خود دلاور کے ہاتھ پاؤں کا نیپے لگے تھے۔

اس دل خراش منظر نے ہوشو کے ہوش اڑا دیے تھے۔ اس کی زندگی فٹ پاتھوں اور سڑکوں سے شروع ہوئی تھی..... وہ ایسے قیدی تھے جو کبھی آڈ کے اپنے کمروں تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔

ایک آنکھ بند کی اور وہ پھر سننا تا ہوا مولانا کے سینے پر جا لگا۔ مولانا صاحب ایک مکروہ بیچ کے ساتھ دوسری طرف الٹ گیا۔

اس کے ساتھ ہی دوسری بلڈنگ سے ہوشو اور چکیرے نے بھی پتھروں کی پوچھا زور شروع کر دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے کرسیاں اٹنے لگیں اور جگہ جگہ ٹوٹ گئی۔
پورا جلسہ درہم برہم ہو کر رہ گیا تھا۔

☆☆☆

حیرت انگیز طور پر راجا، دلاور کی اس کارکردگی سے بہت خوش اور مطمئن تھا۔ ”یار! تو نے تو کمال کر دیا۔ مولانا صاحب بھی بہت خوش ہیں۔“

”لیکن میں نے تو سنا ہے کہ وہ زخمی ہو گئے ہیں۔“

”جی بات تو سحرے کی ہوئی ہے۔ اب ان کے ڈرائے میں اصلی رنگ شامل ہو گیا ہے۔ اب کوئی یہ نہیں کہے گا کہ وہ پتھر آؤ ایک ڈراما تھا۔ اب سب مولانا صاحب سے ہمدردی کر رہے ہیں۔“

”راجا بھائی! یہ تو کمال ہو گیا۔ یعنی وہ لوگ ہر طرح سے فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔“

”ہاں بیٹا! اسی کا نام تو سیاست ہے۔“ راجا نے کہا۔
”اور سن لے، اگر زندگی میں اس مولانا کی طرح کامیاب ہونا ہے تو ہر قسم کی چوہین سے فائدہ اٹھانا سیکھ لے۔“

”اب یہ ہنر تو سیکھنا ہی پڑے گا راجا بھائی۔“

”اور جانتا ہے اس کامیابی پر تیرے جیسے میں اور دو ہزار آگئے ہیں۔ یعنی اب یہ کیس پورے پانچ ہزار کا ہو گیا ہے۔“

”پھر تو سحرے آگئے۔“

”ایک بات اور۔ مولانا صاحب نے دو چار دنوں کے بعد تجھے بلایا ہے۔ میرے ساتھ چلنا۔“

”وہ کیوں؟“

”میں نے تیری بہت تعریف کر دی تھی۔ کہہ رہے تھے بہت کام کا لڑکا ہے۔ میرے پاس لے آنا، میں اس سے اور بڑے کام لوں گا۔“

دلاور کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ایک راستہ اس کے لیے کھلنے لگا تھا۔ اسے زندگی فٹ پاتھ پر تو نہیں گزارنی تھی۔ آگے جاتا تھا اور آگے جانے کا یہ ایک موقع مل رہا تھا۔

”میں ضرور چلوں گا راجا بھائی، ضرور چلوں گا۔“

وہ پورے چار ہزار نقد لے کر اپنے ساتھیوں کے پاس واپس آیا تھا۔ ”یہ کوئی شکر کرو۔“ اس نے ایک ایک ہزار ان

پتلی گر

امجد حباوید

کسی کسی کی زندگی ایک خوب صورت خواب کے مانند گزرتی چلی جاتی ہے... اور کسی کی زندگی میں... سنکون و اطمینان... طمانیت... سرشاری اور آسودگی... صرف خوابوں کی حد تک ہی محدود رہتی ہے... وہ کبھی کسی خوشی سے مسکرائے نہیں ہوتے... کیونکہ خوشی انہیں چھوٹے بغیر گذر جاتی ہے... ایک ایسے ہی کردار کی کہانی... جو حالات کے سخت ترین شکنجے میں تھا... وہ جب اس سے نکلنے کی کوشش کرتا... کامیابی کے نزدیک تر ہو کے پھر ناکام ہو جاتا... کسی پتلی کے مانند اس کی ذریعہ کسی اور کے ہاتھ میں تھیں... پتلی گراسے اپنی غرض کے مطابق متحرک رکھتا تھا...

حالات کی بے رحم موجوں کی نذر ہو جانے والے ایک بے تورا کا قصہ عبرت

دن گزرتے گئے، اس کی ماں ندرست بھی ہو گئی لیکن حالت ایسی تھی کہ وہ اب کام کرنے لوگوں کے گھروں پر نہیں جاسکتی تھی۔ وقت گزرتا گیا اور ایک دن اس کی ماں نہ رہی۔ وہ اس دنیا میں اکیلا ہو گیا۔ وہ سارا دن باہر رہتا اور رات کو اسی کا بک نما قلیٹ میں آکر سو جاتا۔ جس کا کرایہ وہ پابندی سے دیتا تھا۔ اس کی کسی کے ساتھ دشمنی نہیں تھی۔ بچپن سے وہ یہیں رہ رہا تھا، اسی لیے سبھی اسے جانتے تھے۔ کسی کو اس سے کوئی شکایت نہیں تھی۔

اجا تک ابی وہ بے روزگار ہو گیا تھا۔ کہنی میں فراڈ ہوا تو گندم کے ساتھ بھی نہیں جانے کے مصداق وہ بھی دھریا گیا تھا اس کے پاس جو کچھ تھا، وہ سب بیچ کر بھی کہنی کا پورا نہیں ہوا تھا۔ اب اس پر مزید دباؤ ڈالا جا رہا تھا کہ وہ اپنے حصے کی باقی رقم بھی ادا کرے ورنہ اسے جیل بھیجا جاسکتا ہے۔ جب تک اس کی ماں زندہ تھی، اسے کرائے کی گھر نہیں ہوتی تھی۔ ماں کو جنون سوار تھا کہ وہ پڑھ لکھ کر کوئی بڑا انسر بنے۔ وہ خود لوگوں کے گھروں میں کام کرتی تھی۔ ان کی زندگی جیسے تیسے چلتی رہی۔ ایک دن اس کی ماں بیمار ہوئی۔ وہ کام پر نہ جا سکی تو گھر میں قاتے ہوئے لگے۔ یہاں تک کہ وہ خود ایک چائے والے کی دکان پر کام کرنے لگا۔ رات گئے وہ ابھی ہوئی تو کچھ روپے اس کے ہاتھ میں ہوتے تھے۔ وہ کچھ دوا میں خرچ ہو جاتے اور باقی سے پیٹ کی آگ بجھا لیتے۔ اسی طرح وہ بے مشکل میٹرک کر پایا۔ اس نے مزید پڑھنے کا ارادہ ترک کیا اور بلڈنگ ہی میں موجود ایک چہرہ اسی

وہ چھ منزلہ بلڈنگ کی چھت پر بیٹھا مسلسل سوچ رہا تھا۔ رات کا پہلا پہر ختم ہونے کو تھا لیکن وہ وقت، موسم، ٹریفک کے بے ہنگم شور اور ارد گرد کی عمارتوں سے بچنے کر آنے والی روشنی سے بے نیاز سیاہ آسمان کی جانب دیکھ رہا تھا۔ وہ یہ فیصلہ کرنا چاہتا تھا کہ اسے مزید جینا چاہیے یا نہیں؟ لیکن اسے کچھ سوچ ہی نہیں رہا تھا۔ ایک طرف زندگی کی رنگینیاں تھیں، لیکن ان میں اس کا کوئی حصہ نہیں تھا۔ شاید یہ زندگی بھی کسی بیڑی کے مانند ہے۔ جسے روپے سے چارج رکھا جاتا ہے۔ کسی گاڑی کی بینگی کے مانند جس میں فیول ہوگا تو چلے گی، اس طرح زندگی بھی روپے کے ساتھ چلتی تھی۔ اگر آپ کے پاس پیسہ ہے تو آپ کھانا کھا سکتے ہیں، ورنہ آپ بھوکے رہ گئے۔ پیسہ ہے تو چھت میسر ہوئی ورنہ کھلے آسمان کے نیچر ہٹا پڑے گا۔ اتنے بڑے شہر میں کوئی کسی کا پڑسان حال نہیں۔ کیا میں کسی درگاہ پر جا کر جیکب مانگتا شروع کر دوں؟ اس نے غمی سے سوچا؟ مطلب پھر میں جی تو نہیں رہا ہوں، جیکب مانگنے سے بہتر ہے کہ مر جاؤں۔ اسی طرح کی اوٹ پٹانگ سوچوں میں اس کا کافی وقت گزر گیا تھا۔

وہ عام حالات میں اتنا بخ نہیں ہوتا تھا لیکن آج تو حد ہو گئی تھی۔ وہ جس بلڈنگ کی چھت پر بیٹھا تھا، اسی میں چھوٹے چھوٹے لے کا بک نما قلیٹ تھے۔ غریب غرباء، چھوٹے چھوٹے کام کرنے والے اور دفتروں میں چہرہ اسی جیسے لوگوں کے خاندان بھرے ہوئے تھے۔ یہ سب یہاں کرائے پر تھے۔ کی واسطے سے غمی کہنی میں چہرہ اسی کی نوکری کرنے لگا۔



اسے یہ خیال ہی نہیں آیا تھا کہ فلیٹ کا کرایہ بھی دینا ہے۔ وہ ماہ سے گھانا ٹھیک طرح سے نہیں کھا پایا تھا، فلیٹ کا کرایہ کہاں سے دیتا۔ آج شام اس بلڈنگ کا فٹنی آیا اور اس نے اسے جری طرح بے عزت کر کے رکھ دیا تھا۔ فٹنی نے وہ باتیں سنائیں جو اس نے کبھی نہیں سنی تھیں۔ شاید وہ باتیں سن کر اتنا ڈسٹرب نہ ہوتا لیکن فٹنی کے ساتھ آئے غنڈے نے آتے ہی اس کے چار پانچ بزدلے تھے۔ جاتے ہوئے وہ دمکی دے کر گیا تھا کہ کرائے کے پیسے جمع کر دے ورنہ صبح آکر اسے نکال باہر کریں گے۔ فٹنی تو چلا گیا مگر بے عزتی کے ساتھ ہونے والی پٹائی نے اس کا دماغ خراب کر دیا۔ اس شور شرابے میں بلڈنگ کے لوگ بھی جمع ہو گئے تھے۔ وہ ان سے لگا ہیں بچا کر تپ سے یہاں بیٹھا سوچتا چلا جا رہا تھا۔

جاسوسی ڈائجسٹ 263 دسمبر 2018ء

سارے راستے مسدود ہو چکے تھے۔ وہ کیا کرے، یہ اسے سوچ ہی نہیں رہا تھا۔

”اوتے راجا تم یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟“

آواز پر پلٹ کر اس نے دیکھا تو دلبر اس کے سامنے کھڑا حیران نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ جیسی اس نے چمکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”میں خودکشی کے بارے میں سوچ رہا ہوں؟“

”اوتے، سوچنا کیا ہے، جلدی سے کود جا، تاکہ تیرے قلت میں وہ موتی تو نہ والا آجائے جو ایک ماہ سے قشی کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔“ اس نے مزاحیہ انداز میں کہا۔ وہ شاید اس کی ذہنی کیفیت سے بے خبر تھا۔

”ہاں جس کے تیرے جیسے دوست ہوں، وہ خودکشی کرنے کا مشورہ تو دے سکتے ہیں لیکن اسے بھانپیں سکتے۔“ راجا نے انتہائی دکھ سے کہا تو دلبر کھوس ہوا کہ کوئی نہ کوئی۔ گڑبڑ ہے۔ اس نے جب سے تراڑا سرگرم نکالا اور باجس تلاش کرتے ہوئے سمجھ لے میں بولا۔

”ایک طرف دوست کہتے ہوئے طعنہ دے دیا، پر دوسری طرف مجھے یہ بتا بھی تم نے میرے مشورے پر عمل کیا؟“

”تم ہمیشہ غلط راستے پر چلنے کی بات کرتے ہو، میں ایسا نہیں کر سکتا۔“ اس نے ٹھنکے لہجے میں کہا۔

”تو پھر یہ خودکشی کا فیصلہ بالکل ٹھیک ہے، یہ غلط راستہ نہیں ہے۔ یہ بالکل درست راستہ ہے۔ تیرے جیسے احمق کو کون بچائے؟“ اس نے رخ لہجے میں کہا اور سرگرم ہونٹوں میں دبا کر دیا سلائی جلائی اور سرگرم لگا لگا۔ دلبر نے ایک گہرا کش لیا اور راجا کی جانب دیکھنے لگا جس نے اسے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ ایک تنگ سیاہ آسمان کی جانب دیکھے... جارہا تھا۔ کافی دیر بعد اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

”ہاں مجھے خودکشی کر لینی چاہیے۔“

”ہاں حرام موت مرے گا لیکن اس دنیا سے اپنا حق نہیں چھینے گا۔ میں تجھے احمق ہی نہیں گماڑ بھی کہوں گا۔“ دلبر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”حرام موت مرنا یا حرام کام کرنا، ایک ہی بات ہے۔“ اس نے خود کو تسلی دینے والے انداز میں کہا تو دلبر نے ہنساتے ہوئے کہا۔

”میں تجھے نہیں سمجھا سکتا کیونکہ تو سمجھتا ہی نہیں چاہتا۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک گہرا کش لیا اور دھواں نفاشیں چھوڑتے ہوئے بولا، ”دیکھ، یہ دنیا ایک جنگل ہے۔ یہاں صرف طاقتور

کی مائی جاتی ہے۔ جو چھین لے بس اسی کا، ابھی تو نے سوچا کہ اس دنیا میں ہم یوں کیڑے مکوڑوں کی طرح زندگی گزارنے پر مجبور کیوں ہیں؟ اور دوسری طرف یہ بلند بالا عمارتیں، مکوں پر دوڑتی ہوئی تھے ماؤں کی کاریں، عیاشی کرتے ہوئے لوگ، سوچا بھی؟“

”یار یہ ان کا مقدر ہے اور.....“ راجا نے کہنا چاہا تو دلبر عمارت سے بولا۔

”یہ مقدر انہوں نے خود بنایا ہے، دوسروں سے چھین کر، مجھے یہ بتا تم نے اپنی کمپنی میں فراڈ کیا تھا؟“

”جیہں، میں تو.....“ اس نے کہنا چاہا تو دلبر بات کاٹتے ہوئے بولا۔

”وہ طاقت ور تھے اور تو کمزور، چھین لیا تا تجھ سے سب بکھ، اب خودکشی کا سوچ رہا ہے۔ حالانکہ تو فراڈ کا حصہ نہیں تھا۔ مر جائے گا تو کیا انہیں سچے میں جائیں گے اور زندہ رہا تو وہ تیری زندگی کا خراج وصول کریں گے۔ یا تو اتنا ہی احمق ہے اپنا حق بھی نہیں بچا سکتا؟“

”یار میں کیا کر سکتا ہوں؟ وہ تو.....“ اس نے کہنا چاہا تو دلبر سے میں بولا۔

”وہ قشی کا غصہ، جس کی اپنی کوئی اوقات نہیں، اس نے تجھ پر ہاتھ اٹھا دیا تو کم از کم اس کے جواب میں دو چار تو دھرسکا تھا، اُس نے بھی مار کھائی۔“

”پھر میں کیا کروں، تو یہ حقیقت ہے تاکہ میں کمزور ہوں۔“ راجا نے ایک طویل سانس لے کر دھیسے سے کہا۔

”دیکھ، کون کہتا ہے کہ تو کمزور ہے، میں جانتا ہوں تیرے پاس عقل ہے، شعور ہے لیکن تو اسے استعمال نہیں کرتا۔ اس خواہ تو اہ کی ایمان داری کے چکر میں یہاں بیٹھا خودکشی کا سوچ رہا ہے۔ اپنے آپ کو بچان، خود میں حوصلہ پیدا کر، اپنا حق اس دنیا سے چھین لے۔ اس حالت میں تو کوئی تجھے ایک روپیہ ادھار نہیں دے گا۔“

”تم سچ کہتے ہو دلبر، خالی پیٹ، خالی جیب ہونے سے دماغ بھی خالی ہو جاتا ہے۔“ اس نے غمی سے کہا۔

”دیکھ، مرنا تو ہے، آج نہیں تو کل، ابھی تو اپنے مرنے کا پروگرام نیشنل کر۔ اگر تو مجھے دوست سمجھتا ہے تو ایک بار میرے مشورے پر عمل کر، میں جو کہتا ہوں وہ کر۔ پھر جو تیری مرضی ہو کرنا۔“ دلبر نے کہا اور سرگرم کا ٹوٹا نیچے پھینک کر پاؤں سے مسل دیا۔

”مجھے کیا کرنا ہوگا؟“ راجا نے پوچھا۔

”ابھی تو کل نامیرے ساتھ پہلے کھانا کھا، پھر دیکھتے

آگے بڑھا دی کہ تقریباً ایک کلومیٹر دور جا کر دلبر نے رکنے کا کہا۔ راجا رک گیا۔ اس نے ایک تاریک مدو سے پیٹرول پمپ کی کھولی، پیٹرول کا اندازہ کیا پھر مطمئن ہو کر اسے چلانے کا کہہ دیا۔

وہ بانیک لے کر سنان گلیوں میں آ گئے۔ ایک طرف دوڑ کے کھڑے بائیں کر رہے تھے۔ راجا نے ان کے پاس بانیک لے جا کر کھڑی کر دی، یہی دلبر اترا اور پستل سیدھا کرتے ہوئے کہا۔

”جو کچھ بھی ہے نکال دو، ورنہ گولی مار دوں گا۔“
ان لڑکوں نے کوئی مزاحمت نہیں کی، اپنی جیب سے پرس نکال کر اسے حمدا دیے۔ ایک کے گلے میں سونے کا لاکٹ تھا، دلبر نے وہ منجھ لیا۔ سل فون لیے اور بانیک پر بیٹھ کر دونوں تیزی سے آگے بڑھ گئے۔ دلبر نے جلدی سے پرس کھولے، ان میں جو نقدی تھی وہ جیب میں ڈالی اور پرس واپس پر پھینک دیے۔

ایسے ہی ایک گلی میں انہیں کار جاتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ شاید اسے نظر انداز کر دیے لیکن وہ ایک گھر کے سامنے رک گئی تھی۔ اس میں سے ایک خوش پوش آدمی نکلا تو دلبر نے اسی وقت اسے لوٹنے کا فیصلہ کرتے ہوئے راجا کو رکنے کا کہا۔ وہ اس وقت کار کا دروازہ بند کر رہا تھا، جب دلبر اس کے سر پر جا پہنچا۔ اس نے پستل تانے ہوئے کہا۔
”نکال سب کچھ، ورنہ گولی مار دوں گا۔“

اس شخص نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا پھر کسی مزاحمت کے بغیر اپنے جیب سے پرس نکالا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس کے ہاتھ میں سونے کی انگلی دیکھ کر اس نے اس کی طرف بھی اشارہ کیا۔ خوش پوش آدمی نے وہ بھی اتار کر دے دی۔ اس ساری کارروائی میں دو منٹ سے بھی کم وقت صرف ہوا تھا۔ دونوں بانیک پر بیٹھ کر فرار ہو گئے۔

آدھی رات سے زیادہ کا وقت گزر چکا تھا۔ وہ ایک منجھان آباد علاقے میں جا پہنچے تھے۔ میز می می گلیوں میں سے گزرتے ہوئے ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں چند موٹائی قسم کے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ دلبر نے ان کے پاس رکے کو کہا۔
ان میں سے ایک نے اونچی آواز میں کہا۔
”اودلبر بھائی کی خیر۔“

”یہ مال پکڑا کر پیش دے، مجھے لگتا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے جیب سے چمچیں، انگلی اور سل فون اس کی جانب بڑھا دیے پھر بانیک کی طرف اشارہ کر کے بولا، ”اور یہ بھی۔۔۔۔۔“

پس کیا کرتا ہے، چل آ۔“ اس نے یہ کہتے ہوئے اپنا ہاتھ بڑھایا تو راجا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ دونوں میزوں کی جانب بڑھ گئے۔

وہ سڑک کنارے ایک چھارے والے کے پاس بیٹھے کھانا کھا چکے تھے۔ راجا نے جی بھر کے کھانا کھا یا تھا۔ دلبر نے پیسے دیے تو وہ اٹھ کر چل پڑے۔

”سوڈا پیسے؟“ دلبر نے اس سے پوچھا۔
”پلاؤسے۔“ راجا نے سکون سے کہا تو وہ سامنے ایک کھوکھے والے کے پاس چلا گیا۔ اس سے دو سوڈے کی بوتلیں لیں اور وہیں کھڑے ہو کر پینے لگے۔ سوڈا پی لینے کے بعد راجا کو یوں لگا جیسے پیٹ بھرنے کے بعد اس میں قوت ہی نہیں بلکہ وہ زیادہ اعتماد بھی ہو گیا ہے۔ دونوں سڑک کنارے چلنے لگے۔ تھوڑا آگے جا کر دلبر نے پوچھا۔
”جہاں تک مجھے علم ہے تو بانیک اچھی طرح چلا لیتا ہے۔“

”ہاں، کمپنی نے مجھے دی ہوئی تھی بانیک، باہر کا سارا کام اسی پر کرتا تھا۔ میں تو کار بھی چلا لیتا ہوں۔ کچھ عرصہ صاحب کی ڈرائیوری کی بھی میں نے، اب بھی کوئی۔۔۔۔۔“ راجا کہہ رہا تھا کہ دلبر نے اسے ٹوکتے ہوئے سمجھایا۔
”تو بس، تجھے میرے ساتھ رہنے ہوئے صرف بانیک چلانی ہے۔ اس طرح چلانی ہے کہ ہم پکڑے نہ جا سکیں، چلا لے گا۔“
”چلاؤں گا یار۔“ راجا نے اکتائے ہوئے لیجے میں کہا۔

”چل پھر آج کی رات تیرے نام، دیکھتے ہیں تیری قسمت میں کیا ہے۔“ دلبر نے بے پروائی کے انداز میں کہا اور اسے سمجھانے لگا کہ وہ اس رات گرنا کیا چاہتا ہے۔ راجا اس کی باتیں بڑے غور سے سنتا رہا۔ اب دونوں پوری طرح تیار تھے۔

دلبر اور راجا ایک گلی میں داخل ہوئے۔ ایک گھر کے سامنے بانیک کھڑی تھی۔ دلبر نے راجا کو گلی کے کنارے پر رکنے کا اشارہ کیا اور بڑے اعتماد سے اس بانیک کے پاس جا پہنچا۔ اس نے ایک منٹ سے بھی کم وقت میں پہلے جھکا دے کر پیٹرول لاک توڑا، پھر تاروں سے جھپٹ جھکا کر کے بانیک اسٹارٹ کر لی۔ اگلے منٹ میں وہ بانیک لے کر راجا کے پاس پہنچ گیا پھر سیٹ پر بیچھے ہوتے ہوئے بولا۔
”چل چلا رہے۔“

راجا نے بانیک تھامی اور اگلے چند لمحوں میں بانیک

اس موالی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں سارے مال کا اندازہ لگایا، پھر جیب سے درمیانے نوٹوں کی دو گڈیاں نکال کر اس کی جانب اچھال دیں۔ دلبر انہیں بچ کرتے ہوئے کہا۔

”بھائی، ایک اور دو، کچھ ضرورت ہے۔“

”اور لے لے میری جان۔“ اس نے کہا اور ایک گڈی نکال کر اس کی جانب اچھال دی۔ اس نے بانٹک دیں چھوڑی اور ہاتھ ہلاتا ہوا واپس چل پڑا۔ کچھ دور جا کر اس نے راجا سے کہا۔

”لے یہ سب تیرا ہے۔ کل فلیٹ کا کرایہ مٹی کے منہ پر دے مارنا اور پورا مہینہ سکون سے گزار، پھر دیکھتے ہیں کیا کرتا ہے۔“

”یار یہ تو.....“ راجا نے کہنا چاہا تو دلبر ہنسنے ہوئے بولا۔

”ابھی تو کچھ بھی نہیں ہے، آگے دیکھنا۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک آنور کسے کو کسے کا اشارہ کر دیا۔

☆☆☆

یہ پیسے کی طاقت تھی یا بھرے ہوئے پیٹ کا اعتماد، راجا کے فلیٹ میں بہت ساری چیزیں نئی آئیں۔ آسودگی نصیب ہوئی تو اس کا دماغ بھی کام کرنے لگا تھا تین ماہ کے اندر اندر راجا پوری طرح بدل گیا۔ اس میں اعتماد آ گیا تھا۔ ان تین ماہ میں صرف ایک بار مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ انہوں نے دو لڑکوں کو گھیر لیا تھا لیکن انہیں پتا نہیں تھا کہ وہ بھی ان سے اُلجھ پڑیں گے۔ جب دلبر نے دیکھا کہ وہ لوگ پیچھے ہٹنے والے نہیں ہیں تو اس نے گولی چلا دی۔ وہ ایک مزاحمت کرنے والے لڑکے کو لگی۔ وہ سڑک پر گر گیا تو دوسرا بھاگ کھڑا ہوا۔ راجا کے اندر جو تھوڑا بہت خوف تھا، وہ بھی جاتا رہا۔

راجا نے اپنی کمپنی میں جا کر شور مچا دیا کہ اس سے اب تک اتنے پیسے کیوں وصول کیے گئے ہیں؟ وہاں لوگ حیران تھے کہ جو بھی بولا نہیں تھا، دب کر رہنے والا تھا اب اتنا شور کیوں مچا رہا ہے۔ اب نوکری تو اس نے کرنا نہیں تھی، وہ کسی سے کیوں ڈرتا۔ اس کے پیچھے دلبر کی برین واشنگ اور لوگوں کو لوٹنے کا حوصلہ بھی تھا۔ اس کو باقی پیسے تو کیا دینے تھے، اپنے پیسوں کی واپسی کا مطالبہ کر دیا۔ وہ وہاں لوگوں کے خلاف بولنے لگا۔ بہت مشکل سے دسے دلا کر اسے خاموش کروایا گیا۔ اس سے راجا کا حوصلہ مزید بڑھ گیا کہ یہ دنیا اسے خوب دیاتی ہے جو دب جاتا ہے، جو ڈٹ جاتا ہے، پھر

یہ دنیا اس کے سامنے دب جاتی ہے۔

وہ اور دلبر دونوں ہی ہفتے میں کسی ایک بار اور کبھی دو بار رات کے وقت نکلنے اور اپنے ڈکار سے جھین جھٹ کر واپس اسی علاقے میں جاتے جہاں سب بچ کر کیش اٹھاتے تھے۔ واپسی پر آدھا آدھا کرتے اور اپنے اپنے گھر ہو لیتے۔ ان تین مہینوں میں راجا نے بانٹک چوری کرنا اور بے عمل چلانا بھی اچھی طرح سیکھ لیا تھا۔ وہ جب بھی کسی سے کچھ چھینتا تو یہی سمجھ کر کہ وہ اپنا حق وصول کر رہا ہے۔ اس کے من سے یہ خوف جاتا رہا کہ وہ رہ بھی سکتا ہے۔ مرنے کا خوف اس نے اسی رات بلڈنگ کی چھت پر چھوڑ دیا تھا جس رات دلبر اسے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

ایک رات وہ اپنے دھندلے کے لیے بانٹک چُرا کے نکلے ہی تھے کہ راجا کا دماغ بھر گیا۔ اس نے دلبر سے کہا۔

”یار آج جہاں میں کہوں اُدھر جانا ہے۔“

”کہاں جانا ہے، خیر تو ہے؟“ دلبر نے حیرت سے پوچھا۔

”یہ جو ہماری اس بلڈنگ کا مٹی ہے نا، آج اسے سبق سکھانا ہے۔“ وہ سرد سے لہجے میں بولا۔

”کیا مطلب.....؟“ دلبر نے حیرت سے پوچھا۔

”اس بے غیرت نے آج پھر بلڈنگ میں آکر خالہ زینت کو بے عزت کیا ہے۔ اس بے چاری بوہ کے پاس کہاں.....“ یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔ دلبر بھی اس

شام ہونے والے واقعے سے واقف تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ دونوں سیدھے وہاں پہنچے جہاں مٹی کا آفس تھا۔ آفس کے بالکل قریب بچ کر دلبر نے سمجھانا چاہا۔

”وہ ہمیں پچھتاہے یا، بالکل بلڈنگ میں آکر.....“

”تم ایسا کرو، بیٹھی اتر جاؤ۔ مجھے آج اس کے ساتھ کچھ نہ کچھ کرنا ہے۔“ راجا نے بانٹک روک کر عجیب سرد لہجے میں کہا۔

”پاگل ہو گیا ہے کیا؟“ دلبر نے اس کی حالت کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

”بس تم مجھے پاگل ہی سمجھو۔“ اس نے تیزی سے کہا۔

”چل پھر جو کرنا ہے کر۔“ دلبر نے راجا کو ٹھوکا دیتے ہوئے کہا۔

راجا نے بانٹک بڑھا دی تھی۔ وہ مٹی کے آفس کے سامنے آرکے۔ انہوں نے بانٹک کھڑکی کی اور اندر کی جانب بڑھے۔ مٹی میز کے پار بیٹھا آج کی ساری رقم من رہا تھا۔ وہ غنڈا جس نے راجا کو تار تھا، وہ ساتھ میں کھڑا تھا۔ راجا نے

”ارے یار تمہیں کیا پتا، وہاں کس کیل کی عیاشی ہوتی ہے۔ ہم جیسے تو دو دن بھی نہیں نکال سکتے وہاں پر۔“ اس نے مزہ لیتے ہوئے کہا۔

”جب دو دن نہیں نکال سکتے تو بھر سونے کی وجہ؟“ راجا نے ہنستے ہوئے پوچھا تو دلبر نے چونک کر کہا۔

”یار ایسے ہی ایک بات ہے اگر کبھی یہاں سے بھاگنا پڑ گیا تو کیا کریں گے؟“

”تیرے کہنے کا مقصد کیا ہے؟“

”یار ایک بار محکوم کر آئیں۔“ اس نے حسرت سے کہا۔

”اس کے لیے پاسپورٹ بنانا پڑتا ہے پھر اس پر ویزا لگتا ہے۔ تب جاتے ہیں لوگ۔“ راجا نے سمجھایا۔

”تو بخوا لیتے ہیں۔ چل کل ہی نکلتے ہیں، پاسپورٹ تو بنوا سکیں، پھر کل چلیں گے۔“ دلبر نے جوش سے کہا۔

اگلے دن دلبر صبح ہی صبح آگیا اور اسے لے کر پاسپورٹ آفس چلا گیا۔

ان کے دن یونہی گزرتے چلے جا رہے تھے۔ ایک رات وہ کافی دیر بعد وہاں اپنی بلڈنگ تک پہنچے تھے۔ وہ

دونوں بہت خوش تھے۔ اس رات لبا ہاتھ پڑا تھا۔ جس وقت وہ رقم آدمی آدمی کر کے تو کبھی خیال تھا اس بٹنے میں وہ دوبارہ

نہیں نکلیں گے۔ وہ بلڈنگ کے سامنے رکے تھے کہ ان کے ساتھ ہی ایک آنر کشا آن رکا، اس میں سے روزی باہر

نکلی۔ اسے دیکھ کر دلبر کا منہ بن گیا۔ روزی کے بارے میں کبھی کا بھی خیال تھا کہ وہ کال گرل ہے۔ لیکن اس نے

بلڈنگ کے کسی کڑے کولفٹ نہیں کرا دی تھی۔ کوئی لڑکا بھی اس کے ساتھ اپنے تعلق کا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ مغرور تھی پاکی

کو منہ نہیں لگاتی تھی، جو بھی تھا، وہ کسی بھی لڑکے کو نزدیک نہیں آنے دیتی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ ایک خوش

حقل اور حسین لڑکی تھی۔ یوٹا ساق، بھرا بھرا بدن، جس پر وہ کسا ہوا لباس پہنتی تھی۔ اس وقت روزی نے کسی ہوئی نہیں

کے ساتھ چوڑی دار پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ اس کے سیاہ دراز گیسو ہلکے ہلکے لہرا رہے تھے۔ راجا نے جب بھی روزی کو

دیکھا تھا، اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اسے خوار آلودگی محسوس کی جیسے وہ کوئی نشہ کرنے کی عادی ہو۔ اس میں کوئی شک

نہیں تھا وہ راجا کو بہت اچھی لگتی تھی۔ کبھی بھی اس کے من میں یہ خیال آتا تھا کہ روزی اس کی دوست بن جائے لیکن اپنی

اوقات دیکھ کر خاموش ہو جاتا تھا۔ وہ تو اسے کسی اچھے ریسٹوران میں ایک وقت کا کھانا بھی نہیں کھلا سکتا تھا اس لیے

ریستوران میں ایک وقت کا کھانا بھی نہیں کھلا سکتا تھا اس لیے

بے مل ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ انہیں یوں آفس میں داخل ہوتا دیکھ کر وہ غنڈا آگے بڑھا اور سختی سے بولا۔

”کیا بات ہے، یوں کیسے گھٹتے چلے آ رہے ہو؟“

”دروازہ کھلا تھا، ہم اندر آ گئے۔“ دلبر نے کہا۔

”چل، بول بات کیا ہے؟“ غنڈے نے پوچھا۔

”نشی سے کام ہے۔“ راجا نے کہا۔

”مجھے سے کیا کام آن پڑا تجھے؟“ نشی نے آتے ہوئے انداز میں کہا ہی تھا کہ راجا آگے بڑھا اور اس نے نشی

کو گریبان سے پکڑ کر میز پر ٹھیک لیا۔ اتنے میں وہ غنڈا آگے بڑھا۔ اس غنڈے پر اس نے دو گولیاں چلائیں وہ

وہیں ڈیر ہو گیا۔ تیسری گولی اس نے نشی کے سر پر رکھ کر چلا دی۔ اتنی دیر میں دلبر نے میز کے ساتھ پڑا ہوا بیگ کھولا،

اس میں نوٹ بھرے ہوئے تھے۔ وہ اس نے اٹھا یا اور واپس بائیک تک آ گیا۔ جب تک سڑک پر کسی کو سمجھ آتی، وہ

واپس بائیک پر بیٹھ چکے تھے۔ اول تو کوئی اتنی جلدی رکتا نہیں تھا، اگر کوئی رکتا بھی تو خود کو موت کے منہ میں ڈسنے کی

بات تھی۔ وہ دونوں اپنی کارروائی کر کے وہاں سے نکل گئے۔

جتنا انہوں نے اب تک لوگوں سے چھینا تھا، اس سے کہیں زیادہ رقم ان کے ہاتھ لگ گئی تھی۔ دلبر بلاشبہ ایک

اسٹریٹ فائٹر لیکن راجا کا حوصلہ بڑھ گیا تھا۔ اس نے اپنی ساری نفرت کا اظہار گولی سے کرتا سیکھ لیا تھا۔

☆☆☆

راجا اور دلبر کی زندگی ایک نئی منج پر چل نکلی تھی۔ وہ دونوں اپنی آنے والی زندگی کے بارے میں گمنوں بیٹھے

باتیں کرتے رہتے۔ کئی پلان بننے مگر کسی پر عمل نہیں ہوتا تھا۔ وہ اپنا معیار زندگی بھی بلند نہیں کر سکتے تھے۔ اگر وہ اپنے پیسے

کا کھلا استعمال کرتے تو بلڈنگ والوں کی نگاہ میں آ جاتے۔ وہ یہ بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ اس علاقے کے بڑے بڑے

جرائم پیشہ انہیں نظر انداز کر رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ بھی سمجھ رہے ہوں کہ چھوٹی سوئی واردات کر کے ہمارا پیٹ پال

رہے ہیں۔ جس دن انہیں یہ احساس ہو گیا کہ یہ دونوں بھی رقم لوٹ رہے ہیں تو وہ اپنا حصر ضرور وصول کریں گے۔ ایسے ہی

کبھی حقیقی اور کبھی خیالی پلاؤنگا تے ان کا وقت گزر رہا تھا۔ ایک دن دلبر نے اس سے کہا۔

”یار میرا بڑا دل کرتا ہے کہ میں دینی کا چکر لگا کے آؤں؟“

”کیا کرنے جانا ہے تو نے وہاں؟“ راجا نے پوچھا۔

اوقات؟“

”اوہ، مطلب تم لوگ بھی.....“ روزی نے یہ کہتے ہوئے قہقہہ لگایا، پھر دانت پیستے ہوئے بولی، ”سنو، میں کال کر لیں ہوں بلکہ تیرے جیسے پرس جیسے والے غنڈوں کی بھی باپ ہوں۔“ یقین نہیں آتا تو آجا میرے گھریا پھر میں آ رہی ہوں راجا کے قلیٹ میں۔“

یہ کہہ کر وہ چند لمحوں میں دوڑ کر رسی پھر تیزی سے سیزیاں چڑھتی چلی گئی۔ وہ دونوں وہیں کھڑے ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

وہ تو یہی سمجھتے تھے کہ یہاں بلڈنگ میں تو کیا اور درمی کسی کو معلوم نہیں ہے کہ وہ کیا کرتے ہیں۔ لیکن یہ جو روزی اشارہ دے گئی، اسے کیسے پتا؟ اس کی باتوں سے تو یہی لگتا تھا کہ وہ بھی انہی کی لائن کی ہے۔ یہی سوچتے ہوئے وہ اوپر آگئے۔ راجا نے چابی کی ہول میں ڈال کر دروازہ کھولا چاہا تو دروازہ کھلتا چلا گیا۔ اس نے حیرت سے دلبر کی طرف دیکھا۔ ایسے میں اندر سے آواز آئی۔

”آ جاؤ، میں تم دونوں سے پہلے پہنچ گئی ہوں۔“ بلاشبہ روزی کی آواز تھی۔ راجا نے اندر داخل ہو کر لائٹ آن کی تو روزی سامنے والے صوفے پر بیٹھی تھی۔ وہ فریج میں سے سوڈا نکال کر بڑے آرام سے پی رہی تھی۔ ”تم اس طرح میرے گھر میں کیسے.....“ راجا نے پوچھا تو روزی نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔

”فصلوں باتیں نہیں کرو، سامنے بیٹھو، تم میں دونوں کی اوقات بتاؤں پھر میں بتاتی ہوں کہ میں کون ہوں؟“ وہ دونوں بیٹھ گئے۔ دلبر کے چہرے پر دبا دبا غصہ تھا، جبکہ راجا سمجھ گیا تھا کہ جس حوصلے سے وہ اس کے قلیٹ میں موجود تھی، اس کی کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوگی۔ وہ دونوں اطمینان سے بیٹھ گئے تو راجا نے کہا۔

”ہاں بول ہمارے بارے میں کیا جانتی ہے؟“ ”ممکی کہ بائیک چراتے ہو، لوگوں سے پرس اور چیزیں جیسے ہو اور چور بازار میں بچ آتے ہو، یہ ہے تم دونوں کی اوقات، ایسا ہی ہے؟“

”تمہیں کس نے.....“ دلبر نے کہنا چاہا تو وہ بولی۔ ”فصلوں سوال مت کرو، اور ہاں یہ جو تم مجھے کال کر لیتے ہو، تم اکیلے ہی نہیں، بہت سارے لوگ یہی سمجھتے ہیں۔ مجھے ان پر کوئی غصہ نہیں۔ یہ بے جا رہے محبتوں کے مارے ہوئے اپنی بھڑاس نکال رہی ہیں تو مجھے کچھ نہیں ہونے والا، لیکن تم جیسے اسٹریٹ کریمٹل مجھ سے اس لہجے میں بات

کبھی کوشش نہیں کی تھی۔ آج عرصے بعد وہ اس کے سامنے آئی تھی۔ ان کی ٹیکسی تو کب کی چلی گئی تھی۔ روزی نے رکشے والے کو پیسے دیے تو وہ بھی چلا گیا۔ اب سڑک کنارے وہ تینوں کھڑے تھے۔ روزی نے ان دونوں کو بڑے غور سے دیکھا، چند لمحوں کے بعد وہ ہلکے سے مسکرا کر بولی۔

”ہیلو، کیسے ہو تم دونوں؟“

”ارے جا، کام کر اپنا۔“ دلبر نے نفرت سے کہا اور بلڈنگ کی جانب قدم بڑھا دیے۔ راجا بھی اس کے ساتھ چل پڑا تو روزی بھی ان کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے بڑھتا رہنے کے بجائے خوش دلی سے پوچھا۔

”اوئے ہوئے، اتنا غصہ، کا ہے کو؟“

”دماغ خراب نہ کر، جا پتار استہ ناپ۔“ دلبر نے پھر نفرت اور حقارت سے بھرے لہجے میں جواب دیا۔ ”نہیں، یہ تو اب تمہیں بتانا ہی پڑے گا کہ مجھ سے اتنی نفرت کیوں ہے، اتنا حقارت بھرا لہجہ، کچھ تو ہے.....“ اس بار روزی نے اکھڑ لہجے میں پوچھا تو راجا نے مصالحتہ انداز میں کہا۔

”دیکھ روزی ہمیں اُلجھنا نہیں، رات بہت ہو گئی ہمیں.....“

”دیکھ دلبر، ہم تینوں ہی اس بلڈنگ میں پلے بڑھے ہیں۔ تم شاید میرے بارے میں اتنا نہیں جانتے جتنا میں تم دونوں کے بارے میں جانتی ہوں۔ تم ایک بار مجھے میرے بارے میں کچھ کہو تو میں تمہیں بتا دوں گی تمہاری اوقات کیا ہے۔“ اس نے کافی حد تک غصے میں کہا۔ وہ تینوں بلڈنگ کی سیزیاں تک آگئے تھے۔

”میری جو بھی اوقات ہے تجھ سے بہتر ہے سمجھی۔ میرے منہ مت لگ۔“ دلبر نے بھٹکا کر کہا تو روزی سکون سے بولی۔

”اگر ہمت ہے تو دلبر تو بس ایک بار بول دے میری اوقات کیا ہے، پھر دیکھ میں تیری اوقات کیا بتاتی ہوں۔“ روزی بھی تو پر آگئی۔

”اے روزی، تو خواہ مخواہ میرے منہ لگ رہی ہے، آج تیرے کسی یار نے تجھے زیادہ پلا دی ہے کیا؟“ دلبر نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔

”تو مجھے سمجھتا کیا ہے؟“ اس نے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا تو دلبر نے گھوم کر انتہائی غصے میں کہا۔

”میں تجھے کال کر لیتا ہوں، اب بول، بتا میری

محسوس کی تھی جو پہلے کبھی کسی لڑکی میں اس نے محسوس نہیں کی تھی۔ روزی لگتی تھی ایسے کبھی جیسے اس کے بدن کا ہر عضو اپنی نمائش کو چننا ہو۔ اسے ہلکے محسوس ہوئی تو وہ اٹھ کر کچھ کھانے کے بارے میں سوچنے لگا تاکہ اس کا میل فون بج اٹھا۔ اسکرین پر اجنبی نمبر تھے۔ اس نے کال ریسیو کر کے بڑے محتاط انداز میں ہیلو کہا تو دوسری جانب روزی کی چہکتی ہوئی آواز سنائی دی۔

”اوئے ابھی تک سو رہے ہو کیا؟“

”نہیں جاگ رہا ہوں، بس تیرے ہی خیالوں میں گم ہوں۔“ اس نے بھی ہمت کر کے کہہ دیا۔

”لگتا ہے تیرا حال بھی دلبر کی طرح ہونے والا ہے، چل تیار ہے میرے ساتھ جانے کے لیے؟“ اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”ہم تو تیرے ہو گئے ہیں جانم، جہاں کو وہیں چلتے ہیں، انکار وہ بھی تجھے، اب یہ ہم سے نہیں ہو سکے گا۔“ اس نے جذبہ باتی پن سے کہا۔

”اے، تمہرے کلاس عاشقوں کی طرح مت بول، یہ بتا چتا ہے کہ نہیں؟“

”میں تیار ہوں تو کھم تو کر۔“ اس نے تیزی سے کہا۔

”رنگ لگتا ہے وہ تیرا دلبر نہیں جانے والا۔ فون بند کر کے گھر سے بھی غائب ہے۔ میں نے ابھی پتا کیا ہے۔“ اس نے طنز سے لہجہ میں کہا۔

”میں جو ہوں۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

”چل پھر، اچھے سے پکڑے پکین کے تیار ہو جا، آدھے گھنٹے بعد میں تیرا نیچے انتظار کر رہی ہوں۔“ اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

وہ تیار ہو کر بیٹھ پہنچا تو روزی بھی پہلے گلابی رنگ کا قیمتی لباس پہنے کھڑی تھی۔ اس نے جھٹکے گا گھڑ لگائے ہوئے تھے۔ نیلی نگاہ میں یہی لگتا تھا جیسے وہ کسی بہت امیر کبیر گھرانے کی لڑکی ہے۔ روزی اسے دیکھتے ہی چل پڑی۔ وہ بھی اس کے پیچھے ہو گیا۔ بلڈنگ کے احاطے سے نکل کر وہ سڑک پر آ گئے۔ وہ چند قدم ہی چلے تھے کہ ایک کار روزی کے پاس آ کر رک گئی۔ اس نے راجا کو اشارہ کیا اور کار میں بیٹھ گئی۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے سفر کے بعد وہ شہر کے سب سے بڑے شاؤپنگ مال میں آ گئے۔ انہوں نے کار باہر سڑک پر ہی چھوڑ دی تھی۔ جیسے ہی وہ اندر آئے تو روزی نے راجا کی طرف دیکھتے ہوئے۔

”آ، پہلے کچھ کھانی لیتے ہیں۔“

کریں، یہ میں برداشت نہیں کر سکتی۔“

”تو کیا ہے تو بول؟“ دلبر نے طنز سے لہجہ میں پوچھا۔

”کہا نا کہ میں تم جیسے لوگوں کی بھی باپ ہوں۔ سنو، جو تم دو مہینے میں بھی نہیں کما سکتے نا، وہ میں چند گھنٹوں میں کما لیتی ہوں۔“ روزی نے حقارت سے کہا تو دلبر ایک دم سے قہقہہ لگا کر ہنس دیا پھر بولا۔

”اور اتنا کمانے والی ہم جیسے کیڑے کوڑوں کے ساتھ اسی بلڈنگ میں رہ رہی ہے۔ کیا بات ہے روزی، اتنی مت چھوڑ۔“

روزی اُسے بڑے اطمینان سے دیکھتی رہی، پھر سوڑے کا بڑا سا سب لے کر سٹرائٹ ہوئے بولی۔

”اب میں تجھے سب کچھ تو نہیں بتا سکتی۔ اگر تو دیکھنا ہی چاہتا ہے تو کل چلنا میرے ساتھ۔ پھر خود ہی اندازہ لگا لیتا۔“

”چل شیک ہے، وہ تو چلے جائیں گے، اب تو کل یہاں سے، ہم دو مرد اور تو ایک اکیلی لڑکی، کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“ دلبر نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا تو روزی بڑے سکون سے بولی۔

”دلبر، اگر تو مجھے ہاتھ لگا کر دکھا دے نا تو جو کہے گا کروں گی، لیکن اگر مجھے ہاتھ نہ لگا سکا تو جو میں کہوں گی وہ کرے گا؟“ یہ کہتے ہوئے اس نے اسکرٹ کے نیچے سے پائل نکال لیا۔ دلبر ساکت ہو کر کھڑا رہا۔ وہ چند لمحے وہیں کھڑی رہی پھر وہ دروازے کی جانب بڑھی اور نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، بھی راجا زور سے ہنس دیا۔ پھر بولا۔

”یہ بھی کوئی اونچی شے ہی لگتی ہے۔“

”ہاں ہے تو، چل لکھا ہوں۔“ دلبر فحش سا قلیت سے چلا گیا۔ راجا دروازہ بند کر کے جب واپس بیڈ پر آ کر لیٹا تو اسے روزی کے بدن کے ایک ایک ٹم یاد آنے لگے۔ پتلی کمر، لمبی گردن، سیاہ بال۔ پھر وہ نیند کی داوی میں اتر گیا۔

☆☆☆

اگرچہ راجا داد پھر ہی کے وقت بیدار ہو گیا تھا لیکن سسٹنڈی سے بستر پر ہی پڑا رہا۔ سامنے ہی وی چل رہا تھا لیکن روزی اس کی آنکھوں سے ہٹ ہی نہیں رہی تھی۔ پہلی بار کسی لڑکی نے یوں اسے اپنی جانب متوجہ کر لیا تھا کہ وہ اس کے خیالوں سے باہر نہیں آ رہا تھا۔ بات یہ نہیں تھی کہ اس نے کبھی کوئی لڑکی دیکھی نہیں تھی یا پھر کوئی لڑکی اس کی طرف متوجہ نہیں ہوئی تھی۔ اصل میں اس نے روزی میں ایسی کشش

فحش فوراً ہی وہاں سے ہٹ گیا اور کچھ دیر بعد اس کے سامنے وہی سیٹ لاکے رکھ دیا گیا۔

”یہ لیس جی، سو فیصد سبکی ہے۔“

وہ فور سے دیکھتی رہی، پھر اس تصویر سے ملا کر اطمینان کر کے پوچھا۔ ”کیا قیمت ہے اس کی؟“

”جی صرف تیس لاکھ روپے۔“ کاؤنٹر والے نے کہا تو روزنی کے چہرے پر چند لمحے سکوت آ گیا، وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر چند لمحے بعد بولی۔

”میں ڈر ایک کال کر لوں۔“

یہ کہہ کر وہ اپنے سل فون سے کال کرنے لگی۔ یہ محض ایک ڈراما تھا۔ وہ چند منٹ باتیں کرتی رہی پھر واپس کاؤنٹر تک آ کر بولی۔

”پیک کر دیں۔ اگر ہو سکے تو اس کی قیمت دوبارہ دیکھ لیں۔“

”جی میڈم۔“ کاؤنٹر والے نے کہا۔ اگلے پندرہ منٹ میں اس نے وہ سیٹ پیک کر کے اس کے سامنے رکھ دیا۔ ساتھ میں رسید رکھتے ہوئے بولا۔

”جی ہم نے آپ کو ایک پریسٹنٹ ڈسکاؤنٹ دے دیا ہے۔“

روزنی نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ بیگ سے کارڈ نکال کر بولی۔ ”یہ لیں۔“

کاؤنٹر والے نے کارڈ لیا، اسے مشین سے لگایا، اگلے چند لمحوں میں مشین نے بتا دیا کہ مطلوبہ رقم موجود ہے، وہ منہا ہو گئی۔ کاؤنٹر والے نے شک یہ کہ ساتھ کارڈ واپس کیا تو روزنی نے راجا کو اشارہ کیا کہ سیٹ اٹھا لے۔ جیسے ہی راجا نے سیٹ اٹھایا، روزنی نے کہا۔

”اب چلیں۔“

یہ وہ اشارہ تھا کہ اب شاپنگ مال میں نہیں رہتا۔ راجا نے اعتماد کے ساتھ وہ سیٹ اٹھایا اور اسے لینا ہوا شوروم سے باہر آ گیا۔ روزنی بڑے آرام سے کچھ دوسرے زیورات کو دیکھنے ہوئے شاپ سے نکلے گی۔ راجا نے جیسے مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ اطمینان سے چلتا ہوا اس دروازے تک آ گیا جہاں سے باہر نکل کر سڑک پر آ جاتا تھا۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں سے نکلنا مشکل تھا۔ اگر وہ یہاں سے پکڑا جاتا تو کوئی برس تک جیل کے اندر ہو سکتا تھا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ روزنی نے کیا کیا ہے۔ اس نے بڑے طریقے سے راجا کو استعمال کیا تھا۔ راجا نے ایک طویل سانس لی اور آگے بڑھ گیا۔ دروازے کے دونوں جانب گاڑ زکھڑے تھے۔ وہ ان کے درمیان سے نکلتا ہوا

وہ دونوں ایک عالمی برانڈ کے کھانے پینے والی شاپ پر آ گئے۔ وہاں سے کھانا لے کر وہ ایک جانب تنہائی میں جا بیٹھے۔ کھانا کھاتے ہوئے اچانک روزنی نے کہا۔

”راجا، مجھے جو ہاتھ مارنا ہے، وہ ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں ہوگا، اور اس گیم میں صرف دو چیزیں چاہئیں، ایک بہت زیادہ اعتماد اور دوسرا انتہائی پھرتی۔ جیسے ہی میں تجھے چلنے کے لیے کہوں، اسی لمحے کم سے کم وقت اس شاپنگ مال سے باہر نکلنا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”تیزی کا مطلب یہ نہیں کہ تو بھاگتے ہوئے نکلے، ایسے نہیں بلکہ اس قدر اعتماد کے ساتھ کہ کسی کو شک نہ ہو۔“

روزنی نے اسے سمجھایا۔

”اوکے ہو گیا۔“ اس نے کہا۔

”باہر نکلتے ہی، تجھے وہی کارڈ والا دکھائی دے گا، جو ہمیں یہاں چھوڑ گیا ہے۔ میرا انتظار کیے بغیر تجھے اس کے ساتھ بیٹھ کر نکل جانا ہے۔ اس کے بعد مجھے فون کرنا۔“ اس نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”ایسا ہی ہوگا۔“

”چل اب کھانا کھا، پھر نکلتے ہیں۔“ روزنی نے کہا اور کھانے کی طرف متوجہ ہو گئی۔

تقریباً ایک گھنٹہ بعد وہ شاپنگ مال کے اس حصے میں جا پہنچے، جہاں زیورات کی شاپ تھی۔ روزنی بڑے سکون سے راجا کے ساتھ باتیں کرتی ہوئی ایک شاپ کے سامنے رک گئی۔ اس نے شاپ کا نام بڑھ کر یوں اطمینان کیا کہ اندر بھی پتا چل جائے کہ وہ تلاش کرتی ہوئی یہاں پہنچی ہے۔ یہاں پر روزنی کا اعتماد اپنے عروج پر تھا۔ وہ یوں دکھائی دے رہی تھی جیسے ایسے شوروم اس کے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتے ہوں۔ وہ کاؤنٹر پر کھڑے ایک فحش کے سامنے جا کر کی تو اس نے پوچھا۔

”جی میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”مٹھریں ابھی۔“ اس نے آگے بڑھے ہوئے انداز میں کہا اور اپنے برس میں سے سل فون نکالا، اس کے ساتھ چند لمحے لگی رہی پھر ایک تصویر نکال کر اس کے سامنے کرتے ہوئے بولی۔ ”اس ڈیزائن کا سیٹ آپ کے پاس ہے یا نہیں؟“ یہ کہتے ہوئے اس نے فون اس شخص کو دکھایا۔ اس نے چند لمحے تصویر کو غور سے دیکھا پھر خوشگوار لہجہ میں بولا۔

”جی، بالکل ایسا ہی سیٹ ہمارے پاس ہے۔“

”دکھائیں ذرا۔“ اس نے اعتماد سے کہا تو کاؤنٹر والا

”جنتا عرصہ بھی ہو گیا اسے چھوڑ، میں یہ دھند اب ختم کر رہی ہوں، اس میں رسک بڑھ گیا ہے۔ میں اب بڑا تھ مارنا چاہ رہی ہوں۔“

”اب اس سے بھی بڑا کیا تھ مارنا ہے؟“ راجا نے پوچھا

”ابھی میں نے بتایا تو بھی تیری سمجھ میں نہیں آیا، بعد میں بتاتی ہوں۔ اب یہ یاد رکھ، میرے ساتھ رہے گا تو عیش کرے گا۔“ روزی نے اپنی خوار آلود نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے لبوں پر بڑی قاتلانہ مسکراہٹ تھی۔ یہی مسکراہٹ راجا کو مار چالی تھی۔

”وہ وقت کب آئے گا۔“ راجا نے پرسکون لہجے میں پوچھا۔

”بہت جلد، ابھی تو ہم نے آج کی رقم وصول کرنی ہے۔ پھر کم از کم ایک ہفتہ باہر نہیں لگنا۔ اس کے بعد ہوگا، جو بھی ہوتا ہے۔“ اس نے کہا اور سیل فون کی طرف متوجہ ہو گئی۔ وہاں میسج آ گیا تھا۔ وہ پڑھنے کے بعد بولی، ”لو بھی رقم آگئی۔ آجھے دوں پھر نکلتے ہیں۔“

یہ کہہ کر وہ اٹھی تو راجا بھی اس کے ساتھ اٹھ گیا۔

☆☆☆

راجا کو ایک دم سے پانچ لاکھ کی رقم ملی تو اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اتنی بڑی رقم کا کیا کرے۔ اسے روزی پر رشک آ رہا تھا کہ وہ لڑکی ہوتے ہوئے بھی اتنا مارتی ہے۔ کاش وہ بھی پڑھا لکھا ہوتا، اسے بھی سمجھ ہوتی تو وہ بھی آگے نکل چکا ہوتا۔ اب اس کے پاس حوصلہ اور اعتماد تھا لیکن کرنے کیا، یہ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ دودن اپنے فلیٹ ہی میں پڑا رہا تھا۔ بس کھانے لیا اور سو رہا۔ اس دوران میں دلبر بھی نہ جانے کہاں غائب تھا۔ اس سے کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا۔ پانچ لاکھ کی رقم اس کے بیڑے کے نیچے ویسے کی ویسے ہی دھری تھی۔ دوسرے دن کی دوپہر وہ فلیٹ کی کھڑکی سے باہر جھانک رہا تھا کہ اس کا سیل فون بول اٹھا۔ اسکرین پر روزی کا نمبر تھا۔

”ہاں بول روزی؟“

”اچھا ایسا ہے کہ ہم ایک دودن کے لیے نکل رہے ہیں، رہیں اسے شہر میں، جو تلے گا میرے ساتھ؟“

”اوکے، کب جانا ہے؟“ راجا نے پوچھا۔

”ابھی نکلتے ہیں، تو تیار ہو کر آ جا نیچے۔“ روزی نے پیار سے کہا۔

”آدھے گھنٹے تک آ رہا ہوں۔“ اس نے کہا تو روزی

باہر سڑک پر آ گیا۔

سانے غی سڑک کے پار وہی کار والا اپنی کار کے ساتھ کھڑا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ راجا بڑے آرام سے چلتا ہوا اس کے پاس جا بیٹھا۔ اسی لمحے روزی بھی شاپنگ مال کے دروازے پر نمودار ہوئی۔ وہ بھی کار میں آ بیٹھی۔

ان کی کار سڑک پر بھاگتی جا رہی تھی۔ ایک خاص اسٹاپ پر کار روک گئی تو روزی نے راجا کو اترنے کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں اتر گئے، سونے کا سیٹ پچھلی نشست پر پڑا رہا اور کار چل دی۔

”وہ سیٹ.....“ راجا نے کہنا چاہا تو روزی نے جلدی سے کہا۔

”جانے دو، چل کہیں وقت گزارنے چلیں۔“

وہ ساحل سمندر پر آ گئے۔ وہیں ساتھ میں بنے پارک میں جب وہ آئے سانسے بیٹھ گئے تو راجا نے خاموشی توڑی۔

”یہ سب کیا تھا روزی؟“

”سن، میں تجھے سمجھاتی ہوں۔ میں ایک بیکر ہوں، کیپیوٹر بیکر۔ جس طرح کہیں بھی کسی کی منڈی لگتی ہے، بیکرز کی دنیا میں کریڈٹ اور ڈیٹ کارڈز کی بھی منڈی لگتی ہے۔ کسی کو کچھ پتا نہیں ہوتا کہ کس کارڈ میں کتنی رقم ہے، ڈالر ہیں، پاؤنڈز ہیں پورو ہیں کیا ہیں؟ بس کارڈ کے بارے میں ساری معلومات مل جاتی ہیں۔ میں بھی ایسے کارڈ خرید لیتی ہوں، پھر ان کارڈز کے پیچھے جا کر پتا کرتی ہوں کہ یہ کس کا ہے؟ کتنی رقم والا ہے، کون سی کرنسی ہے۔ یہ ساری معلومات لے کر میں یہاں پر موجود ایک گینگ کے کارڈ بخواتی ہوں، وہ بالکل اصل کے مانند بن جاتا ہے۔ اس سے میں خریداری کر لیتی ہوں۔ ویری سہل۔“ اس نے گاندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

”لیکن جیسے ہی کارڈ سے کوئی ہوتی ہے، اس کے سیل فون پر میسج چلا جاتا ہے، وہ اسی وقت.....“ راجا نے سمجھنا چاہا تو روزی تیزی سے بولی۔

”بس یہی خیال رکھنا پڑتا ہے۔ یہی رسک ہے اسی لیے کہنا کہ جلدی لگنا ہے۔“

”اب جو نیس لاکھ کا مال چلا گیا، اس میں تیرا کتنا ہے؟“ راجا نے پوچھا۔

”پندرہ لاکھ، ادواب صرف دس لاکھ، پانچ لاکھ تیرے ہیں۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا تو راجا حیران رہ گیا۔

”کب سے کر رہی ہے یہ کام؟“ اس نے پوچھا۔

نے فون بند کر دیا۔

ہے۔ پھر وہ شہر تک پہنچا دیتا ہے۔ پچھلے تین برس سے یہ کام کر رہے ہیں۔ انہیں آج تک کوئی ٹیکس چڑھا سکا۔
”مجھے کچھ معلوم؟“ راجا نے پوچھا۔

”ساری اسی انفارمیشن ہی کا تو کمال ہے جو مجھ مل گئی۔ میں اسی پر ہی محنت کرتی ہوں۔ اگر ہم ایک بھی ڈیل بڑھالیتے ہیں نا اگلے چند برس سکون سے گزاریں گے۔“ روزی اس کے استے قریب ہوتے ہوئے بولی کہ اس کا بدن راجا سے مس ہونے لگا تھا۔

”ہم کیسے کر پائیں گے؟“ راجا نے بڑبڑانے والے انداز پوچھا۔

”یہ بھی بتا دوں گی، اتنی جلدی کیا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے روزی نے اپنی ہاتھیں اس کے گلے میں ڈال دیں۔ ایک لمحے کو راجا کا دماغ کام کرنا چھوڑ گیا۔ پھر جب اسے نشین ہو گیا کہ روزی اس کے گلے میں ہاتھیں ڈال چکی ہے تو اس نے بھی اسے اپنے ساتھ چھوڑ دیا۔ وہ کچھ دیر یونہی ایک دوسرے میں کھوئے رہے۔ جیسے ہی کمرے کے باہر چاب کی آواز آئی، وہ الگ ہو گئے۔ دروازہ کھلا اور وہی نوجوان اندر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں شے تھی۔ اس نے چائے کے دو کپ ان کے سامنے رکھے اور وہاں پلٹ گیا۔

”ہم دو دن یہیں رہیں گے، ممکن ہے اس سے پہلے ہی ہمارا کام مکمل ہو جائے اور ہم اس سے پہلے ہی نکل جائیں۔“ روزی نے سمجھایا۔

”مجھے کیا کرنا ہے؟“ راجا نے کہا۔

”اتنی جلدی کا ہے کی ہے، ابھی چائے پی کر یہاں سکون سے رہتے ہیں، شام تک ہمیں کوئی ڈسٹر ب نہیں کرے گا۔ تب تک میں تجھے سب سمجھا دوں گی۔“ اس نے بھی خوار آلود لہجے میں کہا اور اپنی آنکھوں کی پوروں سے اس کے لب چھو لیے۔ راجا کو جھرجھری سی آگئی۔

شام تک وہ فریش ہو کر اس نو تعمیر شدہ ہنگلے کے پورچ میں تھے۔ وہاں ایک کار کھڑی تھی۔ راجا اور روزی تعلق کے ایک نئے دائرے میں داخل ہو چکے تھے۔ ان کے درمیان تکلفات کی ساری حدیں ختم ہو چکی تھیں۔ روزی نے بڑے پیار سے راجا کی جانب دیکھا تو راجا مسکراتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ روزی اس کے ساتھ بیٹھی تو وہ وہاں سے نکلتا چلا گیا۔

وہ ساحل کا ویران علاقہ تھا۔ شام ہونے لگی تھی۔ وہ ایک بڑی سڑک سے چلتی سی سڑک پر آئے اور اس جگہ جا پہنچے۔ پتلی سڑک کے ساتھ کچھ دور تک منی تھی، پھر ساحلی

وہ بلڈنگ کے پورچ میں آیا تو روزی وہاں ایک عورت سے باتیں کر رہی تھی۔ وہ وہاں سے چلتا ہوا احاطہ پار کر کے سڑک پر آ گیا۔ دو منٹ کی تاخیر سے روزی بھی وہیں آگئی۔ کچھ ہی دیر بعد ایک ٹیکسی ان کے پاس آئی تو وہ اس میں بیٹھ کر چل دیے۔

وہ ایک ساحلی علاقے میں موجود نئے تعمیر شدہ ہنگلے میں آن رکے۔ ٹیکسی والا انہیں چھوڑ کر چاچکا تھا۔ وہ دونوں پورچ سے ہوتے ہوئے لاؤنج میں آ گئے۔ وہاں ایک نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ روزی نے اسے نظر انداز کیا اور اندر کی جانب بڑھ گئی۔ راجا اس کے ساتھ تھا۔ ایک کمرے کے آگے جا کر روزی نے دروازہ کھولا اور اندر چلی گئی۔ وہ ایک کشادہ اور سادہ سائبر پروم تھا۔ اندر کوئی بھی نہیں تھا لیکن کرا خشک ہو رہا تھا۔ اس نے جاتے ہی اپنا آچل اتار کر ایک جانب رکھ دیا۔ پھر بیڈ پر بیٹھتے ہوئے اپنا سل فون نکال لیا۔ اسے آن کر کے روزی نے راجا کی طرف دیکھا پھر اپنے ساتھ ہی بیڈ پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”ادھر آ میرے پاس بیٹھ۔“

راجا اس کے بالکل ساتھ جا کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔ سل فون کی اسکرین روشن تھی۔ روزی کچھ دیر انجی رہی پھر اس نے راجا کی جانب دیکھ کر کہا، ”میں نے تجھ سے کہا تھا کہ اب ایک بڑا ہاتھ مارنا ہے؟“

”ہاں کہا تو تھا۔“ اس نے دھیسے سے لہجے میں کہا۔ اس کا دھیان روزی کی باتوں کی طرف نہیں بلکہ اس کی قربت میں ہونے والی سنسنی کی جانب تھا۔ اس کے بدن پر لگا ہینکا پر فیوم اس کے دماغ کو شمار آلود کر رہا تھا۔ روزی سمجھ چکی تھی کہ اس وقت راجا کی حالت کیا ہو رہی ہے۔ وہ اس کے مزید قریب ہو کر سل فون اسکرین دکھاتے ہوئے بولی۔

”یہ دیکھ اسکرین پر، یہ فیض اس وقت ارب پتی ہے۔ اس کے لیے کام کرنے والے بہت سارے لوگ ہیں۔ اس کی ایک فیبری بھی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے انگلی سے وہ تصویر بدل دی۔ تین افراد کی تصویریں سامنے آئیں۔ یہی وہ بولی، ”یہ تین بندے دیکھ رہا ہے نا، یہ اس کے خاص بندے ہیں، یہی اس کی دولت میں اضافے کا باعث ہیں۔“

”کیسے؟“ راجا خنکار آلود لہجے میں بولا۔
”اس فیض کی فیبری پانی میں جاتی ہے، وہیں سونے، ہیرے اور کئی بھی منشیات کی ڈیل ہوتی ہے۔ ان تینوں میں سے کوئی ایک منشی کے ذریعے وہ ڈیل ساحل سمندر تک لاتا

ریت بہت آگے تک تھی۔ اس کے بعد سمندر تھا۔ پتلی سڑک سے سمندر کا فاصلہ کوئی آدھا کلومیٹر سے زیادہ تھا۔ وہ دونوں وہاں کھڑے تھے۔ راجا وہاں اترا تو روزی کار بڑھا کر لے گئی۔

سورج غروب ہونے میں ابھی وقت تھا۔ مغربی افق تاریخی ہونے کو تھا۔ سرخی بادل سورج سے آنکھ بچوٹی مٹیل رہے تھے۔ راجا جلتے ہوئے ساحل کے پاس ایک پتھر پر جا بیٹھا۔ وہ ساحل سے ٹھمرانے والی موجوں کو دیکھ رہا تھا۔

اس نے اپنے سامنے تاحید نگہ مضطرب پانی کو دیکھا، جو بہتے ہوئے کنارے تک موج کی صورت میں آتا، اس پہاڑی سے گرا کر دل دہلا دینے والا شور پیدا کرتا ہوا پُرسکون ہوجاتا۔ وقفے وقفے سے یہی عمل جاری تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو شاید وہ اس ماحول سے حظ اٹھاتا لیکن اس وقت وہ

سارا ماحول اسے بے چینی کر دینے والا تھا۔ اس نے حسرت سے اپنے ارد گرد کے ماحول کو دیکھا اور پھر سگریٹ سلاگ لیا۔ فضا میں دھواں چھوڑتے وقت اس نے ساحل کی لمبی پٹی کو غور سے دیکھا۔ اس کے ارد گرد کوئی ڈی روح نہیں تھا۔ ساحل کا

یہ حصہ اکثر ویران رہتا تھا۔ شام ہوجانے کے باعث اب وہاں کوئی نہیں تھا لیکن اس سے کافی دور کچھ لوگ دھویں کی صورت میں دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے وہاں سے

لگا میں ہٹا کر شہر میں موجود بلند بالا عمارتوں کو دیکھا۔ اس کے دل سے ایک ہوک اُٹھی۔ وہ پھر خود کلائی کے سے انداز میں بڑبڑانے لگا۔ ”تختی دولت ہے اس شہر میں، کتنا سرمایہ ہے لوگوں کے پاس لیکن ایک میں ہوں جو زندہ رہنے کے لیے کیا کچھ کر رہا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے سگریٹ کا طوٹیلں لیا اور

دھواں دھیرے دھیرے فضا میں چھوڑنے لگا۔ وہ وہیں بیٹھا ایسے ہی اوٹ پٹانگ سوچتا رہا۔ یہاں تک کہ سگریٹ ختم ہو گیا۔ اس نے سگریٹ کا ٹوٹا سمندر کی جانب اچھال دیا۔ وہ پھر سے سمندر اور موجوں کو دیکھنے لگا جو ڈھلتی ہوئی شام میں سنہری ہو گئی تھیں۔

”اوجھائی..... اولو کے..... ذرا بات سنو۔“

اس نے ایک گونجتی ہوئی مرادٹہ آواز سنی۔ پہلے تو اس نے اس گونجتی ہوئی آواز کو اپنا دھم سمجھا، جب دوسری بار ایسے ہی کار کیا تو اس نے آواز کی سمت دیکھا، ایک موٹا سا شخص اس کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلا رہا تھا۔ اس موٹے شخص نے

گلابی ٹی شرٹ اور سیاہ شارٹس پہنے ہوئے تھا۔ اس کے پاس کچھ سامان رکھا ہوا تھا۔ وہ بالکل ساحل کے پاس کھڑا تھا۔ قریب ہی ایک نشیمنی بھی جس میں ایک شخص بیٹھا ہوا تھا۔

یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ ابھی ابھی ساحل تک پہنچا ہو۔ اس نے غور سے دیکھا، وہ تین افراد میں سے ایک تھا، جن کی تصویریں روزی نے دکھائی تھیں۔ گویا ٹھکرا سے خود ہلا رہا تھا۔ اس نے ہاتھ ہلا کر موٹے شخص کو آنے کا کہا اور اس کی طرف چل پڑا۔ وہ اس کے پاس جا کر بولا۔

”ہاں بولو، کیا بات ہے؟“

”میرے ساتھ یہ سامان اٹھا کر وہاں میری گاڑی تک لے چلو، میں تمہیں اس کام کے پے دوں گا۔“ موٹے شخص نے جھکے ہوئے لہجہ میں کہا۔

”جب تمہیں پتا تھا کہ تم یہ سامان نہیں اٹھا سکتے تو اسے ساتھ لائے کیوں؟“ اس نے بڑے جھکے انداز میں سوال جڑ دیا۔

”بات دراصل یہ ہے، میرے ملازم کو یہاں آنا تھا، وہ یہاں نہیں پہنچا، شام ہونے والی ہے، میں اس کا سختی دیر انتظار کروں گا، میں نے سوچا شاید یہ کسی والا ملاح مجھے چھوڑ دے گا مگر اس نے بھی انکار کر دیا۔ سو اس لیے تمہیں مدد کے لیے کہا۔“ موٹے شخص نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”یہی سامان ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں یہی ہے؟“ موٹے شخص نے کہا تو پہلے اس نے ایک نگہ سامان کی جانب دیکھا، وہاں درمیانے سائز کی تین ٹوکریاں تھیں۔ تو گویا انہی میں مال ہے۔ اس نے ایک ٹوکری اٹھا کر کاندھے پر رکھ لی۔ یہی مچھلی کی تیز بساند اس کے تفتنوں سے ٹکرائی۔ موٹے شخص نے دوسری ٹوکری اس کے دوسرے کاندھے پر رکھ دی۔ تیسری اس نے خود اٹھائی اور سمندر کی مخالف سمت میں چل دیے۔ سختی واپس چلی گئی تھی۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“ چند قدم چلنے کے بعد موٹے شخص نے یونہی سوال داغ دیا۔

”راجا۔“ اس نے ہنکارا بھرنے والے انداز میں کہا۔ اس کا سانس پھولنے لگا تھا۔

”یہاں کیا کر رہے تھے؟“ موٹے شخص نے پوچھا۔ وہ کیا جواب دیتا اس لیے خاموش رہا۔ ”میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟“ موٹے شخص نے دوبارہ پوچھا تو وہ بولا۔

”چھوڑ اس قصے کو بھائی۔“ اس نے یونہی بات بتاتے ہوئے کہا۔

”پھر بھی، یہاں تو لوگ.....“

”بس یہاں وقت گزاری کر رہا ہوں۔ اس دنیا میں اکیلا بندہ اور کیا کرے۔ اب یہ مزدوری مل گئی ہے تو رات کی

”میرا خیال ہے اب نکل چلیں۔“ راجا نے ارد گرد دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں چل نکل۔“ روزی نے تیزی سے کہا۔ اس نے تینوں ڈبے سمیت کچھیلیوں سمیت نوکریاں وہاں بھینکیں اور کار کی جانب بڑھی۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ کچھ دور جانے کے بعد راجا نے اٹھے ہوئے انداز میں پوچھا۔

”ایک بات کی اب تک سمجھ نہیں آ رہی، اتنا مال لے کر وہ آ رہا تھا۔ اس کے لیے تو کم از کم پانچ دس بندے ہونے چاہیے تھے اور۔۔۔“

”یہی تو ان کا کمیل ہے، زیادہ رش پڑتا ہے تو کوئٹہ گاؤں کی لگا ہوں میں آ جاتے ہیں، اس طرح تو یہی سمجھا جاتا ہے کہ کوئی امیر بندہ پھلی کا فکار کر کے لایا ہے بس۔“ روزی نے سمجھا یا تو راجا نے اٹھے ہوئے لہجے ہی میں پوچھا۔

”لیکن وہ جس نوکر کا انتظار کر رہا تھا، وہ بھی نہیں آیا۔ اس کا ڈرائیور بھی نہیں پہنچا، یہ سب۔۔۔“

”اتفاق نہیں ہے، منصوبہ تھا سب۔۔۔ اس کا ڈرائیور ہی اس کا نوکر تھا، وہ جان بوجھ کر سائل پر نہیں گیا۔ وہ ہم سے صرف دو منٹ کے فاصلے پر تھا۔ جب ہم چلے ہیں تو وہ وہاں پر آیا ہوگا۔ یہ میرا اور اس کا پلان تھا جو کامیاب ہو گیا۔ یہ وہی ڈرائیور ہے جس نے ہمیں شاپنگ مال سے اٹھایا تھا۔“

روزی نے اسے پوری تفصیل بتادی تو اسے سمجھ میں آ گیا۔

وہ روزی پر رشک کر رہا تھا۔ یہ سارا ان معلومات کا کمال تھا جن کی وجہ سے وہ اس مال تک پہنچی تھی۔ لیکن اب اس نے بمزوں کے جتنے میں ہاتھ ڈال لیا تھا۔ اتنے بڑے گینگ سے مال چھین لینا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ یہ روزی نے اسے خود بتایا تھا کہ جس شخص سے اس نے مال چھینا ہے، وہ ان تین خاص لوگوں میں سے ایک ہے۔ کیا وہ گینگ اسے صحاف کر دے گا۔ ظاہر ہے اب وہ بھی اسی کے ساتھ تھا۔ وہ بھی اتنا ہی گمنام ہے جتنا روزی ان کی ہٹ لسٹ پر ہوگی۔ کیا روزی ان سے بچ پائے گی؟ یہ سوال اسے بے چین کرنے لگا۔ وہ اس سے پوچھتا جا رہا تھا لیکن وہ پوری توجہ سے ڈرائیونگ کر رہی تھی اس لیے یہ سوال اس نے موخر کر دیا۔

وہ واپس اس نوٹیر شدہ پینکل پر آ گئے۔ پوریج میں گاڑی چھوڑ کر وہ سیدھے بیڈ روم میں گئے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی روزی نے ناک چڑھا کر کہا۔

”ابھی تک تم سے پچھلیوں کی بے ساختہ رہی ہے۔“

”یہ تو ہے، جب پچھلیاں اٹھائیں تو۔۔۔“ اس نے

روٹی اچھی مل جائے گی۔“ راجا نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔

”اچھا میں تمہیں اپنا ہاتھ دلاؤں گا، اگر کوئی کام دھندا کرنا ہو تو میرے پاس آ جانا، میں تمہیں کام دے دوں گا۔“ اس موٹے نے کہا۔ ان کے درمیان خاموشی چھا گئی۔ راجا کو اتنی ممکن نہیں ہوتی تھی جتنی اس موٹے کو ہونے لگی تھی۔ اس کا سانس پھول گیا تھا لیکن پھر بھی وہ تیز قدموں سے چلا چلا جا رہا تھا۔ تقریباً بیس منٹ بعد وہ پتلی سڑک پر تھے۔ سامان زمین پر رکھتے ہی موٹی تو نندوالے نے اپنا سیل فون نکالا اور نمبر پیش کرنے کے بعد کال کرنے لگا۔ اس کے چہرے پر گہری تشویش چھا گئی۔ دوسری جانب سے کوئی جواب نہ پا کر اس نے جلدی سے دوسرا نمبر ملا یا اور رابطہ ہوتے ہی دھاڑتے ہوئے بولا۔

”یہاں ابھی تک کوئی نہیں پہنچا، خیر ہے؟“ پھر راجا کی طرف دیکھ کر تھوڑا دور ہو کر انتہائی غصے میں بات کرنے لگا۔ وہ بات کر چکا تو اس نے سیل فون جیب میں ڈالا اور جیب سے چند بڑے نوٹ نکال کر راجا سے بولا۔ ”یہ لو تمہاری مزدوری، اب تم جا سکتے ہو۔“

”ٹھیک ہے۔“ راجا نے وہ نوٹ پکڑ کر جیب میں رکھے ہی تھے کہ سامنے سے روزی کی کار آتی دکھائی دی۔ غریبی طور پر توند والا اس کار کی جانب دیکھنے لگا۔ راجا کو روزی کا چہرہ دکھائی دے گیا تھا۔ جب تک وہ ان کے پاس آ کر رہی۔ راجا نے جیب سے انتہائی سرعت کے ساتھ پینکل نکالا اور اس کا دستہ زور سے موٹے شخص کے سر پر دے مارا۔ وہ اپنا ہاتھ بھی سر پر نہیں رکھ سکا تھا، پکڑا اور کر گیا۔ راجا نے اسے چکی سڑک پر دھکیلا۔ روزی کا دروہ چکی گئی۔ اس نے ڈی کھولی تو راجا نے ایک ایک کر کے وہ تین نوکریاں ڈکی میں رکھ دیں۔ اس نے دھیان سے ڈکی بند کی اور روزی کے ساتھ آکر بیٹھ گیا۔ روزی نے کار آگے بڑھا دی۔

شام ڈھل چکی تھی اور رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ روزی نے کار ایک ویرانے میں لے جا کر روکی اور جلدی سے ڈکی کی جانب بڑھی۔ راجا بھی اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ انہوں نے تیزی سے نوکریاں نکھولیں، وہ پچھلیوں سے بھری ہوئی تھیں۔ وہ تیزی سے پچھلیاں نکال کر پچھتے گئے۔ نوکری کی تہ میں ایک ڈبا دکھائی دیا۔ روزی نے وہ مگولا تو اس میں سونے کے بکٹ تھے۔ باقی دو میں بھی ایسے ہی بکٹ تھے۔

”واؤ۔۔۔ کروڑوں کا مال۔۔۔“ روزی کے منہ سے

بات ادھوری چھوڑ دی تو روزی نے بیڈ پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔
”ایسا کرو، نہا کر اس بساند سے جان چھڑاؤ۔ اس کے بعد نکلتے ہیں۔“

”کپڑے تو وہی ہیں، ان سے تو آئے گی بساند؟“
راجا نے کہا۔

”چلو کچھ کم تو ہوگی، چلو نہاؤ، لیکن ابھی کپڑے مت پہننا۔“ اس نے خمار آلود لہجے میں یوں کہا جیسے وہ اسے دعوت دے رہی ہو۔
راجا مسکراتے ہوئے ہاتھ روم کی طرف چلا گیا۔

راجا نہا کر ہاتھ روم سے باہر آیا تو اس نے اپنے گرد تو لیا لیٹا ہوا تھا۔ اس کے کپڑے ابھی تک ہاتھ روم ہی میں تھے۔ بیڈ روم میں روزی نہیں تھی۔ وہ کچھ دیر انتظار کرتا رہا پھر بیڈ پر بیٹھ گیا۔ اگلے پندرہ منٹ میں منٹ وہ پونجی بیٹھارہا لیکن روزی واپس نہیں پلٹی تھی۔ اس نے اپنے سیل فون سے روزی کو کال کی لیکن اس کا فون بند تھا۔ اسے تشویش ہونے لگی۔ وہ کہاں گئی؟ وہ جلدی سے ہاتھ روم میں گیا، اس نے تیزی سے کپڑے پہنے اور بیڈ روم سے نکلتا چلا گیا۔ اس نے سارا ہنگامہ جان لیا مگر وہ اسے کہیں دکھائی نہیں دی۔ وہ لاؤنج میں آیا تو وہی نوجوان وہاں کھڑا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس سے پوچھتا، وہ نوجوان اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔

”تم ابھی تک یہیں ہو، چلو تم بھی، وہ تمہاری معشوق تو کب کی چلی گئی۔“

”کیا مطلب.....؟“ راجا نے حیرت سے پوچھا۔
”وہ ایسا ہی کرتی ہے، حیرے جیسے کسی کو یہاں لے آتی ہے، پھر اسے چھوڑ کر چلی جاتی ہے، مجھے ایسے نکالنا پڑتا ہے۔“ اس نوجوان نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا تو راجا سمجھ گیا۔ اس نے فوراً کہا۔

”اوکے، میں ابھی چلا جاتا ہوں لیکن ایک بات بتادو، وہ کب سے یہاں آ رہی ہے اور تم اُسے یہاں کیوں آنے دیتے ہو؟“

”دو سوال کر دیے تم نے خیر، وہ تو ایک برس سے آ رہی ہے، یہی کوئی پانچ چھ بار آئی ہوگی۔ وہ یا تو ابھی جو یہاں وقت گزارے، میں اس سے رقم لیتا ہوں، لوگ دیتے ہیں۔“ اس نے کانٹے پر چکا کر کہا۔

”میں بھی اگر دوں تو.....؟“ راجا نے ایک خیال کے تحت پوچھا۔

”وہ تب کی بات ہے، ابھی نکلو۔“ اس نے بے مروتی

سے کہا تو راجا لاؤنج سے نکلتا چلا گیا۔ اس نے باہر والا گیٹ پار کیا اور سڑک پر آ گیا۔ اب اپنے فلیٹ تک جانے کے لیے اسے کتنا پیدل چلنا ہوگا اور کہاں سے کوئی عکسی یا رکشا اسے ملے گا، یہ اسے معلوم نہیں تھا۔

آدمی رات کے قریب جب وہ اپنے فلیٹ پہنچا تو اس کا سیل فون بج اٹھا۔ اسکرین پر روزی کے نمبر تھے۔ اس کا دماغ پھٹنے والا ہو گیا تھا۔ پچھلے کئی گھنٹوں سے وہ اس کا فون ٹرائی کر رہا تھا جو مسلسل بند جا رہا تھا۔ اب اس نے خود کال کر لی۔ اس نے خود پر قابو پایا اور کال ریسپونڈ کرتے ہوئے ہیلو کہا۔

”سوری راجا، مجھے تمہارے ساتھ یہ کرنا پڑا۔ ورنہ شاید میں یہاں سے نکل نہ سکتی۔“ دوسری طرف سے روزی کی محذرت خواہانہ آواز سنائی دی۔

”کہاں ہو تم؟“ راجا نے پوچھا۔
”میں چند منٹ بعد میں ڈان بھرنے والی ہوں، اس وقت جہاز میں ہوں۔ میں کسی دوسرے ملک جا رہی ہوں۔“ اس نے بڑے سکون سے کہا۔

”اوکے، لیکن یوں مجھے وہاں چھوڑ کر..... تم مجھے بتا کر بھی جاسکتی تھیں، میں کون سا تمہیں روک لیتا؟“ اس نے شکوہ بھرے لہجے میں کہا۔

”میں کسی پر بھی اعتبار نہیں کرتی، تم پر بھی نہیں حالانکہ تم انتہائی بے ضرر قسم کے بندے ہو، خیر، میں تو اب تمہیں کبھی ملنے والی نہیں لیکن میں نے تمہارا حصہ تمہارے بیڈ کے نیچے رکھ دیا ہے، دیکھ لیتا۔ ہمیشہ کے لیے بائے بائے۔“ یہ کہتے ہی اس نے فون بند کر دیا۔

وہ کچھ دیر تک سٹائٹ میں بیٹھا رہا۔ اسے کہیں لاشعہ میں یہ احساس تو تھا لیکن کم از کم روزی کے بارے میں یقین نہیں تھا کہ وہ ایسا کرے گی۔ اسے دکھ کا شدید احساس ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی کم مائیگی کا احساس ہونے لگا۔ وہ کچھ دیر بیٹھارہا پھر روزی کے کہے کا یقین کرنے کے لیے اس نے اپنے بیڈ کا گدا اٹھا کر دیکھا۔ جہاں اس کی پہلے والی رقم محفوظ تھی۔ وہاں سونے کے تین بکٹ پڑے ہوئے تھے۔ تین سونے کے بکٹ دیکھ کر اس کا دماغ خراب ہونے لگا۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

”تو راجا یہ ہے تمہاری اوقات؟ اس نے تمہیں ٹشو طرح استعمال کیا، پلان میں جتنا تمہارا کردار تھا، اتنا سوتا تمہارے سامنے ڈال دیا۔“

اس نے وہ بکٹ الٹ پلٹ کر دیکھے پھر انہیں وہیں

پتلس گو

کہہ دیا۔ ”جی دوسری جانب سے ایک بھاری آواز سنائی دی۔
”ہاں بھی راجا، بہت دن آرام کر لیا، اب تھوڑا کام ہو جائے؟“

”او بھائی تم کون ہو، کیا آرام اور کیا کام؟“ اس نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا تو دوسری جانب سے ایک ہلکا سا قہقہہ لگا یا کیا۔ چند لمبے خاموشی کے بعد وہ بڑے سکون سے بولا۔

”وہ بے چاری روزی تو کچھ بھی نہیں تھی، وہ میرے لیے کام کرتی تھی۔ جیسا میں کہتا تھا، ویسے کرتی تھی۔ اب وہ غائب ہوئی تو کیا ہوا، تیرے جیسے کئی لوگ میرے لیے کام کر رہے ہیں۔“

”میں سمجھا نہیں تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“ اس نے مزاحمت بھرے لہجے میں کہا جیسے وہ اس اجنبی سے جان چھڑانا چاہتا ہو۔

”نہیں ایسے نہیں میری جان، تمہیں میری باتیں بڑی اچھی طرح سمجھ میں آئیں گی، جب میں تمہیں سمجھاؤں گا۔ ابھی تم جاؤ اپنے قلیٹ، میں بعد میں بات کرتا ہوں۔ وہ بھی تفصیل سے۔“ یہ کہتے ہی اس نے کال بند کر دی۔

راجا پریشانی میں فون کو دیکھتا رہ گیا۔ اس کے دماغ میں یہی سوال گونجنے لگا کہ یہ کون ہے؟ اسے روزی کے بارے میں کیسے پتا؟ یہی سوچتے ہوئے وہ چل پڑا۔ سڑک پار کرتے ہی اسے خیال آیا کہ اس نے کہا تھا کہ ابھی تم جاؤ اپنے قلیٹ..... مطلب وہ پیچھے نہیں رہے، اسے یہ معلوم ہے کہ میں قلیٹ سے باہر ہوں اور اپنے قلیٹ کی جانب جا رہا ہوں؟ کیا وہ نہیں آس پاس ہے؟ یہ خیال آتے ہی اس نے اپنے ارد گرد دیکھا، پھر احاطے میں بیٹھے ہوئے لوگوں پر نگاہ ڈالی۔ وہاں چند بوڑھے بیٹھے نہیں لگا رہے تھے۔ وہ پوربج سے ہوتا ہوا سیر میوں تک جا پہنچا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ ممکن ہے فون میں ٹریفک کا شور جا رہا ہو، اسی بنا پر اس نے کہا ہوگا۔ اگر اسے روزی کے بارے میں پتا تھا تو اسے میرے قلیٹ میں ہونے کا بھی پورا پتا ہوگا۔ یہ سوچ کر وہ مطمئن ہو گیا۔

وہ تنہائی سے سوچنے لگا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ وہ کسی سے کوئی مشورہ نہیں لینا چاہتا تھا۔ وہ پہلے ہی دہرے بہت شرمندہ تھا۔ اس نے ایک بار کہا تھا کہ عورت کا اعتبار نہیں کرنا چاہیے، وہ کسی بھی وقت دھوکا دے سکتی ہے، تب اس کی بات راجا کے ذہن میں ہی نہیں آئی تھی۔ وہ سیر میوں چڑھ کر قلیٹ میں آیا یہی تھا کہ اس کا

گلدے کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ اسے دکھ یہ نہیں تھا کہ اسے مال میں حصہ نہیں دیا گیا بلکہ وہ روزی کی بے وفائی کو کچھ زیادہ ہی محسوس کر گیا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ روزی اس کے ساتھ ایسا بھی کر سکتی ہے۔ اگرچہ وہ شدید تھکا ہوا تھا لیکن اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ دکھ کا شدید احساس اس کے رگ دپے میں سرایت کر گیا تھا۔

☆☆☆

وہ دو دن قلیٹ سے باہر نہیں نکلا تھا۔ اسے مال سے زیادہ روزی کے چلے جانے کا دکھ سنا رہا تھا۔ پہلی بار کوئی لڑکی اس کی زندگی میں آئی تھی۔ اچانک لیٹے لیٹے اسے خیال آیا کہ کیا وہ اپنی ماں کو بھی ساتھ لے گئی ہے یا اسے یہیں چھوڑ گئی ہے؟ اس خیال کے ساتھ ہی وہ چونک گیا۔ وہ اٹھا اور پہلی منزل پر جا کر اس نے روزی کے قلیٹ پر جا کر دستک دی۔ دروازہ کسی اجنبی عورت نے کھولا۔ اس نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”کیا بات ہے بھائی؟“

”وہ یہاں جو آئی باہر رہتی تھیں، ان سے ملنا تھا۔“ اس نے منہ پر ہونے لہجے میں کہا تو وہ خاتون بولی۔
”بھائی کہاں سے آئے ہیں؟ ہمیں ان کے بارے میں نہیں پتا، ہم تو کل ہی شفٹ ہوئے ہیں ادھر۔“

”ٹھیک ہے۔ میں نیچے واپس مین سے پتا کر لیتا ہوں۔“ راجا نے کہا اور پلٹ گیا۔ اسے یہ یقین ہو گیا تھا کہ اب روزی پلٹ کر نہیں آئے والی۔ وہ اتنا ملتا پتا بھی تھی کہ کسی بھی ملک میں جا کر سکون سے زندگی گزار سکتی تھی۔ وہ سیر میاں اتر کر نیچے آ گیا۔ پھر وہاں سے چلا ہوا بلڈنگ کے احاطے سے بھی باہر چلا گیا۔ سڑک کے پار ایک چھارے والا بیٹھا ہوا تھا۔ راجا اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ اس نے کھانا کھایا، پھر جانے والے کھوکھے سے چائے پی کر پوئی ہوا خوری کے کپے وہاں بیٹھ گیا۔ وہاں دنیا کی گہما گہما بھی دیکھی تو اسے خیال آیا کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔ اس کے پاس اتنے پیسے تو تھے کہ جس طرح سامنے چائے والا کھوکھا بنا ہوا ہے، ایسا ہی ایک کھوکھا بنائے۔ پہلے بھی تو وہ یہی کام کرتا رہا ہے۔ پار کیا یہی میری زندگی ہے؟ کیا میں بھی ایسے ہی کیڑے مکوڑے کی زندگی گزار کر مر جاؤں گا؟ وہ جتنی ہی دیر ایسی سوچوں میں الجھا ہوا وہاں بیٹھا رہا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو وہ اٹھ کر پھر سے اپنے قلیٹ کی جانب بڑھ گیا۔ ابھی وہ بلڈنگ کے احاطے میں پہنچا ہی تھا کہ اس کا تیل فون بج اٹھا۔ اجنبی نمبر تھے۔ اس نے چند لمبے سوچا پھر کال ریسیور کے ہیلو

”راجا ہم جانتے ہو کہ میں تمہیں چاہتی ہوں جب سے
آئی نہیں رہیں، میرا دل کرتا ہے کہ میں تمہارے یہاں آ کر
سارے کام کر جا یا کروں، مگر تم جانتے ہو، میں بدنامی سے
زیادہ مر جائے کو ترجیح دوں گی۔“
”فرحانہ، تم وہ بات کہو جو کہنا چاہتی ہو؟“ راجا نے
دھجے سے کہا۔

”راجا، میں نے تمہیں دلبر کے ساتھ بھی دیکھا ہے اور
روزی کے ساتھ بھی، وہ اب مجھے لوگ کہیں ہیں، میں تمہیں سمجھانا
چاہتی تھی لیکن ہمت نہ کر سکی کہ اتنا سا فاصلہ عبور کر کے
تمہارے پاس آ جاؤں۔ لیکن آج مجھے آنا پڑا۔“ وہ جذباتی
لہجے میں بولی۔

”اس کی وجہ؟“.....“ راجا نے حیرت سے پوچھا۔
”مجھے پتا چلا ہے کہ روزی اپنی ماں کے ساتھ کہیں
چلی گئی ہے اور دلبر کو رات پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔
دونوں.....“

”دلبر پکڑا گیا ہے؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔
”ہاں، ساری بلاؤنگ کو پتا ہے تمہیں نہیں معلوم؟“ اس
نے مزید حیرت سے پوچھا۔

”نہیں، مجھے نہیں علم۔“ راجا نے شکست خوردہ لہجے
میں کہا۔

”تو پھر جان لو کہ اسے پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔ خدا
کا شکر ہے تم اس کے ساتھ نہیں تھے۔ خیر، میں یہی تمہیں کہنے
آئی تھی۔ قدرت کی طرف سے اب ان دونوں کا ساتھ نہیں
رہا۔ میں تمہیں یہ سمجھانے آئی ہوں تم کوئی اچھا سا کام کر لو،
چاہے چھوٹا سا ہی ہو لیکن کوئی غیر قانونی نہ ہو۔“ اس نے
بڑے پیار اور مان بھرے لہجے میں کہا تو راجا شرمندہ سے
لہجے میں بولا۔

”تم ایسا کیوں چاہتی ہو؟ تمہاری اپنی ایک زندگی
ہے اور.....“

”دیکھو راجا، میں نے بچپن سے تمہیں چاہا ہے اور
میری خواہش ہے کہ میں تمہاری ہو جاؤں۔ اس سے زیادہ
مجھے کوئی چاہت نہیں ہے۔“

”میں ماننا ہوں اور تمہاری چاہت کو بھی جانتا ہوں
لیکن تمہارے اور میرے درمیان بہت بڑا فاصلہ ہے، تم
ایک بڑھی گئی لڑکی ہو، میرا حال تو ان بڑھ لوگوں جیسا ہے۔
جس کے پاس نہ کوئی گھر ہے، نہ کوئی جاب، نہ کوئی ہنر، تھرڈ
کلاس لوگوں سے میرا تعلق ہے لیکن تم.....“ اس نے کہنا چاہا
تو فرحانہ تڑپ کر بولی۔

دور ازہ۔ بجا۔ یہ دیکھ اس کے دل کے تار ہلایا کرتی تھی۔ وہ
بچپان گیا تھا کہ باہر ضرور فرحانہ ہوگی۔ وہ اسی منزل پر۔۔۔
ساننے کی لائن میں آخری فلیٹ میں اپنے معذور باپ کے
ساتھ رہتی تھی۔ کافی عرصہ ہو اس کی ماں اس دنیا میں نہیں
رہی تھی۔ باپ ایک ٹھکے میں جو نیچر کلرک تھا۔ تقریباً چھ برس
پہلے وہ ایک حادثے میں اپنی ناگھیں گنوا بیٹھا تھا۔ اس کی
زندگی کو تو فتح بھی تھی لیکن ساری زندگی کے لیے ایک جگہ محدود ہو
کر رہ گیا تھا۔ وہ ابھی طرح جانتا تھا کہ فرحانہ اسے بچپن ہی
سے چاہتی تھی۔ اس کا احساس اسے لو کہیں میں ہی ہو گیا تھا۔
لیکن وہ ہمیشہ اس سے گریز کرتا رہا تھا۔ ایک وقت تھا کہ وہ اس
کے بارے میں بہت سوچا کرتا تھا، ہر بار اسے وہ خود سے
بہت دور دکھائی دیتی تھی۔ اس دور کی کہ بہت ساری وجوہات
تھیں۔ دوسری بار دیکھ ہوئی تو اس نے بڑھ کر دروازہ کھول
دیا۔ اس کی توقع کے مطابق باہر فرحانہ کھڑی تھی۔ حسب
معمول اس کے ساتھ میں ڈھکا ہوا برتن تھا جس میں کچھ نہ کچھ
کھانے کو ہوتا تھا۔

”فرحانہ تم.....؟“ اس نے جان بوجھ کر حیرت سے
پوچھا۔

”اندر آنے کو نہیں کہو گے؟“ اس نے گہری آنکھوں
سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تو راجا دروازے سے
بہت گیا۔ وہ اندر آ کر ایک لمبے کوٹھڑی پر برتن میز پر رکھ کر
خود ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

وہ بالکل دیکھی کی دیکھی ہی تھی، تکی کی کامنٹی سی۔ سانولا
رنگ، ہلکے ہلکے ٹھنڈے بال جسے اس نے کس کر باغدا
ہوا تھا۔ اس کی وجہ سے اس کا چوڑا ہاتھ مزید کشادہ دکھائی
دے رہا تھا۔ بڑی بڑی آنکھوں پر ہلکا سا چشمہ تھا۔ ٹیکسی
ناک، پتلے سے جانی ہونٹ، نازک، ٹھوڑی اس کے گول
چہرے پر بہت جھنجھکی تھی۔ اس نے سستے سے کپڑے کا شلوار
سوٹ پہنا ہوا تھا۔ گلے میں لٹکا ہوا آئینہ اس نے اپنے سینے
پر پھیلا یا ہوا تھا۔ راجا نے بس چند لمبے اسے دیکھا اور
پھر ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔

”میرا خیال ہے، اماں کے چلے جانے کے بعد آج
آئی ہو تم؟“

”شاید نہ آتی، لیکن مجھے تم سے ایک بات کرنا تھی۔“
اس نے صاف لہجے میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے
ہوئے کہا۔

”کیا بات کرنی تھی؟“ وہ سمجھتے ہوئے بھی انجان بن
گیا۔

گی۔

”یولو، میں تمہاری ہر بات ماننے کو تیار ہوں۔“ وہ خوشی سے بولی تو وہ..... اندر کمرے میں چلا گیا۔ بیڈ کے گدے کے نیچے سے اس نے ایک بڑے نوٹوں کی گڈی نکالی اور وہاں اس پلٹ آیا پھر اس کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

”اب تم جاب نہیں کرو گی۔ پڑھنے کے بعد سیدھا کمرہ آؤ گی اور ہاں خود پر زیادہ توجہ دو گی۔“

اس کے یوں کہنے پر فرحانہ بھی نوٹوں کی طرف دیکھتی اور کبھی اس کے چہرے پر۔ خود اس کے اپنے چہرے پر خوشی اور شدید حیرت کے ملے جلے تاثرات تھے۔ وہ بے تابانہ انداز میں ابھی اور راجا کے گلے لگ گئی۔ چند لمحوں بعد اس سے الگ ہو کر اس کے ہاتھوں سے گڈی لے کر بولی۔

”مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میری محبت رانگاں نہیں جائے گی۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے زبور والا برتن اٹھایا اور کمرے سے... چلی گئی۔ راجا کو لگا جیسے کوئی ہوا کا خوشگوار جھونکا آیا تھا اور اسے سرشار کر کے چلا گیا ہے۔ اس نے پہلی بار دل میں حقیقی خوشی کو محسوس کیا تھا۔ کوئی کہ تو ہے اس دنیا میں جو اس کی جی چاہت رکھتا ہے۔ وہ فرحانہ کے بارے میں سوچتا...

رہا۔ روزی کی بے وفائی کا جو دکھ تھا، وہ دھیرے دھیرے تحلیل ہونے لگا۔ وہ خواہوں کی دنیا میں بچنے کی کیا لیکن جب حقیقت اس کے سامنے آتی تو رز کر رہ گیا۔ اسے دلبر کے انجام کا خیال آیا۔ اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ خود اسے یہ فکر پڑ گئی تھی کہ اگر اس کا نام سامنے آ گیا تو وہ کیا کرے گا؟ یہ خیال آتے ہی اس کے سارے خواب بکھر کر چکنا چور ہو جاتے۔ اس نے بہت سوچ کر یہ فیصلہ کر لیا کہ ممکن ہے کسی وقت بھی دلبر سارا کچھ یک دم دے۔ وقت آ گیا ہے کہ اسے یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ ورنہ کبھی بھی وقت وہ پکڑا جا سکتا ہے۔

☆☆☆

وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ جب اس کا سل فون بج اٹھا۔ اس نے ادھ مچلی آنکھوں سے سلطند کی ساتھ فون اٹھایا، اسکرین پر نمبر دیکھے تو اس کی نیند ایک دم سے کا فور ہو گئی۔ یہ وہی نمبر تھے جس نے دوپہر کے وقت اسے کال کی تھی۔ سل فون۔ ہاتھ میں لیے بیٹھا رہا۔ فون بج کر خاموش ہو گیا۔ اگلے چند لمحوں میں فون بھر بیٹھ گیا۔ اس نے کال ریسیو کر لی۔

”میں مانتی ہوں کہ میری تعلیم مکمل ہو جانے میں صرف دو ماہ باقی ہیں۔ اس کے بعد مجھے زیادہ اچھی نوکری مل جائے گی۔ مجھے کوئی اچھا بندہ بھی مل جائے گا شادی کرنے کے لیے۔ مگر میں تمہیں چاہتی ہوں۔ مجھے تم سے کچھ نہیں چاہیے۔ جس طرح میں اب اپنے سارے اخراجات پورے کر رہی ہوں، بعد میں بھی کروں بس مجھے میری چاہت مل جائے۔“

”یہ سب جذباتی باتیں ہیں۔ حقیقت کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ تمہارے ساتھ تمہاری اپنی مجبوریاں ہیں اور میرے ساتھ میری مجبوریاں۔ میرا خیال ہے ہم اپنی مجبوریاں ایک دوسرے پر مت لادیں۔“

”لیکن ایک دوسرے کی مدد تو کر سکتے ہیں؟“ فرحانہ نے یاسیت بھرے لہجے میں کہا تو راجا جی سے بولا۔

”کیسے، ہم کیسے ایک دوسرے کی مدد کر سکتے ہیں؟ کیا میں تم سے پیسے لوں گا جو تم جاب کر کے کماتی ہو؟ تمہارے معذور باپ کی پیشکش لوں گا، جو بے چارہ خود بے بس ہے؟“

”تم سچ کہتے ہو لیکن میری اماں کا کچھ زور ہے۔ میں وہ ساتھ لاتی ہوں۔ تم اسے سچ کر تھوڑا بہت کوئی کام شروع کر دو، میں تم سے وعدہ کرتی ہوں، ہم بہت جلد اس بلڈنگ سے نکل کر ایک گھر بنا لیں گے۔ ہم دونوں مل کر محنت کریں گے تو.....“

”تمہاری اماں کا زور، مطلب تم وہ زبور لاتی ہو میرے لیے، مجھے دے؟“ راجا نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں، میں لاتی ہوں اپنے ساتھ، تمہارے لیے۔“ اس نے برتن کا ڈھکن اٹھایا۔ اس میں نمودار ساز زور پڑا ہوا تھا۔ راجا اسے دیکھ کر کئی سے مسکرا دیا پھر بولا۔

”یہ زیادہ سے زیادہ ایک لاکھ کا ہوگا۔“

”اس سے کسی بھی چھوٹے نمونے کام کی شروعات تو ہو سکتی ہے نا؟“ فرحانہ نے تیزی سے کہا تو راجا کچھ دیر تک خاموش رہا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ فرحانہ سے کیا کہے۔ اسے فرحانہ پر رشک آ رہا تھا۔ وہ پورے غلوں کے ساتھ اس کی مدد کرنے کی خواہاں تھی۔ کچھ دیر سوچ کر اس نے کہا۔

”فرحانہ، میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ اپنا یہ زور اسی طرح واپس لے جاؤ۔ میں اب تمہیں ایک اچھا آدمی بن کر دکھاؤں گا، یہ میرا تم سے وعدہ رہا۔“

”سچ.....“ وہ خوشی سے نہال ہو گئی۔

”بالکل سچ لیکن تمہیں بھی میری ایک بات ماننا پڑے

”میں جانتا ہوں تم اس وقت سو رہے ہو گے لیکن اب تمہارا سونا اور جاگنا میری مرضی سے ہوگا۔“
 ”یار کون ہو تم؟ مجھے کیوں تنگ کر رہے ہو؟“ اس نے اکتاہٹ سے کہا۔

”تو چلو شک ہے، میں آج کے بعد تمہیں فون نہیں کروں گا مگر دلبر کے ساتھ کیا ہوا، شاید یہ تم نہیں جانتے ہو۔ اگر جانا چاہتا ہوں اپنے فون میں موجود ویڈیوز دیکھ لیتا۔ پھر اگر چاہو تو رابطہ کر لیتا۔“ اس بھاری آواز نے کہا اور فون کا کال ختم کر دی۔

راجا پریشانی میں چند لمبے بھشار ہا، پھر اس نے فون کا ڈیٹا آن کر کے دیکھا۔ اس میں چند ویڈیوز ایسی تھیں جو سی سی ٹی وی فوٹیج سے لے گئی تھیں۔ ان سب میں وہ اور دلبر تھے۔ کسی میں چہرہ صاف دکھائی دے رہا تھا اور کسی میں نہیں۔ دو چھوٹی چھوٹی ویڈیوز اس شاپنگ مال کی تھیں۔ ایک سی سی ٹی وی کی کمرے کی فوٹیج تھی اور دوسرا زیورٹ کا سرخ چمکی ڈبا پکڑتے ہوئے کسی سیل فون سے بنائی گئی تھی۔ اس سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ شریک جرم ہے۔ تیسری ویڈیوز ساحل سمندر کی تھی۔ وہ اس توند والے شخص کے ساتھ کھڑا ہے۔ ایک میں سامان اٹھائے ہوئے تھا اور تیسری میں وہ توند والا زمین پر پڑا ہوا تھا اور روزی کے ساتھ وہ کھڑا تھا۔ کوئی تیسرا ایسا شخص تھا جو ان کے ثبوت اکٹھے کر رہا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ فون کرنے والا جو بھی شخص ہے، وہ اتنی رسائی رکھتا تھا کہ ان کے سارے جرم اس کے سامنے ہوئے تھے۔ اب وہ بلیک میٹنگ کی بنیاد پر اس سے مزید جرم کروانا چاہتا تھا۔ اس کے پاس اب دو ہی آپشن تھے یا تو وہ اس فون والے شخص کو انکار کر دیتا اور دلبر کے پیچھے ہی ٹیل چلا جاتا۔ دوسرا آپشن یہی تھا کہ وہ سب کچھ کرنے کو تیار ہو جائے جو فون والا اسے حکم دے۔

شاید وہ ذہنی طور پر تیار ہو جاتا کہ فون والے کی بات مان لے مگر وہ یہ قلیٹ چھوڑ کر کسی دوسرے علاقے میں نکل جانے والا تھا۔ اسے دلبر کے انجام نے یہاں سے نکل جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ فون والے کا رابطہ تو صرف فون خبے کے ساتھ ہی تھا۔ اگر فون سے سم ہی نکال کر چھینک دے تو وہ بھی کال نہیں کر سکے گا۔ وہ جب یہاں سے نکل جائے گا تو پھر اسے کسی کے ساتھ رابطہ رکھنے کی ضرورت بھی نہیں ہوگی۔ اس نے کھڑکی میں سے دیکھا۔ باہر دن نکلنے کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ اس نے اپنا ضروری سامان سینٹا شروع کر دیا۔ اس نے ایک بیگ میں اپنے کپڑے رکھے، انہی کے درمیان جتنے

اس کے پاس نوٹ تھے دو رکھ لیے، جیسے ہی اس کے سامنے سونے کے بسکٹ آئے تو اسے روزی کی یاد آگئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے اندر نفرت کا ابال اٹھا۔ اس کا دل چاہا کہ انہیں پھینک دے۔ سچی اسے خیال آیا کہ فرحانہ کو دے جائے۔ شاید اس کے کسی کام آجائیں۔ اس نے ساری تیاری کر لی۔ اب وہ خطر تھا کہ فرحانہ کب باہر نکلتی ہے۔ تقریباً سات بجے کے قریب جب وہ اپنے قلیٹ سے نکلی تو راجا نے اسے بلالیا۔ وہ اس کے قلیٹ میں آگئی۔ اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں پوچھا۔

”خیریت ہے۔ جو تم مجھے بلو رہا ہے ہو؟“
 ”یہ تین سونے کے بسکٹ غیر قانونی ہیں، سمجھو چوری کے ہیں۔ یہ کہو، تمہارے کسی کام آئیں گے۔“ اس نے بڑے سکون سے کہا۔
 ”لیکن تم اسے کیوں نہیں رکھ رہے ہو؟“ فرحانہ نے پوچھا۔

”میں یہاں گھر پر نہیں ہوتا نا، ممکن ہے چوری ہو جائیں، تمہارے پاس محفوظ رہیں گے۔ کسی وقت کام آجائیں گے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔
 ”چلو میں اسے تمہاری امانت سمجھ کر رکھ رہی ہوں۔ مجھے ان کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی۔“ فرحانہ نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا تو اس نے وہ بسکٹ اسے تھما دیے۔ وہ چند لمبے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور پھر فرحانہ واپس پلٹ کر اپنے قلیٹ کی جانب چل دی۔

راجا دیکھتا رہا کہ فرحانہ کب بلڈنگ سے جاتی ہے۔ اس کے جانے کے کوئی دس منٹ بعد وہ بلڈنگ سے نکل گیا۔ اس نے روڈ پر جا کر رکشالیا اور اسے قریبی بس اسٹاپ تک جانے کا کہا۔ اس کا اس دن چاہی کوئی نہیں تھا لیکن اس کا ایک دوست تھا جو شاپنگ فعل کا لونڈی میں رہتا تھا۔ وہ دونوں پہننی میں اکٹھے کام کرتے تھے۔ اس کے ذمے بھی فراڈ کے پیسے آئے تھے جو بعد میں راجا جی کی کوششوں سے واپس مل گئے تھے۔ اب وہ کوئی اور کام کر رہا تھا۔ بس اسٹاپ پر جا کر اس نے اس کے بارے میں پتا کیا اور اسے اپنی آمد کے بارے میں بتایا۔ پھر سیدھا اس کے پاس جا پہنچا۔ لیکن راستے میں وہ نیا سم کارڈ لینا نہیں بھولا تھا۔

حنیف اس سے مل کر بہت خوش ہوا۔ اس نے جاتے ہی بتا دیا کہ وہ قلیٹ چھوڑ کر آ گیا ہے۔ اب یہیں کہیں رہے گا۔ فوراً کسی کرائے کے مکان کا بندوبست کر دے۔
 ”یار تم ایک دن تو میرے گھر میں رہو۔ شام تک کچھ

پتلاں گہ

”تمہیں کرنا صرف یہ ہے کہ چند دھرتی کے بوجھ میں
انہیں دھرتی کے اندر پہنچانا ہے۔ اس کے عوض تمہیں لاکھوں
میلین گے۔ ممکن ہے تم کروڑوں ہی بن جاؤ، یہ تمہاری محنت
ہے۔“ اسی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بڑے سکون سے کہا گیا تو
چند لمبے سوچنے کے بعد اس نے وضاحت سے پوچھا۔

”مطلب مجھے قتل کرنا ہوں گے؟“

”ظاہر ہے ایسے ہی تو دھرتی کا بوجھ کم نہیں ہوتا۔“
دوسری جانب سے طنز پر لہجے میں کہا گیا۔

”میں یہ سب کیسے کر پاؤں گا؟“ اس نے بے چارگی
سے پوچھا۔

”اگر تم میرے ساتھ تعاون کرتے رہو گے تو میں
تمہارے لیے آسانیاں پیدا کرتا چلا جاؤں گا۔ تمہیں بھی عقل
استعمال کرنا ہوگی۔“ دوسری جانب سے کہا گیا۔

”ٹھیک ہے۔ میں تیار ہوں۔“ اس نے فیصلہ کن لہجے
میں کہا۔

”تو پہلی بات یہ ہے کہ واپس اپنے فلیٹ میں جاؤ۔
کوئی تمہاری جانب اٹکی بھی نہیں اٹھا سکے گا۔ چاہے دلبر جتنا
مرضی منہ کھول دے۔ کیونکہ آج شام تک وہ اس قابل ہی
نہیں رہے گا کہ منہ کھول سکے۔“ اتنا کہنے کے ساتھ ہی اس
نے فون کال ختم کر دی۔ راجا حیرت سے اپنے سیل فون کی
طرف دیکھا رہ گیا۔

☆☆☆

پورا ایک ہفتہ وہ اپنے فلیٹ میں پڑا رہا۔ اس دوران
میں وہ بہت ضرورت کے لیے باہر جاتا تھا۔ کچھ چیزیں خریدتا
اور واپس آ جاتا تھا۔ ان دنوں میں ایک بار بھی وہ فرحانہ سے
نہیں ملا تھا اور نہ ہی وہ آئی تھی۔ دلبر کے مرنے کی خبر اس کے
فلیٹ میں آنے سے پہلے ہی بلڈنگ میں پھیل چکی تھی۔ اسے
خود بھی یہ یقین ہو گیا کہ اب وہ کسی بھی اندیشی گلی میں کسی بھی
گولی کا شکار ہو جائے گا۔ اسے کون دن کرے گا، کہاں دن
ہوگا، ہوگا بھی یا نہیں، اس کے ساتھ کیا ہوگا؟ یہ کچھ معلوم
نہیں تھا۔ وہ فرحانہ کو کوئی امید نہیں دلا سکتا تھا اس لیے اس
نے فرحانہ کو اپنے دل اور دماغ سے نکال باہر کیا۔ اس نے
فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ فرحانہ کو اب مزید آگے نہیں بڑھنے دے
گا۔ وہ اب اس نادیدہ کال کا ٹھہر تھا کہ کب اس سے کوئی
کام لیا جائے۔

ایک سپرہوٹی دی کے آگے بیٹھا شہر کی خبریں سن رہا
تھا۔ جیسی اس کا فون بج اٹھا۔ دوسری طرف وہی بھاری آواز
والا شخص کہہ رہا تھا۔

”کچھ کر لیں گے، ابھی پراپرٹی ڈیلر کے پاس جاتے ہیں، مل
جائے گا۔“ حقیقت نے اسے یقین دلایا تو وہ مطمئن ہو گیا۔
حقیقت نے اسے باہر والا کمرادے دیا۔ وہ سکون سے اس
میں لیٹ گیا۔ تنہائی پاتے ہی اس نے سم کارڈ بدلے اور
سارے نائٹ ختم کر دیے۔ اب وہ مطمئن ہو گیا تھا۔

شام ہوتے ہی حقیقت اسے ایک پراپرٹی ڈیلر کے
پاس لے گیا۔ اس نے کچھ ایڈوائس اور ایک ماہ کے کرائے
پر دو کمروں کا ایک چھوٹا سا مکان دے دیا۔ ضمانت حقیقت
نے دے دی۔ شام ڈھلتے ہی وہ نئے گھر میں تھا۔ وہ حقیقت
کے گھر سے کھانا کھا کر اپنے نئے مکان میں آیا اور آکر سکون
سے لیٹ گیا۔ اس نے یہ سوچ لیا تھا کہ آنے والے ایک
دو دن میں یہیں کوئی چھوٹا موٹا حادثہ شروع کر دے گا۔

اگلی صبح جب وہ اٹھا تو فریض تھا۔ حسب معمول اس
نے اپنے فون پر نگاہ ڈالی تو ایک میسج آیا ہوا تھا۔ اس نے کھولا
تو ایسی انجینیئر والے کا میسج تھا۔ جس میں لکھا ہوا تھا کہ اپنے
فون میں ویڈیو دیکھو۔ اس نے جلدی سے ڈیٹا آن کر کے
دیکھا تو دو چھوٹی چھوٹی ویڈیوز تھیں۔ ایک میں وہ سم کارڈ خرید
رہا تھا اور دوسری میں حقیقت کے گھر کے سامنے کھڑا ہونے کی
ویڈیو تھی۔ ان دونوں ویڈیوز بھیجے کا مقصد صاف ظاہر تھا کہ
وہ اس کی نگاہوں سے بچ نہیں سکے گا۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔
”یہ کس مصیبت میں چھن گیا ہوں۔“ اس نے

بڑبڑاتے ہوئے کئی گالیاں بک دیں۔ نمبر تبدیل کرنے کے
باوجود وہ اس تک پہنچ گیا تھا۔ کیا اسے معلوم تھا کہ میں سم کارڈ
بدل لوں گا؟ کیا اسے یہ بھی علم تھا کہ میں فلیٹ چھوڑ کر بھاگ
جاؤں گا؟ مجھ سے کہاں تکسلی ہوئی کہ میں اس کی نگاہ سے بچ
نہیں سکا؟ وہ کتنی ہی دیر تک سوچتا رہا لیکن اسے کچھ بھی سمجھ
میں نہیں آیا۔ وہ سارا دن پڑا سوچتا رہا۔ اب وہ کیا کرے کہ
اس کی نگاہوں سے بچ جائے؟ اگر زیادہ مزاحمت کی تو وہ غصے
میں آکر اسے پولیس سے پکڑا سکتا ہے۔ اسے یقین ہو گیا کہ
دلبر کے پکڑے جانے میں اسی بندے کا ہاتھ ہے۔ وہ کوئی
آہستہ آہستہ کا مالک تھا اس نے اب تک فون کال بھی
نہیں کی تھی۔ وہ اپنی بات پر قائم تھا۔ شام ہونے تک اس
نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اسے فون کر لے گا۔ اس نے نمبر ملائے تو
دوسری جانب سے بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا گیا۔

”تم نے یہ اچھا فیصلہ کیا، ورنہ آج رات تو پولیس کے
ہاتھوں میں ہوتا۔“

”مجھے کرنا کیا ہوگا؟“ اس نے اکتائے ہوئے انداز
میں پوچھا۔

”آج رات نہیں نکلتا ہے۔ کیا کرتا ہے، کیسے کرتا ہے اس کی ساری تفصیل تمہیں مل جائے گی۔ میں نے تمہیں ویڈیوز اور دوسری ساری معلومات بھیج دی ہیں۔ پھر بھی اگر کوئی سوال ہو تو مجھے فون کر لیتا۔“ یہ کہتے ہی فون کال بند ہو گئی۔ اس نے جلدی سے ڈیٹا آن کیا اور وہ ساری ویڈیوز دیکھنے لگا۔ اس کے مطابق اسے شام دھلتے ہی بلڈنگ سے نکلتا تھا۔

رات ڈھل گئی تھی۔ وہ عین اور شرٹ پہنے روڈ پر آگیا۔ اسے ایک مخصوص نمبر کی کار کا انتظار تھا۔ اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ایک کار اس کے قریب آ کر رکنے لگی۔ اسے ایک نوجوان ڈرائیور کر رہا تھا۔ پچھلی نشست پر ایک لڑکا اور لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ دونوں ہی کسی امیر گھر کے لگ رہے تھے۔ وہ اگلی نشست پر بیٹھا تھا کہ کار چل پڑی۔

وہ تھوڑی ہی دور چلے گئے کہ پیچھے بیٹھے ہوئے لڑکے نے اسے بتانا شروع کر دیا کہ وہ کس ”مشن“ پر جا رہے ہیں۔ وہ کچھ دیر اس کی تفصیلات بتاتا رہا، جہاں اسے سمجھ میں نہیں آیا، وہ اس نے پوچھ کر اپنا تھک دور کر لیا۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد وہ نچیان آباد علاقے میں پہنچ گئے۔ یہ بھی شہر کا پوش علاقہ رہا تھا۔ بہت زیادہ تعداد میں اب بھی کاروباری گھرانے وہیں آباد تھے۔ وہ پرانی وضع کے بنے ہوئے بڑے بڑے بنگلوں تھے۔ درمیان میں کھلی سڑک تھی۔ انہوں نے ایک پتکے کے سامنے جا کر کار روک دی۔ ان کے سامنے ایک بڑا سا آہنی گیٹ تھا۔ جس کے ساتھ دو رنگ چار دیواری تھی۔ ان کی معلومات کے مطابق اس وقت اندر کوئی چوکیدار نہیں تھا۔ ان تینوں نے اپنے اپنے پہل سنبھالے اور کار سے اتر گئے۔

لڑکے نے گیٹ کو بلا کر دیکھا اور پھر کسی دیوئل کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر تک کوئی دیوئل نہ پا کر وہ لڑکا تیزی سے گیٹ پر چڑھا اور اگلے چند لمحوں میں وہ دوسری جانب اتر گیا۔ گیٹ کھلا تو راجا کے ساتھ وہ لڑکی بھی اندر چلی گئی۔ ڈرائیور کا رسمیت باہر ہی رہا۔ اس نے فون آن رکھا ہوا تھا اور تینوں سے کال لی ہوئی تھی تاکہ کسی بھی ناگہانی صورت میں انہیں مطلع کر سکے۔

وہ تینوں بڑے محتاط انداز میں پورچ میں جا پہنچے۔ پتکے میں سنا تھا۔ کوئی ذی روح وہاں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پتکے کے اندر کہیں نہیں روشنی ہو رہی تھی۔ اندر کا داخلی دروازہ بند تھا۔ اس کے ساتھ آئے لڑکے نے ایک تاریک کال اور لاک کے اندر داخل کر دیا۔ ذرا سی کوشش کے بعد وہ

پرانی وضع کا لاک کھل گیا۔ وہ اندر چلے گئے۔ لاؤنج میں سناٹا تھا۔ راجا نے اوپری منزل کی جانب دیکھا، وہاں بھی خاموشی تھی۔ ایک بلب جل رہا تھا جس کی روشنی میں وہ بڑی آسانی سے دیبھے جا سکتے تھے۔ وہ تینوں دبے پاؤں سیزر حیاں چڑھتے ہوئے اوپر چلے گئے۔ وہ ایک ایک دروازے کے سامنے رک کر اندر کی سن کن لیتے رہے یہاں تک کہ آخر والے کمرے میں انہیں آوازیں سنائی دیں۔ پوری طرح تعقیب کرنے کے بعد انہوں نے دروازہ کھولا جا پایکین وہ اندر سے بند تھا۔ ساتھ آئے لڑکے نے پھر تاریک کال لاک پر کوشش کی۔ ذرا سی دیر میں وہ لاک بھی کھل گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ تینوں اندر تھے۔ مذہم روشنی میں بیڈ پر ایک جوڑا آپس میں مدھم تھا۔ انہیں یوں اندر آتے دیکھ کر عورت ہلکی سی چیخ مارتی ہوئی اٹھ گئی۔ اس نے لاشعوری طور پر اپنے بدن کو ڈھانپنے کے لیے کوئی کپڑا لیتا چاہا تو اس کے ہاتھ میں تو لیا ہی آیا۔ اسے لپیٹ کر وہ بیڈ کے ایک کونے میں بیٹھ گئی۔ اس دوران لڑکی نے دیوار پر لگا بلب روشن کر دیا۔

”کون..... کون..... ہو تم لوگ؟“ اس شخص نے پوچھا جو خاصا عجیب و غریب تھا، اس کے بدن پر کافی سے زیادہ بال تھے۔ سر سے نچوڑا کئی موچیں تھیں۔ وہ گورت اپنے آپ کو سمیٹ کر ایک کونے میں سٹی بیٹھی گئی۔ راجا آگے بڑھا اور اس نے بیڈ پر بیٹھے شخص کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”یہ چھوڑو کہ ہم کون ہیں، یہ پوچھو، ہم کرنے کیا آئے ہیں؟“

”کیا کرنے..... کیا کرنے آئے ہو؟“ اس شخص کے اب تک حواس بحال نہیں ہوئے تھے۔

”اس وقت یہاں آنے کا مطلب سمجھتے ہو، کیا ہے؟“ راجا نے پہل لہراتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا، اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتا وہ خود ہی بولا، ”اس کا مطلب ہے کہ ہمیں تمہارے بارے میں پوری پوری معلومات ہیں۔ کس طرح تم نے اپنے بیوی بچے کھل کے پیسے ہونے ہیں اور آج ایک لمبا مال لا کر تم عیاشی کر رہے ہو؟“

”تم شک..... کون ہو؟ کیا چاہتے ہو؟“ اس مرد نے کافی حد تک سمجھتے ہوئے پوچھا تو راجا نے کہا۔

”ہمیں تم سے کوئی غرض نہیں، نہ کوئی دشمنی ہے، بس جو مال ہے وہ ہمارے حوالے کر دو، پھر جو مرضی کرو۔ انکار کرنے پر مال تو ہم نے ہی چاہیں گے لیکن تم دونوں زندہ نہیں رہو گے۔ بولو مال کہاں ہے؟“ راجا نے سفاک لہجے

پتلیں گھو

”نہیں تم دھرتی کے بوجھ ہو۔“ اس نے کہا اور ٹیکر دو دیا۔ ایک دھماکا ہوا، گولی اس کے سر کے دوسری جانب نکل گئی۔ اس نے پتل کا رخ اس سٹی ہوئی عورت کی جانب کیا اور بولا۔ ”سوری، تم نے ہمیں دیکھ لیا ہے۔“ یہ کہتے ہی اس نے فائر کر دیا۔ وہ فائر اس کے سینے پر لگا۔ وہ وہیں ڈھیر ہو گئی۔ جب تک راجا باہر نکلا تب تک وہ لڑکا اور لڑکی گیٹ کے پاس پہنچ چکے تھے۔ وہ ہمارا ہوانا کے پیچھے گیا تو وہ کار میں بیٹھ چکے تھے۔ اس کے پیٹھے ہی کار چل پڑی۔

راجا جب اپنی بلڈنگ کے سامنے اترتا تو اس کے کاندر سے پرایک بھاری بیگ تھا۔ وہ تینوں اپنا اپنا حصہ لے جا چکے تھے۔ اس کا حصہ اسے لیا تھا۔ راجا کا اندازہ تھا کہ شاید یہ رقم اور زیورات ملا کر کڑے سے بھی زیادہ ہوں گے۔ اس نے قلیٹ میں جا کر وہ بیگ اسی طرح اسٹور روم میں رکھ دیا۔ وہ جھک چکا تھا۔ وہ بیڈ پر لیٹا اور بھر گہری نیند سو گیا۔

☆☆☆

اگلا پورا ہفتہ کوئی کال نہیں آئی۔ وہ سکون سے قلیٹ میں رہا۔ شام کے وقت وہ باہر نکلا۔ آوارہ گردی کرنے کے بعد کسی اچھے سے ریسٹوران سے کھانا کھاتا اور واپس آ کر قلیٹ میں سو جاتا۔ اس نے اپنے ارد گرد جیتی جاگتی زندگی کو دیکھا تو اس کے اندر بھی حیات چلنے لگیں۔ اس کا من چاہنے لگا کہ کوئی تو اس کے ساتھ ہو۔ ریسٹورانوں میں اور آوارہ گردی کے دوران انسانی تقیہ اور آوازیں اس کے من کی دنیا کو اٹھل پھل کر دیتی تھیں۔ اسے بار بار فرحانہ کا خیال آتا۔ وہ اس کے ساتھ نہیں بھی جاسکتا تھا۔ اسے غربت کی زندگی سے نکال کر ایک اچھا گھر دے سکتا تھا۔ وہ پوری آزادی کے ساتھ اس سے ٹھنوں باتیں کر سکتا تھا لیکن پھر یہ سوچ کر اپنے آپ کو سیٹ لیتا کہ کل جب وہ نہیں رہے گا، کسی انجانی غلطی یا راستے پر مارا جائے گا تو اسے جو دکھ ہوگا، وہ برواشت سے باہر ہوگا۔ یہی اچھا ہے کہ وہ اپنی دنیا تک محدود رہے اسے کسی بھی قسم کی کوئی امید نہ دلائی جائے۔ وہ یہی سمجھے کہ میں اسے نہیں چاہتا ہوں۔

ایسی ہی ایک شام وہ ریسٹوران میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ذہن میں فرحانہ گھوم رہی تھی۔ اگر وہ یہاں اس کے ساتھ ہوتی تو کیسا ہوتا۔ وہ بھی اس کے سامنے بیٹھی ہنس ہنس کے باتیں کر رہی ہوتی۔ ایسے میں اس کا نوں بیج اٹھا۔ اسکرین پر وہ بھر دیکھ کر اس نے طویل سانس لی اور کال ریسپونڈ کر لی۔

”جی، بولیں۔“ اس نے سکون سے کہا۔

”میں نے تمہیں ایک چھوٹا سا اشتہار بھیجا ہے۔ ایک

میں کہا تو اس شخص نے خوف زدہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

”تم لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے، میں کوئی.....“ اس نے کہنا چاہا تو ساتھ کھڑی لڑکی نے ایک زوردار چھڑ اس کے جڑ دیا۔ ”جی راجا بولا۔“

”اس حالت میں مر گئے تو تمہارے بیوی بچے اور خاندان والے کیا سوچیں گے، بولو۔“

”میں پھر کہہ رہا ہوں کہ تم لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔“ اس نے تیزی سے کہا تو راجا نے اس لڑکی کو اشارہ کیا۔ وہ تیزی سے دیوار پر... تصویریں مٹولنے لگی۔ ایک بڑی سی پینٹنگ کے پیچھے ایک تجوری دکھائی دی۔ تب تک ایک لڑکا.... چاہوں کے لیے تلاش لینے لگا۔ اسی لمحے اس مرد نے کمال مہارت سے راجا پر چلا ٹیک لگا دی۔ راجا اگر غافل ہوتا تو اب تک اس کے پیچھے ہوتا لیکن وہ جھکا کر دے گیا۔ وہ شخص آدھا بیڈ پر اور آدھا پیچھے تھا۔ راجا نے اس کے سر پر ٹھوکر ماری تو اس کی پیچ نکل گئی۔ راجا نے اس کی دھنکی کرنا شروع کر دی۔ وہ شخص بے دم سا ہو کر بیڈ کے نیچے آ رہا۔ راجا نے اس کی گردن پر پاؤں رکھ کر کہا۔

”اب میں تم پر گولی بھی منافع نہیں کروں گا، ایسے ہی مار دوں گا۔ بول چاہیاں کہاں ہیں؟“

”مل گئی ہیں۔“ لڑکے نے ایک دراز میں سے چاہوں کا گچھا نکالے ہوئے کہا۔ اس کا سلی فون اور والٹ بھی وہیں پڑا ہوا تھا۔ اس نے وہ چاہیاں لڑکی کی جانب پھینک دیں۔ اگلے چند منٹ میں تجوری مل گئی۔ اوپر سے نیچے تک فونوں کی گڈیاں رکھی ہوئی تھیں۔ زیورات کے بکس تھے۔ وہ لڑکا اور لڑکی دونوں سارا مال اکٹھا کرنے لگے۔ ان کی پشت پر بیگ تھے وہ اتار کر بھرنے لگے۔ انہیں سارا مال سینے ہوئے تقریباً دس منٹ لگ گئے۔ جیسے ہی ساری تجوری خالی ہوئی لڑکا اور لڑکی باہر جانے کے لیے تیار تھے۔ یہی راجا نے اپنے عمل کی نال اس شخص کے ہاتھ پر رکھی تو وہ ہڈیاں انداز میں بولا۔

”مجھے مت مارو، تم سب لے جاؤ۔“

”تمہاری اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اگر تعاون کرتے تو شاید چھوڑ دیتے۔ تم کیا سمجھتے ہو، تمہارے کالے دھندے کا پیسہ محفوظ ہے۔ دیکھنے والے قیامت کی نگاہ رکھتے ہیں۔“ راجا نے سرد لہجے میں کہا۔

”مال لے لیا اب میری جان بخش دو۔“ اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

بھر کھانا میسر آ جائے بھی بہت ہے۔ باقی جو آپ دیں گی وہ میرے لیے کافی ہوگا۔“

”مطلب تم رہنا بھی اور ہی چاہتے ہو؟“ اس بار خاتون نے خشک ہنسی نگاہ سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ضروری نہیں، جب آپ مجھنی دیں گی تو میں چلا جایا کروں گا۔“ اس نے کہا تو خاتون نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا اور پھر بولی۔

”تمہارا فون نمبر ہے تو یہاں لکھ دو، میں کل تمہیں بتا دوں گی۔“

”جی میرا نمبر ہے۔“ اس نے جیب سے ایک لکھا ہوا کاغذ آگے بڑھا دیا تو خاتون نے وہ لے کر رکھ لیا۔

”ٹھیک ہے، اب تم جا سکتے ہو۔“ خاتون نے کہا تو وہ واپس پلٹ کر کمرے سے نکل چلا گیا۔

اگلے دن کی صبح وہ ناشتا کر چکا تھا۔ تب اس کا فون بجا۔ ایک نسوانی آواز نے اس کا نام پوچھا۔

”جی میں بات کر رہا ہوں۔“

”تمہیں نوکری پر رکھ لیا گیا ہے۔ تنخواہ تمہارا کام دیکھ کر دی جائے گی۔ اگر تم چاہو تو آج ہی آ جاؤ۔“

”جی ٹھیک ہے۔ میں آ رہا ہوں۔“ اس نے کہا تو دوسری جانب سے کال بند کر دی گئی۔

اس خاتون کا نام مسرت بیگم تھا۔ سوسائٹی میں وہ ایک بزنس وومن کے طور پر جانی جاتی تھی لیکن سیاسی طور پر بھی وہ خاصی سرگرم تھی۔ چند برس پہلے وہ دیوبند ہو گئی تھی۔ اس کا ایک ہی بیٹا تھا جو امریکا میں کہیں پڑھ رہا تھا۔ گھر میں وہ ہوائی یا پھر چند لوگ رہتے تھے۔

راجا، مسرت بیگم کے پاس پہنچا تو اس نے راجا کی جانچ اپنے ایک پرانے ڈرائیور سے کرائی۔ اس نے واپسی پر ہیکری رپورٹ دی کہ بہت اچھا ڈرائیور ہے۔ اسی دن وہ پھر سے ڈرائیور کے طور پر پورچ میں کار لیے کھڑا تھا جب مسرت بیگم اندر سے باہر آئی۔ راجا نے ہچکلی نشست کا دو واڑہ کھولا وہ بیٹھ گئی تو راجا آگے بڑھ گیا۔ وہاں پر اس کی نوکری کا آغاز ہو گیا تھا۔ یہی بات جب اس نے انجینی فون نمبر والے کو بتائی تو اس نے انتہائی شغف سے کہا۔

”بس سر جھکائے اس کی نوکری کرتے رہو۔ جو بھی کہتی ہے، کرتے جاؤ۔ اس کا اعتماد جتو۔ جیسے ہی کسی معاملے کی ضرورت ہوئی، بتا دوں گا۔“

اس نے اتنا ہی کہا اور پھر فون بند کر دیا۔

کئی دن گزر گئے۔ راجا واپس کام کرتا رہا۔ مسرت بیگم

خاتون کو ڈرائیور کی ضرورت ہے۔ کل دیے گئے پتے پر پہنچ جانا اور نوکری حاصل کرنے کی کوشش کرنا۔ وہ عورت اپنے ڈرائیور بڑی جلدی بدلتی ہے اس لیے خود کو ڈرائیور بنانا سوار کر جاتا۔“

”بنا سنوار کر، مطلب.....؟“ اس نے اُلٹتے ہوئے پوچھا

”وہ خاتون بڑے رکھنے کی شوقین ہے۔ کچھ عرصہ تک اپنا مطلب پورا کرتی ہے اور پھر نیا ڈرائیور رکھ لیتی ہے۔ اس طرح جانا کہ وہ پہلی نگاہ میں ہی گھاسل ہو جائے۔“ اس نے بات کھول کر کہہ دی تو وہ مسکرا دیا۔ اسے جس جاب کے لیے جانا تھا، اس کی ضرورت تو وہ خود بھی محسوس کر رہا تھا۔

اگلے دن وہ دیے گئے پتے پر پہنچ گیا۔ وہ ایک عالیشان بنگلا تھا۔ پورچ میں دو تین مہنگی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ لان میں جاب کے لیے آئے سات آٹھ افراد کھڑے تھے۔ وہ بھی ان میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ پورچ سے آگے اور داخلی دروازے سے پہلے ہی ایک کمرے میں باری باری بلایا جا رہا تھا۔ جب وہ سارے لوگ اس کمرے سے ہو کر آ چکے تو راجا بھی اپنی باری پر اندر چلا گیا۔ کمرے میں خشکی تھی اور سامنے ہی.... صوفے پر ایک خاتون بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ ادھیر مٹھی لیکن اس کا رنگ روپ جوانوں کے مانند تھا۔ گورا رنگ تھا۔ اس نے گہرے جامنی رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا۔ اس نے خود کو آئینے سے لپیٹا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ اب بھی حسین ہے تاہم ہاضمی میں کیا قیامت ڈھاتی ہوگی، اس کا اندازہ وہ خوب کر سکتا تھا۔ وہ خاتون گہری نگاہوں سے راجا کو دیکھتے ہوئے بولی۔

”کتنا تجربہ ہے تمہارا ڈرائیونگ کا؟“

”شاید بچپن ہی سے ہے۔“ اس نے دھمے سے لہجے میں کہا۔

”ہر طرح کی گاڑی چلا لیتے ہو؟“ خاتون نے پوچھا۔

”بس انٹرنیٹک ہو، جو بھی گاڑی ہوگی چلا لوں گا۔“

اس نے پھر اسی دھمے سے لہجے میں کہا۔

”تنخواہ کیا لوگے؟“ خاتون نے ذرا سخت لہجے میں پوچھا۔

”جو آپ مناسب سمجھیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کیوں تمہیں زیادہ پیسوں کی ضرورت نہیں؟“

خاتون نے ذرا نرم پڑتے ہوئے پوچھا۔

”میں اس دنیا میں اکیلا ہوں۔ رہنے کو جگہ اور پیسے

پتلی کو

اسے وہاں رہتے ہوئے پندرہ دن سے زیادہ ہو گئے تھے۔ مگر ابھی تک اس کے بارے میں کوئی نیا حکم نہیں ملا تھا۔ اس دوران راجا نے پورا بنگلہ اچھی طرح سے دیکھ لیا تھا۔ نچانے کیوں اسے یہ احساس تھا کہ اس عورت نے اسی کے ہاتھوں قتل ہونا ہے۔ وہ ہر پہلو سے جائزہ لیتا رہا کہ اگر ایسا کرنا ہی پڑا تو وہ فرار کیسے ہوگا؟ اس کے فح جانے کے پہلو کیا ہو سکتے ہیں؟ کس طرح وہ کسی بھی الزام یا قلم سے بری ہو سکتا ہے؟ اس کے دن رات یہی سوچتے ہوئے گزرتے تھے۔ وہ کئی دنوں سے اپنے قلیٹ بھی نہیں جاسکا تھا۔ وہیں بنگلے میں رہتا تھا۔ اس رات وہ پرسکون سویا ہوا تھا جب اس کا فون بج اٹھا۔ اسکرین پر وہی اچھی خبر جھلکار ہے تھی۔

”ہیلو۔“ اس نے نیند بھری آواز میں کہا۔
”وہ دن کے اندر راتدر مسرت بیگم کو ختم ہو جانا چاہیے۔“ بھاری آواز میں اسے حکم دیا گیا تو وہ چونک کر پوری طرح بیدار ہو گیا۔
”ٹھیک ہے۔“ اس نے سمجھے ہوئے دل سے کہا۔
”کوئی پلان ہے تمہارے پاس؟“ اس سے پوچھا گیا۔

”ہاں ہے۔“ اس نے جواب دیا۔
”بس ٹھیک ہے۔“ وہاں اپنے قلیٹ چلے جانا۔“
دوسری طرف سے کہا گیا اور اس کے ساتھ ہی کال ختم کر دی گئی۔

وہ جب سے یہاں اس بنگلے میں آیا تھا، اس کا سارا دھیان ہی اسی طرف تھا کہ آخر ایک دن اسے مسرت بیگم کو ختم کرنے کے لیے کہا جائے گا۔ وہ دن آن پہنچا تھا۔ اگلی شام جب مسرت بیگم تیار ہو کر نئی تو اس نے سیاہ ساڑی پہنی ہوئی تھی۔ اس میں گورباؤن جھلک رہا تھا۔ ایسی ادھیر عورتیں پر ایسا لباس سجتا نہیں لیکن وہ جس پارٹی میں جا رہی تھی، ممکن ہے اس میں ایسا لباس اچھا سمجھا جاتا ہوگا۔ وہ جس وقت کار میں آکر بیٹھی تب ہینگے پر فریڈم کی مہک سے گویا کار معطر ہو گئی۔ راجا نے کار بڑھا دی۔

رات گئے تک پارٹی چلتی رہی۔ راجا کی توقع کے مطابق مسرت بیگم نے بی ہوئی تھی لیکن اتنی نہیں کر لڑکھڑا جائے۔ وہ آتے ہی اگلی نشست پر بیٹھ گئی۔ جیسے ہی راجا کار میں روڈ پر لایا، مسرت نے اپنی انگلیاں راجا کے کال پر پھیرنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی بولی۔

”تم سمجھتے ہو گے؟“
”جی میں سمجھ گیا۔“ راجا نے بے تکلفی سے کہا۔

کا بجی معمول تھا کہ وہ گیارہ بجے کے قریب گھر سے نکلتی، اپنے آفس جاتی۔ وہاں سے کہیں جانا ہوتا تو چلی جاتی ورنہ شام دھلے دھلے آ جاتی۔ پھر آٹھ بجے کے قریب گھر سے نکلتی اور رات گئے تک کسی ہوش یا گھر میں پارٹی سے وہاں لوثی۔ راجا کو یہی حکم تھا سو وہ اس کے ساتھ رہتا تھا۔ ایک رات جب وہ پارٹی سے لوثی تو نشے میں دھت تھی۔ دو خاتون نے راجا کو اندر بلا یا اور اسے لے جانے کو کہا۔ راجا نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر اٹھایا تو مسرت بیگم اس سے لپٹی چلی گئی۔ وہ بہت مشکل سے اسے کار تک لے کر آیا۔ اس نے پچھلی نشست پر بٹھانا چاہا مگر مسرت بیگم اگلی نشست پر بیٹھ گئی۔ جیسے ہی کار چلی اس نے راجا کی گردن پر اپنی انگلیاں پھیرنا شروع کر دیں۔ راجا کو محسوس ہوا کہ وہ پختہ خاتون کا تجربے کار ہے۔ تمام راستے وہ اس سے بے تکلف ہونے کی کوشش میں لگی۔ یہی جبکہ راجا بھی دیر سے دیر سے بے تکلف ہوتا چلا گیا۔ جس وقت وہ پورچ میں پہنچے تو لڑکھڑائی تھی۔ وہاں موجود نوکر دوں کو بلا شبہ پوری طرح علم تھا اس لیے انہوں نے مسرت بیگم کو پکڑا اور اس کے بیڈروم تک لے گئے۔ کچھ ہی دیر بعد مسرت بیگم نے راجا کو بلوایا۔ وہ اس کے بیڈروم تک جا پہنچا۔

جس وقت وہ بیڈروم سے نکلا، تب صبح کے آثار نمودار ہونے والے تھے۔ چونکہ رات نے اسے اپنے کوارٹر میں جاتے ہوئے دیکھا۔ راجا نے جاتے ہی وہ ساری رپورٹ اس انجینی کال والے کو دے دی اور سکون سے سو گیا۔

اگلی صبح مسرت بیگم بہت دیر سے اٹھی۔ دوپہر سے ذرا پہلے اس نے راجا کو بلوایا۔ وہ لاؤنچ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ جا کر کھڑا ہو گیا تو مسرت بیگم بڑے سکون سے بولی۔

”اتنے دن ہو گئے ہیں تمہیں یہاں آئے ہوئے، تم نے اپنے اخراجات کے لیے کوئی رقم نہیں مانگی؟“
”مجھے ابھی ضرورت نہیں پڑی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو مسرت بیگم نے اپنے پرس میں سے چند بڑے نوٹ نکال کر اسے دیے ہوئے کہا۔

”یہ رکھو اپنے پاس، یہ تمہاری تنخواہ میں سے نہیں ہیں۔ آج مجھے کہیں نہیں جانا اگر تم چھٹی کرنا چاہو تو کر سکتے ہو۔“

”آپ کہتی ہیں تو چلا جاتا ہوں مگر مجھے کوئی کام نہیں ہے۔“ اس نے سکون سے کہا۔

”چلو پکڑو تمہاری مرضی جاؤ جا کر آرام کرو۔“ مسرت بیگم نے کہا تو راجا لاؤنچ سے پلٹ کر کوارٹر میں آ گیا۔

ہی چھری پڑی تھی۔ وہ نشے میں آجھی تھی۔ راجا نے ایک مزید چنگ بنا کر اس کے سامنے کر دیا۔ اس نے انکار کرتے ہوئے چلا لیا۔ اس نے جلدی سے گلاس خالی کیا اور راجا کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ اسے اپنے قریب کرنا چاہتی تھی۔ بھی راجا نے اسے کاندھے سے پکڑا اور بیڈ پر لٹا دیا۔ پھر اس کے سینے پر چڑھ کر اس کی ناک کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ وہ نیچے پڑی کسمانے لگی۔ مگر راجا نے اسے دبائے رکھا۔ اس نے سانس لینے کے لیے منہ کھولا تو راجا نے پاس پڑی بوتل اٹھا کر اس کے منہ میں شراب انڈیل دی۔ اس نے کچھ دیر میں ساری بوتل اس کے اندر اتار دی۔ اس وقت تک سرت بیگم بے ہوش ہو چکی تھی۔ راجا نے بڑے سکون سے اس کا ہاتھ پکڑا اور اس کے منہ پر رکھ دیا۔ پھر دوسرے ہاتھ سے اس کی ناک دبادی۔ سرت بیگم کچھ دیر تک تڑپتی رہی پھر ساکت ہو گئی۔ راجا اس سے الگ ہو گیا۔ اس نے وہاں اپنی موجودگی کے نشانات مٹانے کی پوری کوشش کی تھی۔ جس جس چیز کو بھی اس نے ہاتھ لگا یا تھا، وہاں سے صاف کر دیا۔ پھر بڑے محتاط انداز میں وہاں گھیرا ج تک آیا۔ وہاں کچھ دیر تک انتظار کرنے کے بعد وہ نکلا اور اپنے کوارٹر تک چلا گیا۔

صبح جب وہ بیدار ہوا تو ہر جانب سکون تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ابھی کسی کو چٹا نہیں چلا تھا۔ وہ حسب معمول تیار ہو کر باہر نکل پڑا۔ اس نے پورج میں کھڑی کار کو صاف کرنا شروع کر دیا۔ باہر والے نوکر بھی اپنا اپنا کام کر رہے تھے۔ ایسے میں پولیس کی گاڑی اندر آئی۔ وہ اس کی کار کے پیچھے ہی رکی۔ کئی سارے پولیس والے اندر چلے گئے۔ وہ سمجھ گیا کہ اندر والے نوکروں نے سرت بیگم کے مرنے کی خبر پولیس کو دے دی تھی۔

کچھ دیر بعد لاؤنج میں سارے نوکروں کے ساتھ وہ بھی قطار میں کھڑا تھا۔ ایک لیڈی انسپکٹر کے ساتھ دو پولیس والے کھڑے تھے۔ اس نے سب کی طرف دیکھا اور پھر بولی۔

”رات آخری بار کون بیگم صاحبہ کے پاس تھا؟“
”جی میں تھی۔“ اندر والی ملازم نے دھمے سے کہا۔
”کیا کیا تھا تم نے؟“ اس نے ٹک بھرے لہجے میں پوچھا۔

”جی رات وہ کافی دیر سے آئی تھیں۔ اکثر وہ پارٹی وغیرہ کی وجہ سے دیر سے آتی تھیں۔ وہ آئیں تو میں نے ان سے کھانے پینے کا پوچھا، انہوں نے انکار کیا اور اپنے بیڈ

”آج میں نے اس لیے بھی زیادہ نہیں پی، میں آج تمہارے ساتھ کافی وقت گزارنا چاہتی ہوں۔ کیونکہ دو دن بعد مجھے امریکا جانا ہے۔ پھر دو ہفتے بعد ہی واپس آؤں گی۔“
وہ اپنی رو میں ہنسی چلی گئی۔ بھی راجا کی سمجھ میں آیا کہ کیوں دو دن کے اندر اسے ختم کرنے کے لیے کہا گیا۔ سرت بیگم یونہی باتیں کرتی چلی جا رہی تھی لیکن راجا کا دماغ تیزی سے کام کرنے لگا تھا۔ اس نے اپنے ذہن میں سارا پلان تیار کر لیا تھا۔

اس نے پورج میں کار روکی تو سرت بیگم اندر چلی گئی۔ وہ کار کھڑی کر کے اپنے کوارٹر میں چلا گیا۔ وہ کچھ دیر وہاں رہا پھر اس کے بعد وہ خاموشی سے گھیرا ج کے راستے اندر چلا گیا۔ ہر جانب سناٹا تھا۔ وہ بڑی احتیاط سے سرت بیگم کے بیڈ روم تک جا پہنچا۔ وہ اسی کے انتظار میں تھی۔ کمرے میں مدھم سی روشنی تھی۔ وہ جیسے ہی اندر گیا تو وہ بولی۔

”دروازہ لاک کر دو۔“

وہ دروازہ بند کر کے اس کے پاس آن بیٹھا، پھر بڑے رومانوی انداز میں بولا۔

”ایک بات کہوں آپ سے؟“

”یوں۔“ وہ غماز آلود لہجے میں بولی۔

”مجھے لگتا ہے کہ آج آپ نے زیادہ نہیں پی، اب تو ویسے ہی آپ کا نشہ اتر چکا ہوگا؟“ اس نے بڑے پیار سے پوچھا۔

”ہاں، لیکن اب تک ہلکا سا ہے۔“ وہ دھمے سے بولی۔

”میرا خیال ہے کہ آپ کو تھوڑی پی لینی چاہیے تاکہ.....“ یہ کہتے ہوئے اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ وہ چند لمحوں میں مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر ہتھ بٹھک لگا کر فیس دی۔

”ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔ نشہ دو آتشہ ایسے ہی ہوتا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے فرنیج کی جانب اشارہ کیا اور بولی۔ ”خود ہی لے آؤ۔“

راجا اسی لمحے کے انتظار میں تھا۔ وہ جلدی سے اٹھا اور فرنیج میں سے بوتل اور گلاس لے آیا۔ اس کے ساتھ ہی کچھ پھل نکالے۔ اور اس کے سامنے دھر دیے۔ سرت بیگم نے ایک پیگ بنایا اور پی گئی۔

زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔ جس وقت وہ دو پیگ پی چکی تو راجا نے پھل ساڑھیں پکڑ رکھ دیے۔ اس کے ساتھ

پتلی گرو

دوں۔ اگر ایسا کرتا تو آج سلاخوں کے پیچھے ہوتا۔ اس بار اس سے بیکاری ہی لگتی تھی۔ دھیرے دھیرے وہ یہ سوچنے لگا تھا کہ اب وہ حکم دینے والے کی منت کر لے گا کہ اس کی جان چھوڑ دے۔ وہ کہیں ٹھیلا لگا کر اپنی زندگی گزار لے گا لیکن اب ایسا کام نہیں کرے گا۔ اس نے یہ طے کر لیا تھا کہ اگر اس نے جان چھوڑ دی تو وہ واقعی ٹھیلا لگا کر اپنی زندگی کو بدل ڈالے گا۔

ایسی ہی ایک رات وہ آوارہ گردی کے دوران میں کھانا کھا کر واپس اپنے قلیت میں آ گیا۔ وہ بی وی آن کر کے چائے بنانے کے لیے بکن کی طرف گیا یہ تھا کہ اس کا دروازہ بج اٹھا۔ یہ وہی مخصوص دسک جس پر اس کا دل دھڑک جایا کرتا تھا۔ وہ بکن میں جانے کے بجائے دروازے کی جانب چلا گیا۔ حسب توقع باہر فرحانہ کھڑی تھی۔ ایک لمبے کوتوا سے یوں لگا جیسے وہ پہلے والی فرحانہ ہے ہی نہیں بلکہ کوئی اور ہے۔ بہترین تراش کا سوٹ پہنے، لیوں پر ہلکی لپ اسٹک لگائے، نینوں میں کامل بھرے، بیسو کٹے چھوڑے وہ اس کی جانب دیکھے مسکرائے جا رہی تھی۔ حسب معمول اس کے ہاتھ میں ایک ڈھکا ہوا برتن تھا۔ وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اتنی جلدی کیسے آگئی؟

”اندرا آنے کے لیے نہیں کہو گے؟“
”اوہ..... آں..... آؤ۔“ اس نے رات دیتے ہوئے کہا اور پھر خود ہی آگے چل پڑا۔ وہ اندرا آکر کرسی پر بیٹھ گئی۔ راجا نے پھر سے اسے سر تا پا دیکھا۔ نیل پالش گلے پاؤں میں نازک سی ہونٹیں چھل پھل ہوتی تھیں۔

”انتا غور سے کیوں دیکھ رہے ہو؟“
”بہت بدل گئی ہو۔ سبکی دیکھ رہا تھا؟“ راجا نے ایک طویل سانس لے کر کہا اور سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔
”تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ اپنے آپ پر دھیان دیا کروں۔ سوخو پر توجہ دینے لگی ہوں، اب یوں کیوں کہہ رہے ہو۔“ اس نے کاغذ سے اچکا کر پوچھا۔
”اچھا لائی ہو میرے لیے۔“ اس سے جواب نہ بن پڑا تو برتن کی طرف دیکھ کر پوچھا۔
”مٹھائی ہے تمہارے لیے۔“ اس نے برتن اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا تو اس نے پکڑ کر کھولتے ہوئے پوچھا۔

”کس خوشی میں؟“
”جہاں میں جاب کرتی تھی نا، وہاں کی میڈ ہو گئی ہوں۔ ایک دم سے بڑی ترقی، ہے ناسر پر اثر۔“ اس نے

روم میں چلی گئیں۔ وہ سونے لگیں تو مجھے جانے کا کہہ دیا۔ میں واپس اپنے کوارٹر میں آکر سوئی۔“

”اس وقت کیسی حالت میں تھیں۔ مطلب نارمل تھیں؟“ لیڈی انسپکٹر نے پوچھا۔

”جی..... وہ..... اکثر..... نشے میں ہوتی تھیں۔ رات بھی تھیں۔“

”تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ وہ نشے میں تھیں؟“ لیڈی انسپکٹر نے پوچھا۔

”جی۔“ ملازم نے جواب دیا۔

”بارٹی میں کوئی ڈرائیور لے کر گیا تھا یا وہ خود ڈرائیور کے گئی تھیں؟“ اس نے سب کی جانب دیکھ کر پوچھا۔

”جی میرے ساتھ گئی تھیں اور میں ہی انہیں واپس لایا تھا۔ انہوں نے واپسی پر پی ہوئی تھی۔“ اس نے جواب دیا۔

”ایسا اکثر ہوتا تھا یا رات ہی ایسا ہوا تھا؟“ اس نے شک بھرے لہجے میں پوچھا تو راجا نے اعتماد سے کہا۔

”جی اکثر ایسے ہی ہوتا تھا۔ ایک بار تو کچھ خواتین انہیں کار تک چھوڑ کر گئی تھیں۔“

”ٹھیک ہے، تم دونوں خاص طور پر کہیں نہیں جاؤ گے، یہیں رہو گے۔“ لیڈی انسپکٹر نے کہا اور اپنے اسسٹنٹ سے بولی۔

”پوسٹ مارٹم کا بندوبست کیا جائے۔“
”ٹھیک ہے۔“ اسسٹنٹ نے کہا تو لیڈی انسپکٹر دوسرے ملازمین سے پوچھتا چھ کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد ان سب کو جانے کا کہہ دیا۔

شام تک پوسٹ مارٹم رپورٹ آگئی۔ جس میں یہی لکھا گیا تھا کہ زیادہ شراب پینے کی وجہ سے موت واقع ہوئی ہے۔ تشدد کے ہلکے پھلکے نشان ہیں۔ ممکن ہے وہ بے ہوشی ہی میں خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی ہو۔ چونکہ وہاں تعزیت کے لیے لوگ آچکے تھے اس لیے یہی کہا گیا کہ موت ہارٹ ایٹک کے باعث ہوئی ہے۔ یہی بات میڈیا کو بھی بتا دی گئی۔

☆☆☆

راجا کو بیٹھنے سے آئے بیٹھے سے زیادہ ہو گیا تھا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ اس سے کام تو لے لیا گیا تھا لیکن اس کے عوض ایک پیسہ بھی اس کے ہاتھ نہیں لگا تھا۔ حکم دینے والے نے یہ تک نہیں کہسا تھا کہ اس کی تجویز ہی خالی کر

وقت گزارا ہے۔ اب آسانیاں ہیں تو انہیں انجوائے کرو
بھول جاؤ اپنے ماضی کو، اس بلڈنگ کی طرح مجھے بھی اپنے
دامخ سے کھرچ دو۔“ اس بار دراجا کا لہجہ دکھ بھرا تھا۔

”کوئی ایسا صل نہیں ہے۔ ہم مل کر اس.....“ اس نے
کہنا چاہا تو راجا نے تکی سے اس کی بات کاٹنے ہوئے کہا۔
”نہیں ہے نافرمانہ۔“

”اچھا تم سوچو، تھوڑا غور کرو، ہم اس پر پھر بات کر
لیں گے کیونکہ اس کی وجہ ہے۔“ فرحانہ نے موضوع بدلنے
کے لیے کہا۔

”وجہ، مطلب کیا وجہ ہے؟“ راجا نے پوچھا۔
”میں نے جب اپنی ترقی کی بات بابا کو بتائی تو ظاہر
ہے وہ بہت خوش ہوئے لیکن اس کے ساتھ میں نے پہلی بار
کھل کر۔۔۔ بابا کو بتا دیا میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔۔۔
وہ بھی تمہارے جواب کے منتظر ہیں۔“

”تم اگر اپنی امید نہیں توڑنا چاہتے تو بھلا میں کیا کر
سکتا ہوں اور یہ تم نے ظلم کیا کہ انہیں بھی بتا دیا۔ وہ بھلا کیا کر
سکتے ہیں۔ سوائے اس کے کہ ان کو دکھ ہوگا کہ تم اپنی پسند
نہیں پاسکی ہو۔ خیر یہ تمہارا فیصلہ ہے، میں کیا کر سکتا ہوں۔“
راجا نے اس کے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں پھر بات کروں گی بلکہ میں چلنا میرے ساتھ ہم
کہیں باہر جا کر اچھا سا بیچ لیں گے۔ وہیں بات کریں
گے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ گئی۔ وہ چند لمحوں۔۔۔ کھڑی راجا
کی طرف دیکھتی رہی مگر وہ کم صبر سا بیٹھا رہا۔ فرحانہ ایک دم
سے باہر نکلی چلی گئی۔ راجا کو لگا کہ کمرے کے مانند اس کی
زندگی بھی خالی خالی سی ہوگئی ہے۔ اس نے دروازہ بند کیا اور
اپنے بستر پر جا پڑا۔ زندگی اسے بری لگنے لگی تھی۔ وہ سوچتا
کچھ چاہتا تھا لیکن فرحانہ کا چہرہ اس کی نگاہوں سے ہٹ نہیں
رہا تھا۔ وہ جس چنگل میں پھنس گیا تھا، اس سے چھٹکارا پا کر
ہی وہ فرحانہ کو اپنا سکتا تھا۔

شاید آدمی رات سے بھی زیادہ دقت ہو گیا تھا۔ وہ
نیند بھری آنکھوں سے جاگ رہا تھا کہ اس کا سیل فون بج
اٹھا۔ اس نے نسل کر فون اٹھایا۔ اسکرین پر اسی اپنی کے
نمبر تھے۔ اس نے کال ریسیو کرتے ہوئے ہلکا ہلکا تو دوسری
جانب سے بھاری آواز میں کہا گیا۔

”اب تک جو تم نے پیسہ کمایا ہے، وہ کہاں ہے؟“
”وہ سب میرے پاس ہے، چاہو تو سارا لے لو، لیکن
مجھے آزاد کرو، میں اب اپنی زندگی مزید نہیں جی سکتا۔“ اس
نے تڑپ کر اپنی ساری اذیت لفظوں میں بیان کر دی۔

خوش ہوتے ہوئے بتایا۔
”اودھ، یہ تو ہونا ہی تھا۔ یہ کوئی سر پر اثر نہیں ہے۔“
اس نے مضامی منٹ منٹ ڈالتے ہوئے کہا۔
”تو سر پر اثر کس بات کا ہونا تھا؟“ اس نے بھوس
اچکا کر پوچھا۔

”پہلی کہ تمہاری مقفی ہوگئی ہے اور.....“ اس نے کہا
تو فرحانہ اس کی طرف آنکھیں کھینچ کر دیکھنے لگی۔ دیکھتے ہی
دیکھتے اس کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے۔ بھی وہ بھرا
ہوئی آواز میں بولی۔

”کوئی دوسرا کہتا تو مجھے اتنا برا نہیں لگتا تھا لیکن مجھے
تمہاری بات سے بہت دکھ ہوا ہے راجا۔“
”نہیں دکھ نہیں ہونا چاہیے فرحانہ۔“ اس نے دو
ٹوک لہجے میں کہا۔

”وہ کیوں؟“ فرحانہ نے حیرت سے پوچھا۔
”یقین جانو میں تمہیں دل سے چاہتا ہوں، تمہارا
احرام کرتا ہوں اس لیے بھی کہ کوئی تو ہے جو مجھے چاہتا ہے
لیکن میں ایسا بد قسمت ہوں تمہیں پاس نہیں سکتا۔ اس سے بھی
بڑی بد قسمتی یہ ہے کہ میں تمہیں اس کی وجہ نہیں بتا سکتا۔“ راجا
نے کچھ اس انداز سے کہا جیسے پہلی بار اس کے سامنے اپنا دل
کھول کر رکھ دیا ہو۔

”تم چاہے نہ بھی مانو تو میں یہ بات اچھی طرح جانتی
ہوں کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو لیکن ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا
جس کا کوئی حل موجود نہ ہو۔ مجھے بتاؤ، ہم مل کر اس مسئلے کو حل
کر لیں جو تمہیں میرے ساتھ شادی کرنے پر روک رہا
ہے۔“ اس نے استعنائی جذباتی انداز میں پوچھا۔

”پہلی تو بد قسمتی ہے فرحانہ، میری ہاں یا مرضی بھی
تمہیں میرا نہیں کر سکتی۔ میں ان دیکھی زنجیروں میں جکڑا ہوا
ہوں۔ یہ میری محبت ہے کہ میں تمہاری زندگی اجیرن نہیں
کرنا چاہتا۔“ راجا نے یاسیت بھرے لہجے میں کہا۔

”دیکھو، مجھے ایک اچھا گھر مل رہا ہے۔ میں بابا کے
ساتھ وہاں شفٹ ہو جاؤں گی۔ بس چندوں کی بات ہے۔
میں تمہیں بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتی ہوں۔ اس بلڈنگ
سے دور جہاں ہمارا بوکا، بکلا ہوا چمچن بیٹا ہے۔ میں جانتی
ہوں کہ رو بار کیسے ہوتا ہے۔ یقین جانو ہمارا اچھا مستقبل ہمارا
انتظار کر رہا ہے۔ میری بات مان لو۔“ فرحانہ نے منت
بھرے انداز میں کہا۔

”میں تمہیں کوئی امید نہیں دلا سکتا۔ تم جاؤ، میں
پورے دل سے خوش ہوں۔ میں جانتا ہوں تم نے کتنا مشکل

پتلیں گھو

تھا شادولت دے سکتا ہوں۔ تم اس لڑکی سے بھی شادی کرو، اس کے باپ کا بھی سہارا بنو، میں نہیں روکتا۔“ بھاری آواز والے نے کہا۔

”ٹھیک ہے، میں منالوں گا۔ اگر وہ نہیں مانے تو پھر میری زندگی تمہارے لیے ہے تم جو چاہو۔“ راجا نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

”جو کچھ تم کہہ رہے ہو، اگر ایسا ہی ہوا تو مجھ میں تم سے رابطہ کیے بنا بھی تمہارے ساتھ ہوں گا۔ تم اس لڑکی کے ساتھ شادی کرو، میں دیکھتا ہوں تم اپنے بیان میں کتنے سچے ہو۔“

”ؤن ہو گیا۔“ اس نے خوشی بھرے لہجے میں کہا تو دوسری جانب سے فون بند ہو گیا۔ راجا بے ساختہ اٹھ بیٹھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنی بڑی خوشی اسے مل سکتی ہے۔ اس کا سن چاہ رہا تھا کہ ابھی جانے اور یہ خوشخبری فرحانہ کو سنائے کہ میں تم سے شادی کر رہا ہوں لیکن اتنی رات گئے وہ اسے کیسے بتانے جا سکتا تھا۔

وہ ساری رات نہیں سو سکا۔ اس دوران اس نے بہت کچھ سوچ لیا تھا۔ صبح کا اجالا پھیل رہا تھا کہ وہ ہمت کر کے فرحانہ کے دروازے تک جا پہنچا۔ اس نے ہلکے سے دستک دی۔ دوسری دستک پر دروازہ کھول دیا گیا۔ فرحانہ اسے اپنے سامنے دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی۔

”کون ہے بیٹا۔“ عقب سے آواز آئی تو فرحانہ نے کہا۔

”بابا، وہ، یہ راجا آیا ہے۔“

”راجا، تو آنے دانا اندر۔“ بابا نے کہا تو وہ سیدھا ان کے پاس چلا گیا۔ وہ ایک تخت پوش پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے ان ہاتھوں سے معائنہ کیا اور ان کے قریب پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ بابا اس سے حال احوال پوچھنے لگے، اسنے میں فرحانہ دو گم میں چائے لے کر آگئی، بلاشبہ وہ پہلے ہی سے بنی ہوئی تھی۔ وہ چائے دے کر پلٹ گئی تو بابا نے بڑے پرسکون لہجے میں پوچھا۔

”جیسے خبریت اتنی صبح؟“

”دیکھیں اگر میری ماں ہوتی یا کوئی بڑا ہوتا تو یہ بات وہ کرتے لیکن آپ کو پتا ہے میرا کوئی نہیں ہے۔ میں آپ کا بیٹا بننا چاہتا ہوں۔“ اس نے بے دھوک کہہ دیا۔

”ہاں، یہ بات مجھے فرحانہ پہلے بتا چکی ہے، اچھا کیا تم نے مجھ سے بات کر لی۔ ٹھیک ہے جب تم دونوں راضی ہو تو میں بھی راضی ہوں۔ زندگی تم دونوں نے گزارنی

”اتنی جلد گھبرا گئے ہو؟“ دوسری جانب سے حیرت بھری آواز ابھری۔

”میں یہ زندگی نہیں جیتنا چاہتا۔ خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔ مجھے آزاد چھینے دو۔ میں مزید جرم نہیں کر سکتا۔“ اس نے رو دینے والے انداز میں کہا۔

”ہاں یہ بات تو میں سمجھ گیا ہوں کہ تم بھرا ماند ذہن نہیں رکھتے ہو مگر مجھے ایک بات بتاؤ، مجرم کر کے کیا، وہی بھوک والی زندگی.....“

”میں وہ گزار لوں گا۔“ اس نے تیزی سے جواب دیا۔

”دیکھو، اس وقت شہر میں بہت سارے ایسے لوگ ہیں جو میرے اشاروں پر کچھ چیزوں کی طرح ناچ رہے ہیں۔ جس کی مثال تم بھی ہو۔ تم اگر نہ بھی رہے تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔ مثلاً جیسے روزی تھی۔ اس نے جب تک کام کیا سو کیا، پھر اس نے خواہش کا اظہار کیا کہ وہ شادی کر کے یہاں سے نہیں دور جانا چاہتی ہے۔ میں نے اسے جانے دیا۔ اگر تم مجھے سچ بتا دو تو میں تمہارے بارے میں سوچ سکتا ہوں۔“ بھاری آواز والے نے پہلی بار اتنی لمبی بات کی تھی۔

”شاید میں بھی کچھ ایسا ہی چاہتا ہوں۔ اس پوری دنیا میں صرف ایک ہی لڑکی ہے جو مجھے بہت چاہتی ہے، میں بھی اسے دل سے چاہتا ہوں، اس کا احترام کرتا ہوں۔ میں نے اسے بہت سمجھایا کہ وہ اپنے معیار کے کسی بندے کو اپنا جیون ساتھی چن لے مگر وہ بھنڈے اور میں بڑی قسمت اس کا ساتھ نہیں دے پا رہا ہوں، وجہ صرف اور صرف تمہاری ذات ہے۔“ اس نے گھوہ بھرے لہجے میں کہا تو بھاری آواز والے نے کہا۔

”چلو تم اس کے ساتھ شادی کر بھی لو مگر رہو گے تو نہیں، کام تو پھر بھی کر سکتے ہو میرے ساتھ۔“

”نہیں میں جرم کی اس دنیا سے نکل جانا چاہتا ہوں۔ وہ اگر میرے لیے اچھا سوچ سکتی ہے تو میں بھی اس کے کام آسکتا ہوں۔ اس کا معذور باپ ہے، میں اس کا سہارا بن سکتا ہوں۔ جب تک اس کی زندگی ہے۔ میرے پاس جرم کی دنیا کا سارا مال دیے گا ویا بڑا ہوا ہے خدا ارادہ لے لو اور مجھے آزاد کر دو۔“ اس نے منت بھرے لہجے کہا کہ تو دوسری جانب خاموشی چھا گئی۔

”صرف ایک شرط ہے۔ تم اگر یہاں سے کسی دوسرے ملک چلے جاؤ، پلٹ کر واپس نہ آؤ تو تمہیں بے

چھوٹوں بعد ایک کوریئر کمپنی کی طرف سے انہیں ایک بڑا سالن لقا ملا۔ وہ راجا کے نام سے تھا۔ اس نے کھولا تو اس میں تین پاپورٹ تھے۔ وہ چکرا کر رہ گیا۔ ایک اس کا، دوسرا فرحانہ کا اور تیسرا بابا کا تھا۔ اسے خبر بھی نہیں ہوئی کہ کب اس کا پاپورٹ چوری ہو گیا تھا۔ اس نے فرحانہ کو بلا کر وہ لقا ٹھکانا دیا۔ اس پر کینیڈا کے ویزے لگے ہوئے تھے۔ ساتھ میں دو دن کے بعد کی ٹکٹیں بھی تھیں۔ اس کے ساتھ ایک خط تھا جس پر لکھا تھا۔

راجا.....!

اگر تم بھرمناہ ذہنیت کے ہوتے تو اب تک مر چکے ہوتے۔ تمہارے اندر ایک اچھا بندہ تھا اس لیے میں نے تمہیں آزاد کر دیا۔ میں ایک بیکر ہوں۔ میرے سامنے کمپیوٹر کی دنیا کھلی ہوئی ہے۔ لوگوں کی معلومات تک رسائی، میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ روزی ایک غریب لڑکی تھی، میں نے اس کی مدد کی۔ دلیر بھرمناہ ذہنیت رکھتا تھا، وہ مارا گیا۔ مسرت بیگم زمین کا بوجھ تھی، ماری کوئی لیکن تم نے یہ ضرور سوچا ہوگا کہ اس کی ٹھہیں رقم نہیں ملی۔ میں نے اس کی ساری رقم ایک ایسے اکاؤنٹ میں منتقل کر دی ہے جو کینیڈا میں ہے۔ وہ رقم میرے کسی کام کی نہیں۔ تم وہاں جاؤ اور سکون سے زندگی گزارو۔ جتنا چاہے خرچ کرو یا کاروبار کرو۔ یہ تم اس کو اپنا انعام سمجھ لو۔ یہ یاد رکھو تمہیں جو کچھ بھی ملا ہے، وہ تمہاری بلڈنگ ہی سے ملا ہے۔ فرحانہ کے مدد کے ملا ہے کہ اس نے تم سے محبت کی۔ جاؤ اپنی زندگی گزارو۔“

آخری لفظ پڑھنے کے بعد دونوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ بھی فرحانہ نے کہا۔

”ٹھیک ہے، ہم پرسوں کینیڈا نکل جائیں گے لیکن بابا کو.....“

”اُن سے بھی بات کرتے ہیں۔“ راجا نے کہا اور وہ خط لے کر بابا کے کمرے کی طرف چلا گیا۔ وہ اپنے کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ گئے۔ اس نے وہ خط ان کے سامنے رکھا تو بابا نے مسکرا کر کہا۔

”کوئی بات نہیں کچھ بیکرا اچھے بھی ہوتے ہیں۔ یہاں سے نکلو۔ کینیڈا جا کر میں سب کچھ بتا دوں گا اور کسکھا بھی دوں گا۔“

اُن کے یوں کہنے پر دونوں پھٹی پھٹی نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگے۔

ہے۔“ بابا نے اسی سکون سے کہا۔ ان دونوں ہی کو پتا تھا کہ فرحانہ یہ سب سن رہی ہے۔

”لیکن میں ایک بات کہنا چاہوں گا۔ شادی کے بعد جتنی جلدی ممکن ہو، اس ملک میں نہیں رہنا، کہیں باہر جانا ہے۔ چاہے باہر مجھے مزدوری کرنا پڑے۔“ راجا نے کہا تو بابا نے اس کی بات پر چند لمحے توقف کیا پھر بولا۔

”یہ تم دونوں کا فیصلہ ہے۔ میں کسی پر بوجھ نہیں بننے والا۔ مجھے اپنے بچوں کی خوشیاں عزیز ہوں گی۔“ بابا نے کہا تو چند لمحوں بعد فرحانہ سامنے آ کر جلدی سے بولی۔

”بابا میری زندگی تو آپ کے ساتھ ہے۔ میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جانے والی۔ راجا سے شادی بھی کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے ادھر اناہ کر۔“

”میں نے یہ تو نہیں کہا کہ بابا کو ہم اکیلا چھوڑ دیں گے۔ میں ان کی دیکھ بھال کروں گا۔ جیسے ہی ممکن ہو باہر چلے جائیں گے۔“ راجا نے کہا تو بابا نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے، میں تم دونوں کے ساتھ ہوں۔“ یہ لفظ تھے کہ گو یا مسرت کا پیغام تھا۔ انہیں زندگی ہی خوب صورت لگنے لگی تھی۔

☆☆☆

بلڈنگ کے احاطے میں ان دونوں کی شادی ہوئی تھی۔ ساری بلڈنگ کے لوگ شریک تھے۔ راجا نے خوب اہتمام کیا تھا۔ سارا دن پلاٹا گٹار باؤں اور فرحانہ بیاہ کر راجا کے قلیٹ میں آئی۔ وہ بیچ پر بیٹھی تھی کہ راجا اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ بھی راجا نے وہ سب باتیں بتادیں جس کی وجہ سے اس کے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پھر یہ شادی کس شرط پر ہوئی وہ بھی اسے بتادی۔ ساری بات سن کر وہ بولی۔

”تم فکر نہ کرو۔ اگر تم مجھے پہلے بتادیتے تو میں اس کا بھی حل نکال لیتی، خیر، ہم وہ شرط پوری کر لیں گے۔ مجھے کینیڈا کی ایک فرم سے آفر ہے۔ میں بابا کی وجہ سے نہیں جا رہی تھی لیکن اب تم ساتھ ہو، تمہارے پاس اتنا سرمایہ بھی ہے کہ ہم چند ماہ آسانی سے گزار لیں گے۔ پھر دیکھیں گے کیا ہوتا ہے۔“

”تم نے تو میری مشکل ہی حل کر دی۔“ راجا نے خوشی سے سرور لیے میں کہا اور اٹھ کر بیٹھ بیٹھادی۔

اگلے دن وہ اس گھر میں شفٹ ہو گئے جو فرحانہ کو ملا تھا۔ بابا کو بھی ایک کمرے میں ان کے سامان کے ساتھ شفٹ کر دیا گیا۔